

خواتین ڈائجسٹ
دسمبر 2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالد جیلانی





زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) — 700 روپے
6000 روپے
7000 روپے

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

دسمبر 2016
جلد 44 شمارہ 8
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91 بلاک W نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721[illegible], 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کرن کرن خوشبو

دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ربیع الاول کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ وہ مبارک مہینہ ہے جب خاتم الانبیاء رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ وہ عظیم الشان شخصیت جن کا پوری کائنات میں کوئی ہمسر نہیں۔ اور نہ قیامت تک ہو گا۔

پوری تاریخ انسانی ان کی کوئی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کائنات کی وہ واحد ہستی جن کی بابرکت ذات میں اللہ تعالیٰ نے تمام کمالات جمع کر دیے ہیں۔ جس پہلو سے بھی دیکھیں، آپ کی شخصیت جامع اور مکمل نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو اللہ تعالیٰ نے رفعت و بلندی عطا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خوشی مناتے ہیں، جلسے جلوس منعقد کرتے ہیں، چراغاں کرتے ہیں لیکن یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس پیغام کو سمجھیں جو آپ لے کر آئے اور ان تعلیمات پر عمل کریں جو ہمارے لیے دنیا میں سربلندی اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ہیں۔

سال نو نمبر۔ سروے،

نئے سال کا پہلا شمارہ سال نو نمبر ہو گا۔ اس میں قارئین کی شمولیت کے لیے حسب روایت سروے بھی شامل ہو گا۔ سروے کے سوال یہ ہیں۔

1۔ نئے سال کے آغاز پر آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

2۔ کوئی ٹھہرا ہوا سا اک لمحہ

ساری عمر رواں سے اچھا ہے

کوئی ایسا کام، کوئی اچھی بات، کسی کی مدد یا نیکی جسے کر کے آپ کو روحانی سکون اور خوشی ملی؟

3۔ 2016ء کے حوالے سے آپ کے لیے سب سے خاص بات کیا رہی؟ کون سی کامیابی ملی۔۔۔ اور کہاں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا؟

4۔ کوئی خوش کن احساس، میٹھا سا جملہ، محبت بھری نظر، کوئی تحسین آمیز بات، جس سے دل کو بے اختیار خوشی حاصل ہوئی؟

5۔ کوئی کتاب جو آپ کو اچھی لگی؟ کیوں اچھی لگی؟ پسندیدہ اقتباس یا شعر لکھیں؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 22 جنوری تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کے ناول آب حیات کی آخری قسط، ، نمرہ احمد کا ناول نمل تکمیل کے مراحل میں،
- محبت خواب جزیرہ۔ عنیزہ سید کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- سیما بنت عاصم، صائمہ شاہد اور فاطمہ عسکری کے ناولٹ،
- شازیہ الطاف ہاشمی، عنبرین اعجاز، عندلیب زہرا اور بشریٰ احمد کے افسانے،
- مشہور اینکر ارسلان کھوکھر سے ملاقات، ، بزم سیمی کی دستر۔ میرا سیمی سے ملاقات،

کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،

- ہمارے نام، خرمن و برمن، نفسیاتی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا امام مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

حاکم کی اطاعت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس نے میری اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی' اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے حاکم کی اطاعت کی' اس نے میری اطاعت کی اور جس نے حاکم کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :
امیر یا حاکم سے مراد اپنے وقت کا مسلم حکمران کسی صوبے کا گورنر و وزیر اعلیٰ اور کسی علاقے کا افسر مجاز ہے۔ ان کی اطاعت' جب تک اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو' ضروری ہے اور ان کی نافرمانی سخت گناہ۔ کیونکہ نظم ملت بہت ہی ضروری ہے اور وہ اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔

صبر کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے'
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو اپنے حاکم کا کوئی کام ناپسندیدہ دیکھے تو اسے چاہیے کہ صبر کرے' اس لیے کہ وہ بالشت برابر بھی حاکم کی اطاعت سے نکلا تو اس کی موت' جاہلیت کی موت ہو گی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :
اس میں بھی حکمرانوں کی اطاعت سے سرکشی کرنے سے روکا گیا ہے۔

بادشاہ کی بے توقیری کرنا

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:
"جس نے بادشاہ کی بے توقیری کی' اللہ بھی اسے ذلیل کرے گا۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ بادشاہ کی بے توقیری اور اہانت سے مراد' ان کی حکم عدولی اور عدم اطاعت ہے۔ اس سے حکمرانوں کا وقار اور ان کی تمکنت و جلال متاثر ہوتا ہے جبکہ امن و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کا رعب و دبدبہ قائم رہے تاکہ جرائم پیشہ اور قانون شکن عناصر کو اپنی مذموم کارروائیوں کی جسارت نہ ہو۔ بہرحال ملکی مفاد اور مصلحت عامہ کی وجہ سے مسلمانوں کو یہی تاکید کی گئی ہے کہ جب تک حکمرانوں سے کفر صریح کا ارتکاب نہ ہو اور جب تک وہ نماز اور دیگر شعائر دین کو قائم رکھیں' اس وقت تک ان کی اطاعت کرو' چاہے وہ عدل و انصاف کے قیام اور عوام کے دیگر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والے ہی ہوں۔

2۔ اسلام کی یہ ہدایت موجودہ مغربی جمہوریت سے یکسر مختلف ہے جس میں حزب اختلاف کا وجود نہایت ضروری ہے۔ جس کا کام ہی ہر وقت حکومت پر تنقید اور اس کے خلاف لوگوں کو خروج و بغاوت پر آمادہ کرنا ہے تاکہ وہ حکومت ناکام اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جائے اور پھر وہ خود اس کی جگہ اقتدار پر فائز ہو جائے۔ اسلام میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کا یہ تصور نہیں ہے۔ سب ایک ہی امت ہیں اور ایک ہی کشتی کے سوار ہیں جن کے مفادات اور مقاصد بھی ایک ہیں۔ اور حکمرانوں کی کوتاہیوں کے باوجود عوام کو ان کے خلاف خروج و بغاوت پر آمادہ کرنا جرم ہے۔

عہدہ و منصب کا سوال کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یہ آخرت کا گھر ہم ان ہی لوگوں کے لیے کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔" (القصص 83)

فائدہ آیت :

1۔ طلب امارت کا مطلب ہے کہ اس کا طالب دنیا میں بڑائی کو پسند کرتا ہے اور بڑائی پسندوں کا رویہ ہی زمین میں فساد کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت باب کے مفہوم کو واضح کر رہی ہے کہ عہدہ و منصب کی خواہش اور اس کے لیے سعی و کوشش کا انجام بالعموم برا ہی ہوتا ہے۔ حسن انجام اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان حکومتی مناصب سے کنارہ کش رہے۔

منصب کا سوال کرنا

حضرت ابو سعید عبدالرحمٰن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے عبدالرحمٰن بن سمرہ! تو خود حکومت کے کسی منصب کا سوال نہ کرنا' اس لیے کہ یہ منصب اگر تجھے بغیر سوال کیے مل گیا تو اس پر (اللہ کی طرف سے) تیری مدد ہوگی اور اگر یہ تجھے سوال کرنے سے ملے گا تو یہ تیرے سپرد کر دیا جائے گا (اللہ کی مدد شامل حال نہیں ہوگی۔) اور جب تو کسی بات پر قسم کھا لے' پھر تو کسی اور میں اس سے زیادہ بہتری دیکھے تو وہ کام اختیار کر جس میں بہتری ہو اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ امارت سے مراد خلافت (حکومت) یا اس کا کوئی بھی منصب ہے۔ اس کی آرزو اور اس کے لیے کوشش کرنا ناپسندیدہ ہے' اس لیے کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونا نہایت مشکل امر ہے۔ البتہ جسے بغیر مانگے یہ منصب مل جائے وہ اسے قبول کر لے کیونکہ بن مانگے یہ اسی کو ملے گا جس میں اس کی خاص استعداد و صلاحیت ہوگی۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی مدد ہوگی۔

جبکہ خود خواہش کر کے حاصل کرنے والا اللہ کی طرف سے خیر اور امداد کی توفیق سے محروم رہے گا' چنانچہ آج اس حقیقت کا عام مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جمہوری حکمران خود کوشش کر کے بلکہ جائز و ناجائز ہر

طرح کے ہتھکنڈے اختیار کر کے اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ خیر کی توفیق سے وہ محروم رہتے ہیں۔ اس طرح کوئی حکمران اچھا اور کامیاب ثابت نہیں ہو رہا ہے کیونکہ سب اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے محروم ہیں۔

2۔ کسی کام کی بابت قسم کھائی ہے' جب کہ اس میں کسی دوسرے کام کے مقابلے میں خیر اور نفع زیادہ ہے تو ایسے موقع پر قسم توڑ کے اس کا کفارہ ادا کر دیا جائے اور جس میں بہتری ہے اس کام کو کر لیا جائے۔ کفارہ قسم ایک گردن آزاد کرنا' یا دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس مہیا کرنا ہے۔ جو ان کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

حاکم نہ بننا

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے ابوذر! میں تجھے کمزور دیکھتا ہوں اور میں تیرے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں' (اس لیے تیرے لیے میری نصیحت یہ ہے کہ) تو دو آدمیوں پر بھی حاکم نہ بننا اور نہ کسی یتیم کے مال کا نگران بننا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بڑے زاہد قسم کے صحابی تھے' دنیاوی معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اسی اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مذکورہ نصیحت فرمائی اور انہیں ان ذمہ داریوں میں کمزور قرار دیا کیونکہ مذکورہ ذمہ داریاں وہی شخص صحیح معنوں میں ادا کر سکتا ہے جو دنیاوی معاملات میں دلچسپی لیتا اور انہیں خوب سمجھتا ہو نہ کہ وہ جسے امور دنیا سے نفرت ہو اور وہ ان سے دور بھاگتا ہو۔

2۔ اس میں عام لوگوں کی مصلحت اور ان کے مفادات اور اسی طرح یتیموں کے اموال کی حفاظت کا جذبہ بھی کارفرما ہے کیونکہ ان معاملات میں کمزور آدمی سے انہیں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے' گو وہ خود نقصان پہنچانے کی نیت نہ رکھتا ہو۔

3۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آدمی جس کام کے لائق ہو اسے وہی کام سونپنا چاہیے' دوسرا کام سونپنا درست نہیں۔

اہلیت و قوت

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ مجھے کسی جگہ کا عامل (سرکاری عہدیدار) نہیں بنا دیتے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر مارا اور فرمایا:

"اے ابوذر! تو کمزور ہے' اور (یہ منصب) ایک اہم امانت ہے۔ یہ قیامت والے دن رسوائی اور ندامت (کا باعث) ہوگا۔ سوائے اس شخص کے جو اسے حق کے ساتھ (اہلیت کی بنیاد پر) حاصل کرے اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو اس کی بابت اس پر عائد ہوتی ہیں۔" (مسلم)

فائدہ:

1۔ اس میں ان لوگوں کو سرکاری مناصب حاصل کرنے کی اجازت دی گئی ہے' جن میں دو شرطیں موجود ہوں: ایک اس منصب کی اہلیت اور دوسری' اس منصب کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی استعداد و قوت۔ جیسے کوئی حکمران بنے تو عدل و انصاف قائم کرنے اور اس کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کی صلاحیت و قوت سے بہرہ ور ہو۔ مالیات کے شعبے کا انچارج بنے تو اس کی اہلیت اور اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی استعداد سے مالا مال ہو۔ گورنر یا کسی شعبے کا وزیر' مشیر یا کلرک وغیرہ جو بھی بنے' اس کی اہلیت بھی اس میں موجود ہو اور دیانت و امانت سے اس کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا جذبہ و استعداد بھی ہو۔ وعلی ہذا القیاس۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑی امانت ہے۔ مذکورہ شرطوں کے بغیر اسے حاصل کرنا ایک گونا خیانت ہے' جس کی سخت سزا قیامت کے روز اسے بھگتنی پڑے گی۔

قیامت کے دن

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم یقیناً" حکومت اور امارت کی حرص کرو گے (لیکن یاد رکھو!) یہ قیامت والے دن ندامت (کا باعث) ہوگی۔" (بخاری)

فائدہ:

اس میں بھی امارت کی عظیم ذمہ داریوں کے حوالے سے ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو بغیر اہلیت کے اس کی خواہش کریں گے اور پھر اس میں کوتاہیوں کی وجہ سے عنداللہ مجرم قرار پائیں گے۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ انسان حکومتی ذمہ داریوں سے دور ہی رہے اور اگر اہلیت کی بنیاد پر اسے یہ منصب ملے تو وہ اس کے تقاضے بھی پوری دیانتداری سے ادا کرے تاکہ روز قیامت کی ندامت سے وہ محفوظ رہے۔

نیک لوگ مقرر کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
"اس روز، دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔"

فائدہ آیت:

1۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت والے دن نیک لوگوں کی باہمی محبت اور دوستی قائم رہے گی کیونکہ ان کی دوستی اللہ کے لیے اور ایک دوسرے کی خیر خواہی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس سے امام نووی رحمتہ اللہ نے بجا طور پر استدلال فرمایا کہ حکومتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے بھی نیک لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ وزیر، مشیر، اہلکار اور دیگر تمام مناصب کے لیے ایمان و تقویٰ کو بنیاد بنایا جائے تاکہ وہ صحیح مشورہ دیں اور صحیح کام کریں اور اگر حکمران نے برے اور خود غرض لوگوں کو اپنا ہم نشین اور عہدیدار (وزیر، مشیر وغیرہ) بنا لیا اور ان کی باتوں اور ہدیوں کو قبول کرنا شروع کر دیا تو جس طرح وہ خود غلط ہیں، حکمرانوں کو بھی غلط راستے پر لے جائیں گے اور قیامت والے دن یہ سب ایک دوسرے کے دشمن اور ایک دوسرے کو کوتاہیوں اور غلطیوں کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔

اچھے مشیر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے راست باز (خیر خواہ) وزیر عطا کر دیتا ہے۔ وہ اگر بھولتا ہے تو وہ وزیر اسے یاد کرا دیتا ہے۔ اگر اسے یاد ہو تو اس کی مدد کرتا ہے اور جب بھلائی کے علاوہ کسی اور بات (برائی) کا ارادہ فرماتا ہے۔ اس کے لیے برا وزیر مقرر کرتا ہے۔ اگر وہ بھول جائے تو اسے یاد نہیں کراتا اور اگر اسے یاد ہو تو اس کی مدد نہیں کرتا۔" (اسے ابوداؤد نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے، جو کہ مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی حاکم کے پاس اگر اصحاب ایمان و تقویٰ موجود ہوں اور وہ ہر وقت اسے صحیح مشورہ دیتے اور برائیوں سے روکتے ہوں تو یہ اللہ کی طرف سے اس کی رضامندی کی دلیل ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی حکمران کو وزیر و مشیر اور کارکن وغیرہ ایسے ملیں جو خود غرض، ابن الوقت اور چڑھتے سورج کے پجاری ہوں جو اسے صحیح مشورے نہ دیں بلکہ غلط خطوط پر ڈالیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس حکمران کا انجام اچھا نہیں ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے حکمرانوں کا دنیوی انجام بھی اچھا نہیں ہوتا، آخرت میں حسن انجام تو بہت دور کی بات ہے۔

منصب کی آرزو کرنا

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا۔
"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جن (علاقوں) پر اللہ نے آپ کو حکمران بنایا ہے ان میں سے بعض کی

گورنری (وغیرہ) ہمیں عنایت فرمادیں۔ دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ کی قسم! ہم حکومتی عہدوں پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو خود اس کا سوال کرے' نہ کسی ایسے شخص کو جو اس کی خواہش رکھے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس حدیث سے اس باب کی تائید ہوتی ہے جو امام نووی رحمتہ اللہ نے باندھا ہے کہ کسی ایسے شخص کو عہدہ و منصب نہ دیا جائے جو خود اس کا طالب یا حریص ہو' کیونکہ ایسے لوگ بالعموم اپنے ذاتی مفادات کے لیے ان عہدوں کو حاصل کرتے ہیں' جس سے عام لوگوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔ جبکہ حکومت کا مقصد تو عام لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے نہ کہ چند مراعات یافتہ مخصوص لوگوں کو یا حکومتی منصب پر فائز لوگوں کو۔

جب خواب کی تعبیر بیان کردی جائے

حضرت ابورزین (لقیط بن صبرہ عقیلی) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرمارہے تھے:

"خواب کی جب تک تعبیر بیان نہ کی جائے اس وقت تک وہ (گویا) پرندے کے پاؤں میں ہوتا ہے۔ جب تعبیر کردی جائے تو واقع ہوجاتا ہے۔" اور فرمایا:

"خواب نبوت کے چالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔" اور غالباً "یہ بھی فرمایا:

"خواب صرف اسی کو سنائے جو محبت رکھنے والا یا سمجھ دار ہو۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ پرندے کے پنجے میں پکڑی ہوئی چیز گر بھی سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ گرے۔ اسی طرح خواب کی جب تک تعبیر نہ کی جائے تب تک یہ ممکن ہے کہ خواب میں دیا ہوا اشارہ واقع ہوجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقع نہ ہو۔ جب تعبیر کردی جائے تو پھر اس کا وہی مطلب بن جاتا ہے جو بیان کیا گیا۔

2۔ امام بخاری رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ اگر پہلے تعبیر کرنے والے نے تعبیر میں غلطی کی ہو اور اس کے بعد دوسرا شخص صحیح تعبیر کردے تو دوسری تعبیر ہی معتبر ہوگی۔ (صحیح البخاری)

3۔ تعبیر بیان کرنے والا شخص جاہل نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ غلط تعبیر بیان کرے گا جو پریشانی کا باعث ہوگی' جب کہ عالم اس کا اچھا مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کرے گا' اسی طرح مخلص دوست اچھا مطلب تلاش کرے گا جب کہ اجنبی شخص کے دل میں وہ ہمدردی نہیں ہوگی' اس لیے ممکن ہے کہ وہ نامناسب تعبیر بیان کردے۔

زیادہ سچ بولنے والے کا خواب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب زمانہ (ختم ہونے کے) قریب آجائے گا تو (اس زمانے میں) مومن کا خواب شاذو نادر ہی جھوٹا نکلے گا۔ اور زیادہ سچا خواب اس کا ہوگا جو (روزمرہ زندگی میں) بات چیت میں زیادہ سچا ہے۔ اور مومن کا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ قیامت کے قریب کفر، فسق اور جہالت کا غلبہ ہوگا۔ سچے مومن بہت کم ہوں گے۔ ان مومنوں کے خواب سچے ہوں گے۔

2۔ بعض علماء نے اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا زمانہ لیا ہے' البتہ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔ (فتح الباری)

——— نیک آدمی کے خواب زیادہ سچے ہوتے ہیں۔

✡

آپ کی عمر کیا ہے

انشا جی

معاف فرمایئے۔ یہ سوال آپ سے نہیں ہے' کیونکہ ہمیں آداب مجلس سے اتنا بھی بے بہرہ نہ جانیئے کہ ہم خواتین سے اس قسم کا اشتعال انگیز سوال کریں گے' نہ ہمیں اتنا سادہ جانیئے کہ آپ جواب میں جو کچھ فرمائیں گی۔ (آپ سے مطلب آپ نہیں' آپ تو ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں' دوسری خواتین کی بات ہے۔) اس میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں ملائیں گے۔ دراصل آپ کی عادت بھی پختہ ہو چکی ہے' ہماری بھی۔ صرف آپ کی عمر کے بارے میں نہیں' سودا سلف کی خریداری میں بھی۔

ہمیں ایک چھاتا خریدنا تھا' دکان دار نے کچھ قیمت بتائی۔ ہم نے سنا' سات روپے۔ فوراً" اپنے اصول کے مطابق کہا۔ "چھ روپے لینے ہوں تو دو۔" بلکہ یہ بھی کہا کہ "ابھی کل ہی ہم نے بوہری بازار سے چھ روپے میں ایسا ہی چھاتا لیا ہے۔" دکان دار مسکرا کر بولا۔ "جی میں نے سات روپے نہیں کہا۔ چار روپے کہا ہے۔" ہم نے اپنے اصول کو پھر بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اور کہا۔ "چار روپے؟ زیادہ ہیں چار روپے۔ تین روپے منظور ہوں تو ٹھیک' ورنہ ہم چلے۔"

خواتین کے بارے میں ہمارا اصول یہ رہا ہے کہ جہاں کسی نے عمر بتائی۔ ہم نے اس میں پندرہ سال اپنی طرف سے ملا لیے' اس کی وجہ یہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد ایک خاتون سے ہم نے ان کا سن شریف پوچھا تو انہوں نے انیس برس بتایا۔ یہ 1948ء کی بات ہے۔ 1963ء میں ہماری جاننے والی ایک صاحبہ کو ان سے یہ ہی استفسار کرنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک انیس برس ہی کی ہیں۔ اور 1947ء کے ہنگاموں کے بارے میں فرماتی ہیں کہ "ہاں ہاں کچھ کچھ ہو یاد ہے۔ میری عمر اس وقت تین چار برس کی تھی۔" اس سے ہمارا یہ نتیجہ نکالنا قدرتی بات تھی کہ خواتین کی عمر میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب وہ پندرہ سال بعد اپنی اگلی سالگرہ مناتی ہیں۔ بعد میں تجربے سے پتا چلا کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ بعض دس سال ہی میں سالگرہ مناتی ہیں اور ایسی تعجیل پسند بھی دیکھنے میں آئیں کہ آج بیس برس کی ہیں اور پانچ ہی سال بعد خود کو اکیس برس کی بھی کہنے لگیں۔

عمر کے باب میں چین میں ہم سے بہت دھوکا ہوا۔ پہلے تو یوں کہ پیکنگ یونی ورسٹی کی اردو طالبات اور طلبا سے ہمارا تعارف ہوا تو ہم نے ان کے سن و سال کے اعتبار سے "بلو کا بستہ" اور "چاند تارا" وغیرہ کتابیں تحفے میں دیں۔ اور پھر ان کو اپنے ہوٹل میں چائے پر بھی مدعو کیا۔ کوئی پانچ سات بچے بچیاں اس میں شریک ہوئے۔ ایک بچی کا خط بہت اچھا تھا۔ ہم نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ "کیا عمر ہے تمہاری؟" ایک لڑکا بول اٹھا۔ "بیس برس کی ہیں جناب! مجھ سے بڑی ہیں۔" ہم نے کہا۔ "دیکھو مذاق نہیں کرتے۔" اس بچی نے بھی کہا۔ "جناب بڑا شریر ہے یہ' غلط کہتا ہے۔ 15 مئی کو میں بائیس برس کی ہو جاؤں گی۔" ہم فوراً" الگ ہو کر بیٹھ گئے اور بلو کا بستہ وغیرہ واپس لے کر ان کو موازنہ دبیر و انیس اور آثار الصنادید وغیرہ دیں۔ ان کی استانی سنجیدہ صورت' حد سے حد چالیس برس کی لگتی تھی۔ لیکن ہم سمجھ گئے کہ تینتالیس کی ضرور ہوں گی۔ طالب علموں سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ "جناب تیس برس کی ہیں ہماری استانی۔"

☼ ☼ ☼

لیکن جو حادثہ دوہاں میں ہم پر گزرا قدرے زیادہ عبرت ناک ہے' وہاں دریائے یانگسی کے کنارے تین شہروں کا اتصال ہے۔ جن میں ایک شہر ہانکو بہت مشہور ہے۔ یہاں ایک ڈراما ہو رہا تھا۔ مضمون تو اس کا جو تھا سو تھا' لیکن ہیروئن اس کی من موہنی تھی۔ ریشم کی طرح گداز' کونپل کی طرح نازک' شیریں آواز' ڈرامے کی جان تھیں۔ ہم نے پیر صاحب قبلہ (پیر حسام الدین راشدی) سے جان کی امان پاکر عرض کیا کہ اس دیس میں ہر چند کہ دل کے کاروبار کی اجازت نہیں۔ تاہم آپ کو اعتراض نہ ہو تو اپنی دلوں کی پوٹلی میں سے ایک آدھ اس بانو کو نثار کر دیں۔ بولے' بانوئے قشنگ است یعنی ہاں یہ ماہ رو ہے اسی لائق۔ لیکن لڑکی نہیں عورت ہے۔ ہم نے کہا۔ پچیس برس سے زیادہ نہیں' پیر صاحب فرمانے لگے کہ یہ تمہارا حسن ظن ہے۔ تیس سال کی ضرور ہوں گی۔ خیر ہم کھیل دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں اشعار آبدار موزوں کرتے رہے۔ ڈراما ختم ہونے کے بعد ہم اس کے آرٹسٹوں سے ضرور ملا کرتے تھے۔ اب کے بھی اسٹیج کے پیچھے گئے اور سب سے شرف تعارف حاصل کیا۔ اس بی بی سے ہم نے اپنے دل کے بارے میں تو کوئی بات نہ کی۔ ہاں یہ کہا کہ "آپ کا کمال فن ہمیں پسند آیا۔ اس چھوٹی عمر میں فن پر یہ قابو؟ سبحان اللہ" بولیں "تعریف کا شکریہ لیکن میں کافی دنوں سے اسٹیج پر کام کر رہی ہوں۔" کتنے برس سے؟ کسی نے پوچھا۔

حساب لگا کر بولیں" کوئی چالیس برس سے۔ 1926ء میں پہلے ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اس وقت دس برس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہمارا ترجمان تو' دیکھنے میں چالیس سے زیادہ کا نہ لگتا تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں ہم نے اسے یہ ہی اندازہ جتایا تو ہنس کر بولا۔" ابھی تو پچھلے مہینے میں چونتیس برس کا ہوا تھا۔" اس کے بعد ہم نے ذرا احتیاط اختیار کی۔ اگر کوئی چینی ہم سے پوچھتا کہ ذرا میری عمر کا اندازہ کرو تو ہم محض تخمینہ بتاتے تھے کہ بھیا تم بیس سال سے کم کے نہیں ہو اور ساٹھ سال سے کسی صورت زیادہ نہیں ہو۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ اندازہ اکثر و بیشتر صحیح ثابت ہوتا تھا۔

ایک عزیزہ سے ہماری بے تکلفی تھی۔ لہٰذا ہم نے ان سے کہا کہ یہ آپ کی زیادتی ہے کہ پانچ سال پہلے بھی آپ تیس برس کی تھیں' اب بھی تیس برس کی خود کو بتاتی ہیں"۔ بولیں" جناب انسان کی ایک زبان ہوتی ہے' یہ نہیں کہ آج کچھ کہا' کل کچھ اور بیان دے دیا۔ آپ پانچ سال بعد بھی پوچھیں گے تو ان شاء اللہ یہ ہی جواب ملے گا۔ ہم شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ اس ضمن میں اپنے ایک شناسا کی مثال بھی یاد آتی ہے اور اگرچہ اخبار خواتین میں ہمیں خواتین کے ذکر سے باہر نہ جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایک آدھ استثنا میں حرج نہیں۔ یہ صاحب ہمیں گاڑی میں ملے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیس برس کی تھی۔ ایک سال بعد ہمارے ایک دوست کے ہاں ان کے رشتے کی تجویز آئی تو پتا چلا کہ اٹھائیس کے ہیں۔ رشتہ تو نہ ہوا۔ لیکن اس کے اگلے برس پھر ان سے ملاقات کی تقریب نکل آئی۔ وہ ایک نوکری کے انٹرویو میں آئے تھے اور ہمیں بھی انٹرویو بورڈ میں بٹھا لیا گیا تھا۔ ہم نے پوچھا۔ سن شریف؟ جواب ملا۔ چوبیس کا ہوں جی۔ جبکہ ہمارے حساب سے وہ اس وقت چھتیس کے ہونے چاہیے تھے۔ ہم نے کہا صاحب زادے اتنی رفتار تیز مت کرو۔ ورنہ دو ہی سال میں سن بلوغت کو پار کر کے نیچے پہنچ جاؤ گے۔ چار سال بعد گھٹنوں چلنے اور تتلانے لگو گے اور پانچ برس بعد کی کیفیت ہم عرض نہیں کر سکتے۔ سال کے عمر سے فقط ایک سال گھٹا لیا جائے تو ابھی خاصے دن چل سکتے ہو۔"

☼



معروف فنکارہ انجم سیٹھی کی دختر

میرا سیٹھی سے باتیں

شاہین رشید

1۔ "اصلی نام؟"
"میرا ہی ہے۔"

2۔ "پیار کا نام؟"
"میرو Miru۔"

3۔ "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"12 جنوری"

4۔ "قد بغیر ہیل کے؟ / ستارہ؟"
"5 فٹ 9 انچ / کیپری کورن۔"

5۔ "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"دو... ایک بڑا بھائی اور میں۔"

6۔ "تعلیمی قابلیت؟"
"بی اے۔"

7۔ "شادی؟"
"ابھی تو نہیں ہوئی۔ جب اللہ کو منظور ہوگا' ہو جائے گی۔"

8۔ "شوبز میں آمد؟"
"لمبا سوال ہے۔ مختصر بتاتی ہوں کہ امریکہ میں ایک چینل کے لیے کام کرتی تھی۔ تو مجھے اداکاری کا شوق ہوا... تو سوچا کیوں نہ باقاعدگی کے ساتھ آجاؤں' سو آگئی۔"



9۔ "پہلا ڈرامہ؟/ شہرت؟"
"سلوٹیں" جو اے آر وائی سے آن ایئر ہوا تھا۔ اس سے میری پہچان بنی اور اس سے مجھے مزید آفرز بھی آئیں۔"

10۔ "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"10 بجے۔۔۔ اور اگر شوٹ پر ہوں تو پھر آٹھ بجے ہی اٹھ جاتی ہوں۔"

11۔ "صبح اٹھ کر پہلا کام؟"
"گرم پانی پیتی ہوں۔۔۔ لیموں کے ساتھ۔"

12۔ "کوئی کھانا جو مسلسل کئی دن کھانے سے بھی بور نہیں ہوتیں؟"
"مٹن"

13۔ "جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"کاش میرے بال تھوڑے گھنے ہوتے۔"

14۔ "بھوک مٹانے کے لیے کیا کھاتی ہیں؟"
"چکن سینڈوچ۔"

15۔ "فخر کا کوئی لمحہ؟"
"بہت سارے ہیں۔۔۔ میں نے اپنی گریجویشن سیرمنی میں ایک تقریر کی تھی۔ مجھ سے پہلے یعنی 30 سال پہلے ہیلری کلنٹن نے تقریر کی تھی۔ اس کے بعد میں نے تو یہ میرے لیے اعزاز کی اور فخر کی بات ہے۔ کیونکہ جس ادارے سے میں نے گریجویشن کی ہے اسی کالج سے ہیلری کلنٹن نے بھی پڑھا ہے۔"

16۔ "وہ دن جس کا انتظار ہے؟"
"جب میری کتاب شائع ہوگی۔ کتاب کا نام ابھی نہیں بتا سکتی۔"

17۔ "تھکن میں کہاں جانے کے لیے تیار رہتی ہیں؟"
"صرف اور صرف اپنے بیڈ پر اور کہیں بھی نہیں۔"

18۔ "بچپن کی ایک بری عادت جو ابھی بھی ہے؟"
"اب نہیں ہے۔ مگر بچپن میں ناخن کترتی تھی، (Nail biting)۔"

19۔ "طبیعت میں ضد ہے؟"
"ضدی ہوں۔۔۔ اور کامیاب ہونے کے لیے "ضد" بہت ضروری ہے۔"

20۔ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"اینٹی بایوٹک۔"

21۔ "دماغ پہ غصہ کب سوار ہوتا ہے؟"
"جب لوگوں کو کچھ کہا جائے اور وہ اپنے کام پر پورا نہ اتریں تو۔"

22۔ "غصے میں آپ کی کیفیت؟"
"جس طرح سب کی کیفیت ہوتی ہے۔۔۔ غصہ دکھانا۔۔۔ تھوڑا بولنا۔"

23۔ "سات دنوں میں پسندیدہ دن؟"
"ہفتہ۔"

24۔ "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"ذہانت... اور کھلے دل کا ہونا۔"

25۔ "مردوں میں کون سی بات بری لگتی ہے؟"

"کنجوسی۔"

26۔ "گھر کے کس فرد کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"ابو کے۔"

27۔ "سیاست میں آنے کو دل چاہا؟"

"نہیں... بالکل نہیں۔"

28۔ "وقت سے پہلے کیا ملا؟"

"شہرت اور بہترین تعلیم۔"

29۔ "بچت کس انداز میں کرتی ہیں؟"

"بینک میں رکھتی ہوں۔ کیش بہت ذاتی سا سوال ہے۔ چلیں خیر۔"

30۔ "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"

"کہ یہ اچھی جگہ پر خرچ ہو رہا ہے یا نہیں۔"

31۔ "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"لکشمی چوک۔"

32۔ "کبھی برا وقت گزارا؟"

"ہاں... جدوجہد ہی کرتی آ رہی ہوں اور جدوجہد سے ہی سب کچھ ملتا ہے اور میں شوبز کی بات کر رہی ہوں۔"

33۔ "کون سا کردار کرنا چاہتی ہیں؟"

"میں پنجابی بہت اچھی بولتی ہوں... تو دل چاہتا ہے کہ پنجاب کی لڑکی کا کردار ادا کروں۔ پنجاب کی جٹی بننا چاہتی ہوں۔"

34۔ "تنقید اور تعریف کس انداز میں پسند ہے؟"

"میری عدم موجودگی میں میری تعریف ہونی چاہیے اور میرے منہ پر تنقید تاکہ میں بہتر سے بہترین پرفارم کر سکوں۔"

35۔ "کس پسندیدہ شخصیت کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہیں؟"

"میرے ایک پسندیدہ رائٹر ہیں لندن میں رہتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں جانتا مگر وہ مجھے پسند ہیں۔"

36۔ "کس ایئر لائن سے زیادہ سفر کرتی ہیں؟"

"اتحاد ایئر لائن۔"

37۔ "کب موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"

"جب کوئی بہت اچھا سا لطیفہ سنا دے۔"

38۔ "پسندیدہ پروفیشن؟"

"یہی ایکٹنگ۔"

39۔ "مخلص زیادہ کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"

"دونوں ہو سکتے ہیں... اس کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔"

40۔ "چھٹی کا دن کہاں گزارنے کا دل چاہتا ہے؟"

"لاہور میں۔"

41۔ "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"تو برے وقت میں انہیں آزما کر دیکھیں۔"

42۔ "اپنی شخصیت کے لیے کیا کہیں گی؟"

"فائٹر۔"

43۔ "عورت ذہین ہونی چاہیے یا حسین؟"

"دونوں... مگر اگر شوبز میں آنا ہے تو پھر "حسن" زیادہ ضروری ہے۔"

44۔ "اور مرد؟"

"اگر شوبز میں آنا ہے تو وہی بات کہوں گی اور اگر ایسا نہیں ہے... تو پھر ذہانت بہت ضروری ہے۔"

45۔ "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"نعمان اعجاز کے ساتھ۔"

46۔ "کس کے ایس ایم ایس کے جواب "فوراً" دیتی ہیں؟"

"کسی کے بھی... جس کا ضروری ہو اسی کو جواب دیتی ہوں۔"

47۔ "بوریت ہو رہی ہو تو؟"

"تو کتاب پڑھتی ہوں۔"

48۔ "ایک کردار جو ہٹ ہوا؟"

"مسلوتیں کی 'تاشا'۔"

49۔ "ایک کردار جو کر کے پچھتائیں؟"

"نہیں... ایسا کوئی نہیں ہے۔"

50۔ "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو؟"

"پرفیوم... رسیدیں، بہت ساری 'ڈسپلین' جو لپ

یہ لگاتے ہیں اور ایر فون۔"

51۔ "آپ کے پاس ذخیرہ ہے؟"

"کتابوں کا اور جیولری۔"

52۔ "مہمان بننا اچھا لگتا ہے یا ان کی آمد؟"

"دونوں۔"

53۔ "سیاسی پاور میں آجائیں تو؟"

"عورتوں کے حقوق کے لیے کوئی پالیسی بناؤں گی۔"

54۔ "ایک کھلاڑی جس کی وجہ سے کرکٹ دیکھتی ہیں؟"

"مصباح۔"

55۔ "کون سا جملہ برا لگتا ہے؟"

"صبر کرو۔"

56۔ "انسان کی زندگی کا خوب صورت دور؟"

"جب اس کو ایک اچھا لائف پارٹنر مل جائے۔"

57۔ "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"

"بہت۔۔۔ بہت زیادہ کرتی ہوں۔"

58۔ "کس پہ بہت خرچ کرتی ہیں؟"

"اپنی فیملی پہ۔۔۔ اور اپنی دوستوں کے بچوں پر۔"

59۔ "اپنے لیے ایک قیمتی چیز جو آپ نے خریدی؟"

"گرم جیکٹ۔"

60۔ "کہاں کھانا کھانا اچھا لگتا ہے؟"

"ڈائننگ ٹیبل پہ۔"

61۔ "ہاتھ سے کھاتی ہیں یا چھری کانٹے سے؟"

"چھری کانٹے سے۔"

62۔ "ایک کردار جو آپ کی شخصیت کے قریب تھا؟"

"ایک ڈرامہ چل رہا ہے ٹی وی ون سے "خوشبو کا سفر" اس میں میرے کردار کا نام ہے "ردا" یہ میری شخصیت کے قریب ہے۔"

63۔ "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"نارمل ہے۔۔۔ جیسے سب کی ہوتی ہے۔"

64۔ "اپنے آپ کو ساتویں آسمان پہ کب محسوس کرتی ہیں؟"

"جب میں نے کسی چیز کے لیے محنت کی ہو اور اس پر مجھے داد اور حوصلہ افزائی ملے تب۔"

65۔ "کانٹی نینٹل کھانوں میں پسندیدہ کھانا؟"

"اسپگیٹیز۔"

66۔ "ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"چکن کڑاہی۔"

67۔ "بہترین کک مرد یا عورت؟"

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کے بھی ہاتھ میں ذائقہ ہو سکتا ہے۔"

68۔ "ایک سوال جو صحافی ضرور کرتے ہیں؟"

"کہ والدین نے آپ کو شوبز میں کیسے آنے دیا جبکہ آپ ایک پڑھے لکھے بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہیں۔"

69۔ "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"سانپ سے ڈر لگتا ہے۔ کیڑوں سے ڈر نہیں لگتا۔"

70۔ "آپ کو فوبیا ہے؟"

"جی۔۔۔ مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔"

71۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"جی۔۔۔ بالکل۔"

72۔ "درزی کے چکر لگاتی ہیں یا بوتیک کے؟"

"پہلے تو درزی سے ہی سلوائی تھی۔۔۔ مگر اب زیادہ تر ریڈی میڈ ہی لیتی ہوں۔ مگر جب موقعہ ملتا ہے سلوائی بھی ہوں۔ ڈراموں کے لیے۔"

73۔ "دکھ ہوتا ہے؟"

"جب کوئی منہ پر جھوٹ بولے تو۔"

74۔ "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"جوتا چھپائی۔"

75۔ "تحفہ یا کیش؟"

"تحفہ۔"

76۔ "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"ہمارا کک ہے مشتاق ان کے ہاتھ کا۔"

77۔ "ایک شخصیت جن سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"ہیلری کلنٹن۔"
78۔ "اپنا نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
"شاید ایک بار۔"
79۔ "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"بیگ۔ کیش اور کچھ ضروری چیزیں۔ ہاں گھر کی چابی بھی۔"
80۔ "ایک کارنامہ جو انجام دینا چاہتی ہیں؟"
"اپنی موری خود بنانا چاہتی ہوں۔ لکھوں بھی خود' اداکاری بھی خود کروں اور پروڈیوس بھی خود ہی کروں۔"
81۔ "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"
"پاکستان کے لیے امن چاہتی ہوں۔ دہشت گردی ختم ہو جائے۔ لڑائیاں ختم ہو جائیں اور ہم ایک جمہوری راستے پر چلیں۔"
82۔ "ماں ناراض ہو جائے تو؟"
"تو منا لیتی ہوں۔ پھر بڑی جلدی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"
83۔ "اپنی غلطی مان لیتی ہیں؟"
"جی۔ بالکل مان لیتی ہوں۔ غلطی کی ہے تو مان بھی لینی چاہیے۔"
84۔ "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سنیں؟"
"نہیں۔ ایسا نہیں کرتی۔"
85۔ "اپنی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"
"جو کہتی ہوں وہ کرتی ہوں' یعنی اپنی بات کی پکی ہوں اور بری عادت یہ کہ میں "بے صبری" بہت ہوں۔"
86۔ "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"
"پہلے دماغ کی سنتی تھی مگر اب دل کی سنتی ہوں۔ جب سے اداکارہ بنی ہوں۔"
87۔ "بچپن کی کیا کیا چیزیں سنبھال کر رکھی ہیں؟"
"چوڑیاں ہیں میرے پاس بچپن کی۔"
88۔ "غصے میں کھانا پینا چھوڑ دیتی ہیں؟"
"نہیں۔ کیونکہ مجھے کھانے سے بہت محبت ہے۔"
89۔ "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب آپ کی پرائیویٹ لائف پر لوگ زیادہ غور کرنے لگیں۔"
90۔ "جلدی نیند آجاتی ہے؟"
"نہیں۔ کروٹیں بدل کر نیند لانے کی کوشش کرتی ہوں۔"
91۔ "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر کیا کیا کچھ رکھتی ہیں؟"
"کچھ خاص نہیں بس۔ فون ہی لازمی ہوتا ہے۔"
92۔ "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"
"سلاد۔ یعنی گاجر' پیاز اور کھیرا۔"
93۔ "کون سے تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"
"نیو ایئر۔"
94۔ "آپ کے وارڈ روب میں کس کلر کے کپڑے زیادہ ہیں؟"
"بلیو اور گرین۔"
95۔ "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"
"میرے خیال سے محنت سے پیسہ ملتا ہے۔"
96۔ "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"جب کسی کو بچانا ہو۔ پروٹیکٹ کرنا ہو تب۔"
97۔ "بدلہ لیتی ہیں؟"
"یقیناً"۔"
98۔ "فریش کب محسوس کرتی ہیں؟"
"چھ بجے کے بعد۔ یعنی صبح کے وقت۔"
99۔ "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"ٹھنڈا پانی پینا اور صوفے پر لیٹ جانا۔"
100۔ "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے؟"
"کوئی بات نہیں۔ پھر ابھرنے کی کوشش کریں گے۔"



اینکر بنتا یا نیوز کاسٹر بننا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی' اس کے لیے نہ صرف بہت پڑھنا بھی پڑتا ہے بلکہ قدرتی صلاحیت کا ہونا بھی بہت ضروری ہے کہ آپ کو بات سے بات نکالنے اور بولڈ ہو کر بولنے کا فن بھی آنا چاہیے ... ایسے اچھے اینکرز کی تعداد انگلیوں پہ گنی جاسکتی ہے۔ ان ہی میں ایک "ارسلان کھوکر" بھی ہیں جو ایکسپریس نیوز میں کافی عرصہ رہنے کے بعد اب سچ ٹی وی سے وابستہ ہوگئے ہیں کیونکہ بقول ان کے کہ "سچ ٹی وی" کی ویورشپ زیادہ ہے۔

"کیا حال ہیں ارسلان صاحب؟"

"الحمد للہ ... آپ سنائیں۔"

"جی اللہ کا شکر ہے ... نیوز اینکر ہیں' ہر طرح کے لوگوں سے آپ کا رابطہ رہتا ہو گا ... سیاست دانوں کو

سچ ٹی وی کے نیوز اینکر

ارسلان کھوکھر سے مُلاقات

شاہین رشید

کیسا پایا؟"

"اچھا سوال ہے ... جب میں انہیں کچھ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھتا' تو پھر یہ مجھے انسانوں جیسے نہیں لگتے ... میں جب پڑھنے کے لیے یو کے گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں جس کے پاس جتنی اونچی اور اچھی پوسٹ ہے' وہ اتنا ہی ڈرتا ہے' اتنا ہی نرم مزاج اور اتنا ہی منکسر المزاج ہے اور یہ بات مجھے اتنی پسند آئی کہ بیان نہیں کر سکتا ... اور ہمارے یہاں اس کے بالکل الٹ یا برعکس ہے یہاں جس کے پاس جتنی بڑی پوسٹ ہے وہ اتنا ہی بڑا بدمعاش ہے۔"

"اس کی وجہ کیا ہے۔ تربیت کی کمی ہے؟"

"وہاں انسان کی تربیت سسٹم کرتا ہے اور سسٹم بنانے کے لیے جب ملک بنتے ہیں تو اس کی بنیاد ٹرانسپیرنسی کے اوپر رکھی جاتی ہے۔ ہم جب دوسرے ملکوں کی ہسٹری پڑھتے ہیں۔ جیسے امریکہ' جاپان اور اٹلی' فرانس وغیرہ کی تو ان کے یہاں بھی بہت گڑبڑ تھی' مگر جب ان ملکوں کی بنیاد رکھی گئی تو ٹرانسپیرنسی پہ رکھی گئی ... ہمارے یہاں تو بنیاد ہی سیاست کے اوپر رکھی گئی ... تو بس سیاست کو رنگ ہی الٹا سیدھا دے دیا گیا۔ ہے تو گڑبڑ تو ہوگی۔"

"کوئی مخلص نظر آتا ہے آپ کو؟"

"سچ بتاؤں تو جب عمران خان سیاست میں آئے تھے تو بہت بہتر لگتے تھے۔ لیکن عمران خان نے کوئی کام نہیں کیا۔ آپ پشاور دیکھ لیں یا پورا صوبہ ... وہ تو بس تین سال سے احتساب کا نعرہ لگا کر تین حلقے کھلوانے کی بات کر رہے تھے ... چار حلقے کھل گئے تین میں رزلٹ بھی آگیا ... مگر پھر بھی ... تو اس وقت تو مجھے کوئی بھی ملک کے لیے مخلص نظر نہیں آتا۔"

"آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"میں آج کل "سچ ٹی وی" سے وابستہ ہوں۔ نیوز بھی پڑھتا ہوں اور اسپورٹس شو بھی کرتا ہوں ... نہ

صرف نیوز پڑھتا ہوں بلکہ سیاسی لحاظ سے ملک میں جو اتار چڑھاؤ ہو رہا ہوتا ہے اس کو عوام تک پہنچانا بھی میری ذمہ داری ہے۔"

"سچ ٹی وی دیکھا جاتا ہے؟"

"بالکل دیکھا جاتا ہے۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ویور شپ ایکسپریس نیوز کی طرح نہیں ہے۔۔۔ مگر اس کے باوجود مجھے بہت اچھا رسپانس ملتا ہے فیس بک پہ میری فرینڈ لسٹ فل ہے۔ لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔"

"ایکسپریس نیوز چینل کیوں چھوڑا آپ نے؟"

"ایکسپریس نیوز میں نے نہیں چھوڑا۔۔۔ مسئلہ یہ ہے کہ میڈیا انڈسٹری میں خاص طور پر نیوز کے شعبے میں پرائیویٹ انڈسٹری غیر یقینی صورت حال کا شکار ہوتی ہے۔ پھر کچھ حالات ایسے پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ آپ کسی ایک جگہ رہ نہیں پاتے۔ پورا ملک سیاست کا شکار ہے تو چینل کیوں کسی سے پیچھے رہیں گے۔ بس اسی وجہ سے مجھے چینل چھوڑنا پڑا اور میں اس سیاست کا شکار نہیں ہوا تھا اور بھی بہت سے اینکرز اور دیگر لوگ اس سیاست کا شکار ہوئے تھے۔"

"تو پھر آپ اس چینل سے مطمئن ہیں یا دل چاہ رہا ہے کہ کہیں اور چلا جاؤں؟"

"سچ" بہت اچھا چینل ہے۔ بہت اچھی مینجمنٹ ہے اور میں بہت مطمئن ہوں اس چینل پہ کام کر کے۔۔۔ اور اب جب سے پرائیویٹ چینل آئے ہیں۔۔۔ نیوز کاسٹر کا تصور بدل گیا ہے۔ جب پی ٹی وی تھا تو لوگ خبریں پڑھتے تھے اور بس۔۔۔ مگر پرائیویٹ چینل میں نیوز پڑھنے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ درمیان میں انٹرویو بھی کرے 'نیوز رپورٹر سے بات بھی کرے' کراس سوال بھی کرے تو اب نیوز کاسٹر کی اصطلاح نہیں استعمال ہوتی بلکہ انہیں نیوز اینکر کہا جاتا ہے۔ ہینڈلنگ کرنے والے کو اینکر کہتے ہیں کیونکہ اب ہر چیز لائیو ہوتی ہے۔"

"اس فیلڈ تک کیسے پہنچے؟"

"اس فیلڈ میں میرے آنے کی ابتدا میرے بچپن سے ہی ہے۔ ریڈیو سے اسٹارٹ کیا اور بچوں کی دنیا میں اینٹری دی۔ اور آپ یقین کریں کہ جب "بچوں کی دنیا" میں پروگرام کرتا تھا' تو میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں بڑے بڑے نامور لوگوں کے انٹرویو کیے جن میں "میر واعظ عمر فاروق" بھی شامل ہیں۔۔۔ ریڈیو پاکستان سے ایک پروگرام کرتا تھا "بزم طلبہ" اس کی پروڈیوسر سیمار ضا تھیں انہوں نے مجھے ایک پروگرام دیا جس میں نامور لوگوں کے انٹرویو کرنے ہوتے تھے تو ناظم کراچی کا انٹرویو بھی کیا۔ کھلاڑیوں کے یعنی ہر فیلڈ کے لوگوں کے انٹرویو کیے۔۔ بہت اچھے اور بڑے لیول کے انٹرویو کیے۔"

"اچھا۔۔ گڈ۔۔ انٹرویو کے لیے لوگ آجاتے تھے؟"

"بالکل آجاتے تھے۔ کہا تو یہی جاتا تھا کہ یہ لوگ نہیں آئیں گے۔ مگر آجاتے تھے اور جب میں انٹرویو کے لیے بیٹھتا تھا تو کہتے تھے کہ ارے آپ تو بہت چھوٹے ہیں۔۔۔ (اور بچوں کی دنیا" میں نہیں بزم طلبہ میں کیے) ایک دن قاسم جلالی صاحب کو انٹرویو کے لیے بلایا۔۔۔ تو انہوں نے مجھے کہا کہ پی ٹی وی آؤ اور کام کرو۔۔۔ میں ٹی وی گیا انہوں نے ہماری ایک سینئر پروڈیوسر حنا یاسمین کو بلا لیا اور ان کے ساتھ ایک پروگرام ڈیزائن کیا اور پی ٹی وی کے ساتھ پروگرام کرتا رہا پھر سن ٹی وی شروع ہوا تو اس کے ساتھ بھی کام کیا۔۔۔ زم ٹی وی آیا تو اس کے ساتھ بھی پروگرام کیے۔ چھوٹی عمر میں بہت کچھ کرنے کا موقعہ ملا۔۔۔ ساتھ ساتھ پڑھائی بھی چل رہی تھی۔ انٹر تک سب کچھ چلتا رہا اور اس کے بعد میں پڑھنے کے لیے ملک سے باہر برطانیہ چلا گیا۔ وہاں میرے ماموں تھے' جنہوں نے مجھے کہا کہ تم باہر آ کر پڑھو۔ میں وہاں گیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان کی تعلیم اور وہاں کی تعلیم میں کتنا فرق ہے اور پاکستان کی دنیا اور باہر کی دنیا میں کتنا فرق ہے۔"

"کیا پڑھا۔۔۔ کیا ڈگری لی آپ نے؟"



”وہاں پہلے میں نے بیچلرز کیا۔۔۔ میڈیا سائنس میں پھر ماسٹرز کیا فلم میکنگ میں۔“

”فلم میکنگ میں ماسٹرز کر کے نیوز میں آنا اور اسپورٹس شو کرنا کچھ مختلف کام نہیں ہے کیا؟؟“

”بالکل مختلف ہے۔ مگر ہوا یہ کہ کبھی کبھی زندگی اور قسمت آپ کو ایک ڈگر پہ ڈال دیتی ہے۔ جب یو کے گیا تو نیا ماحول تھا۔ بہت سے نئے دوست بنے' کچھ دوست پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے تو وہاں کام کیے بغیر گزارہ نہیں۔ اگرچہ سپورٹ کرنے والوں میں ماموں بھی شامل تھے مگر میں ان پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا' لہٰذا شروع میں ایک ریسٹورنٹ میں جاب کی۔۔۔ اور ٹل Till پر جاب ملی جو کہ بہت اچھی تھی۔۔۔ چونکہ یہاں سے ریڈیو کر کے گیا تھا تو وہاں بھی ریڈیو سنتا تھا۔ ایک دن پتا چلا کہ ریڈیو کے لیے آڈیشن ہو رہے ہیں۔ 9.9 ریڈیو بریڈ فورڈ پہ۔۔۔ آڈیشن دیا کامیاب ہوا' ویلکم کیا گیا اور پروگرام کرنے لگا۔۔۔ وہاں بی بی سی کا ایک ریڈیو چینل تھا' ریڈیو ایشیاء جو کہ انگریزی میں تھا۔۔۔ وہاں سے بھی میں نے پروگرام شروع کر دیا۔ پڑھائی بھی جاری رہی۔ چھٹیاں ہوتی تھیں تو پاکستان نہیں آتا تھا بلکہ دنیا گھومنے نکل جاتا تھا کیونکہ ٹریولنگ کا بہت زیادہ شوق تھا اور یورپ کے چھوٹے بڑے تمام ممالک ہی گھوم لیے۔“

”پھر پاکستان کیوں آئے؟ وہیں آپ نے اپنی دنیا کیوں نہیں بسائی؟؟“

”پاکستان بس آگیا' کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ہاتھ میں نہیں ہوتیں۔ ڈگری تو لے لی مگر ہمارے ملک نے دوسرے ملکوں کے ساتھ نوجوانوں کے سلسلے میں کچھ معاہدے نہیں کیے جبکہ پڑوسی ممالک کے بہت اچھے معاہدے ہیں جس کی وجہ سے انہیں جلدی جاب مل جاتی ہے۔ جبکہ پاکستانیوں کو جاب بہت مشکل سے ملتی ہے۔ انڈین جاب کے لیے ٹاپ پرائٹی پہ ہیں جبکہ ہم بارہویں نمبر پر ہیں تو بس دل برداشتہ ہو کر پاکستان آگیا۔ اگرچہ جاب بھی اچھی کر رہا تھا۔ پانچ چھ سال کے بعد پاکستان آیا تو یہاں دوستوں نے مشورہ دیا ایکسپریس نیوز کو جوائن کرنے کا' میں نے ایکسپریس نیوز اور جیو کو اپنی ”سی وی“ بھیج دی۔ پانچ چھ دن کے بعد مجھے ایکسپریس نیوز سے کال آگئی۔۔۔ میں چلا گیا' میرا انٹرویو ہوا اور اینکر اور پروڈیوسر کا عہدہ دے دیا گیا۔۔۔ بہت خوشی ہوئی۔ مگر پھر بھی سوچنے کا وقت مانگا اور ایک ماہ کے بعد جاب کے لیے سائن کیا' میں سمجھ رہا تھا کہ نہیں رکھیں گے کہ میں لیٹ ہو گیا تھا' مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ میرا لک تھا شاید۔۔۔ کافی ٹائم میں نے ایکسپریس نیوز میں کام کیا اور جیسا کہ آپ کو بتایا کہ ”سچ“ میں آگیا۔“

”سچ میں آکر مطمئن ہیں؟؟“

”بالکل مطمئن ہوں۔۔۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کچھ اور کرنا چاہتے ہیں اور اللہ آپ سے کچھ اور کام لینا چاہتا ہے اور میں کچھ بھی کر لوں اللہ کے آگے بے بس ہوں مگر پھر بھی میں اپنی دوست اور کولیگ جنیفر علی ظفر کے ساتھ مل کر ڈاکومنٹریز پہ۔۔۔ ورک آؤٹ کرتا ہوں۔ یہ میری یو کے کی

دوست ہیں دو ڈاکومنٹریز بنائی ہیں ہم نے اور وہ "چینل 4" پہ چلی بھی ہیں اور ان شاء اللہ اس کے لیے کام کرتا رہوں گا۔"

"نیوز اینکر کو کیا ڈراما ایکٹنگ سے دور رہنا چاہیے؟"

"جی۔۔۔ دور ہی رہنا چاہیے' کیونکہ نیوز اینکر کی جاب ایک سنجیدہ نیچر کی جاب ہے۔ پاکستان میں تو نہیں لیکن انگلینڈ کے تھیٹر میں کام کیا ہے میں نے اور انڈیا میں بھی تھیٹر کر چکا ہوں۔ ہمارا اپنا تھیٹر گروپ ہے اور "آصف الیاس" میری اداکاری میں ہمیشہ میرے استادوں کی طرح رہے ہیں۔ آصف الیاس نے ہی مجھے ریڈیو پہ بولنا سکھایا بہت کچھ کیا میرے لیے اور مرحوم اقبال جعفری سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا اور ان سے زیادہ بھی اہم بات یہ ہے کہ میرے ماموں اور میری والدہ نے مجھے ہر موقع پر بہت سپورٹ کیا۔ میری والدہ ماہر تعلیم ہیں' انگریزی میں انہوں نے ماسٹرز کیا ہے' انہوں نے مجھے رہنمائی میں بہت موٹی ویٹ کیا بلکہ میں نے جو جو کام کرنے چاہے میری والدہ نے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں کرکٹ کا شوقین تھا اور انڈر 19 تک کھیلی مگر پھر چھوڑ دی۔۔۔ ریڈیو کا شوق ہوا تو ریڈیو کی طرف آ گیا۔ میری امی کی خواہش تھی کہ میں ایجوکیشن کی فیلڈ میں آؤں' پاکستان ایئر فورس میں جاؤں مگر وہ میرا شوق نہیں تھا اس لیے نہیں گیا۔ جبکہ پائلٹ کے لیے کلئیر ہو گیا تھا۔ بڑے عجیب و غریب کام کیے میں نے۔"

"ان عجیب و غریب کاموں میں کس کی حوصلہ افزائی زیادہ تھی۔۔۔ اور بسم اللہ برکت والا قصہ بھی سنائیں؟"

"میرے بڑے ماموں کی۔۔۔ وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا کرنا ہے (وہ میرے رول ماڈل ہیں۔ بالکل میرے والد کی طرح) میں نے کہا ریڈیو کرنا ہے حالانکہ بچپن سے میری لیے دو کام سب سے مشکل تھے۔۔۔ ایک ریڈیو اور دوسرا ٹی وی مگر جانے کا شوق تھا۔ میں سوچتا تھا کہ ایک مائیک کے آگے بندہ کیسے بول سکتا ہے۔ یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ مگر آسانی سے کر لیا پھر سوچا ٹی وی پہ کام تو کبھی نہیں کر سکوں گا۔۔۔ مگر پھر ٹی وی بھی کر لیا پھر اسٹیج بھی کر لیا۔

میرے ماموں آفتاب احمد ایک "این جی اوز" کے ساتھ وابستہ تھے۔ ہیومن رائٹس کمیشن پاکستان کے ساتھ تھے۔ ان کا بڑا نام تھا بڑے اچھے تھراپسٹ تھے۔ ان کے ساتھ میں چائلڈ لیبر کے کام کے لیے جاتا تھا تو ماشاء اللہ بڑے بڑے کام کیے۔۔۔ فہرست کافی لمبی ہے۔

خیر جب ورلڈ سوشل فورم ہوا تو ایک پروجیکٹ تھا میرا "بسم اللہ برکت" کے نام سے اس کے حوالے سے جب میں نے ایک اخبار ۔۔۔ کے لیے انٹرویو دیا تو انہوں نے بھی اس بچے کے حوالے سے بڑی شہ سرخیوں کے ساتھ میرا انٹرویو دیا۔۔۔ تو حنا (پروڈیوسر) نے کہا کہ وہ بچہ کہاں ہے' اس بچے کی کوالٹی یہ تھی کہ وہ ایمبیسی کے باہر پھول بیچتا تھا کراچی۔۔۔ اور چونکہ کراچی کے حالات اتنے برے نہیں تھے تو جو قونصلیٹ سے نکلا کرتے تھے' وہ اس سے خرید لیا کرتے تھے۔۔۔ تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی سیکھ گیا اور اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک بچہ اس کے گھر کے پاس رہنے آیا تو اس نے اس سے دوستی کر لی۔ وہ بچہ تین مہینے رہا۔ ان تین مہینوں میں نہ صرف اس نے انگلش سیکھ لی بلکہ اس کا تلفظ بھی سیکھ لیا اور زبردست قسم کی انگریزی بولنے لگا۔

تو میں نے جب اس سے ملاقات کی تو سوچا کہ اگر اس بچے کو پڑھایا جائے تو یہ بہت آگے تک جائے گا۔ تو ہم نے اس کی ایجوکیشن کے حوالے سے پورا پروجیکٹ ڈیزائن کیا۔۔۔ میرے ساتھ اس پروجیکٹ میں ایک سری لنکن لڑکی بھی تھی۔

پھر اس بچے کو ہم نے یونائیٹڈ نیشن میں ری پریزنٹ کیا۔۔۔ پھر اس کے حوالے سے یہ طے پایا کہ اسے امریکہ بھیجیں گے تعلیم کے لیے۔۔۔ ہم نے اس کا پاسپورٹ بنوایا' اس کے گھر گیا۔۔۔ تو اس کے باپ نے کہا۔



”یہ تو میرے لیے سونے کی مرغی ہے‘ یہ میں تمہیں کیوں دے دوں۔“ بڑا لالچی باپ تھا اس کا کیونکہ وہ خود کام نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ اس کے 50 ہزار دو اور لے جاؤ اسے۔ ہمارے پاس تو 50 ہزار نہیں تھے... بڑی بھاگ دوڑ کی یونائیٹڈ نیشن نے کہا کہ بچہ خریدنے کے لیے تو ہم پیسے نہیں دے سکتے اور پھر نہیں ہو پایا۔ ہم انڈیا چلے گئے واپس آئے تو پی ٹی وی کی پروڈیوسر حنا نے مجھے بلایا اور کہا کہ اس بچے پر مجھے ایک ڈرامہ کرنا ہے۔

اس بات کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ خیر میں اس بچے کو ڈھونڈنے نکلا کہ اگر پروگرام کروں گا یا ڈراما کروں گا تو اسی بچے کے ساتھ کروں گا... مگر وہ نہیں ملا... خیر وہ ایک ڈاکومنٹری ڈراما تھا جس کا آئیڈیا بھی میرا تھا۔ کانسیپٹ بھی میرا تھا۔ اسے سیمارضا صاحبہ سے لکھوایا۔ ڈیزائن کیا ہم نے اور حنا نے پروڈیوس کیا‘ میں نے اس میں ایکٹ کیا... اور ڈرامے کا نام 50 ہزار رکھا... تو ڈرامہ کرکے اچھا لگا... شوق بھی ہے اور کروں گا بھی... مگر ابھی نہیں نیوز کے ساتھ ڈرامہ کرنے سے ورتھ نہیں رہتی اور شخصیت پہ فرق آتا ہے۔ جو مجھے نیوز میں پسند کرتے ہیں وہ مجھے ڈرامے میں



پسند نہیں کریں گے۔ اگر ڈرامہ کیا تو پھر نیوز چھوڑ دوں گا۔ مجھے ماڈلنگ کی آفرز بھی آئیں مگر وہی بات کہ امیج خراب نہیں کرنا چاہتا۔

”جناب باتیں بہت ہوگئیں... اب ذرا فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے؟“

”میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ آرمی میں تھے اور آرمی کو جلدی چھوڑ دیا۔ ہماری پوری فیملی کا تعلق آرمی سے ہے۔ میرے دادا ریٹائرڈ جنرل تھے‘ میرے والد بہت محبت کرنے والی شخصیت تھے‘ مگر وہ ہماری پڑھائی پہ زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے... بس وہ کہتے تھے کہ جو کر رہے ہو ٹھیک کر رہے ہو جبکہ والدہ اس کے برعکس تھیں۔ میں حیدر آباد میں پیدا ہوا 1986ء میں‘ حیدر آباد میں میرا آبائی گھر ہے... پنجابی مادری زبان ہے میری مگر دو سو سال سے ہمارے آباؤ اجداد حیدر آباد میں ہیں اور ہماری یہاں زمینیں ہیں اور ہماری حویلی ڈیڑھ سو سال پرانی ہے گاڑی کھاتہ میں آبائی گھر ہے ہمارا... اسکولنگ حیدر آباد کی ہے۔ پھر پڑھنے کے لیے اسلام آباد آگیا۔

”او لیول“ کرنے... پھر کراچی آیا اے لیول کرنے۔ میں نے اپنی زندگی میں سفر بہت کیا ہے۔ انگریزی والا

بھی اور اردو والا بھی، دونوں سنز میں ایکسپوز بست کیا مگر اللہ کا شکر ہے کہ پروفیشنل لائف میں اللہ نے جدوجہد نہیں کروائی۔ ہر جگہ سے خود بلایا جاتا تھا۔ اور کرتے کرتے سفر یہاں تک پہنچ گیا۔"

"بہن بھائی، مزاج؟"

"ہم چار بھائی اور بہن سب سے چھوٹی ہیں گھر میں بڑا ہوں۔ مزاج کے حوالے سے خوش مزاج ہی رہا اور میں تو خود لوگوں کو فون کر کے یاد رکھتا ہوں۔ اللہ نے مجھ میں یہ صفت ڈال دی ہے کہ میں خود لوگوں کو یاد رکھتا ہوں۔"

"کوئی برائی؟"

"جی..... میں غصے کا بہت تیز ہوں۔ غصہ جلدی آجاتا ہے کوئی بات مزاج کے ناگوار گزر جائے تو غصہ آ ہی جاتا ہے۔ اور اسے میں کبھی تبدیل بھی نہیں کر پایا کہ شاید یہ میری نیچر ہے۔ عادت ہوتی تو تبدیل کر دیتا نیچر تبدیل کرنا مشکل ہے۔"

"ضدی ہیں..... مطالعہ کا شوق؟"

"کبھی کبھی ضدی بھی ہو جاتا ہوں۔ میں ستاروں کی چال پہ یقین نہیں رکھتا مگر لوگ کہتے ہیں کہ Aries والوں کو غصہ آتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کا بہت شوق رہا ہے مجھے..... کیونکہ اس کی عادت ہمارے ماموں نے ڈالی۔ اگرچہ یہ عادت اس وقت بری لگتی تھی۔ مگر پھر اچھی لگنے لگی، میں نے شاعری بہت پڑھی فیض صاحب کا "نسخہ ہائے وفا" یہ وہ شاعری کی کتاب تھی جو میں نے سب سے پہلے پڑھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آئی تو امی سے اس کو سمجھایا..... اور پھر یہ اتنی اچھی لگی کہ اس کے 100 صفحات مجھے یاد ہو گئے۔ جو بیت بازی کے وقت کام آتے تھے اور شاید میں میٹرک میں تھا جب میں نے کئی ممالک کی ہسٹری پڑھی تھی۔"

"شادی ہوئی؟"

"نہیں جی..... اور ابھی کرنی بھی نہیں ہے۔ کم سے کم دو سال تو نہیں لیکن فیملی کی طرف سے پریشر بہت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آزادی متاثر ہوتی ہے۔ ابھی تو میں آزادانہ طور پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹریولنگ کر لیتا ہوں لیکن جب فیملی بن جاتی ہے تو پھر آپ زیادہ باؤنڈ ہو جاتے ہیں۔ ابھی میں کسی بھی شہر میں جا کر جاب کر سکتا ہوں۔ دوسرے ملکوں میں جا سکتا ہوں..... تو بس ابھی میں کچھ کرنا چاہتا ہوں اس لیے شادی کے لیے ٹائم مانگ رہا ہوں گھر والوں سے۔"

"کھانے پینے کے کتنے شوقین ہیں آپ؟"

"بہت شوقین ہوں اور کھانے کے معاملے میں تھوڑا سا چوزی ہوں۔ خاص طور پر ٹیسٹ کے معاملے میں..... اور اپنا پاکستانی ٹیسٹ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے..... اور اگر میں باہر کا کوئی کھانا کھاؤں جیسے پیزا ہے یا میکرونی ہے تو پھر ان ہی کے ٹیسٹ میں کھانا پسند کرتا ہوں اس میں پاکستانی مسالوں کی **مکسنگ** نہیں کرتا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ارسلان لکھو کھر سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

✡

پیر کامل صلی اللہ علیہ وسلم سے آب حیات تک

آب حیات آج آپ کے سامنے اپنا دو سالہ سفر ختم کر رہا ہے اور میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتی جو اس دو سالہ سفر میں چاہے تعریف چاہے تنقید لیکن میرے ساتھ جڑے رہے۔ کوئی بھی رائٹر یقیناً "اپنی لکھی ہوئی تحریروں سے ہی بڑا بنتا ہے لیکن میرا خیال ہے وہ ان تحریروں کی عوامی پذیرائی سے بہت بڑا بن جاتا ہے۔

میرا اٹھارہ سالہ کیریر کبھی اتنا لمبا نہ ہوتا' اگر مجھے اور میری تحریروں کو آپ سے پذیرائی اور محبت نہ ملتی...... میرے اس ٹیلنٹ کو جلا آپ کی حوصلہ افزائی اور داد نے دی' اس میں اس کے لیے آپ کی بہت ممنون ہوں۔ میں خواتین ڈائجسٹ کی انتظامیہ کی بھی بہت ممنون ہوں جنھوں نے دو سال اس ناول کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

پیر کامل صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا حصہ لکھنا کتنے بڑے دل گردے کا کام تھا' اس کا اندازہ مجھے لکھنے کے دوران نہیں "آب حیات" کی اشاعت کے دوران ہوا۔ ہم ہیرو اور ہیروئن نہیں بناتے' بت بناتے ہیں اور پھر یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتے کہ ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ ججمنٹ کی بھی ہے۔ اور ترغیبات نفس کی بھی۔ آب حیات میں میں نے پیر کامل (صلی اللہ علیہ وسلم) کے "کامل" انسانوں کو زندگی کے تجربات اور چیلنجز سے نبرد آزما دکھایا۔ کبھی ہارتے' کبھی جیتتے دکھایا..... لیکن ہمیشہ "سیکھتے" دکھایا..... اور یہ سفر وہ ہے' جو ہم سب کرتے ہیں..... ہر "کامل" بن جانے والا انسان بھی.....

2003ء میں پیر کامل صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہت متنازعہ موضوع پر لکھا جانے والا ناول تھا جو آج بھی بہت سے ادبی حلقوں میں شدید تنقید کا شکار ہوتا ہے۔

آب حیات اس دہائی کے بہت سے متنازعہ ایشوز پر لکھی جانے والی کتاب ہے۔ ان بڑے چیلنجز پر جو مسلم امہ کو درپیش ہیں۔ ان چھوٹے چیلنجز پر جو ہم سب کو اپنی نجی اور معاشرتی زندگی میں درپیش ہیں۔

میں اس بات پر کامل یقین رکھتی ہوں کہ زندہ رہ جانے والی کتابیں وہ نہیں ہوتیں جنہیں ہر کوئی صرف داد دے اور ان میں سے کوئی ایک بھی قابل اعتراض یا قابل بحث بات نہ نکال سکے۔

زندہ رہ جانے والی کتابیں وہ ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کو اگر ایک طرف داد دینے کے لیے مجبور کرتی ہیں تو دوسری طرف الجھاتی بھی ہیں اور اعتراض اور اختلاف کرنے پر بھی مجبور کرتی ہیں اور میری ہر کتاب کی طرح یہ آب حیات نے بھی کیا۔ اس کا مقام آنے والے سالوں میں کیا ہوگا' یہ صرف اللہ رب العزت ہی کو معلوم ہے۔

بہت سے قارئین کو تڑپ کا بیٹا شاید الجھا دے..... آب حیات کی کہانی "تبارک الذی" پر ختم ہو رہی ہے' مگر تڑپ کا بیٹا وہ چیلنجز ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ ایک اور دہائی میں چند اور کردار زندگی میں کچھ اور چیلنجز کے ساتھ اور زندگی نسل در نسل یوں ہی چلتی رہے گی۔ ہر دہائی میں کچھ لوگ ان چیلنجز پر پورا اتریں گے اور ہر دہائی میں کچھ لوگ آب حیات پی کر لازوال بنتے رہیں گے۔

عمیرہ احمد



عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس سخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

ل۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال وجواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

پچیسویں اور آخری قسط

اس بینکوئٹ ہال کے اوپر والے فلور کے ایک کمرے کی ایک کھڑکی کے شیشوں سے ایک اور ٹیلی اسکوپ رائفل بالکل اسی طرح اس ٹارگٹ کلر کو نشانہ بنائے الٹی گنتی گننے میں مصروف تھی۔ وہ چوتھا فلور تھا اور وہ کمرہ اس فلور کے اسٹور رومز میں سے ایک تھا جہاں پر صفائی ستھرائی اور اسی طرح کا سامان ٹرالیوں میں بھرا پڑا تھا۔ جن لوگوں نے اس بینکوئٹ ہال میں اس مہمان کے لیے اس پیشہ ورانہ قاتل کا انتخاب کیا تھا اُن ہی لوگوں نے اس قاتل کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا تھا اور اس جگہ کا بھی جہاں وہ چالیس سالہ شخص رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھے، آنکھیں اس ٹارگٹ کلر پر لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اس کمرے کو اندر سے لاک کر رکھا تھا۔ وہ ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا اس کمرے میں صبح کے وقت آیا تھا جب اس فلور کے کمروں کی صفائی ہو رہی تھی اور پھر وہ اپنی ٹرالی کو اندر رکھ کر باہر جانے کے بجائے خود بھی اندر ہی رہ گیا تھا۔ وقتاً "فوقتاً" کچھ اور بھی ٹرالیاں لانے والے اندر آتے اور جاتے رہے تھے اور اس کے ساتھ ہیلو ہائے کا تبادلہ بھی کرتے رہے تھے، مگر کسی کو اس پر شبہ نہیں ہوا تھا۔ ایک مقررہ وقت پر اس نے اسٹور روم کو اندر سے لاک کر لیا تھا۔ کیوں کہ اسے پتا تھا اب اس فلور کو بھی وقتی طور پر سیل کیا جانا تھا جب تک وہ کانفرنس وہاں جاری تھی۔

اسٹور روم کی کھڑکی کے شیشے میں اس کی ٹیلی اسکوپک رائفل کے لیے سوراخ پہلے سے موجود تھا جسے ٹیپ لگا کر وقتی طور پر بند کیا گیا تھا۔ اس نے ٹیپ ہٹانے سے پہلے ایک دوسری ٹیلی اسکوپ سے سڑک کے پاس اس عمارت کے اس فلیٹ کی اس کھڑکی کو دیکھا اور پھر اس پیشہ ور قاتل کو جو گھات لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی گھڑی کو دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا۔ ابھی بہت وقت تھا اور اس کی کھڑکی سے اس پیشہ ور قاتل کی کھڑکی کا منظر بے حد زبردست تھا۔ وہ پہلا فائر مس بھی کر جاتا تو بھی وہ قاتل اس کی رینج میں رہتا... بھاگتے ہوئے بھی... کھڑکی سے ہٹنے کی کوشش کے دوران بھی... انہوں نے جیسے اس کے لیے حلوہ بنا دیا تھا۔

اسے یقین تھا اس کھڑکی میں گھات لگانے کے بعد اس پیشہ ور قاتل نے اس ہوٹل کے اوپر نیچے کے ہر فلور کی کھڑکیوں کو اپنی ٹیلی اسکوپ رائفل سے ایک بار جیسے کھوجا ہوگا... کہیں کوئی غیر معمولی حرکت یا شخص کو ٹریس کرنے کی کوشش کی ہوگی وہ ٹیلی اسکوپ رائفل کھڑکی کے شیشے سے لگا کر بیٹھا خود اس کی نظر میں نہ آتا تب بھی اس کی رائفل کی نال اس کی نظر میں آجاتی۔ اس لیے آخری منٹوں تک وہ کھڑکی کے پاس نہیں گیا تھا۔ اسے اس پیشہ ور قاتل پر ایک پہلا اور آخری کارگر شوٹ فائر کرنے کے لیے گھنٹے چاہیے بھی نہیں تھے۔ وہ بے حد قریبی رینج میں تھا۔

اور اب بالکل آخری لمحوں میں اس نے بالآخر رائفل کو اس سوراخ میں نکالا تھا۔

اسے اس پیشہ ور قاتل کو اس وقت مارنا تھا جب وہ فائر کر چکا ہوتا۔ اس مہمان کو صرف مارنا ضروری نہیں تھا بلکہ اس سازش کے سارے ثبوت مٹائے جانے بھی ضروری تھے۔

گھڑی کی سوئیاں جیسے بھاگتی جا رہی تھیں۔ ٹک... ٹک... ٹک کرتے... دو انگلیاں دو ٹریگرز پر اپنا دباؤ بڑھا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

حمین سکندر سے ہشام متاثر زیادہ تھا یا مرعوب... اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ اس سے جلن محسوس کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں اسے شبہ نہیں تھا۔ رئیسہ سے ملنے اور اس کی فیملی کے بارے میں جاننے سے بھی پہلے وہ حمین سکندر کے بارے میں جانتا تھا۔ اپنے تقریباً "ہم عمر اس نوجوان کے بارے میں وہ اتنا ہی تجسس رکھتا تھا جتنا بزنس اور فنانس کی دنیا میں دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص۔

ہشام کا باپ امریکا میں سفارت کاری کے دوران بھی بہت ساری کمپنیز چلا رہا تھا اور ان کمپنیز میں سے کچھ کا واسطہ حمین سکندر کی کمپنیز سے بھی پڑتا تھا۔ وہ خود حمین سے رئیسہ سے متعارف ہونے سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا' لیکن اس کا باپ مل چکا تھا اور اس کا مداح تھا۔ اپنی زندگی کی دوسری دہائی کے اوائل میں وہ جن بزنس ٹائیکونز سے ڈیل کر رہا تھا' وہ عمر میں اس سے دوگنا نہیں چار گنا بڑے تھے' اس کے باوجود حمین سکندر کی بزنس اور فنانس کی سمجھ بوجھ پر کوئی سوال نہیں کرتا تھا۔ وہ بولتا تھا تو لوگ سنتے تھے۔ بیان جاری کرتا تھا تو اس پر تبصرے آتے تھے۔ پروڈکٹ پلان دیتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مارکیٹ میں نوٹس نہ ہو..... اور بزنس مینیج کرتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ ناکامی سے دوچار ہو.....

اور اس حمین سکندر سے متاثر ہونے والوں میں ایک ہشام بھی تھا متاثر بھی' مرعوب بھی' لیکن اس سے رقابت کا جذبہ اس نے رئیسہ کی وجہ سے رکھنا شروع کیا۔ وہ لڑکی جس پر ہشام جان چھڑکتا تھا۔ وہ صرف ایک شخص پر اندھا اعتماد کرتی تھی' صرف ایک شخص کا حوالہ بار بار دیتی تھی اور بدقسمتی سے وہ شخص وہ تھا جس سے ہشام پہلے ہی مرعوب تھا۔ پھر رقابت کے علاوہ کوئی اور جذبہ ہشام اپنے دل میں محسوس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ رئیسہ اسے صرف ایک دوست اور بھائی سمجھتی تھی اور یہ جاننے کے باوجود کہ حمین کے بھی رئیسہ کے لیے احساسات ایسے ہی تھے۔ وہ رئیسہ سے متعارف ہونے کے بعد حمین سے چند بار سرسری طور پر مل چکا تھا' مگر یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس سے تنہا ملنے جا رہا تھا اور وہ بھی اس کے گھر پر۔ وہ اب بحرین کا ولی عہد نہ ہوتا تو اس شخص سے ملنے کے لیے جاتے ہوئے بے حد احساس کمتری کا شکار ہو رہا ہوتا۔ حمین سکندر کی کامیابی اور ذہانت کسی کو بھی اس احساس سے دوچار کر سکتی تھی۔

نیویارک کے ایک مہنگے ترین علاقے میں ایک ستاون منزلہ عمارت کی چھت پر بنے اس پینٹ ہاؤس میں حمین سکندر نے بے حد گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے ساتھ اب سائے کی طرح رہنے والے باڈی گارڈز اس عمارت کے اندر نہیں آسکتے تھے کیوں کہ انٹرنس پر وزیٹرز میں صرف ہشام کا نام تھا۔ ولی عہد یا شاہی خاندان کے القابات کے بغیر۔

ان چند مہینوں میں پہلی بار "ہز رائل ہائی نس" صرف ہشام بن صباح کے طور پر پکارے گئے تھے۔ اسے برا نہیں لگا' صرف عجیب لگا۔ وہ نام اس کے پینٹ ہاؤس کے دروازے پر اندر داخلے کے وقت حمین نے اور بھی چھوٹا کر دیا تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم بالکل وقت پر آئے ہو ہشام۔" اس سے مصافحہ کرتے ہوئے سیاہ ٹراؤزر اور سفید ٹی شرٹ میں ملبوس حمین سکندر نے کہا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور وہ لنچ کے بعد مل رہے تھے۔ وہ دنیا کے امیر ترین نوجوانوں میں سے ایک کے گھر پر تھا اور ہشام کا خیال تھا اس پینٹ ہاؤس میں بھی وہی سب لوازمات ہوں گے جو وہ اپنے خاندانی محلات اور اپنے سوشل سرکل میں دیکھتا آیا تھا۔ پرتعیش رہائش گاہ جہاں پر دنیا کی ہر آسائش ہوگی' ہر طرح کے لوازمات کے ساتھ۔ بہترین انٹیریر' فرنیچر' شوپیسز' بارز اور دنیا کی بہترین سے بہترین شراب۔ اس کا خیال تھا نیویارک کے اس مہنگے ترین علاقے میں اس پینٹ ہاؤس میں حمین سکندر نے ایک دنیاوی جنت بسا رکھی ہوگی کیوں کہ ہشام ایسی ہی جنتیں دیکھتا آیا تھا۔

حمین سکندر کے اس پینٹ ہاؤس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بہت مختصر تقریباً "نہ ہونے کے برابر فرنیچر..... دیواروں پر چند کیلی گرافی کے شاہکار اور کچن کاؤنٹر پر ایک رحل میں کھلا قرآن پاک جس کے قریب پانی کا ایک گلاس اور کافی کا ایک مگ تھا۔

ہشام بن صباح رعب میں آیا تھا' اس شخص کے جس سے وہ "مل" رہا تھا' جسے بزنس اور فائنانس کی دنیا کا گرو نہیں بجن مانا جاتا تھا اور جس کے کروڑوں روپے کے اس پینٹ ہاؤس میں بھی رکھی جانے والی نمایاں چیز قرآن پاک تھا۔ وہ سالار سکندر کا چشم چراغ تھا۔

"یہ میرے دادا کا دیا ہوا قرآن پاک ہے' اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں میں۔ گھر پر تھا' فرصت بھی تو تمہارے آنے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔" حمین نے رحل پر رکھے قرآن پاک کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو۔" اس نے کاؤنٹر کے قریب پڑے کچن اسٹولز کے بجائے لاؤنج میں پڑے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہشام سے کہا۔ وہ پورا پینٹ ہاؤس اس وقت دھوپ سے چمک رہا تھا۔ سفید انٹیریر میں گلاس سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی کی کرنیں ان صوفوں تک بھی آرہی تھیں جن پر اب وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہشام بن صباح شاہی محل کے تخت پر بیٹھ کر آیا تھا مگر۔ اپنے سامنے صوفے پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے ہوئے شخص کے جیسا طمطراق اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بات کا آغاز مشکل ترین تھا اور بات کا آغاز حمین نے کیا تھا' اسے چائے کافی کی آفر کے ساتھ۔

"کافی!" اس نے جواباً" آفر قبول کرتے ہوئے کہا۔ حمین اٹھ کر اب سامنے کچن ایریا میں کافی میکر سے کافی بنانے لگا۔

"رئیسہ سے تمہارا بہت ذکر سنا ہے میں نے اور ہمیشہ اچھا۔" وہ کافی بناتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے بھی۔" ہشام کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ حمین کافی انڈیلتے ہوئے مسکرایا اور اس نے کہا۔" آئی ایم ناٹ سرپرائزڈ۔"

وہ اب کافی کے دو مگ اور کوکیز کی ایک پلیٹ ایک ٹرے میں رکھے واپس آکر بیٹھ گیا تھا۔

ہشام نے کچھ کہے بغیر کافی کا۔ مگ اٹھایا' حمین نے ایک کوکی...

"تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔" کوکی کو کھانا شروع کرنے سے پہلے اس نے جیسے ہشام کو یاد دلایا۔

"ہاں۔" ہشام کو ایک دم کافی پینا مشکل لگنے لگا تھا جس مسئلے کے لیے وہ وہاں آیا تھا' وہ مسئلہ پھر گلے کے پھندے کی طرح یاد آیا تھا۔

"میں رئیسہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔" اس نے اس جملے سے آغاز کیا جس جملے سے وہ آغاز کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"گڈ۔" حمین نے بے حد اطمینان سے جیسے کوکی کو نگلنے سے پہلے یوں کہا جیسے وہ اس کا چیس کا اسکور تھا۔

"میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ہشام نے اگلا جملہ ادا کیا۔ اسے اپنا آپ عجیب چغد محسوس ہو رہا تھا اس وقت۔

"میں جانتا ہوں۔" حمین نے کافی کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ یہ کرو گے کیسے؟" اس نے جیسے ہشام کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ وہ اسے سیدھا اس موضوع پر بات کرنے کے لیے لے آیا تھا جس پر بات کرنے کے لیے وہ آیا تھا۔ ہشام اگلے کئی لمحے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا یہاں تک کہ حمین کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

"اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟" ہشام نے یک دم اس سے پوچھا۔ حمین کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"جو میں کرتا' وہ تم کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتے۔" حمین نے جواباً" کہا۔ ہشام کو عجیب سی ہتک محسوس ہوئی۔ وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔

"تم بتائے بغیر مجھے جج نہیں کر سکتے۔" اس نے حمین سے کہا۔
"ٹھیک ہے' بتاؤ بتاتا ہوں۔" حمین نے کافی کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔
"رئیسہ کو چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی بھی حل بتا دو مجھے میرے مسئلے کا۔" پتا نہیں اسے کیا وہم ہوا تھا کہ حمین کے بولنے سے پہلے وہ ایک بار پھر بول اٹھا تھا۔ حمین اس بار مسکرایا نہیں' صرف اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔
"میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو......"

☆ ☆ ☆

امامہ جبریل کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اسے کچھ دیر کے لیے جیسے اس کی بات سمجھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے جو عنایہ اور عبداللہ کے حوالے سے کہا' جو احسن اور عبداللہ کے حوالے سے اور جو اپنے اور عائشہ کے حوالے سے' وہ سب کچھ عجیب انداز اس کے دماغ میں گڈ مڈ ہو گیا تھا۔
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا جبریل۔" وہ اس سے کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ "ممی...... آئی ایم سوری۔" جبریل کو بے اختیار اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ اس نے ماں کو پریشان اور حواس باختہ کر دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ماں سے کسی لڑکی کے حوالے سے اپنے کسی "افیئر" کی بات کر رہا تھا' وہ بھی ایک ایسا معاملہ جس میں اس پر الزامات لگائے جا رہے تھے۔
عائشہ عابدین کون تھی؟ امامہ نے زندگی میں کبھی اس کا نام نہیں سنا تھا اور جبریل پر کیوں اس کے ساتھ ملوث ہونے کا الزام ایک ایسا شخص لگا رہا تھا جو اس کے ہونے والے داماد کے لیے ایک انسپائریشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور جبریل کیوں عنایہ کی شادی عبداللہ کے ساتھ کرنے کے اچانک خلاف ہو گیا تھا جب کہ وہی تھا جو ماضی میں ہمیشہ امامہ کو عبداللہ کے حق میں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔
"میں یہ سب آپ سے شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن اب اس کے علاوہ اور کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ شرمندہ زیادہ تھا یا پریشان' اندازہ لگانا مشکل تھا۔
"لیکن اس سب میں عنایہ اور عبداللہ کا کیا قصور ہے؟"
"ممی! اگر وہ اس شخص کے زیر اثر ہے تو وہ بیوی کے ساتھ رویے کے لحاظ سے بھی ہو گا...... جو کچھ میں نے احسن سعد کو عائشہ کے ساتھ کرتے دیکھا ہے' وہ میں اپنی بہن کے ساتھ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" جبریل نے غیر مبہم لہجے میں کہا۔
"تم نے عنایہ سے بات کی ہے؟" امامہ نے بے حد تشویش سے اس سے پوچھا۔
"ہاں' میں نے کی ہے اور وہ بہت اپ سیٹ ہوئی' لیکن اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں نہیں جانتا' وہ کیا سوچ رہی ہے۔"
جبریل کہہ رہا تھا اور امامہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے جبریل کو کبھی اس طرح پریشان اور اس طرح کسی معاملے پر اسٹینڈ لیتے نہیں دیکھا تھا۔
"اتنے مہینے سے عائشہ عابدین کا مسئلہ چل رہا ہے' تم نے پہلے کبھی مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
وہ بے حد سنگین الزامات تھے جو جبریل پر کسی نے لگائے تھے اور اپنی اولاد پر اندھا اعتماد ہونے کے باوجود امامہ ہل کر رہ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی اولاد کے حوالے سے ایسی کسی بات کو سننا پڑ رہا تھا' وہ بھی جبریل کے

بارے میں حسین کے حوالے سے کوئی بات سنتی تو شاید پھر بھی اس کے لیے غیر متوقع نہ ہوتی، وہ حسین سے کچھ بھی توقع کر سکتی تھی، لیکن جبریل۔۔؟؟

"بتانے کے لیے کوئی بات تھی ہی نہیں ممی۔" جبریل نے جیسے صفائی دینے کی کوشش کی۔ "ایک دوست کی بہن ہے وہ۔ دوست نے اس کی مدد کرنے کے لیے کہا اور میں اس لیے considerate (توجہ دے رہا) تھا کیوں کہ مجھے لگا، آپریشن میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ویزل سے۔ اگرچہ اس میں میرا قصور نہیں تھا پھر بھی میں اس سے ہمدردی کر رہا تھا۔ مجھے یہ تھوڑی پتا تھا کہ ایک سائیکو (نفسیاتی مریض) آ کر خوامخواہ میں مجھے اپنی ایکس وائف (سابقہ بیوی) کے ساتھ انوالو کرنے کی کوشش کرے گا۔" وہ کہتا جا رہا تھا۔

"That man is۔۔۔ " (وہ آدمی۔۔۔) جبریل کہتے کہتے رک گیا، یوں جیسے اس کے پاس احسن سعد کو بیان کرنے کے لیے لفظ ہی نہ رہے ہوں۔

"تمہارے پاپا سے بات کرنی ہوگی ہمیں۔۔۔ اتنا بڑا فیصلہ ہم خود نہیں کر سکتے۔" امامہ نے اس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا۔

"فیصلہ بڑا ہو یا چھوٹا، ممی! میں عنایہ کی عبداللہ سے شادی نہیں ہونے دوں گا۔" جبریل نے شاید زندگی میں پہلی بار امامہ سے کسی بات پر ضد کی تھی۔

"کسی دوسرے کے جرم کی سزا ہم عبداللہ کو تو نہیں دے سکتے جبریل۔۔۔" امامہ نے مدھم آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"عبداللہ میری ذمہ داری نہیں ہے، عنایہ ہے۔۔۔ میں رسک نہیں لے سکتا اور نہ ہی آپ کو لینا چاہیے۔" وہ ماں کو جیسے خبردار کر رہا تھا اور امامہ اب واقعی پریشان ہونے لگی تھی۔

"تمہارے پاپا جو بھی فیصلہ کریں گے، وہ بہتر فیصلہ ہوگا۔۔۔ اور تم ٹھیک کہتے ہو، ہم عنایہ کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتے، لیکن ہم عبداللہ کی بات سنے بغیر اس طرح اس سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتے۔" امامہ نے کہا۔ "عبداللہ سے ایک بار بات کرنی چاہیے۔"

جبریل کچھ ناخوش ہو کر اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا جب امامہ نے اسے پکارا، وہ پلٹا۔

"ایک بات پوری ایمان داری سے بتانا مجھے۔" وہ ماں کے سوال اور انداز دونوں پر حیران ہوا۔

"جی؟"

"تم عائشہ عابدین کو پسند کرتے ہو؟" جبریل ہل نہیں سکا۔

☼ ☼ ☼

وہ عنایہ کے کہنے پر عائشہ عابدین سے ملنا آیا تھا، یقین اور بے یقینی کی ایک عجیب کیفیت میں جھولتے ہوئے۔ وہ اسلام سے ایک بچے کے طور پر متعارف ہوا تھا، ایک بچے کے طور پر متاثر۔ وہ ایک ایسے خاندان کے ذریعہ اس مذہب کے سحر میں آیا تھا کہ ان جیسے لوگ اس نے دیکھے ہی نہیں تھے ان کی نرمی، فیاضی اور ہمدردی نے ایرک کا وجود نہیں دل اپنی مٹھی میں کیا تھا اور اتنے سالوں میں وہ اسلام کی اسی روشن خیالی، اسی فیاضی اور نرمی کو ہی آئیڈیلائز کرتا رہا تھا اور اب وہ اپنے mentor (مرشد) کے بارے میں ایسی باتیں سن رہا تھا جو اس کے لیے ناقابل یقین تھیں۔ وہ اس نے عنایہ کی زبان سے نہ سنی ہوتیں تو وہ انہیں جھوٹ کے پلندے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ سمجھتا۔۔۔ ڈاکٹر احسن سعد وہ نہیں ہو سکتے تھے اور وہ نہیں کر سکتے تھے جس کا الزام عنایہ ان پر لگا رہی تھی۔

عنایہ نے امریکا پہنچنے کے فوراً" بعد اسے کال کر کے بلایا تھا' اور پھر احسن سعد کے معاملے کو اس سے ڈسکس کیا تھا۔ جبریل پر ڈاکٹر احسن کے الزامات کو بھی اور عائشہ عابدین کے ساتھ ہونے والے معاملات کو بھی۔ وہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھا کہ احسن سعد' اتنا بے حس اور جھوٹا ہو سکتا ہے۔ اور جس پر وہ الزامات لگ رہے تھے اس کے بارے میں بھی عبداللہ قسم کھا سکتا تھا کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔

دونوں کے درمیان بحث ہوئی پھر تکرار اور پھر ان کی زندگی کا پہلا جھگڑا۔ وہ بے حد ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کے لوگوں میں۔

"میں یقین نہیں کر سکتا... میں یقین نہیں کر سکتا... ڈاکٹر احسن سعد عملی مسلمان ہیں۔ نماز کی امامت کرواتے ہیں' وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہ سلوک کریں گے... یہ سب... ؟ اور بغیر وجہ کے' میں مان ہی نہیں سکتا... میں مان ہی نہیں سکتا۔" وہ اس کے علاوہ کچھ کہتا بھی تو کیا کہتا۔

"تو جاؤ' تم پھر عائشہ سے مل لو اور خود پوچھ لو کہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ' لیکن میرا بھائی جھوٹ نہیں بول سکتا۔" عنایہ نے بھی جواباً" بے حد خفگی سے کہا تھا۔

ملاقات کا اختتام بے حد تلخ موڑ پر ہوا تھا اور اس وقت پہلی بار عنایہ کو احساس ہوا کہ جبریل کے خدشات بے جا نہیں تھے۔ عبداللہ اگر اس حد تک احسن سعد سے متاثر تھا تو ان دونوں کے تعلق میں یہ اثر بہت جلد رنگ دکھانے لگتا۔ وہ عبداللہ سے مل کر آئی تو اس کا ذہن بری طرح انتشار کا شکار تھا۔ وہ مصیبت جو کسی اور کے گھر میں تھی ان کی زندگی میں ایسے آئی تھی کہ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوا تھا۔

عبداللہ نے اس سے ملنے کے بعد اسے کال نہیں کی تھی' اس نے جبریل کو کال کی تھی... ایک بے حد شکایتی کال۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ احسن سعد کے حوالے سے یہ سب کیوں کہہ رہا تھا؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا احسن کتنا اچھا انسان اور مسلمان تھا؟ وہ بہت دیر جبریل کی بات سنے بغیر بے حد جذباتی انداز میں بولتا ہی چلا گیا تھا۔ جبریل سنتا رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی کے مشکل ترین لمحات میں سے ایک تھا۔ ایک نو مسلم کو یہ بتانا کہ اس کے سامنے جو سب سے زیادہ عملی مسلمان تھا' وہ اچھا انسان ثابت نہیں ہوا تھا۔

وہ عبداللہ کا دل مسلمانوں سے نہیں پھیرنا چاہتا تھا' خاص طور پر ان مسلمانوں سے جو تبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ وہ ایک حافظ قرآن ہو کر ایک دوسرے حافظ قرآن کے بارے میں ایک نو مسلم کو یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹا تھا' ظالم تھا' بہتان لگانے والا ایک لالچی انسان تھا اس کے باوجود کہ وہ صوم و صلوۃ کا پابند ایک مسلمان تھا۔ جبریل سکندر کا مخمصہ ایک بڑا مخمصہ تھا مگر اس کی خاموشی اس سے زیادہ خرابی کا باعث بنتی تو وہ خاموش نہیں رہ پایا تھا۔

"احسن سعد کے بارے میں جو میں جانتا ہوں اور جو میں کہوں گا' تم پھر اس سے ہرٹ ہو گے' اس لیے سب سے بہترین حل یہ ہے کہ تم اس عورت سے جا کر ملو اور وہ سارے ڈاکومنٹس دیکھو جو اس کے پاس ہیں۔" اس نے عبداللہ کی باتوں کے جواب میں اسے کہا۔

اور اب عبداللہ یہاں تھا' عائشہ عابدین کے سامنے اس کے گھر پر' وہ جبریل کے حوالے سے آیا تھا۔ عائشہ عابدین اس سے ملنے سے انکار نہیں کر سکی۔ وہ اس رات آن کال تھی اور اب گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی جب عبداللہ وہاں پہنچا تھا اور وہ وہاں اب اس کے سامنے بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ اس کی منگیتر نے احسن سعد کے حوالے سے کچھ شبہات کا اظہار کیا تھا خاص طور پر عائشہ عابدین کے حوالے سے اور وہ ان الزامات کی تصدیق یا تردید کے لیے وہاں آیا تھا... لیکن یہ کہنے سے پہلے اس نے عائشہ کو بتایا تھا کہ وہ احسن سعد کو کیا درجہ دیتا تھا اور اس کی زندگی کے پچھلے کچھ سالوں میں وہ اس کے لیے ایک رول ماڈل رہے تھے۔

وہ جیسے ایک "بت" لے کر عائشہ عابدین کے پاس آیا تھا جسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک

جا سکتا تھا اور گفتگو کے شروع میں ہی اتنی لمبی تمہید جیسے ایک حفاظتی دیوار تھی جو اس نے صرف اپنے سامنے ہی نہیں، عائشہ عابدین کے سامنے بھی کھڑی کردی تھی۔

اس نے بھی جبریل جیسی ہی خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنی تھیں۔ بے حد تحمل اور سکون کے ساتھ۔ کسی مداخلت یا اعتراض کے بغیر۔ عبداللہ کو کم از کم اس سے یہ توقع نہیں تھی۔ وہ یہاں آنے سے پہلے عائشہ عابدین کا ایک امیج ذہن میں رکھ کر آیا تھا۔ وہ پہلی نظر میں اس امیج پر پوری نہیں اتری تھی۔ بے حجاب ہونے کے باوجود اس میں عبداللہ کو بے حیائی نظر نہیں آئی۔ بے حد سادہ لباس میں میک اپ سے بے نیاز چہرے والی ایک بے حد حسین لڑکی جس کی آنکھیں اداس تھیں اور جس کی آواز بے حد دھیمی، عبداللہ وہاں ایک تیز طرار، بے حد فیشن ایبل الٹرا ماڈرن عورت سے ملنے کی توقع لے کر آیا تھا جسے اس کے اپنے خیال اور ڈاکٹر احسن سعد کے بتائے ہوئے کردار کے مطابق بے حد قابل اعتراض حلیے میں ہونا چاہیے تھا، مگر عبداللہ کی قسمت میں شاید مزید حیران ہونا باقی تھا۔

عنایہ اور جبریل دونوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے ڈاکومنٹس دکھائے گی۔ احسن سعد سے طلاق کے کاغذات، قانونی کارروائی کے کاغذات، کورٹ کا فیصلہ، کسٹڈی کی تفصیلات اور وہ حقائق جو صرف وہی بتا سکتی تھی، عائشہ عابدین نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

"احسن سعد برا شخص نہیں ہے، صرف میں اور وہ compatible نہیں تھے۔ (مطابقت نہیں رکھتے تھے) اس لیے شادی نہیں چلی۔" "تقریباً" دس منٹ تک اس کی بات سننے کے بعد عائشہ نے بے حد مدھم آواز میں اسے کہا تھا۔

"وہ یقیناً" اتنے ہی اچھے مسلمان ہیں، جتنا آپ اسے سمجھتے ہیں اور اس میں بہت ساری خوبیاں ہیں۔ آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کا واسطہ ان کی خوبیوں سے پڑا۔ میں شاید اتنی خوش قسمت نہیں تھی یا پھر مجھ سے کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔" وہ کہہ رہی تھی اور عبداللہ کے دل کو جیسے تسلی نہیں ہو رہی تھی، یہ وہ کچھ نہیں تھا جو وہ سننا چاہتا تھا، لیکن وہ بھی نہیں تھا جس کی اسے توقع تھی۔

"وہ آپ کے لیے ایک انسپاریشن اور رول ماڈل ہیں... یقیناً" ہوں گے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "کوئی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا، مگر چند غلطیاں کرنے پر ہم کسی کو نظروں سے نہیں گرا سکتے۔ میرے اور احسن سعد کے درمیان جو بھی ہوا، اس میں ان سے زیادہ میری غلطی ہے اور آپ کے سامنے میں ان کے بارے میں کچھ بھی کہہ کر وہ غلطی پھر سے دہرانا نہیں چاہتی۔"

عائشہ نے بات ختم کردی تھی۔ عبداللہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے تسلی ہونی چاہیے تھی، نہیں ہوئی۔ وہ وہاں احسن سعد کے بارے میں کچھ جاننے اور کھوجنے نہیں آیا تھا اس کا دفاع کرنے آیا تھا، اس عورت کے سامنے جو اس کی تذلیل اور تضحیک اور دل شکنی کا باعث بنی تھی، لیکن اس عورت نے جیسے اس کے سامنے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی کسی صفائی، کسی وضاحت کی۔ اس نے ہر غلطی، ہر گناہ خاموشی سے اپنے کھاتے میں ڈال لیا تھا۔

اس کے لاؤنج میں بیٹھے عبداللہ نے دیواروں پر لگی اس کے بیٹے کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس کے کھلونوں کی ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر، ویسی جگہ نہیں جیسا وہ اسے تصور کرکے آیا تھا، کیوں کہ احسن سعد نے اسے اس عورت کے "پھوہڑپن" کے بھی بہت قصے سنا رکھے تھے جو احسن سعد کے گھر کو چلانے میں ناکام تھی، جس کا واحد کام اور مصروفیت ٹی وی دیکھتے رہنا یا آوارہ پھرنا تھا اور جو گھر کا کوئی کام کرنے کے لیے کہنے پر بھی برہم ہو جاتی تھی۔ عبداللہ کے دماغ میں گرہیں بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔ وہ اس لڑکی سے نفرت نہیں کرسکا، اسے ناپسند نہیں

کر سکا۔

"جبریل سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" وہ بالآخر ایک آخری سوال پر آگیا تھا جہاں سے یہ سارا مسئلہ شروع ہوا تھا۔

"میں اس سے پیار کرتی ہوں۔" وہ اس کے سوال پر بہت دیر خاموش رہی پھر اس نے عبداللہ سے کہا، سر اٹھا کر نظریں چرائے بغیر۔

☼ ☼ ☼

" I met your ex-wife " (میں آپ کی سابقہ بیوی سے ملا تھا) وہ جملہ نہیں تھا جیسے ایک بم تھا جو اس نے احسن سعد کے سر پر پھوڑا تھا۔

عبداللہ پچھلی رات واپس پہنچا تھا اور اگلے دن اسپتال میں اس کی ملاقات احسن سے ہوئی تھی۔ اسی طرح ہشاش بشاش، بااخلاق، پرجوش، عبداللہ کے کانوں میں عنایہ اور جبریل کی آوازیں اور انکشافات گونجنے لگے تھے۔ اس نے احسن سے ملاقات کا وقت مانگا تھا جو بڑی خوش دلی سے دیا گیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی اپارٹمنٹ کی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ احسن کے والدین اس کے ساتھ رہتے تھے اس لیے وہ ملاقات اپنے گھر پر کرنا چاہتا تھا، مگر احسن اس شام کچھ مصروف تھا تو عبداللہ کو اس ہی کے اپارٹمنٹ پر جانا پڑا، وہاں اس کی ملاقات احسن کے والدین سے ہوئی تھی ہمیشہ کی طرح ایک رسمی ہیلو ہائے۔

احسن لاؤنج میں بیٹھتے ہی اس سے بات کرنا چاہتا تھا، مگر عبداللہ نے اس سے علیحدگی میں ملنا چاہا تھا اور تب وہ اسے اپنے بیڈروم میں لے آیا تھا، مگر وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ عبداللہ کا رویہ کچھ عجیب تھا، مگر احسن سعد کی چھٹی حس اسے اس سے بھی برے اشارے دے رہی تھی اور وہ بالکل ٹھیک تھے۔

عبداللہ نے کمرے کے اندر آتے ہی گفتگو کا آغاز اسی جملے سے کیا تھا اور احسن سعد کا لہجہ، انداز اور تاثرات پلک جھپکتے میں بدلے تھے۔ عبداللہ نے زندگی میں پہلی بار اس کی یہ آواز سنی تھی۔ وہ لہجہ بے حد خشک اور سرد تھا... کرخت بہتر لفظ تھا اسے بیان کرنے کے لیے... اور اس کے ماتھے پر بل آئے تھے۔ آنکھوں میں کھا جانے والی نفرت۔

بھنچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس نے عبداللہ سے کہا۔ "کیوں؟"

عبداللہ نے بے حد مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ عنایہ نے اس سے کہا تھا کہ جبریل اس کی شادی عبداللہ سے نہیں کرنا چاہتا اور اس کے انکار کی وجہ احسن سعد سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ اس نے احسن سعد کو بتایا کہ عنایہ اور جبریل دونوں نے اس پر سنگین الزامات لگائے تھے اور اسے عائشہ عابدین سے ملنے کے لیے کہا جو اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

"تو تم نے ان پر اعتبار کیا... اپنے استاد پر نہیں اور تم مجھ سے بات یا مشورہ کیے بغیر اس کتیا سے ملنے چلے گئے اور تم دعوا کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے سب کچھ سیکھ لیا۔"

احسن نے اس کی گفتگو کے درمیان ہی اس کی بات بے حد خشمگیں لہجے میں کاٹی تھی، عبداللہ ویسے بھی بات کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے احسن سعد کی زبان سے ابھی ابھی ایک گالی سنی تھی عائشہ عابدین کے لیے... وہ گالی اس کے لیے شاکنگ نہیں تھی، احسن سعد کی زبان سے اس کا نکلنا شاکنگ تھا، مگر وہ شام عبداللہ کے لیے وہ آخری شاک لانے والی نہیں تھی۔ وہ جس بت کی پرستش کر رہا تھا، وہاں اس بت کو اوندھے منہ گرتے دیکھنے آیا تھا۔

"تمہیں کوئی حق نہیں تھا کہ تم میری سابقہ بیوی سے ملتے۔ میرے بارے میں اس طرح انویسٹی گیشن کرتے، تم اس....... کے پاس پہنچے جس نے میرے بارے میں تم سے جھوٹ پہ جھوٹ بولا ہوگا۔"
احسن سعد کے جملوں میں اب عائشہ کے لیے گالیاں اس روانی سے آرہی تھیں جیسے وہ اسے مخاطب کرنے کے لیے روزمرہ کے القابات تھے۔ وہ غصے کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ عائشہ کی نفرت اس کے لیے سنبھالنا مشکل ہو رہی تھی یا اپنا سالوں کا بنایا ہوا امیج مسخ ہونے کی تکلیف نے اسے اس طرح بلبلانے پر مجبور کر دیا تھا' عبداللہ سمجھنے سے قاصر تھا۔
"وہ دکھانے بیٹھ گئی ہوگی تمہیں کورٹ کے کاغذات کہ' یہ دیکھو کورٹ میرے شوہر کو جھوٹا کہہ رہی ہے۔ کورٹ نے مجھ پر مار پیٹ کے الزامات کو مانا ہے۔ کورٹ نے احسن سعد کو دوسری شادی کرنے کے لیے اسے دھوکے باز کہا ہے اور اس لیے اس.... عورت کے طلاق کے مطالبے کو جائز قرار دیتے ہوئے اسے طلاق دلوادی اور بچے کی کسٹڈی بھی۔"
وہ بولتا ہی جا رہا تھا اور عبداللہ ساکت صرف اسے سن رہا تھا۔ وہ سارے انکشافات جن کو سننے کے لیے جبریل نے اسے عائشہ کے پاس بھیجا تھا' وہ الزامات وہ خود احسن سعد سے سن رہا تھا۔
"میں اس ملک کے کورٹس کو دو ٹکے کا نہیں سمجھتا' یہ کافروں کی عدالتیں ہیں' اسلام کو کیا سمجھتی ہوں گی' وہ یہ فیصلے دیتی ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں۔ میرا مذہب حق دیتا ہے مجھے دوسری شادی کا کسی بھی وجہ کے بغیر تو کورٹ کون ہوتی ہے مجھے اس عمل پر دھوکے باز کہنے والی' مجھے حق ہے کہ میں ایک نافرمان بیوی کو مار پیٹ سے راہ راست پر لاؤں۔ کورٹ کس حق کے تحت مجھے اس سے روک سکتی ہے؟ میں مرد ہوں' مجھے میرے دین نے عورت پر برتری دی ہے' کورٹ کیسے مجھے مجبور کر سکتی ہے کہ میں اپنی بیوی کو برابری دوں۔ ان ہی چیزوں کی وجہ سے تو تمہارا معاشرہ تباہ ہوگا' بے حیائی' عریانی' منہ زوری' مرد کی نافرمانی.... یہی چیزیں تو لے ڈوبی ہیں تمہاری عورتوں کو اور تمہاری کورٹس کہتی ہیں' ہم بھی بے غیرت ہو جائیں اور ان عورتوں کو بسائیں اور ان کے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتے پھریں۔"
وہ شخص کون تھا؟ عبداللہ پہچان ہی نہیں پا رہا تھا۔ اتنا زہر' ایسا تعصب' ایسے الفاظ اور یہ سوچ.... اس نے ڈاکٹر احسن سعد کے اندر چھپا یہ انسان تو کبھی نہیں دیکھا تھا جو امریکا کو ہمیشہ اپنا ملک قرار دیتے ہوئے اپنے آپ کو فخریہ امریکن کہتا تھا اور آج وہ اسے تمہارا ملک' تمہارا معاشرہ' تمہارے کورٹس کہہ کہہ کر بات کر رہا تھا۔ امت اور اخوت کے جو دو لفظ اس کا کلمہ تھے وہ دونوں یک دم کہیں غائب ہو گئے تھے۔
"اب طلاق منہ پر مار کر میں نے اس حرافہ کو چھوڑا ہوا ہے تو خوار ہوتی پھر رہی ہے۔ کسی کی کیپ اور گرل فرینڈ ہی رہے گی وہ ساری عمر' کبھی بیوی نہیں بنے گی۔ اسے یہی آزادی چاہیے' تمہاری سب عورتوں کو یہی سب چاہیے۔ گھر' خاندان' چاردیواری کس چڑیا کے نام ہیں انہیں کیا پتا' عصمت جیسا لفظ ان کی ڈکشنری میں ہی نہیں اور پھر الزام لگاتی ہیں شوہروں پر تشدد کے.... گھٹیا عورتیں۔"
اس کے جملوں میں اب بے ربطگی تھی.... یوں جیسے وہ خود بھی اپنی باتیں جوڑ نہ پا رہا ہو' مگر وہ خاموش ہونے پر تیار نہیں تھا۔ اس کا علم بول رہا ہوتا تو اگلے کئی گھنٹے بھی عبداللہ اسی طرح اسے سن سکتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سحرزدہ معمول کی طرح سنتا رہتا تھا' مگر یہ اس کی جہالت تھی جو گفتگو کر رہی تھی اور کرتے ہی رہنا چاہتی تھی۔
عبداللہ اس کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر اس سے پہلے احسن سعد کے ماں باپ اندر آگئے تھے.... وہ یقیناً احسن کے اس طرح بلند آواز میں باتیں سن کر اندر آئے تھے۔
"ابو! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کے دوست کا بیٹا میرا دشمن ہے' مجھے نقصان پہنچائے گا.... اب دیکھ

لیں' وہی ہو رہا ہے۔ وہ مجھے جگہ جگہ بدنام کرتا پھر رہا ہے۔" احسن نے اپنے باپ کو دیکھتے ہی کہا تھا۔
"کون؟" سعد نے کچھ ہکا بکا انداز میں کہا۔
"جبریل!" احسن نے جواباً" کہا اور عبداللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے عائشہ سے ملوایا ہے اس نے۔۔۔ اور اس عورت نے اس سے میرے بارے میں جھوٹی سچی باتیں کی ہیں' زہر اگلا ہے میرے بارے میں۔"
وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح باپ سے شکایت کر رہا تھا۔
"عائشہ نے مجھ سے آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔ جو بھی بتایا ہے' آپ نے خود بتایا ہے۔" عبداللہ نے سعد کے کچھ کہنے سے پہلے کہا تھا۔ "انہوں نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ آپ کے اور ان کے درمیان compatibility (مطابقت) نہیں تھی' مگر کوئی کورٹ پیپرز اور کورٹ میں آپ پر ثابت ہونے والے کسی الزام کی انہوں نے بات کی نہ ہی مجھے کوئی پیپر دکھایا۔۔۔ جو بھی سن رہا ہوں' وہ میں آپ سے ہی سن رہا ہوں۔"
عبداللہ کا خیال تھا احسن سعد حیران رہ جائے گا اور پھر شرمندہ ہو گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔
"تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔" احسن سعد نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا تھا۔
عبداللہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس گھر میں یک دم ہی اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اب صرف احسن سعد نہیں بول رہا تھا' اس کا باپ اور ماں بھی شامل ہو گئے تھے۔ وہ تینوں بیک وقت بول رہے تھے اور عائشہ عابدین کو لعنت ملامت کر رہے تھے اور جبریل کو بھی۔ سالار سکندر کے ماضی کے حوالے سے سعد کو یک دم بہت ساری باتیں یاد آنے لگی تھیں اور امامہ کے بارے میں۔۔۔ جس کا پہلا مذہب کچھ اور تھا۔۔۔ عبداللہ کو یک دم کھڑے کھڑے یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ ایک پاگل خانے میں کھڑا ہے۔۔۔ وہ اس کے کھڑے ہونے پر بھی اسے جانے نہیں دے رہے تھے بلکہ چاہتے تھے وہ ان کی ہر بات سن کر جائے' ایک ایک بہتان' ایک ایک راز جو صرف ان کے سینوں میں دبا ہوا تھا اور جسے وہ آج آشکار کر دینا چاہتے تھے۔ اسلام کا وہ چہرہ عبداللہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مذہب اس کے لیے ہمیشہ ہدایت اور مرہم تھا' بے ہدایتی اور زخم کبھی نہیں بنا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ کانوں میں پڑنے والی آوازوں کو روک دینا چاہتا تھا' احسن سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قرآن کا استاد رہا ہے' وہ بس وہی سب بتائے اسے' یہ سب نہ سنائے۔
"برادر احسن۔۔۔ You disappointed me۔۔۔ "(آپ نے مجھے مایوس کیا ہے)" عبداللہ نے بالآخر بہت دیر بعد آوازوں کے اس طوفان میں اپنا پہلا جملہ کہا۔ طوفان جیسے چند لمحوں کے لیے رکا۔
"آپ کے پاس بہت علم ہے۔۔۔ قرآن پاک کا بہت زیادہ علم ہے لیکن ناقص۔۔۔ آپ قرآن پاک کو حفظ تو کیے ہوئے ہیں' مگر نہ اس کا مفہوم سمجھ پائے ہیں نہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات۔ کیوں کہ آپ سمجھنا نہیں چاہتے' اس کتاب کو جو اپنے آپ کو سمجھنے اور سوچنے کے لیے بلاتی ہے' آپ سے ایک بار میں نے ایک آیت کا مطلب پوچھا تھا کہ قرآن دلوں پر مہر لگا دینے کی بات کرتا ہے تو اس کا کیا مفہوم ہے؟ مجھے اس کا مفہوم اس وقت سمجھ میں نہیں آیا تھا' آج آ گیا۔ آپ میرے استاد رہے ہیں' مگر میں دعا کرتا ہوں اللہ آپ کے دل کی مہر توڑ دے اور آپ کو ہدایت عطا فرمائے۔"
وہ احسن سعد کو بیچ بازار میں جیسے ننگا کر کے چلا گیا تھا۔ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پھر وہیں کھڑا تھا جہاں عائشہ کو توقع تھی۔ اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کمپاؤنڈ میں۔ ادھر سے ادھر ٹہلتے۔۔۔ گہری سوچ میں۔۔۔ زمین پر اپنے قدموں سے فاصلے ناپتے ہوئے۔ برف باری بہت دیر پہلے ہو کر رکی تھی اور جو برف

گری تھی' وہ بہت ہلکی سی چادر کی طرح تھی۔ جو دھوپ نکلنے پر پگھل جاتی' مگر آج دھوپ نہیں نکلی تھی اور اس برف پر جبریل کے قدموں کے نشان تھے۔ بے حد ہموار اور متوازن جیسے بہت سوچ سمجھ کر رکھے جا رہے ہوں۔ اس نے عائشہ کو باہر آتے نہیں دیکھا تھا' مگر عائشہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ لانگ کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔

جبریل نے اسے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا' وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

"میں گروسری کے لیے جا رہی ہوں اور پھر اسپتال چلی جاؤں گی۔" اس نے جیسے بلاواسطہ انکار کیا تھا۔

وہ اب اس کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی۔ اس کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتی تھی اس ایک گفتگو کے بعد۔

"تو تم کورٹ میں یہ اعتراف کرنا چاہتی ہو کہ احسن سعد ٹھیک ہے اور تم نے اپنے بیٹے کی دیکھ بھال میں لاپروائی کا مظاہرہ کیا' تم اپنی زندگی تباہ کرنا چاہتی ہو؟"

جبریل نے بے حد خفگی سے اسے تب کہا تھا۔

"مجھے اپنی زندگی میں اب دلچسپی نہیں رہی اور اگر اسے قربان کرنے سے ایک زیادہ بہتر زندگی بچ سکتی ہے تو کیوں نہیں۔" اس نے جواباً "ان سب ملاقاتوں میں پہلی بار اس سے اس طرح بات کی تھی۔

"تم مجھے بچانا چاہتی ہو؟" جبریل نے سیدھا اس سے پوچھا۔ اسے اتنے ڈائریکٹ سوال کی توقع نہیں تھی اس سے اور ایک ایسے سوال کی جس کا جواب وہ اسے دینے کی جرأت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے یہ کیسے بتا سکتی تھی کہ وہ احسن سعد سے اس شخص کو بچانا چاہتی تھی جو اسے اسفند کے بعد اب سب سے عزیز تھا۔

یہ جاننے کے باوجود کہ احسن سعد نے اسے جبریل کے آپریشن میں ڈاکٹر ویزل سے ہونے والی کوتاہی کے بارے میں بتایا تھا۔ اسے جبریل کے اس معذرت والے کارڈ کی سمجھ بھی تب ہی آئی تھی لیکن وہ پھر بھی جبریل کو معاف کرنے پر تیار تھی۔ یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ اس کے بیٹے کی جان لینے میں اس شخص سے ہونے والی کسی دانستہ غلطی کا ہاتھ تھا۔ وہ اسے اتنی توجہ کیوں دیتا تھا' اس کے لیے کیوں بھاگتا پھرتا تھا' عائشہ عابدین جیسے اب ڈی کوڈ کر پائی تھی اور وہ اسے اس احساس جرم سے آزاد کر دینا چاہتی تھی' یہ بتا کر کہ اس نے جبریل کو معاف کر دیا تھا اور وہ جبریل کو بچانے کے لیے احسن سعد کے آگے دیوار کی طرح کھڑی ہو سکتی تھی۔ وہ ایک کام جو وہ زندگی میں اپنی ذات اور اپنی اولاد کے لیے بھی نہیں کر سکی تھی۔

"میں تمہیں صرف احساس جرم سے آزاد کر دینا چاہتی ہوں جو تم اسفند کی وجہ سے رکھتے ہو۔" اس نے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

جبریل بول نہیں سکا تھا۔

"میں اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا کر سکتا ہوں' مگر تمہیں اپنی زندگی تباہ کرنے نہیں دے سکتا۔" بڑی لمبی خاموشی کے بعد جبریل نے کہا تھا۔

"تم اگر احسن کے اس الزام پر کورٹ میں یہ کہو گی تو میں اپنی غلطی کورٹ میں جا کر بتاؤں گا۔" اس نے عائشہ سے کہا۔ "تمہیں کوئی سمجھانے والا نہیں ہے' ہوتا تو تمہیں یہ نہ کرنے دیتا۔ اور نہیں۔ تمہارے پاس آنے کی واحد وجہ میرا احساس جرم نہیں ہے۔ زندگی میں احساس جرم ہمدردی تو کروا سکتا ہے محبت نہیں۔"

جبریل اس دن جانے سے پہلے اس سے کہہ کر گیا تھا۔ ایسے ہی معمول کے انداز میں۔ یوں جیسے سردرد میں ڈسپرین تجویز کر رہا ہو یا نزلہ ہو جانے پر فلو تشخیص کر رہا ہو۔

اس کے جانے کے بعد بھی عائشہ کو لگا تھا اس نے جبریل سکندر کی بات سننے میں غلطی تھی اور اس میں اتنی

ہمت نہیں تھی کہ وہ اس بات کو دوبارہ سننے کا اصرار کرتی تاکہ اپنی تصحیح کر سکے' بعض وہم جی اٹھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں' بعض شبہات متاع حیات ہوتے ہیں' یقین میں نہ بھی بدلیں تو بھی۔

اور اب وہ ایک بار پھر سامنے کھڑا تھا۔ نہیں کھڑا نہیں تھا۔ برف پر اپنے نشان بنانے میں مصروف تھا گویں جیسے اس کے پاس دنیا بھر کی فرصت تھی۔ اس کی چاپ پر جبریل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ لانگ کوٹ کے اندر اپنی گردن کے مفلر کو بالکل ٹھیک ہونے کے باوجود ایک بار پھر ٹھیک کرتی اس کی طرف آرہی تھی' اس کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود۔

"گروسری میں بہت وقت لگے گا۔" اس کے قریب آتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اسے جتاتے ہوئے اس نے جبریل سے کہا تھا۔ "ہم پھر کسی دن فرصت میں مل سکتے تھے۔"

جبریل کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ایک بار پھر جبریل کو جیسے اپنے ساتھ جانے سے روکنے کے لیے کہا۔ اس کے باوجود کہ جبریل نے اسے انتظار کرنے کا نہیں کہا تھا' وہ اس کے ساتھ سودا سلف کی خریداری کرنے جانے کے لیے تیار تھا۔ اسے صرف اتنا وقت ہی چاہیے تھا جتنا وقت وہ گروسری کرتی۔ ساتھ چلتے پھرتے وہ بات کر سکتا تھا۔

"میں جانتا ہوں' مگر میرے پاس تو بہت فرصت ہے' تمہارے پاس بالکل نہیں۔" اس نے جواباً" اس سے کہا۔

"گاڑی میں چلیں؟" جبریل نے بھی اپنے جواب پر اس کے تبصرہ کا انتظار نہیں کیا تھا۔

"نہیں یہاں قریب ہی ہے اسٹور' چند قدم کے فاصلے پر' گاڑی کی ضرورت نہیں ہے' مجھے بہت زیادہ چیزیں نہیں چاہئیں۔" عائشہ نے قدم روکے بغیر سوئی سڑک کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تم نے عبداللہ سے جھوٹ کیوں بولا؟" وہ چند قدم خاموشی سے چلتے رہے تھے' پھر جبریل نے اس سے پوچھنے میں دیر نہیں کی تھی۔ عائشہ نے گہرا سانس لیا۔ اسے اس سوال کی توقع تھی' لیکن اتنی جلدی نہیں۔

"بزدلی اچھی چیز نہیں عائشہ۔" اس نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا تھا۔ وہ طنز نہیں تھا' مگر اس وقت عائشہ کو طنز ہی لگا تھا۔ ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں اب فٹ پاتھ پر آگئے تھے۔ برف کی چادر پر وہ نشان جو کچھ دیر پہلے جبریل اکیلا بنا رہا تھا' اب وہ دونوں ساتھ ساتھ بنا رہے تھے۔

"تمہیں لگتا ہے میں بزدل ہوں اس لیے میں نے احسن سعد کے بارے میں عبداللہ کو سچ نہیں بتایا؟" اس نے ساتھ چلتے ہوئے پہلی بار گردن موڑ کر جبریل کو دیکھا تھا۔

"بزدلی یا خوف۔۔۔ اس کے علاوہ تیسری وجہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔" جبریل نے جیسے اپنی بات کی تصدیق کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تمہیں ڈر تھا کہ احسن سعد تمہیں پریشان کرے گا' تمہیں فون کرے گا اور تنگ کرے گا۔" جبریل نے کہا تھا۔ "مگر تم نے عبداللہ سے جھوٹ بول کر احسن سعد کو بچا کر بہت زیادتی کی۔۔۔ تم نے مجھے اور عنایہ کو جھوٹا بنا دیا۔" اس کا لہجہ اب شکایتی تھا۔

"آپ لوگوں کا جھوٹا ہونے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا احسن سعد کے جھوٹا ہونے سے عبداللہ کو ہوتا۔" عائشہ نے جواباً" کہا۔

"وہ حافظ قرآن ہے تو میں بھی ہوں۔" جبریل نے کہا۔

"آپ کو وہ اس مقام پر بٹھا کر نہیں دیکھتا جس پر احسن کو دیکھتا ہے۔" عائشہ نے جواباً" کہا۔ "وہ نو مسلم نہ ہوتا تو میں احسن کے بارے میں اب سب کچھ بتا دیتی اسے۔ وہ مجھ سے ملنے کے بعد دوبارہ احسن کی شکل بھی نہ دیکھتا شاید۔ مگر وہ نو مسلم ہے۔۔۔ میں اس سے کس منہ سے یہ کہتی کہ اتنے سالوں سے وہ جس شخص کو بہترین مسلمان اور انسان سمجھ رہا ہے' وہ ایسا نہیں ہے۔ عبداللہ نے صرف احسن کو جھوٹا نہیں ماننا تھا' میرے دین سے اس کا دل

اچاٹ ہو جاتا تھا۔" وہ کہہ رہی تھی اسی مدھم آواز میں جو اس کا خاصا تھی۔

"میرے ساتھ ہوا تھا ایک بار ایسے۔ میں احسن سعد سے ملنے سے پہلے بہت اچھی مسلمان تھی' آنکھیں بند کر کے اسلام کی پیروی کرنے والی۔ جنون اور پاگل پن کی حد تک دین کے راستے پر چلنے والی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے اندھی محبت اور عقیدت رکھنے والی لیکن پھر میری شادی احسن سعد سے ہو گئی اور میں نے اس کا اصل چہرہ دیکھ لیا اور میرا سب سے بڑا نقصان ایک خراب ازدواجی زندگی' طلاق یا اسفند کی موت نہیں ہے۔ میرا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے مجھے دین سے بے زار کر دیا۔ مجھے اب دین کی بات کرنے والا ہر شخص جھوٹا اور منافق لگتا ہے۔ داڑھی اور حجاب سے مجھے خوف آتا ہے' میرا دل جیسے عبادت کے لیے بند ہو گیا ہے۔ اتنے سال میں دن رات اتنی عبادتیں اور وظیفے کرتی رہی اپنی زندگی میں بہتری کے لیے کہ اب مجھے لگتا ہے مجھے اللہ سے کچھ مانگنا ہی نہیں چاہیے۔ میں مسلمان ہوں لیکن میرا دل آہستہ آہستہ منکر ہوتا جا رہا ہے اور مجھے اس احساس سے خوف آتا ہے لیکن میں کچھ کر نہیں پا رہی اور یہ سب اس لیے ہوا کیونکہ مجھے ایک اچھے عملی مسلمان سے بہت ساری توقعات اور امیدیں تھیں اور میں نے انہیں چکنا چور ہوتے دیکھا اور میں عبداللہ کو اس تکلیف سے گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر وہ احسن سعد کو اچھا انسان سمجھتے ہوئے ایک اچھا انسان بن سکتا ہے تو اسے بننے دیں۔"

وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں اور گالوں کو رگڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں کافر ہوں لیکن میں کسی کو کافر نہیں کر سکتی بس مجھ میں اگر ایمان ہے تو صرف اتنا۔" وہ اب ٹشو اپنی جیب سے نکال کر آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

"پسند۔۔۔؟ مجھے پسند کا نہیں پتا ممی مگر عائشہ عابدین میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے۔ میں اس سے شدید ہمدردی رکھتا تھا مگر اب ہمدردی تو بہت پیچھے رہ گئی۔ میں اسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پاتا۔۔۔ بار بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا اور میرا کوئی فیوچر نہیں ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ لائف پارٹنر کے طور پر مجھے جیسی لڑکی کی خواہش ہے' عائشہ اس کی متضاد ہے۔۔۔ مجھے بے حد مضبوط' پُراعتماد' زندگی سے بھرپور کیریئر اورینٹڈ ہر وقت ہنستی رہنے والی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جو بہت اچھی (تربیت) بھی رکھتی ہوں اور عائشہ میں ان سب چیزوں میں سے صرف دو ہوں گی۔۔۔ یا تین۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میں عائشہ سے (علیحدہ) نہیں رہ سکتا۔"

امریکہ آنے سے پہلے اس نے امامہ کے اس سوال پر اسے اپنی بے بسی بتائی تھی۔

"اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی۔" امامہ نے جواباً اس سے پوچھا تھا۔ "کیا خصوصیت ہے اس میں ایسی کہ وہ تمہارے ذہن سے نہیں نکلتی؟" اس نے جبریل سے پوچھا تھا۔

"وہ عجیب ہے ممی' وہ بس عجیب ہے۔"

اس نے جیسے امامہ کو اپنی بے بسی سمجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ بے بسی ایک بار پھر سے در آئی تھی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اس لڑکی کی منطق صرف اس کی منطق ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے دین کافر کہہ رہی تھی اور وہ اس کے ظرف پر حیران تھا۔

"تم بے حد عجیب ہو۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ہاں میں ہوں۔" عائشہ عابدین نے اعتراف کیا۔

"مجھے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا ہے کہ تم سولہ سال کی عمر میں زیادہ اچھی تھیں یا اب۔۔۔؟" بے حد غیر متوقع

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



جملہ تھا' عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"عبداللہ نے مجھ سے کہا' تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" عائشہ کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس وقت وہیں اس میں سما جائے۔ ندامت کا یہ عالم تھا اس کا۔ وہ جملہ جبریل تک پہنچانے کے لیے نہیں تھا' پھر بھی پہنچ گیا۔

"میں نے اس سے کہا میں جانتا ہوں۔" وہ اسی طرح جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پانی پانی اس جملے نے بھی کیا تھا اسے۔ وہ اس کے دل تک کب پہنچا تھا۔

"عبداللہ کا خیال ہے' ہم دونوں اچھے لائف پارٹنر ہو سکتے ہیں۔" وہ اس جملے پر رک گئی۔ پتا نہیں کون زیادہ مہربان تھا' کہنے والا یا پہنچانے والا۔

"میں نے اس سے کہا میں یہ بھی جانتا ہوں۔" وہ بھی رک گیا تھا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کے بالمقابل فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے۔ برف باری پھر سے ہونے لگی تھی۔

"زندگی میں ایک اسٹیج وہ تھی جب میں سوچتی تھی میری شادی اگر آپ جیسے کسی شخص سے ہو جائے تو بس پھر میں خود کو بے حد خوش قسمت مانوں گی۔ سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔" اس نے بالآخر کہنا شروع کیا تھا۔

"آج اس اسٹیج پر میں سوچتی ہوں شادی کوئی حل نہیں ہے۔ اچھی زندگی کی گارنٹی بھی نہیں ہے۔ تو اب میں ایک اچھی زندگی کے لیے کسی سہارے کی تلاش میں نہیں ہوں۔ میں کیریر پر فوکس کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی زندگی اپنے لیے جینا چاہتی ہوں۔ ورلڈ ٹور پر جانا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہیں اسپانسر کر سکتا ہوں۔" وہ نم آنکھوں سے بے اختیار ہنسی' بے حد سنجیدگی سے کہا گیا وہ جملہ اسے ہنسانے کے لیے ہی تھا۔

"آپ عجیب ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" بے ساختہ کیے گئے تبصرے کا بے ساختہ ہی جواب آیا تھا۔ "عبداللہ نے بھی مجھ سے یہ ہی کہا تھا کہ آپ دونوں ہی عجیب ہیں۔ انہیں مدر ٹریسا بننے کا شوق ہے آپ کو اپنے مفروضوں پر دوسروں کی خوشیاں خراب کرنے کا۔ "یو کمپلیمنٹ ایچ ادر" وہ کہہ رہا تھا۔

"راستے سے ہٹ جائیں۔" وہ ایک راہ گیر تھا جو انہیں راستہ دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت راستے سے ہٹے تھے۔

"کبھی کسی زیادہ اچھے موسم میں' میں تم سے ایک بار پھر پوچھوں گا کہ کیا میں تمہارے ورلڈ ٹور کو اسپانسر کر سکتا ہوں۔" راہ گیر کے گزر جانے کے بعد جبریل نے اس سے کہا تھا۔

"مجھ جیسوں کو ڈھونڈنے کے بجائے تم اگر مجھ سے ہی بات کر لیتیں تو سولہ سال کی عمر میں بھی میں تمہیں "نہیں" نہیں کہتا۔ انتظار کرنے کو کہہ دیتا زیادہ سے زیادہ۔"

اس نے جبریل کو کہتے سنا۔ "میں نیورو سرجن ہوں' دماغ پڑھ سکتا ہوں' دل نہیں اور میں روایتی قسم کی رومانٹک باتیں بھی نہیں کر سکتا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تم سولہ سال کی عمر میں بھی مجھے اچھی لگی تھیں۔ آج بھی لگتی ہو۔ میں نے اپنی ماں سے بھی یہ کہا' انہوں نے مجھ سے کہا اگر اللہ نے جبریل سکندر کے دل میں اس کی محبت اتاری ہے تو پھر وہ بہت اچھی لڑکی ہوگی۔ جس کی کوئی خوبی اللہ کو پسند ہے.... میں اپنی ماں کا جملہ دہرا رہا ہوں' اسے خود پسندی مت سمجھنا۔"

آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا عائشہ عابدین کی آنکھوں میں اور اس کے پتھر ہوتے دل کو گھلانے لگا تھا۔

"پتا نہیں ہم کتنے مومن' کتنے کافر ہیں' لیکن جو بھی ہیں۔ اللہ ہمارے دلوں۔ سے بے خبر نہیں ہے۔" عائشہ عابدین نے ایک بار کہیں پڑھا تھا۔

"اچھا وقت اچھے وقت پر آتا ہے۔" اس کی نانی کہا کرتی تھیں۔
وہ عجیب جملے تھے... اور سالوں بعد اپنا مفہوم سمجھا رہے تھے۔
"تم میری ممی کی طرح بہت روتی ہو بات بات پر... تمہاری اور ان کی اچھی نبھے گی۔" جبریل نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی سرخ بھیگی ہوئی آنکھوں اور ناک کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کافی ہو گی یا اب بھی گروسری کرو گی؟" وہ اسے اب چھیڑ رہا تھا۔
"گروسری زیادہ ضروری ہے۔" اس نے اپنی ندامت چھپاتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پا کر کہا۔
"اگر اتنی ضروری ہوتی تو تم گروسری اسٹور کو پیچھے نہ چھوڑ آتیں۔" عائشہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ وہ واقعی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بہت ساری دوسری چیزوں کی طرح... آگے بہت کچھ تھا... اس نے جبریل کا نم چہرہ دیکھا، پھر نم آنکھوں سے مسکرائی۔

☼ ☼ ☼

امامہ نے اس اسکریپ بک کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ اس ہی کی اسکریپ بک تھی۔ وہ اسکریپ بک جس میں اس نے کبھی اپنے تصوراتی گھر کے لیے ڈیزائننگ کی تھی۔ مختلف گھروں کی مختلف چیزوں کی تصویریں کھینچ کھینچ کر ایک کلیکشن بنائی تھی کہ جب وہ اپنا گھر بنائے گی تو اس کا فلور اس گھر جیسا ہو گا۔ کھڑکیاں اس گھر جیسی، دروازے اس گھر جیسے... ہاتھ سے بنائے اسکیچز کے ساتھ... اور اس میں ان بہت سے خوب صورت گھروں کی میگزینز سے کاٹی گئی تصویریں بھی چسپاں تھیں۔
وہ اسکریپ بک چند سال پہلے اس نے پھینک دینے کے لیے بہت ساری ردی کے ساتھ نکالی تھی اور حمین نے اسے پھینکنے نہیں دی تھی۔ اس سے وہ اسکریپ بک لے لی تھی اور اب امامہ نے اس اسکریپ بک کو یہاں دیکھا تھا۔ حمین سکندر کے اس پینٹ ہاؤس کی ایک دراز میں... اس کی مرمت کی جا چکی تھی اور وہ بہت صاف ستھری اور اس سے بہتر حالت میں نظر آرہی تھی جس میں امامہ نے اسے آخری بار حمین کو دیتے ہوئے دیکھا تھا۔
"تم کیا کرو گے اس کا؟" اس نے حمین سے پوچھا تھا۔
"آپ کو ایسا ایک گھر بنا کر دوں گا۔" اسے وہی جواب ملا تھا جس کا اسے پہلے ہی اندازہ تھا، وہ حمین سکندر کے سرپرائز کو بوجھنے میں ماہر تھی۔
"مجھے اب ایسے کسی گھر کی تمنا نہیں ہے۔" امامہ نے اسے کہا تھا۔
"ایک وقت تھا جب تھی پر اب نہیں، اب مجھے بس ایک چھوٹا سا ایسا گھر چاہیے جہاں پر میں تمہارے بابا کے ساتھ رہوں اور تمہارے بابا کے پاس وہ ہے۔ اس لیے تم اس گھر کو بنانے میں اپنی انرجی اور وقت ضائع مت کرنا۔" اس نے حمین کو نصیحت کی۔
"میری خواہش ہے یہ ممی!" حمین نے اس سے کہا تھا۔
"یہ گھر میں نے تمہارے بابا سے مانگا تھا، وہ نہیں دے سکے اور تم سے میں لوں گی نہیں، میں کبھی سالار کو یہ احساس نہیں ہونے دوں گی کہ تم نے مجھے وہ دے دیا ہے جو وہ نہیں دے سکا۔" حمین کو اس کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔
"سوچ لیں۔" اس نے جیسے امامہ کو چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
"سوچ لیا۔" وہ چیلنج قبول کرتے ہوئے ہنس پڑی۔
"آپ کو دنیا میں بابا کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔" حمین نے شکایتاً اس سے کہا۔

"ہاں نہیں آتا۔" وہ ہنسی۔
"زیادتی ہے یہ۔" اس نے جتایا۔
"اتنا تو کر سکتی ہوں۔" اس نے جواباً "چھیڑا۔
"دادا کہتے تھے آپ دونوں پتھر کے زمانے میں بھی ہوتے تو مل جاتے۔" وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا' وہ بے اختیار ہنسی تھی اور ہنستی چلی گئی تھی۔
اور اب وہ اس اسکریپ بک کو کھولتے ہوئے اسے ورق بہ ورق دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنی زندگی کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کے پاس وہ اسکریپ بک آدھی خالی تھی اور اب وہ ساری بھر چکی تھی۔ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں ان صفحوں سے آگے دیکھنا شروع کیا جو اس نے بھرے تھے۔ وہاں بھی تصویریں تھیں۔ خوب صورت گھروں کی۔ وہ حمین سکندر کا انتخاب تھا۔ اس ہی کی طرح کاٹ کاٹ کر لگائی ہوئی تصویریں' مگر فرق صرف یہ تھا کہ وہ میگزینز سے کاٹی ہوئی تصویریں نہیں تھیں' وہ کھینچی ہوئی تصویریں تھیں حمین سکندر کے اپنے گھروں کی' وہ چہرے پر مسکراہٹ لیے بڑے اشتیاق سے ان گھروں کی تصویروں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ یقیناً "خوش نصیب تھا" تیس سال کی عمر تک پہنچے بغیر درجنوں گھروں کا مالک تھا۔ اس کی ساری اولادوں میں دولت کے معاملے میں سب سے زیادہ امیر اور خرچ کرنے میں سب سے زیادہ فیاض... اس نے اپنی زندگی کی سب سے پہلی کمپنی امامہ سے قرض لے کر شروع کی تھی۔
"صرف اس لیے لے رہا ہوں آپ سے کہ بابا نے بھی ایس آئی ایف آپ کے قرض سے شروع کیا تھا۔" اس نے امامہ کو منطق بتائی تھی اور اس وقت پہلی بار امامہ نے سالار سے ایس آئی ایف میں دی جانے والی اپنی اصل رقم واپس مانگی تھی۔
"وہ ڈبو دے گا... مجھے یقین ہے۔" سالار نے اسے خبردار کیا تھا۔ وہ اس وقت سولہ سال کا بھی نہیں تھا اور اگر سالار یہ تبصرہ کر رہا تھا تو غلط نہیں تھا۔
"جب تمہیں ایس آئی ایف کے لیے یہ رقم دی تھی تو پاپا نے بھی یہ ہی کہا تھا۔ تم نے ڈبو دی کیا؟" اس نے سالار کو جتایا تھا۔
"تم میرا حمین سے موازنہ کر رہی ہو۔" سالار ناخوش ہوا تھا۔
"پہلی بار نہیں کر رہی۔" اس نے جواباً" کہا تھا۔
کتنا وقت گزر گیا تھا۔ گزر گیا تھا یا شاید بہہ گیا تھا۔ زندگی بہت آگے چلی گئی تھی۔ خواہشات نفس بہت پیچھے چلی گئی تھیں۔
امامہ نے ہاتھ میں پکڑی اسکریپ بک اپنے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہاں پڑا چائے کا مگ اٹھا لیا۔ وہ اب سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ چند دن پہلے پاکستان سے مستقل طور پر امریکہ شفٹ ہوئی تھی اور حمین کا گھر اس کا پہلا پڑاؤ تھا۔ سالار بھی چند دن کے لیے وہیں تھا اور اس وقت صبح سویرے وہ اپنے لیے چائے بنا کر پینٹ ہاؤس کے اس حصے میں آکر بیٹھی تھی جس کی چھت بھی شیشے کی تھی۔ نیلے آسمان پر تیرتے ہلکے بادلوں اور اڑتے پرندوں کو وہ اس پُرسکون خاموشی میں بچوں کے سے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے اپنے عقب میں آہٹ سنی۔ وہ سالار تھا۔ چائے کے اپنے مگ کے ساتھ۔
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے۔ ایک طویل مدت کے بعد وہ یوں امریکہ میں اس طرح فرصت سے مل رہے تھے۔ سالار کی زندگی کی بھاگ دوڑ کے بغیر۔ وہ بھی اس کے قریب کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا' کاؤچ پر اس کے برابر بیٹھے چائے کے مگ ہاتھ میں لیے' وہ دونوں آج بھی ویسے ہی تھے۔ سالار کم گو' وہ سب کچھ کہہ دینے والی۔

سالار سنتے رہنے والا' وہ دنیا جہان کی باتیں دہرا دینے والی۔ مگر ان کے پاس فرصت صرف چائے کے مگ جتنی ہوتی تھی۔ چائے کا مگ بھرا ہوتا تو ان کی باتیں شروع ہوتیں اور اس کے ختم ہونے تک باتیں اور فرصت دونوں ختم ہو جاتیں۔ چائے کا وہ مگ جیسے ان کی قربت میں گزاری ہوئی زندگی تھی۔ نرم گرم' رک رک کر' ٹھہر ٹھہر کر گزرتی ہوئی' لیکن جتنی بھی تھی تسکین بھری تھی.....

سالار نے سامنے پڑی اسکریپ بک کو سرسری نظر سے دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اٹھا کر الٹا پلٹا پھر واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جیسے شوق ہیں تمہارے بیٹے کے۔" وہ مسکرا دی۔ وہ دونوں اس کے پاس پینٹ ہاؤس میں پہلی بار آئے تھے۔

"اس سال ریٹائر ہونے کا سوچ رہا ہوں۔" چائے کا ایک سپ لیتے ہوئے سالار نے امامہ سے کہا۔

"کئی سالوں سے سن رہی ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔ وہ دھیرے سے ہنسا۔

"نہیں' اب تم آ گئی ہو امریکہ۔ تو اب ریٹائر ہو سکتا ہوں۔ پہلے تو تنہائی کی وجہ سے کام کرنا میری مجبوری تھی۔" وہ اسے چھیڑ کر رہا تھا۔

"بیس سال کی ہوتی تو تمہاری اس بات پر خوش ہوتی۔" امامہ نے بے ساختہ کہا۔

"خیر بیس سال کی عمر میں میرے اس جملے پر تو تم کبھی خوش نہیں ہوتیں۔" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ دونوں بیک وقت ہنسے۔

"یہ ویسا ہی گھر ہے جیسا ایک بار تم نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس جھیل کے کنارے؟" سالار نے ایک دم آسمان کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ بھی سر اٹھا کر شیشے سے نظر آتے آسمان کو دیکھنے لگی۔

"نہیں' ویسا گھر نہیں ہے۔" امامہ نے ایک لمحے کے بعد کہا۔ سکندر عثمان کی موت کے بعد امامہ نے ایک بار پھر وہی جھیل کنارے ایک گھر دیکھا تھا۔ جو وہ اپنی زندگی کے کئی سالوں میں بار بار دیکھتی رہی تھی۔ مگر اس بار وہ خواب اس نے بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا۔

"وہ گھر ایسا نہیں تھا۔" وہ اس پینٹ ہاؤس کو گردن گھما کر دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ "وہ آسمان ایسا نہیں تھا۔ نہ وہ پرندے ایسے تھے نہ وہ شیشہ ایسا۔" کاؤچ پر اس کے برابر بیٹھے چائے کے دو مگ ہاتھ میں لیے وہ بولی۔

"وہ گھر دنیا میں کبھی کہیں نہیں دیکھا میں نے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "اس گھر کی کوئی چیز دنیا بھر میں پھرنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آئی مجھے۔۔۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے وہ گھر جنت میں ملے گا ہمیں۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ بھی چونکے بغیر خاموش ہی رہا تھا۔

"تم نے کچھ نہیں کہا۔" امامہ نے اس کی خاموشی کو کریدا۔ اس نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے امامہ کو دیکھا اور بڑبڑایا۔

"آمین۔" وہ چپ رہی' پھر ہنس پڑی' وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ مختصر مگر اگلے کو لاجواب کر دینے والی باتیں کہہ دینے والا۔

"اگر وہ جنت ہے تو پھر میں تم سے پہلے وہاں جاؤں گا۔" وہ امامہ سے کہہ رہا تھا۔ "تمہیں یاد ہے نا میں وہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"ضروری نہیں۔" لمحہ بھر کے لیے وہ چائے پینا بھولی۔ "خوابوں میں سب کچھ سچ نہیں ہوتا۔" اس نے بے اختیار کہا تھا۔ آج بھی بچھڑ جانے کا خیال اسے بے کل کر رہا تھا۔

"اگر وہ واقعی جنت ہے تو کیا تم چاہتی ہو' وہ خواب سچ ہوتا ہو؟" وہ عجیب انداز میں مسکرایا تھا۔ اک بار پھر

لاجواب کر دینے والے جملے کے ساتھ۔

"بس اتنا کہ تم وہاں پہلے انتظار میں مت کھڑے ہو۔ دونوں اکٹھے بھی تو جا سکتے ہیں۔" امامہ نے چائے کا مگ خالی کر کے سامنے پڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اب سالار کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"اب بھی کھونا؟" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"آمین..."

وہ ہنس پڑا۔ "آمین۔"

☆ ☆ ☆

ٹھیک نو بج کر پندرہ پر لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور دو سیکیورٹی گارڈز تیز رفتار قدموں سے باہر نکلے تھے اور ان دونوں کے بالکل پیچھے چند قدموں کے فاصلے پر وہ نکلا تھا۔ اس پورے کوریڈور میں یک دم ہلچل مچ گئی تھی۔ وہاں پہلے سے کھڑے سیکیورٹی آفیشل اور پروٹوکول کے اہلکار یک دم الرٹ ہو گئے تھے۔

"وہ" بے حد تیز قدموں سے ان دو سیکیورٹی گارڈز کے عقب میں چل رہا تھا اور اس کے بالکل پیچھے اس کے اپنے عملے کے چند افراد بے حد تیز قدموں سے اس سے قدم سے قدم ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ایک' دو' تین' چار' پانچ..." زیر لب گنتی کرتے ہوئے اس ٹارگٹ کلر نے "ایک" کا لفظ زبان سے ادا کرتے ہی اپنی رینج میں آنے والے اپنے ٹارگٹ پر فائر کر دیا تھا۔ اس نے بینکوئٹ ہال کے شیشے کے پرخچے اڑتے دیکھے۔

"تم نے اس سے کیا کہا ہے کہ اس نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی؟" ہشام سے ملاقات کے کئی دن بعد تک بھی اس ملاقات کے حوالے سے کوئی تازہ خبر نہ ملنے اور ہشام کی طرف سے ہو جانے والی پُراسرار خاموشی نے رئیسہ کو فکر مند کیا' اور وہ حمین سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"اس نے تمہارا پیچھا چھوڑ دیا۔ یہ تو اچھا ہے' تم یہی تو چاہتی تھیں نا۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

رئیسہ کو جواب نہیں سوجھا۔ وہ اس کی یونی ورسٹی آیا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے' مگر تم نے اس سے کیا کہا؟" رئیسہ نے کچھ بجھے ہوئے انداز میں حمین سے کہا تھا۔ وہ اس کے لیے برگر لایا تھا اور اپنا راستے میں ہی کھاتا آیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف ایک ٹکڑا رہ گیا تھا جسے وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے نگل رہا تھا۔ رئیسہ نے اپنا برگر نکال کر کھانا شروع کر دیا' اسے پتا تھا وہ اپنا ختم کرنے کے بعد اس کا برگر بھی کھانا شروع کر دیتا۔

"میں نے اس سے کہا' اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بادشاہت چھوڑ دیتا۔" اس نے آخری ٹکڑا نگلتے ہوئے کہا اور رئیسہ کی بھوک مر گئی تھی۔ کیا الٹا مشورہ تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

"لیکن میں نے اس سے صرف یہ نہیں کہا تھا۔" حمین اب اپنی انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ پھر اس نے رئیسہ سے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تمہاری بھوک تو مر گئی ہوگی' میری ابھی ہے۔ تم نے نہیں کھانا تو میں یہ باقی بھی کھالوں۔"

رئیسہ نے خاموشی سے اسے برگر تھما دیا۔ اس کی بھوک واقعی مر گئی تھی۔

"میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ ولی عہد کے لیے مناسب امیدوار ہے ہی نہیں۔ نہ اہلیت رکھتا ہے' نہ صلاحیت... اور یہ شادی ہو یا نہ ہو۔ جلد یا بدیر وہ ویسے بھی ولی عہد کے عہدے سے معزول کر دیا جائے گا۔ (اس لیے اس کے پاس دو راستے ہیں) یا تو اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرے اور ولی عہد کا عہدہ ابھی چھوڑ دے یا پھر

بادشاہت کے خواب دیکھتے رہے میں محبت بھی گنوائے اور تخت بھی۔" حمین نے بڑے اطمینان سے اسے گفتگو کا باقی حصہ سنایا تھا۔
"تم نے یہ سب کہا اس سے اس طرح۔" رئیسہ کو شدید صدمہ ہوا۔
"نہیں ایسے نہیں کہا، تمہیں تو میں مہذب انداز سے بتا رہا ہوں، اسے تو میں نے صاف صاف کہا کہ زیادہ سے زیادہ تین مہینے ہیں اور اس کے پاس۔۔۔ اگر تین مہینے میں وہ معزول نہ ہوا تو پھر رئیسہ سے دوسری شادی کر لینا۔"
وہ دانت پر دانت رکھے حمین سکندر کو صرف دیکھ کر ہی رہ گئی۔ اس "گفتگو" کے بعد اگر ہشام بن صباح نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا تو کوئی بھی خوددار شخص یہ ہی کرتا۔
"صباح بن جراح کے خلاف شاہی خاندان کے اندر شدید لابنگ ہو رہی ہے اور صباح بن جراح اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے پرانے امیر کی فیملی میں شادی کروانا چاہتا ہے ہشام کی۔ اور یہ ہو بھی گئی تب بھی وہ بہت دیر تخت پر نہیں رہ سکتا، اس کے حریف بہت طاقت ور لوگ ہیں اور صباح سے زیادہ بہتر حکمران ہو سکتے ہیں۔ اگر صباح ہٹ جاتا ہے تو پھر ہشام کو کون رہنے دے گا وہاں۔ میں نے ہشام کو یہ سب نہیں بتایا، تمہیں بتا رہا ہوں۔" اس نے برگر ختم کرتے ہوئے ہاتھ جھاڑے اور رئیسہ سے کہا۔
"تم فائنانس کر رہے ہو اس کے حریفوں کو؟" اسے رئیسہ سے جس آخری سوال کی توقع تھی وہ یہ ہی تھا۔
دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے، پھر حمین نے کہا۔
"میں صرف "بزنس" کر رہا ہوں۔ امریکہ میں صباح کے ساتھ۔۔۔ بحرین میں اس کے مخالفین کے ساتھ۔" اس نے بالآخر کہا۔ وہ گول مول اعتراف تھا۔
"کیوں کر رہے ہو؟" رئیسہ نے جواباً اس سے زیادہ تیکھے انداز میں اس سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔
"اپنی فیملی کے لیے۔" رئیسہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔
"مجھے خیرات میں ملی ہوئی محبت نہیں چاہیے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"وہ تمہارے لیے میرے اندازے سے زیادہ مخلص ہے۔ نہ ہوتا تو میں تمہیں بتا دیتا۔ وہ تمہارے لیے بادشاہت چھوڑ دے گا۔" حمین نے دوٹوک انداز میں اس سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنی ٹیلی اسکوپک رائفل سے اس ٹارگٹ کلر کو ٹریگر دباتے دیکھا۔ بے حد سکون اور اطمینان کے عالم میں، اس نے اس کی ہلکی سی مسکراہٹ بھی دیکھی تھی۔ پھر اس نے اس ٹارگٹ کلر کو بے حد مطمئن انداز میں سر اٹھاتے اور ٹیلی اسکوپک رائفل سے آنکھ ہٹاتے دیکھا اور اس وقت اس نے اسے شوٹ کیا۔ ایک مدھم ٹک کی آواز کے ساتھ اس نے کھڑکی سے اس کے بھیجے کو اڑتے دیکھا اور اپنے کمرے کے باہر بھاگتے قدموں کا شور۔۔۔ اس کا مشن پورا ہو چکا تھا، اب اسے یہاں سے فرار کرانے والے اس کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

عنایہ نے اپنے اسپتال کی پارکنگ میں داخل ہوتے ہوئے عبداللہ کی کال اپنے فون پر دیکھی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ الجھی، پھر اس نے اس کی کال ریسیو کی۔
"مل سکتے ہیں؟" اس نے سلام دعا کے بعد پہلا جملہ کہا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہی۔
"تم یہاں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری گاڑی کے پیچھے ہی ہے میری گاڑی۔" عنایہ نے بے اختیار بیک ویو مرر سے عقب میں عبداللہ کی گاڑی کو دیکھا جو اسے لائٹ سے اشارہ کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے وہ اس کی گاڑی میں آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھول کے ساتھ دو شاخیں تھیں۔ عنایہ نے کچھ کہے بغیر اسے دیکھا' پھر وہ تھام لیں۔

وہ فون پر پہلے ہی احسن اور عائشہ کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کے بارے میں اسے بتا چکا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" عنایہ نے جواباً" کہا۔

"میں نے اسپتال میں ڈاکٹر احسن کی امامت میں نماز پڑھنا چھوڑ دی۔"

عنایہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں نے اسے بتا دیا کہ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والا شخص امامت کا اہل نہیں' اسے عائشہ کے خلاف سارے الزامات واپس لینے ہوں گے' اگر وہ دوبارہ امامت کروانا چاہتا ہے تو۔" عبداللہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"اوہ تو اس لیے اس نے کیس واپس لیا ہے۔" عنایہ نے بے اختیار کہا۔

عبداللہ چونکا۔ "اس نے کیس واپس لے لیا؟"

"ہاں۔ جبریل نے بتایا مجھے۔ اس نے ایک معذرت کا خط بھی لکھا ہے عائشہ کے نام۔" عنایہ نے مزید بتایا۔

"یہ سب بے کار ہے اب' وہ بہت زیادہ نقصان کر چکا ہے۔"

"عائشہ کا؟"

"نہیں اپنا۔" عبداللہ کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"اچھے انسان ریکور کر جاتے ہیں ہر نقصان سے' کیونکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے' برے نہیں کر سکتے۔" عبداللہ کہہ رہا تھا۔

"وہ بہت برا جھوٹا ہے۔"

"وہ اپنے پیرنٹس کے ساتھ بابا سے ملنے بھی آئے تھے' جبریل کی شکایت کرنے۔" عنایہ کہہ رہی تھی۔ "بابا نے اس کے باپ سے کہا کہ وہ دیکھے اس کی منافقت اور تنگ نظری نے اس کے اکلوتے بیٹے کو کیا بنا دیا ہے۔"

"وہ شرمندہ ہوئے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"پتا نہیں' خاموش ہو گئے تھے۔ البتہ احسن سعد کی ماں رونے لگی تھی' پتا نہیں کیوں' پھر وہ چلے گئے۔" عنایہ نے کہا۔

"تم نے مجھے معاف کر دیا؟" عبداللہ نے یک دم پوچھا۔

وہ مسکرا دی۔ "ہاں۔۔۔ ایسی کوئی بڑی غلطی تو نہیں تھی تمہاری کہ معاف ہی نہ کرتی۔"

عبداللہ نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بے اختیار ہنسی۔

"اب سب کچھ زبان سے کہنا سیکھو۔ سب کچھ لکھ لکھ کے کیوں بتاتے ہو۔" وہ کارڈ کھولتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی' پھر وہ بات کرتے کرتے ٹھٹک گئی۔ ایک ہاتھ سے بنے ہوئے کارڈ پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

"تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

عنایہ نے اپنی شرٹ کی جیب میں لگے بال پوائنٹ کو نکال کر اس تحریر کے نیچے لکھا۔ "ہاں۔"

عبداللہ مسکرایا اور اس نے اس کا بال پوائنٹ لیتے ہوئے لکھا۔ "کب؟"

عنایہ نے لکھا۔ "پھولوں کے موسم میں۔"
"بہار؟" عبداللہ کا سوال تھا۔
جواب میں عنایہ نے لکھا۔ "ہاں۔"
عبداللہ نے کارڈ پر ایک دل بنایا' عنایہ نے ایک اور۔۔۔ عبداللہ نے مسکراہٹ کا علامتی نشان بنایا۔ عنایہ نے ایک اور۔۔۔

کارڈ لکیروں' حرفوں' ہندسوں' جذبوں سے بھرتا جارہا تھا اور ہر شے صرف محبت کی ترجمان تھی جو اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں سے ایک ہے اور جسے پانے والے خوش نصیب۔۔۔ وہ دونوں خوش نصیب تھے جو اس کارڈ کو عہد اور تجدید عہد سے بھر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

لفٹ کا دروازہ کھلا۔ سالار نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اس کے دو سیکیورٹی گارڈز اس سے پہلے لفٹ سے نکل گئے تھے۔ اس کا باقی کا عملہ اس کے لفٹ سے نکلنے کے بعد پیچھے لپکا تھا۔ کوریڈور میں تیز قدموں سے چلتے وہ استقبال کرنے والے آفیشل سے ملا تھا۔ اس نے گھڑی ایک بار پھر دیکھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ وقت پر پہنچا تھا۔ چند سیکنڈز کے بعد وہ بینکویٹ ہال میں داخل ہو جاتا۔ وہاں جو ہونے والا تھا' وہ اس سے بے خبر تھا۔ بے خبری زندگی میں ہر وقت نعمت نہیں ہوتی۔

ٹی وی پر چلتی اس خبر کو دیکھتے ہوئے سالار گنگ تھا۔ آخری چیز جو وہ اپنی زندگی اور کیریئر کے اس اسٹیج پر ہونے کی توقع کر سکتا تھا' وہ یہ تھی۔ رحم کھا کر گود لی گئی بچی کو اس کے گناہ کے طور پر پوری دنیا میں دکھایا جارہا تھا اور یہ سب کہنے والا اس بچی کا اپنا باپ تھا۔ جس کی بیوی کی سالار نے کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ افیئر اور ناجائز اولاد تو دور کی بات تھی۔ وہ طاقت کا کھیل تھا۔ جنگ تھی اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ سازش کی جارہی تھی نیروبی میں ہونے والے ٹی اے آئی اور ایس آئی ایف کے اس اشتراک کو ہونے سے پہلے توڑنے کی کوشش کی جارہی تھی' بے کار تھا۔

وہ اس وقت نیویارک ایئرپورٹ پر ایک فلائٹ لینے کے لیے موجود تھا جب پہلی بار وہ خبر بریک ہوئی تھی اور اس نے بزنس کلاس کے ڈیپارچر لاؤنج میں دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ موجود اس کے اسٹاف نے ایک کے بعد ایک نیوز چینلز کی اپ ڈیٹ کو اس کے ساتھ شیئر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سالار سکندر نے وہاں بیٹھے سب سے پہلی کال امامہ کو کی تھی۔ اور امامہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس سے کہا تھا۔

"مجھے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں' نہ مجھے' نہ اپنے بچوں کو۔۔۔"
"رئیسہ سے بات کرو۔ مجھے اپنے سے زیادہ تکلیف اس بات کی ہے کہ وہ اس کی تصویریں چلا رہے ہیں۔"
اس نے امامہ سے کہا تھا۔ وہ اپ سیٹ تھا۔ اس کا اندازہ امامہ کو اس کی آواز سے بھی ہو رہا تھا۔
"یہ وقت بھی گزر جائے گا سالار۔" امامہ نے اس سے کہا تھا' تسلی دینے والے انداز میں۔ "تم نے اس سے زیادہ برا وقت دیکھا ہے۔"

سالار نے سر ہلایا تھا' ممنونیت کے عجیب سے احساس کے ساتھ۔ گھر میں بیٹھی وہ عورت ان سب کے لیے عجیب طاقت تھی۔ عجیب طرح سے حوصلہ دیے رکھتی تھی ان کو۔ عجیب طریقے سے ٹوٹنے سے بچاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ یہاں کسی جذباتی ملاقات کے لیے نہیں آئی تھی۔ سوال و جواب کے کسی لمبے چوڑے سیشن کے لیے بھی

نہیں۔ لعنت وملامت کے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی نہیں۔ وہ یہاں کسی کا ضمیر جھنجوڑنے آئی تھی' نہ ہی کسی سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے۔ نہ ہی وہ کسی کو یہ بتانے آئی تھی کہ وہ اذیت کے ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑی ہے نہ ہی وہ اپنے باپ کو گریبان سے پکڑنا چاہتی تھی۔ نہ اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی زندگی تباہ کردی تھی۔ اس کے صحت مند ذہن اور جسم کو ہمیشہ کے لیے مفلوج کردیا تھا۔

وہ یہ سب کچھ کہتی۔ یہ سب کچھ کرتی' اگر اسے یقین ہوتا کہ یہ سب کرنے کے بعد اسے سکون مل جائے گا۔ اس کا باپ احساس جرم یا پچھتاوے جیسی کوئی چیز پالنے لگے گا۔

پچھلے کئی ہفتے سے وہ آبلہ پا تھی۔ وہ راتوں کو سکون آور گولیاں لیے بغیر سو نہیں پارہی تھی اور اس سے بڑھ کر تکلیف وہ چیز یہ تھی کہ وہ سکون آور ادویات لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنا چاہتی تھی' اس بھیانک خواب کے بارے میں' جس میں وہ چند ہفتے پہلے داخل ہوئی تھی اور جس سے اب وہ ساری زندگی نہیں نکل سکتی تھی۔

وہ یہاں آنے سے پہلے پچھلی پوری رات روتی رہی تھی۔ یہ بے بسی کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ اذیت کی وجہ سے بھی نہیں تھا۔ یہ اس غصے کی وجہ سے تھا جو وہ اپنے باپ کے لیے اپنے دل میں اتنے دنوں سے محسوس کررہی تھی۔ ایک آتش فشاں تھا یا جیسے کوئی الاؤ' جو اس کو اندر سے سلگا رہا تھا' اندر سے جلا رہا تھا۔

کسی سے پوچھے' کسی کو بتائے بغیر یوں اٹھ کر وہاں آجانے کا فیصلہ جذباتی تھا' احمقانہ تھا اور غلط تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک جذباتی' احمقانہ اور غلط فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اختتام چاہتی تھی وہ اپنی زندگی کے اس باب کا' جس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس کی موجودگی کا انکشاف اس کے لیے دل دہلا دینے والا تھا۔

اس کا ایک ماضی تھا۔ وہ جانتی تھی لیکن اسے کبھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا "ماضی" بھی ہوسکتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر تھا جب وہ "منقوش" تھی اپنی زندگی میں... جب وہ خود کو باسعادت سمجھتی تھی... اور "مقرب" سے "ملعون" ہونے کا فاصلہ اس نے چند سیکنڈز میں طے کیا تھا۔ چند سیکنڈز شاید زیادہ وقت تھا۔ شاید اس سے بھی بہت کم وقت تھا جس میں وہ احساس کمتری' احساس محرومی' احساس ندامت اور ذلت وبدنامی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوئی تھی۔ اور یہاں وہ اس ڈھیر کو دوبارہ وہی شکل دینے آئی تھی۔ اس بوجھ کو اس شخص کے سامنے اتار پھینکنے آئی تھی' جس نے وہ بوجھ اس پر لادا تھا۔

کسی کو اس وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں تھی۔ کسی کو پتا ہوتا تو وہ وہاں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا سیل فون پچھلے کئی گھنٹوں سے آف تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے خود کو اس دنیا سے دور لے آئی تھی' جس کا وہ حصہ تھی۔ اس دنیا کا حصہ' یا پھر اس دنیا کا حصہ جس میں وہ اس وقت موجود تھی... ؟ یا پھر اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی؟ وہ کہیں کی نہیں تھی اور جہاں کی تھی' جس سے تعلق رکھتی تھی' اس کو اپنا نہیں سکتی تھی۔

انتظار طویل ہوگیا تھا... انتظار ہمیشہ طویل ہوتا ہے کسی بھی چیز کا انتظار ہمیشہ طویل ہوتا ہے... چاہے آنے والی شے پاؤں کی زنجیر بننے والی ہو یا گلے کا ہار' سر کا تاج بن کر بجنا ہو اس نے یا پاؤں کی جوتی۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہی لگتا ہے۔

رئیسہ سالار صرف ایک سوال کا جواب چاہتی تھی اپنے باپ سے... صرف ایک چھوٹے سے سوال کا... اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا تھا؟ اور اگر انہیں مار ڈالا تھا اور اسے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ یا اس کی زندگی اس کے باپ کی چوک کا نتیجہ تھی؟ سوالات کا ایک انبار تھا جو وہ اس سے کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ویٹنگ ایریا میں بیٹھے اپنی سلگتی آنکھوں کو ایک بار پھر مسلا' وہ پتا نہیں کتنی راتوں سے سو نہیں پائی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 78/5.L تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

تھی۔ ایک بھیانک خواب تھا پچھلے دو ہفتے جس میں اسے پہلی بار میڈیا سے پتا چلا تھا کہ اس کا باپ کون تھا' وہ کون تھی کہاں سے تھی' وہ سالار سکندر اور امامہ ہاشم کی بیٹی نہیں تھی' وہ یہ جانتی تھی لیکن اسے ہمیشہ یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سالار کے ایک دوست کی بیٹی تھی جو ایک حادثے میں اپنی بیوی سمیت ہلاک ہو گیا تھا اور پھر سالار نے اسے اڈاپٹ کر لیا۔ مگر اب اس کی زندگی میں اچانک غلام فرید آ گیا تھا جسے ٹی وی دیکھتے ہوئے بھی اس کا ذہن اس سے کسی بھی رشتہ سے انکاری تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

وہ سب اس بھونچال میں اس کے پاس آ گئے تھے' حمین' جبریل' عنایہ' امامہ' سالار اور ہشام بھی۔ اسے یہ بتانے کہ انہیں فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون تھی کیا تھی؟ وہ ان کے لیے رئیسہ تھی۔۔۔ وہی پہلے والی رئیسہ۔۔۔ وہ ان سب کی شکر گزار تھی' ممنون تھی' احسان مند تھی اور اس نے ان سب کو یہ احساس دلایا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک تھی' مگر وہ ٹھیک نہیں تھی اندر ہونے والی توڑ پھوڑ بے حد تھی۔ اس لیے بھی کہ وہ اس خاندان کی ذلت اور رسوائی کا سبب بن رہی تھی جنہوں نے اس پر رحم کھاتے ہوئے اس کو پالا تھا۔ اسے ایک لحظہ بھر کے لیے بھی سالار سکندر پر اپنے باپ کے لگائے ہوئے الزامات کے جھوٹا ہونے میں کوئی شک نہیں ہوا تھا اور اس کے یہاں آنے کی وجہ بھی وہی الزامات بنے تھے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر صرف اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے یہاں تک آنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اپنے خاندان کو بے خبر رکھتے ہوئے۔

غلام فرید جیل کے ایک اہلکار کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تھا' جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ جیل اہلکار وہاں سے چلا گیا۔ غلام فرید کچھ نروس انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کئی لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"آپ نے مجھے پہچانا؟"

"نہیں۔" ایک لحظہ کی تاخیر کے بعد غلام فرید نے کہا۔

"میں آپ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں۔۔۔ جسے مارنا بھول گئے تھے آپ۔" وہ طنز نہیں تعارف تھا اور اس کے علاوہ اپنا تعارف کسی اور طرح سے نہیں کروا سکتی تھی وہ۔

"چنی۔" بہت دیر غلام فرید اس کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد بے ساختہ بڑبڑایا تھا۔

رئیسہ نے ہونٹ بھینچ لیے' اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ اس کے باپ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ اب اس کا وہ نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے لکھوایا تھا پر یاد نہیں کر سکا۔ اس نے چنی کو ایک بار پھر دیکھا۔۔۔ بغور دیکھا۔۔۔ وہ میم صاحب لگ رہی تھی۔ اپنی سانولی رنگت کے باوجود۔۔۔ اس کی بیٹی تو نہیں لگ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ اس کی آخری اولاد کی پرورش سالار سکندر نے کی تھی۔۔۔ یہ اسے ان لوگوں نے بتایا تھا جو بار بار اسے بہت کچھ یاد کروانے اور بار بار دہرانے کے لیے آتے تھے۔ اسے چنی کو دیکھ کر اپنی بیوی یاد آئی تھی۔ نیلی جینز اور سفید شرٹ میں بال ایک جوڑے کی شکل میں لپیٹے' گلاسز آنکھوں پر لگائے' گلے میں۔۔۔ ایک باریک چین میں لٹکتا اللہ کے نام کا لاکٹ پہنے' کلائی میں ایک قیمتی گھڑی پہنے' اس کے سامنے ایک کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے چنی نے اسے اس کی بیوی کی' جو چنی کی ماں تھی' کی یاد دلائی تھی۔۔۔ اس کے نین نقش ویسے ہی تھے۔۔۔ سارے حلیے میں صرف نین نقش ہی تھے جو وہ پہچان پایا تھا' ورنہ وہ بیمار رہنے والی لاغر' کمزور اور ہر وقت روتی ہوئی چنی ایسے کیسے بن گئی تھی کہ اس کے سامنے بیٹھے غلام فرید کو اس کے سامنے اپنا وجود کمتر لگنے لگا تھا۔ پر پتا نہیں اپنی ایک بچ جانے والی اولاد کو ایسے اچھے حلیے میں دیکھتے ہوئے غلام فرید کو ایک عجیب سی خوشی بھی ہوئی تھی۔ وہ اس لمحے بھول گیا تھا کہ وہ اپنی اس اولاد پر ناجائز اولاد کا لیبل لگا رہا تھا۔ برسوں بعد اس نے کوئی "اپنا" دیکھا تھا اور اپنا دیکھ کر وہ پھر بھول گیا تھا۔

ایک لفافے میں موجود کچھ کھانے پینے کی چیزیں اس نے باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ میں آپ کے لیے لائی تھی۔" غلام فرید نے عجیب حیرت سے اس لفافے کو دیکھا اور پھر کانپتے ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ وہ سارے سوالات جو وہ غلام فرید سے کرنا چاہتی تھی۔ ایک دم توڑتے چلے گئے تھے۔ وہ نحیف ونزار شخص جو اس کے سامنے اپنی زندگی کی آخری سیڑھی پر کھڑا تھا' اس سے وہ سوال جواب کرنا بے کار تھا۔ اسے اس پر ترس آگیا تھا' وہ اسے اب کسی کٹہرے میں کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
غلام فرید نے گلاسز اتار کر اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی اس لڑکی کو دیکھا جس نے کچھ دیر پہلے اس سے اپنا تعارف کرایا تھا۔
"تم پڑھتی ہو؟" اس نے پوچھا' عجیب سے انداز میں۔
رئیسہ نے سر اٹھا کر غلام فرید کا چہرہ دیکھا' پھر سر ہلایا۔
غلام فرید کا چہرہ چمکا۔ "زیادہ پڑھنا۔"
رئیسہ کی آنکھوں میں نمی پھر اتری۔
"میں اور تمہاری ماں سوچتے تھے کبھی پڑھائیں گے بچوں کو زیادہ۔ اور..." غلام فرید نے یادوں کے کسی دھند لکے کو لفظوں میں بدلا پھر چپ ہو گیا۔
"صاحب کو میرا شکریہ کہنا اور دوبارہ جیل مت آنا۔" غلام فرید نے چند لمحے بعد کہا اور رئیسہ کی آنکھوں کی نمی اب اس کے گالوں پر پھیلنے لگی تھی۔ غلام فرید کے لیے سالار سکندر ایک بار پھر "صاحب" ہو گیا تھا۔ اپنی اولاد کو ایسی اچھی حالت میں دیکھ کر رئیسہ کو لگا تھا' اس کا باپ شرمندہ بھی تھا۔
وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے رئیسہ کے سر پر ہاتھ پھیرا' وہ اسے گلے لگاتے ہوئے جھجکا تھا..... شاید لگانا چاہتا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر خود غلام فرید کے گلے لگ گئی پھر وہ اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا..... اپنے باقی بچوں اور بیوی کے ناموں کو پکارتے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑا ہلکا وجود لیے امریکہ واپس آئی تھی اور امریکہ پہنچ کر اس نے اپنا نمبر آن کیا تھا اور اس کا فون یک دم سارے رشتوں سے جاگنے لگا تھا۔ پیغامات کا انبار تھا اس کی فیملی کی طرف سے' ایئرپورٹ سے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ ان سب پیغامات کو پڑھتی گئی تھی۔ نم آنکھوں کے ساتھ..... ایک کے بعد ایک پیغام۔
اور پھر ایک آخری پیغام ہشام کی طرف سے..... بادشاہ نے تخت چھوڑ دیا تھا... کیوں؟..... اس نے یہ نہیں لکھا تھا۔ اسے حمین یاد آیا تھا اس کے لفظ۔
گھر کے باہر سالار کے ساتھ ساتھ حمین کی بھی گاڑی تھی۔ رئیسہ نے بیل بجائی... کچھ دیر بعد یہ سالار سکندر تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔
دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر سالار سے لپٹ گئی تھی' بالکل اسی طرح جب وہ ڈیڑھ سال کی عمر میں اس سے لپٹی تھی اور پھر الگ نہیں ہوئی تھی۔ سالار اسے بچوں کی طرح تھپکتا رہا۔ وہ امریکہ واپس آنے سے پہلے پاکستان میں ایک پریس کانفرنس میں اپنی ولدیت کا ٹیسٹ اور غلام فرید کا بیان میڈیا کے ساتھ شیئر کر کے آئی تھی اور ایک وکیل کے ذریعے اپنے خاندان کی واحد وارث ہونے کے طور پر اپنے باپ کو معاف کرنے کا حلف نامہ بھی۔ وہ طوفان جو سالار سکندر اور اس کے خاندان کو ڈبونے کے لیے آیا تھا' وہ اس بار رئیسہ نے روکا تھا۔

اور وہاں اب سالار سکندر کے سینے سے لگی بچوں کی طرح روتی رئیسہ کو دیکھتے ہوئے اسے کوئی دلیر نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بھی سالار سکندر کا حصہ تھی۔ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود رحم اور مہربانی کے مضبوط ترین رشتوں سے ان کے ساتھ جوڑی گئی۔

اپنے نام کے ساتھ سالار کا نام استعمال کرتے ہوئے بھی وہ اپنے باپ کے نام سے واقف تھی مگر وہ باپ جیل میں سزائے موت کا ایک قیدی تھا' سالار کا دوست نہیں' وہ اس سے واقف نہیں تھی۔

اور اس ''واقفیت'' کے بعد اسے اس خاندان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا جو اس کا تعارف تھا۔

''میں نے تمہیں رونا تو کبھی نہیں سکھایا رئیسہ۔ نہ ہی رونے کے لیے تمہاری پرورش کی ہے۔'' سالار نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنے آنسوؤں پر قابو پا رہی تھی اور اس نے سالار کے عقب میں کھلے دروازے سے حمین اور امامہ' دونوں کو دیکھا تھا۔

''آخری بار روئی ہوں بابا۔'' اس نے گیلی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہنے کی کوشش کی اور اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

''تم ہماری فیملی کا حصہ ہو۔'' سالار نے اسے جتانے والے انداز میں کہا۔ ''اور تم سمجھ دار اور بہت بہادر ہو۔ ہم نے یہ ہی سکھایا ہے تمہیں۔''

وہ جیسے اسے یاد دہانی کرا رہا تھا۔ وہ سر ہلانے لگی تھی۔ زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع آتا جب وہ انہیں اپنی احسان مندی دکھا سکتی تو انہیں بتاتی کہ اپنے حقیقی باپ سے ملنے کے بعد اسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ بے حد خوش قسمت تھی۔ واقعی خوش قسمت تھی کہ وہ سالار سکندر کے خاندان کا حصہ بنی تھی' اسے وہ اپنا سمجھتے تھے۔

☼ ☼ ☼

نو بج کر پندرہ منٹ پر بالآخر لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور حمین سکندر اپنے دو ذاتی محافظوں کے پیچھے باہر نکلا تھا۔ اس کے پیچھے اس کے عملے کے باقی افراد تھے۔ کوریڈور میں پریس فوٹوگرافرز اور چینلز کے افراد بھی تھے جو ہر آنے والی اہم شخصیت کی کوریج کر رہے تھے۔ اس سے پانچ منٹ پہلے وہاں سے سالار سکندر گزر کر گیا تھا اور اب وہ وہاں آیا تھا۔۔۔ دونوں تقریب کے دو اہم ترین افراد تھے۔۔۔

بے حد تیز رفتاری سے قدم اٹھاتے ہوئے حمین سکندر کوریڈور میں اپنی آمد کی کوریج کرتے پریس فوٹوگرافرز پر نظر ڈالتے' اپنا استقبال کرتے حکام کے ساتھ بڑی تیزی سے بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے کی طرف جا رہا تھا' جب اسے یک دم اپنے عقب میں آتے اپنی ٹیم کے ایک ممبر سے کچھ پوچھنے کا خیال آیا۔ اپنے چیف فائنانس اسٹریٹجسٹ سے۔۔۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا' پلٹا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا' اس نے اپنی گردن کی پشت میں کوئی سلاخ گھستی محسوس کی۔ پھر شیشہ ٹوٹنے کی آوازیں اور پھر چیخوں کی اور پھر کوئی اسے زمین پر گراتا ہوا اس پر لیٹا تھا۔۔۔ پھر کوئی چیخا تھا۔

''سامنے والی بلڈنگ سے گولی چلائی گئی ہے۔''

اور اس وقت پہلی بار حمین کو احساس ہوا اس کی گردن کی پشت پر کیا ہوا ہے۔ تکلیف شدید تھی' ناقابل برداشت بھی۔ وہ حواس میں تھا۔ سب کچھ سن رہا تھا۔ اسے اب زمین پہ ہی گھسیٹتے اس کی سیکیورٹی ٹیم وہاں سے لفٹ کی طرف لے جا رہی تھی اور اس وقت حمین کو پہلی بار سالار سکندر کا خیال آیا تھا اور اس کا دل اور دماغ

☆ ☆ ☆

سالار سکندر نے بینکوئٹ ہال میں اسٹیج پر رکھی اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے' اپنی تقریر کے نوٹس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے کے بالمقابل شیشے ٹوٹنے کی آواز سنی تھی۔ اس نے بے یقینی سے بہت دور کھڑکی کے اس شیشے کی گرتی کرچیاں دیکھی تھیں۔ وہ ساؤنڈ پروف بلٹ پروف شیشے تھے۔ ٹوٹ کیسے رہے تھے؟ ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا تھا اور پھر اس نے ہال کے عقبی حصے اور باہر کوریڈور میں شور سنا تھا اور اس سے پہلے وہ کچھ سمجھ سکتا' اس سمیت اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو سیکیورٹی گارڈز کور کرتے ہوئے اسٹیج کے عقب میں کھینچتے ہوئے فرش پر لیٹنے کا کہہ رہے تھے۔ ہال میں اب شور تھا۔ گارڈز چلا چلا کر احکامات دے رہے تھے اور جس جس اہم شخصیت کے ساتھ جو بھی سیکیورٹی پر مامور تھے۔ وہ اسے محفوظ کرنے میں مصروف تھے۔ وہاں موجود ہر شخص خاص تھا۔۔۔ اہم۔۔۔ وہ دنیا کے کامیاب انسانوں کا مجمع تھا' جو اب زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

اور وہاں زمین پر اوندھے منہ لیٹے سالار کو حمین کا خیال آیا تھا اور اس کا دل کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔ ہال میں اس کے بعد حمین سکندر کو داخل ہونا تھا۔ اور وہ نہیں آیا تھا۔۔۔ تو کیا یہ حملہ اس پر۔۔۔ وہ سوچ نہیں سکا' وہ زمین سے اٹھ گیا' گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی' اس نے انہیں دھکا دیا اور چلا آیا۔

"دور ہٹو۔" وہ اس کے پیچھے لپکے تھے۔ وہ زمین پر لیٹے لوگوں کو پھلانگتا' کھڑے گارڈز سے ٹکراتا داخلی دروازے تک آگیا تھا جو اس وقت سیکیورٹی حکام سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس ہجوم میں بھی اس نے ریسپشن رز کے ساتھ سفید ماربل کے فرش پر خون کے نشانات دیکھے تھے جو پورے فرش پر لفٹ تک گئے تھے۔

"کس کو گولی لگی ہے؟" اس نے اپنے سرد ہوتے وجود کے ساتھ وہاں ایک سیکیورٹی آفیشل کا کندھا پکڑ کر پوچھا۔

"حمین سکندر۔" سالار کے قدموں سے جان نکل گئی تھی' وہ لڑکھڑایا تھا۔ ان دونوں سیکیورٹی گارڈز نے اسے سنبھالا۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" اس نے اس سیکیورٹی اہلکار سے دوبارہ پوچھا۔ جواب نہیں آیا۔

☆ ☆ ☆

امامہ اس ہوٹل کے ساتویں فلور پر سالار سکندر کے کمرے میں تھی۔ وہ ایک سوئٹ تھا اور ان کے برابر کے کمرے میں حمین رہ رہا تھا۔ امریکہ شفٹ ہوجانے کے بعد امامہ' سالار کے ہر سفر میں اس کے ساتھ جارہی تھی۔ اس سفر میں حمین بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ اسی کے ذاتی طیارے پر آئے تھے۔ وہ افریقہ دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے کے بعد آئی تھی اور اس بار وہ کانگو بھی جانا چاہتے تھے۔ اپنی پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے۔ ان تینوں نے کچھ دیر پہلے اکٹھے ہی کمرے میں ناشتا کیا تھا۔ اس کانفرنس کے بعد وہ سہ پہر کو کنشاسا جانے والے تھے اور امامہ اس وقت اپنی پیکنگ میں مصروف تھی۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے اس سوئٹ میں اپنے اور حمین کے بیڈ رزم کا درمیانی دروازہ کھول کر اس کا سامان بھی پیک کر آئی تھی۔ اپنے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس نے اپنے کمرے کے دروازے پر زوردار دستک سنی تھی۔ وہ بری طرح ہڑبڑائی' پھر اس نے جاکر دروازہ کھولا۔ پورا کوریڈور سیکیورٹی حکام سے بھرا ہوا تھا اور وہ تقریباً" ہر کمرے کے دروازے پر تھے۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔
"ہاں... کیوں؟" اس نے حیرانی سے کہا۔ وہ دونوں بڑی تہذیب سے اسے ہٹاتے ہوئے اندر چلے آئے تھے اور انہوں نے اندر آتے ہی کھڑکی کے کھلے ہوئے بلائنڈز بند کیے۔ پھر ان میں سے ایک حمین کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد لوٹا۔
"کیا بات ہے؟" امامہ اب شدید تشویش کا شکار ہوئی تھی۔
"ایک ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ آپ کمرے سے باہر مت نکلیں۔ اگر کچھ مسئلہ ہو تو ہمیں بتا دیں۔"
ان میں سے ایک اسے کہہ رہا تھا' دوسرا اس کا باتھ روم اور وارڈ روب برق رفتاری سے چیک کر آیا تھا۔ وہ جس تیز رفتاری سے آئے تھے' اسی تیز رفتاری سے باہر نکل گئے تھے۔
امامہ پر جیسے گھبراہٹ کا حملہ ہوا تھا۔ وہ سالار اور حمین کو اس وقت فون نہیں کر سکتی تھی' کیونکہ فون سروس اس وقت کام نہیں کر رہی تھی مگر اس نے ٹی وی آن کر لیا تھا' جہاں پر مقامی اور بین الاقوامی چینلز اس کانفرنس کی براہ راست کوریج کرنے میں مصروف تھے۔ اسکرین پر پہلی تصویر ابھرتے ہی امامہ کھڑی نہیں رہ سکی' وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹی وی کی اسکرین پر وہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی تھی اور بینکوئٹ ہال کے باہر ڈرون کیمروں کے ذریعے فضائی مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ اسکرین پر سرخی بار بار نمودار ہو رہی تھی۔ جو اس گلوبل کانفرنس پر ہونے والے حملے اور فائرنگ کی خبر بریکنگ نیوز کی طرح سے چلا رہے تھے۔ مگر وہ نیوز نہیں تھی جس نے امامہ کو بدحواس کیا تھا۔
وہ دوسرا ٹکر تھا جو بار بار آرہا تھا۔
"ٹی اے آئی کے سربراہ حمین سکندر اس حملے میں شدید زخمی۔"
امامہ کو لگا اسے سانس آنا بند ہو گیا ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی وہ اٹھ نہیں سکی' اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی' مگر وہ چیخ بھی نہیں سکی... افریقہ اس کے لیے منحوس تھا۔ اس نے سوچا تھا اور اپنے کمرے کے دروازے پر اس نے دھڑدھڑاہٹ سنی اور پھر اس نے حمین سکندر کے کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

سالار سکندر کو سیکیورٹی حکام روک نہیں پائے تھے۔ پکڑنے' سمجھانے' آگے جانے سے روکنے کی کوشش کے باوجود... وہ برق رفتاری سے ان چار لفٹس میں سے اس لفٹ کی طرف گیا تھا جس طرف خون کے وہ نشانات گئے تھے۔ سیکیورٹی حکام اب اسے عقب سے کور کر رہے تھے۔ وہ اسی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا' جہاں اب شیشہ نہیں تھا اور اس کے سامنے کی عمارت سے فائرنگ ہوئی تھی۔ سامنے والی عمارت کو اب گھیرے میں لیا جا رہا تھا اور جب تک وہاں سیکیورٹی کلیرنس نہیں ہو جاتی' وہ ہال سے کسی کو ایک بار پھر ان کھڑکیوں کے سامنے سے گزر کر لفٹس تک جانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ مگر سالار سکندر کو وہ کوشش کے باوجود نہیں روک سکے تھے۔
لفٹ کا دروازہ اب کھل گیا تھا اور اس کا فرش بھی خون آلود تھا۔ بہت زیادہ نہیں لیکن فرش یہ بتا رہا تھا کہ وہ جو بھی تھا' شدید زخمی تھا۔ لفٹ کے اندر پہنچنے کے بعد سالار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے بعد آگے کیا کرے۔ وہ اپنے بیٹے کے خون پر بھی قدم رکھنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سیکیورٹی حکام اس کے پیچھے اندر گھسے تھے اور انہوں نے دروازہ فوری طور پر بند کیا اور پھر جیسے سکون کا سانس لیا۔
"اسے کہاں لے کر گئے ہیں؟" سالار نے کھوکھلی آواز کے ساتھ پوچھا۔
"ہمیں نہیں پتا سر!" ان میں سے ایک نے جواب دیتے ہوئے ساتویں منزل کا بٹن دبایا۔

"مجھے حمین کے پاس جانا ہے۔" وہ چلا آیا تھا۔
وہ دونوں خاموش رہے۔ لفٹ برق رفتاری سے حرکت میں تھی۔

☆ ☆ ☆

حمین کے کمرے کے کھلے دروازے میں حمین کھڑا تھا۔ اس کی سفید شرٹ خون آلود تھی اور وہ سیاہ کوٹ بھی اس کے جسم پر نہیں تھا جو وہ پہن کر گیا تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ اسکرین پر ابھی بھی اس پر ہونے والے حملے کی تفصیلات چل رہی تھیں۔ اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ امامہ اٹھی پھر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس کی خون آلود شرٹ اس کی جان نکال رہی تھی اور اس کا اپنے پیروں پر کھڑا وجود اسے زندگی بخش رہا تھا۔
وہ ایک بار پھر اٹھی اور بھاگتے ہوئے اس نے جا کر حمین کو اپنے ساتھ لپٹایا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں ممی.... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔
"بابا کہاں ہیں؟" اس نے امامہ سے اگلا سوال کیا تھا اور امامہ کو پہلی بار سالار کا خیال آیا۔ تب ہی دروازہ دوبارہ دھڑ دھڑایا گیا اور وہ اپنے قدموں پر چلتا دروازے تک گیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے بالکل سامنے سالار سکندر کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے لیے باپ 'بیٹا ایک دوسرے کو دیکھ کر جامد ہوگئے تھے۔ پھر سالار آگے بڑھا اور شادیٔ مرگ کی سی کیفیت میں اس نے حمین کو لپٹایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار حمین سکندر نے سالار سکندر کی گرفت کو اتنا سخت پایا تھا کہ اسے لگا اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اسے اپنی گردن کی پشت سے بہتے خون سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اپنے گالوں کو نم کرتے سالار کے آنسوؤں سے۔
"سالار کے خاندان میں سے اس کا جانشین کون ہوگا۔" اس کی پشت سے رستا خون اس کا اعلان کر رہا تھا۔
"بابا! میں ٹھیک ہوں۔ آئیں 'دوبارہ چلتے ہیں کانفرنس ہال میں۔" سالار نے اپنے کانوں میں مستحکم آواز میں کہی ہوئی ایک سرگوشی سنی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ افریقہ کی تاریخ کا یادگار ترین دن تھا جب کئی سالوں بعد تاریخ ایک بار پھر دہرائی جا رہی تھی۔
بینکوئٹ ہال میں تمام وفود ایک بار پھر اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔ خوف و ہراس کی ایک عجیب سی فضا میں بے حد ناخوش گوار ہمکر کانفرنس جاری تھی۔ منسوخ نہیں ہوئی تھی۔ اس کھڑکی کا وہ شیشہ اسی طرح ٹوٹا ہوا تھا مگر اب سامنے والی بلڈنگ سیکیورٹی حکام کے حصار میں تھی۔ کانفرنس ایک گھنٹے کی تاخیر سے اب دوبارہ شروع ہونے جا رہی تھی۔
سالار سکندر اور حمین دونوں امامہ کے کمرے میں تھے۔ میڈیکل ٹیم حمین کو فرسٹ ایڈ دے چکی تھی اور فرسٹ ایڈ دینے کے دوران انہیں پتا چلا تھا کہ گولی اس کی گردن میں نہیں گھسی تھی۔ وہ اس کی گردن کی پشت پر رگڑ کھاتی اور جلد اور کچھ گوشت اڑاتے ہوئے گزر گئی تھی۔ اس کی گردن پر تین انچ لمبا اور آدھ انچ گہرا ایک زخم بناتے ہوئے۔ میڈیکل ٹیم نے اس کی بینڈیج کر دی تھی اور پین کلر لگا کر اس کے اس زخم کو کچھ دیر کے لیے سن کیا تھا' تاکہ وہ کانفرنس اٹینڈ کر سکے۔ اسے خون چڑھانا تھا لیکن وہ فوری طور پر اس کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اس کے لیے اہم ترین چیز اس کانفرنس ہال میں دوبارہ بیٹھنا تھا۔ ان لوگوں کو دکھانا تھا کہ وہ اسے گرا نہیں سکے۔ ڈرا بھی نہیں سکے۔
سالار سکندر اس سے پہلے کمرے سے نکلا تھا اور اب کپڑے تبدیل کرنے کے بعد حمین سکندر امامہ سے گلے

مل رہا تھا۔ امامہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سالار سکندر کا بیٹا تھا‘ اسے کون روک سکتا تھا۔ اس نے صرف اسے گلے لگایا تھا‘ ماتھا چوما اور دروازے پر رخصت کردیا تھا۔

اس لفٹ کا دروازہ دس بج کر چالیس منٹ پر ایک بار پھر کھلا تھا۔ اس بار حمین سکندر کے ساتھ سیکیورٹی کا کوئی اہلکار نہیں تھا۔ صرف اس کے اپنے اسٹاف کے لوگ تھے۔ اس کے لفٹ سے کوریڈور میں قدم رکھتے ہی وہاں تالیوں کا شور گونجنا شروع ہوا تھا۔ وہ پریس فوٹوگرافرز اور اس کوریڈور میں کھڑے سیکیورٹی اہلکار تھے جو اسے اس دلیری کی داد دے رہے تھے جو وہ دکھا رہا تھا۔ لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس نے ٹوٹے شیشے والی اس کھڑکی کو بھی دیکھا جو ہال کے داخلی دروازے کے بالکل سامنے ایک عجیب سا منظر پیش کررہی تھی۔ اگرچہ اس کے سامنے اب سیکیورٹی اہلکاروں کی ایک قطار تھی۔

تیز قدموں سے لمبے ڈگ بھرتا حمین سکندر جب ہال میں داخل ہوا تھا تو ہال میں تالیاں بجنی شروع ہوئی تھیں‘ پھر وہاں بیٹھے وفود اپنی اپنی سیٹوں سے کھڑے ہوگئے تھے۔

حمین سکندر مسکراتا‘ سر کے اشارے سے ان تالیوں کا جواب دیتا اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ کھڑا ہوتے شروع ہوئے تھے اور پھر حمین نے سالار سکندر کو کھڑا ہوتے دیکھا تھا۔ حمین چلتے چلتے رک گیا تھا۔ وہ اس کے باپ کی طرف سے اس کی تعظیم تھی جو اسے پہلی بار دی گئی تھی۔ ایک لمحہ ٹھٹکنے کے بعد حمین سکندر نے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کردیا تھا۔

دنیا بھر کے ٹی وی چینلز وہ مناظر دکھا رہے تھے۔ دلیری کا ایک مظاہرہ وہ تھا جو دنیا نے کئی سال پہلے اسی افریقہ میں سالار سکندر کے ہاتھوں دیکھا تھا‘ جرات کا ایک مظاہرہ یہ تھا جو آج اسی افریقہ میں وہ حمین سکندر کے ہاتھوں دیکھ رہے تھے۔

اسٹیج پر اب ٹی اے آئی اور ایس آئی ایف کے دونوں سربراہان مل رہے تھے اور اس میمورنڈم پر دستخط کررہے تھے جس کے لیے وہ وہاں آئے تھے اور پھر اس کے بعد حمین سکندر نے تقریر کی تھی۔ اس نے اسی آخری خطبے سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا جس کا حوالہ کئی سال پہلے اس کے باپ نے افریقہ کے اسٹیج پر دیا تھا۔

”بڑی بابرکت ہے وہ ذات‘ جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“ اس نے سورۃ ملک کی آیات سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

”وہ ذات جس نے پیدا کیا‘ موت اور زندگی کو تاکہ آزمائش کرے‘ تمہاری کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں... اور وہ زبردست ہے‘ بے انتہا اور معاف فرمانے والا بھی۔“

اس ہال میں ایسی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز آتی۔ ”بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کرنے پر قادر ہے۔ جو کن کہتا ہے تو چیزیں ہوجاتی ہیں۔ جو دشمنوں کی چالیں ان ہی پر الٹا دیتا ہے۔

”کئی سال پہلے ایس آئی ایف نے سود کے خلاف اپنی پہلی جدوجہد افریقہ سے شروع کی تھی‘ یہ وہ زمین تھی جس پر میرے باپ نے ایک سودی نظام کے آلۂ کار کے طور پر کام کرتے ہوئے سود کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سود کو جسے آخری خطبے میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا تھا اور اس آخری خطبے میں یہ صرف سود نہیں تھا جس کے خاتمے کا فیصلہ کیا تھا‘ یہ مساوات بھی تھی جس کا حکم دیا گیا تھا۔ انسانوں کو ان کے رنگ‘ نسل‘ خاندانی نام ونسب کے بجائے صرف ان کے تقویٰ اور پارسائی پر جانچنے کا۔ ایس آئی ایف اور ٹی اے آئی آج اسی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے دنیا کے سب سے بڑے گلوبل فنڈ کا قیام عمل میں لایا ہے۔“

وہ بات کررہا تھا اور پوری دنیا سن رہی تھی۔ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیتا ہوا بات کررہا تھا اور وہ پھر

بھی سننے پر مجبور تھے۔ کیونکہ وہ باعمل بہترین مسلمان تھے جن کے قول و فعل میں دنیا کو تضاد نظر نہیں آرہا تھا۔ جو طاقت ور تھے تو دنیا ان کے دین کو بھی عزت دے رہی تھی اور اس دین کے پیغام بر کو بھی۔ وہ ایک گولی جو دنیا کی تاریخ بدلنے آئی تھی' وہ کاتب تقدیر کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔

تاریخ ویسے ہی لکھی جا رہی تھی جیسے اللہ تعالیٰ چاہتا تھا اور وہ ہی لکھ رہے تھے' جن کو اللہ نے منتخب کیا تھا۔

بے شک طاقت کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ جس کی محبت وہ آب حیات ہے' جو زندگی کو دوام بخشتا ہے' اس دنیا سے اگلی دنیا تک۔

☼ ☼ ☼

ترپ کا پتا

مارچ 2040ء

امریکہ کے اس اسپتال کے نیورو سرجری ڈپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے وہ آبادی کے اس دو اعشاریہ پانچ فیصد حصہ سے تعلق رکھتا تھا جو ایک سو پچاس آئی کیو لیول کے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹے سے ہو رہا تھا اور ابھی مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا' یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹرز کی اس ٹیم کی سربراہی کرنے والا ڈاکٹر' دنیا کے قابل ترین سرجنز میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ آپریشن تھیٹر سے منسلک ایک گلاس روم میں سرجری ریذیڈنٹس اس وقت جیسے سحر زدہ معمول کی طرح اس ڈاکٹر کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بڑی اسکرین پر دیکھ رہے تھے جو اس کھلے ہوئے دماغ پر یوں کام کر رہا تھا جیسے کسی پیانسٹ کی انگلیاں ایک پیانو پر۔ وہ اپنی مہارت سے سب پر سحر طاری کیے ہوئے تھا' سوائے اس ایک شخص کے جس کی زندگی اور موت اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔

آپریشن کے دوران وہ نیورو سرجن چند لمحوں کے لیے رکا تھا۔ ایک نرس نے بنا کہے اس کے ماتھے پر ابھرنے والے قطروں کو ایک کپڑے سے خشک کیا۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے سامنے آپریشن تھیٹر کی ٹیبل پر پڑے ہوئے اس دماغ پر جھکا جو دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا اور جو ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اس کے سامنے آیا تھا۔

دنیا کی اہم ترین پوزیشن پر فائز رہنے والے اس شخص کے لیے اس ایمرجنسی میں اسے بلایا گیا تھا۔ وہ سرجن اب تک دو سو ستر اہم اور نازک ترین کامیاب سرجریز کرنے کے بعد اس وقت امریکہ کی تاریخ کا کم عمر اور سب سے قابل سرجن تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ اس کا وہ سو فیصد کامیابی کا ریکارڈ ختم ہونے والا ہے۔ وہ ایک بار پھر گہری سانس لے کر ٹیبل سے ہٹا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی' اس آپریشن میں کامیابی کے لیے۔



بشریٰ احمد

ہنرمند

دوسروں کے کام کو اپنے نام سے پیش کرنا اگر ہنر اور فن کہلاتا ہے تو عارفہ بیگم بہت بڑی فنکار کہلانے کی حق دار ٹھہرتی تھیں۔ یہ ہنر سکھانے سے نہیں آتا بلکہ یہ پیدائشی طور پر قدرت کا ودیعت کردہ ہوتا ہے۔

عارفہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی ۔ بچپن میں جب نانا ان سے ملنے گھر آتے تو چپکے سے نانا کو اپنے سے تین برس بڑی ملیحہ کی کاپی یہ کہہ کر دکھاتی کہ دیکھیں نانا! میری ہینڈ رائٹنگ کتنی اچھی ہے۔ نانا واقعی اتنی سی بچی کی ایسی پختہ لکھائی دیکھ کر حیران ہوتے پھر خوش ہو کر اسے بیس روپے دیتے۔

ابا دفتر جانے سے پہلے ناشتہ کر رہے ہوتے تو عارفہ ان کے پالش کیے ہوئے بوٹ ان کے قریب لا کر رکھتی۔

"دیکھیں ابا! آپ کے جوتے کتنے اچھے چمکائے ہیں نا۔" وہ ابا کی توجہ چمکتے جوتوں کی طرف دلاتی۔

حالانکہ اسے کہنا یہ چاہیے تھا کہ "دیکھیں ابا! بڑی آپا نے آپ کے جوتے کتنے اچھے چمکائے ہیں نا۔"

لیکن وہ معصومیت سے آپا کا نام لینا بھول جاتی۔ فقرے کی بناوٹ کے اعتبار سے کارنامہ اسی کا معلوم ہوتا۔ ابا کبھی تو خوش ہو کر شاباش دیتے اور کبھی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے کچھ پیسے تھما دیتے۔ ایک دن ابا کا موڈ خراب تھا شاید رات کو امی 'ابا کی جھڑپ ہوئی تھی۔ عارفہ نے اس دن باپ کے پاؤں کے قریب جوتے رکھتے ہوئے ان کی چمک کی طرف توجہ دلائی تو ابا امی پر دھاڑے۔

"اتنی سی بچی سے جوتے پالش کرواتی ہو۔ کیسی ماں ہو آخر۔"

ابا کی دھاڑ سن کر اماں بوکھلائے ہوئے انداز میں

کچن سے نکلیں۔ ہائیں ہائیں کر کے معاملہ دریافت کرنا چاہا کہ ابا کی دھاڑ تو سنائی دی تھی پر الفاظ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ عارفہ چپکے سے وہاں سے کھسک لی۔ اس روز کے بعد ابا کے پاس جوتے لا کر رکھنا تو چھوڑ دیے مگر دوسروں کے کاموں سے اپنے نمبر بنانے کی عادت برقرار رکھی۔ گھر والے اب اس عادت سے کچھ کچھ واقف ہو چکے تھے لیکن وہ سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی تو اس کی معصومیت بھری چالاکیوں پر ہنستے ہوئے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بچپن کی اس عادت نے لڑکپن میں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد بھی یہ عادت برقرار تھی۔ اب فرق یہ پڑا تھا کہ پیار کرنے والی بڑی بہنیں شادیوں کے بعد اپنے اپنے گھربار کی ہو گئی تھیں اور اب گھر پر بھابھیوں کا راج تھا۔ بھابھیوں کو نند کی چالاکیوں پر خوب غصہ آتا۔ منجھلی بھابھی نے گرم ترین دوپہر میں کچن میں کھڑے ہو کر قیمہ بھرے کریلے بنائے اور عارفہ صاحبہ نے کھانے کی میز پر کس معصومیت سے ارشاد فرمایا۔

"ساری دوپہر تو کچن کی نذر ہوئی لیکن ڈش تو لاجواب بنی ہے۔ کیوں ابا! مزے کے قیمے کریلے ہیں نا۔"

وہ باپ سے مخاطب تھی اور منجھلی بھابھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ وضاحت تو کر دیتی کہ کس کی دوپہر کچن کی نذر ہوئی لیکن ادھورا سا فقرہ بول کر اب عارفہ بی بی بہت رغبت سے کھانا تناول فرما رہی تھیں۔

بھابیوں نے ذاتی دلچسپی لے کر باتیں بنا کر نمبر بنانے والی اس نند کا رشتہ طے کروا دیا تھا۔ تجمل، منجھلی بھابھی کا دور پرے کا کزن تھا۔ اس کے گھر والوں کی خواہش تھی کہ ایک خرچے میں دو بیٹوں کی شادیاں نمٹا دی جائیں۔ تجمل سے ڈیڑھ برس بڑے مصدق کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ وہ لوگ تجمل کے رشتے کی تلاش میں تھے اور عارفہ سے رشتہ طے ہوتے ہی شادی کی تاریخ ٹھہرا دی گئی۔

عارفہ رخصت ہو کر سسرال پہنچی تو بھاوجوں نے سکون کا سانس لیا۔ سسرال میں عارفہ کا واسطہ مدحت سے پڑا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مدحت کا واسطہ عارفہ سے پڑا۔ مدحت، جو عارفہ کے ساتھ ہی رخصت ہو کر یہاں آئی تھی، رشتے میں عارفہ کی جٹھانی تھی مگر عمر میں اس سے ڈیڑھ دو برس چھوٹی ہی ہو گی۔ سیدھی سادی گھریلو لڑکی، جو کام کاج میں تو ماہر تھی لیکن باتیں بنانے کے فن سے قطعی نا آشنا۔ وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی اور عارفہ باتوں کے ذریعے گھر والوں کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرتی۔

"شائستہ باجی! آپ کی اسکن بہت چمک رہی ہے۔ فیشل کروایا ہے نا؟"

بڑی نند کے چہرے کی چمک صرف اسی کو نظر آتی اور یہ تعریف سن کر شائستہ باجی کا چہرہ واقعی خوشی کے مارے چمکنے لگتا۔

"کیسا فیشل چندا۔ بچے جان چھوڑیں تب ہی خود پر توجہ دینے کا وقت ملے۔" وہ مسکراتے ہوئے چھوٹی بھاوج کے اندازے کی تردید کرتیں۔ جواب میں عارفہ ان کی خوب صورتی کی شان میں دو قصیدے اور پڑھ دیتی۔

چھوٹی نند کی اسمارٹ نیس پر عارفہ فریفتہ تھی۔ ساس کے روکھے بالوں کی جانب توجہ مبذول کروا کر وہ بہت پیار سے ان کی سر میں تیل لگا کر ان کی چوٹی گوندھتی۔ مدحت بے چاری کو کچن کے کام ہی اتنی فرصت نہ دیتے تھے کہ وہ ساس کی اس طرح کی کوئی خدمت سرانجام دیتی۔ گھر کے مرد کام سے لوٹتے تو سب سے پہلے چائے پانی کا عارفہ ہی پوچھتی۔ بھلے سے چائے کسی اور کو بنانی پڑے۔ ٹرے میں کپ سجا کر سرو عارفہ ہی کرتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ گھر کا کوئی کام نہ کرتی تھی۔ مارے باندھے ایک آدھا کام کر لیتی لیکن کام اس انداز اور طریقے سے کرتی کہ سب کے نوٹس

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میں آجائے۔
مدحت ہانڈی بناتی تھی اور آٹا گوندھ کر فریج میں رکھ دیتی۔ کچن کی صفائی بھی اسی کے ذمے تھی۔ ہاں روٹیاں بنانے کا کام عارفہ نے از خود اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جب گھر کے سب افراد دستر خوان پر بیٹھ جاتے تب وہ گرم گرم پھلکے اتار کر لاتی رہتی۔
"بھابھی! روٹی پہلے سے بنالیا کریں نا۔ یہ کیا کہ ہم مزے سے بیٹھ کر کھانا کھائیں اور آپ کچن اور کمرے کے چکر ہی کاٹتی رہیں۔" سب سے چھوٹا دیور اپنی ہنس مکھ سی بھابھی سے مخاطب ہوتا۔
"ارے نہیں فرقان! پھلکا تو توے سے اتارتے کے ساتھ ہی کھانے میں مزہ آتا ہے میں جلدی کام نمٹانے کے چکر میں روٹیاں پکا کر ہاٹ پاٹ بھر دوں اور وہ پچکی پچکی روٹیاں رغبت سے کھائی ہی نہ جائیں تو فائدہ۔" عارفہ پسینہ پونچھتے ہوئے مسکراتی۔
"آپ کو ہمارا کتنا خیال رہتا ہے اور خود آخر میں بیٹھ کر ٹھنڈی روٹی کھائیں گی۔" نسرین بھابھی کو پیار سے دیکھتی۔
ساری دوپہر کچن میں کھپا دینے والی مدحت خاموش تماشائی کی حیثیت سے دستر خوان پر خاموشی سے بیٹھی رہتی اور عارفہ کی واہ واہ ہوتی رہتی۔
بہت برس عارفہ نے اس طرح گھر پر راج کیا تھا پھر مدحت کے میاں مصدق نے اس کی عادت پر ہلکا پھلکا طنز کرنا شروع کیا تھا۔ مدحت جتنی مرضی سیدھی سی عارفہ کی چالاکیوں سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے دکھڑے میاں کے آگے روتی تھی اور مصدق اب بیوی کی حمایت میں خم ٹھونک کر میدان میں نکلا تھا۔ اس نے ماں سے مطالبہ کیا کہ کام دونوں بہوؤں میں برابر بانٹے جائیں ورنہ وہ بیوی کو لے کر الگ ہو جائے گا۔
عارفہ کا کچھ نہ بگڑا۔ سسرال والے مدحت اور مصدق سے ہی برگشتہ ہو گئے اور پھر عارفہ کی خوش قسمتی تجمل کی ترقی ہو گئی اور ساتھ ہی دوسرے شہر ٹرانسفر بھی ہو گیا وہ بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔

عارفہ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ اب وہ اپنی راجدھانی کی بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ اب باتیں بنا کر نمبر بنانے کا زمانہ گزر گیا تھا۔ اپنے گھر کا انتظام و انصرام اسے خود سنبھالنا تھا۔ تجمل کی تنخواہ بہت اچھی تھی۔ کل وقتی ملازمہ کا بندوبست ہو گیا۔ زندگی سبک خرامی سے گزرنے لگی۔
بچیاں بڑی ہوئیں تو انہوں نے ماں کو گھریلو ذمہ داریوں سے بالکل آزاد کر دیا۔ منال اور کشف دونوں بیٹیاں کام کاج کے معاملے میں خاصی سگھڑ اور پھرتیلی تھیں اور اب گھر کا انتظام بچیوں کے ہاتھ میں ہی تھا۔
ہر ماں کی طرح عارفہ کی بھی یہ ہی خواہش تھی کہ بچیوں کو جلد از جلد ان کے گھر بار کا کر دے۔
منال کو چھوٹی آپا نے اپنے بیٹے ذیشان کے لیے مانگ لیا۔ اصل مسئلہ کشف کے رشتے کا تھا۔ کشف کی رنگت قدرے دبی ہوئی تھی قد بھی چھوٹا تھا۔ خاندان میں بہت سے لڑکے اس کے جوڑ کے تھے لیکن کسی نے اس کے لیے دست سوال دراز نہ کیا۔ لڑکوں کے رشتے طے ہوتے گئے اور عارفہ کی توقعات اور خواہشات پر پانی پھرتا رہا۔
رشتے کروانے والی ماسی کی خدمات بھی حاصل کی گئیں لیکن کہیں بھی بات نہ بن پائی۔
کشف بنیادی طور پر صابر و شاکر لڑکی تھی عارفہ کے بچوں میں سب سے زیادہ سمجھدار اور سلیقہ مند' عارفہ کا بس نہ چلتا کہ اپنی اس کم گو اور فرمانبردار سی بیٹی کا پلک جھپکتے میں شاندار سا بر ڈھونڈ لے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور کشف کے متعلق سوچ سوچ کر عارفہ کی نیندیں اڑتی جا رہی تھیں۔ تجمل بیوی کو سمجھاتا کہ جب اللہ کی مرضی ہو گی تو خود بخود بیٹی کی شادی کی سبیل بن جائے گی لیکن عارفہ کو شوہر کی ان تسلی دلاسوں پر مزید غصہ آجاتا۔ تجمل ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھا رہتا اور اپنی سی کوشش کرتا تو خاندان میں کہیں بھی کشف کا رشتہ بھی طے ہو جاتا۔
کشف سے بڑے دو بیٹے تو مدحت اور مصدق کے

ہی تھے۔ دونوں لڑکے بہت خوبرو اور قابل تھے لیکن مدحت نے مصدق کی بھتیجی کے بجائے اپنی بھانجیوں سے بیٹوں کے رشتے طے کردیے تھے۔ عارفہ ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہ کرسکی۔

پھر آخر عارفہ کی دعائیں رنگ لائیں اور کشف کا بھی رشتہ طے ہوگیا۔ کامران تجمل کے کسی دوست کا بھانجا تھا۔ فزکس میں ماسٹرز ڈگری لے رکھی تھی اور اس کی ذاتی اکیڈمی تھی۔ آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی لیکن اس کا کنبہ خاصا بڑا تھا۔

عارفہ اتنے بڑے سسرال میں بیٹی بیاہتے ہوئے متذبذب تھی لیکن بیٹی کی بڑھتی عمر کی وجہ سے اس کے پاس یہ رشتہ قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن کشف کی شادی کے بعد اس کے خدشات اور اندیشوں سے دھڑکتے دل کو قرار آگیا۔ اس کے سسرال والے معقول لوگ تھے۔ ساس' نندیں بہت زیادہ تیز طرار نہ تھیں۔ کامران بھی شریف اور بھلامانس لڑکا تھا۔ کشف اس کے ساتھ خوش تھی اور بیٹی کو خوش دیکھ کر عارفہ حد درجہ مطمئن۔

لیکن شادی کے بعد کشف میکے کا چکر بہت کم لگاتی تھی۔ منائل تو چلو قریبی شہر میں بیاہی تھی وہ پھر بھی مہینے میں ایک بار ماں' باپ سے ملنے آجاتی لیکن کشف شہر کے شہر میں ہوتے ہوئے بھی مدتوں اپنی شکل نہ دکھاتی۔ عارفہ جب بھی فون کرتی تو وہ کسی کام میں مصروف ہوتی اور عجلت بھرے انداز میں فون بند کر دیتی۔ اس بار کشف پورے ڈیڑھ ماہ بعد آئی تھی۔ عارفہ کو وہ پہلے کی نسبت کچھ کمزور لگی تھی۔

"سسرال میں تو سب ٹھیک ہیں نا تیرے ساتھ۔ کامران خیال رکھتا بھی ہے یا نہیں؟ میکے آنے سے وہ ہی تو نہیں روکتا۔"

عارفہ نے تابڑ توڑ کئی سوال کرڈالے۔ ماں کی تشویش پر کشف ہنس پڑی اور پھر ہنستے ہوئے ماں کے ہر اندازے کی تردید کی۔

"تو پھر یہ شکل کیوں اتی (اتنی) سی نکل رہی ہے۔"

عارفہ کی تشویش اب بھی برقرار تھی۔

"کام کا برڈن ہے امی اور کوئی بات نہیں اور اچھا ہے نا۔ میں شادی کے بعد بھی موٹی نہیں ہوئی' ابھی تک ویسی ہی اسمارٹ ہوں۔ منائل آپی کو دیکھیں' انہوں نے کتنا وزن گین کرلیا' اب ڈائٹنگ کرکے وزن کم کرنے کی کوشش میں لگی ہیں۔"

"تو کام کا برڈن صرف تجھ پر ہی ہے کیا' وہ تیری جٹھانی بھی تو ہے۔ دونوں مل بانٹ کر کام نہیں کرتیں۔"

عارفہ بیگم کا دھیان بیٹی کے پہلے مسئلے میں ہی اٹک گیا تھا' باقی کی بات تو جیسے انہوں نے سنی ہی نہ تھی۔

"افشاں بھابھی! ان کی تو آپ بات ہی نہ کریں اماں۔" کشف ہنس پڑی تھی۔

"کیوں دیکھنے میں تو بہت بھلی عورت لگتی ہے۔ ہنس مکھ بھی ہے۔ تیرے ساتھ تعاون نہیں کرتی کیا؟" عارفہ نے اچنبھے سے پوچھا۔

"پتا نہیں امی' میں تو آج تک ان کی نیچر سمجھ ہی نہیں سکی۔"

کشف صاف گوئی سے بولی تھی۔ اس سے پہلے عارفہ مزید کچھ استفسار کرتیں۔ تجمل اور کامران مسجد سے نماز پڑھ کر واپس آگئے۔

"چلیں بھئی بیگم صاحبہ! کھانا لگوائیں بہت بھوک لگی ہے۔" تجمل نے انہیں مخاطب کیا۔

"بس ابھی پروین سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔" عارفہ نے ملازمہ کو آواز دی۔ اس دن بات آئی گئی ہو گئی لیکن بیٹی کی ادھوری بات نے عارفہ بیگم کو بے چین کردیا۔

بیٹی کی بات کا مطلب انہیں چند دن بعد سمجھ میں آیا تھا۔ کشف کی سب سے چھوٹی نند نے میٹرک کے امتحان میں بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تھی۔ اس خوشی کو منانے کے لیے کامران کے گھر والوں نے قریبی رشتہ داروں کو دعوت پر بلایا تھا۔

عارفہ بیگم تجمل اور چھوٹے بیٹے اسامہ کے ساتھ

بیٹی کی سسرال پہنچ گئیں۔ کشف کی نند کے لیے شاندار سا گفٹ بھی لیا تھا۔ بیٹی کی سسرال میں ان کا پرتپاک استقبال ہوا۔ بری کا کامدانی سوٹ پہنے، سلیقے سے کیے گئے میک اپ میں کشف بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ عارفہ نے نگاہوں ہی نگاہوں میں بیٹی کی خوب بلائیں لیں۔

کشف ماں کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی جبکہ اس کی جٹھانی مہمانوں کو کولڈ ڈرنکس سرو کر رہی تھی۔ جو کولڈ ڈرنک نہ پینا چاہتا اس کے لیے فوراً" ٹھنڈا ٹھار اسکواش لے آتی۔

ہر جگہ افشاں کے نام کی پکار پڑ رہی تھی۔ افشاں کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ اس نے ابھی تک نہا دھو کر کپڑے بھی نہ بدلے تھے۔ کشف کی ممانی ساس نے اس بات پر اسے ٹوک بھی دیا۔

"اے بیٹا! اب تم بھی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ باقی کام کوئی اور نمٹا لے گا۔"

ممانی کے کہنے پر عارفہ جز بز ہوئی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے کشف کا نام نہ لیا تھا لیکن اشارہ شاید اسی کی طرف تھا۔

کشف کی چھوٹی نند تو آج کی چیف گیسٹ تھی۔ بڑی بیاہی نند کی گود میں سوا مہینے کا بچہ تھا۔ ساس جوڑوں کی مریضہ، لے دے کر کشف ہی بچتی تھی جو تیار ہو کر ماں کے پہلو سے جڑی بیٹھی تھی۔

"تیری جٹھانی پھرکی کی طرح گھوم رہی ہے کشف! کچھ تو بھی اس کا ہاتھ بٹا لے۔ سب مہمان کیا سوچیں گے کہ چھوٹی بہو گھر کے ہر کام سے لاتعلق ہے۔" عارفہ نے بیٹی کے کان میں سرگوشی کی۔

"امی! صبح سے میں ہی کاموں میں جُتی ہوئی تھی۔ سچ میرا کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ پہلے ملازمہ کے ساتھ مل کر پورے گھر کی تفصیلی صفائی کی پھر دوپہر کا کھانا بنایا۔ افشاں بھابھی کے تو صبح سے داڑھ میں درد تھا۔ جب بھی گھر میں زیادہ کام ہو تو ان کے کہیں نہ کہیں درد ہو جاتا ہے اور جب سارے کام نمٹ گئے تو ان کا درد ٹھیک ہو گیا۔ مجھ سے کہنے لگیں۔ تم صبح سے لگی ہوئی ہو۔ اب نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ باقی کے کام میں دیکھ لوں گی۔ اب باقی کا کام بچا ہی کیا ہے امی! لیکن بس یہ اسی طرح بھاگ دوڑ کرتی رہیں گی۔ کبھی کسی کے پاس رک کر اس کا حال احوال دریافت کر لیا۔ کبھی کسی کے کپڑوں کی تعریف کر دی۔ کبھی کسی کا روتا بلکتا بچہ گود میں اٹھا کر تھپکنا شروع کر دیا، کبھی کسی بیمار کی مزاج پرسی کرتے ہوئے اسے مفت مشوروں سے نوازنا شروع کر دیا۔ یوں ہر کسی کے پاس رکتے ہوئے باتیں بگھاریں گی اور ذرا سا کام گھنٹوں پر محیط ہو جائے گا۔ دنیا کو یہ ہی لگے گا کہ ان سے بڑھ کر کام کرنے والا اور کوئی نہیں۔"

کشف تو بھری بیٹھی تھی۔ ماں کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑے بنا نہ رہ پائی۔

"توبہ، میرے اللہ! کتنی چلتر عورت ہے۔ تو بھی اس سے ______ ایسی چالاکیاں سیکھ لے۔" عارفہ نے بیٹی کو سمجھانا چاہا۔

"نہیں امی! یہ میرے بس کی بات نہیں۔ زبان کے بل پر دوسروں کو اپنا بنانے اور ہر کسی کے سامنے اپنا سکہ جمانے کا جو ہنر افشاں بھابھی کے پاس ہے یہ ہنر شاید گاڈ گفٹڈ (خدا کی طرف سے ودیعت کردہ) ہوتا ہے۔ دیکھنے سکھانے سے کچھ نہیں آتا۔"

کشف ٹھنڈی سانس لے کر بولی تھی۔ عارفہ نے کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے مگر پھر خاموش ہو گئیں۔ شاید بیٹی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

٭

سرورق کی شخصیت

ماڈل	فرینہ اعجاز
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

عندلیب زہرا

حنا کی ادی

میں شروع سے کاملیت پسند تھی۔ ہر چیز مکمل' نقص سے پاک اور غلطی سے مبرا ہونی چاہیے۔ اپنی صورت و سیرت کے باعث ہمیشہ تعریف سمیٹتی رہتی۔

میری بکس ہمیشہ صاف ستھری' یونیفارم اجلا اجلا سا' غرض یہ کہ میں نکھری نکھری سی اسٹوڈنٹ ہوتی۔ سال کی بہترین طالبہ کا اعزاز زیادہ تر میرا مقدر بنتا۔

اسی بات نے مجھے پرفیکٹ ہونے کے جنون میں مبتلا کر دیا سہیلیوں کی کوئی بات جو مجھے ناگوار گزرتی یا کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تو میں ہمیشہ کے لیے دوستی ختم کر دیتی۔ مجھے زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی ہی ملی تھی۔

نہ انتظار نہ صبر سے آشنائی نہ خبر سے آگاہی۔

"صدیقہ کے معیار تک پہنچنا تو کسی خاص ہستی کا کام ہو سکتا ہے عام انسان کا نہیں....." یہ تبصرہ مجھے ساتویں آسمان پر پہنچا دیتا۔

قدرت شکر خورے کو شکر سے ہی نوازتا ہے اور میری ذات پر یہ جملہ پورا اترتا۔ محبت کرنے والا صاحب حیثیت شوہر' قدردان سسرال' اولاد کی نعمت۔

میں نے اس بات کو یکسر فراموش کر دیا کہ مکمل اللہ کی ذات ہے۔ ہر خامی اور نقص سے پاک۔

زندگی میں حسن کاملیت پسندی سے نہیں آتا بلکہ یہ نشیب و فراز' اونچ نیچ' دن رات کا آنا جانا..... یہ ہے زندگی کا حسن' انسان کے ظرف اور حوصلے کا امتحان۔

حنا میری اکلوتی' لاڈلی بیٹی..... اگرچہ بیٹے بھی تھے لیکن پہلوٹھی کی اولاد کا ہمیشہ اپنا مقام ہوتا ہے اور وہ تو تھی منتوں مرادوں کی۔ میں نے اسے بھی کاملیت کے سانچے میں رکھ دیا۔ قدرت نے اسے حسن فیاضی سے نوازا تھا۔ تو سیرت حسن سے بھی مالا مال کر رکھا تھا۔ میں اپنی بیٹی کے حسن پر فخر کرتی اور اس کی قابلیت کو اپنا اثاثہ قرار دیتی۔

حنا کی صورت بے مثال' حنا کی سیرت واہ واہ۔

ہر طرف اس کی دھوم تھی۔ کزنز' فرینڈز تو ایک طرف اس کی پھپھیاں' چچی' خالائیں تک اس کے حسن سے خائف رہتیں۔ وہ ابھی سولہ سترہ برس کی تھی کہ رشتوں کی قطار لگ گئی۔

"میں نے آپ کی بیٹی کو فلاں شادی میں دیکھا تھا۔"

"میرے انجینئر بھائی کے لیے حنا کا رشتہ"

"میرا بیٹا دوبئی میں اپنا کاروبار کرتا ہے....."

اف! حنا کے اتنے طلب گار! مگر میری نگاہوں میں کوئی نہ سماتا۔ وقت بھی کبھی ٹھہر سکا ہے؟ میں حنا کی پڑھائی کا بہانہ بنا کر سب کو ٹال دیتی۔

"زندگی میں ملنے والی ہر چیز نعمت ہے صدیقہ' خواہ صحت ہو یا حسن ہو یا دولت' عزت' اچھے رشتے..... انہیں ٹھکراتے نہیں ہیں بلکہ شکر کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور خوشی و انکساری کے ساتھ برتتے ہیں۔" میری ساس نے میری یہ روش دیکھی تو مجھے ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔

"اماں! میری حنا کو دیکھیے۔ ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ' برسر روزگار' خوب صورت و خوب سیرت..... بس اس کے ہم وزن ہو..... ہم پلہ....." میں نے گردن اکڑا کر کہا۔

"وقت کسی کے لیے نہیں رکتا' ہر شے کو روندتا ہوا چلا جاتا ہے۔" میری ساس کو میری سوچ پر افسوس تھا۔

"صدیقہ! جب تعلیم یافتہ لڑکا ہو تو تمہیں دولت کی پڑجاتی ہے۔ دولت مند ہو تو خاندان بڑا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو تو لڑکا معمولی شکل و صورت کا ہے۔" ندیم میری حرکتوں سے سخت نالاں تھے۔

"مجھے سب کچھ مکمل ملا ہے تو میری بیٹی کو کیوں نہ ملے؟" میں نے تنک کر کہا۔

"جب حنا میری رضا میں راضی رہتی ہے تو آپ سب کو کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ میری بیٹی کی عمر کا ہے۔ اس کی تابعداری اور شرافت کو اس کی آزمائش نہ بناؤ۔ اس نے فیصلے کا اختیار ہمیں دیا ہے تو ہم اس کو بوجھ نہ بنائیں... بیٹیاں کتنی ہی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہوں وہ اپنے شوہر کے گھر کی زینت بنی اچھی لگتی ہیں۔" ندیم کا پارہ آسمان کو چڑھنے لگا اور میں سر جھٹک کر رہ گئی۔

✵ ✵ ✵

وقت کے پر نہیں ہوتے پھر بھی اڑتا چلا جاتا ہے پاؤں نہیں ہوتے پھر بھی بھاگتا چلا جاتا ہے۔

میری حنا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کی عمر تیس سے اوپر چلی گئی۔ ساس اور شوہر یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ بیٹے اپنے گھر میں آباد اور خوش باش۔

اب میں اور حنا تھے یا ہماری تنہائی۔ نہ پہلے سے حالات تھے نہ کامیاب وقت کی ہم راہی۔ حنا جاب کرتی' اس کے ساتھ کی سب لڑکیاں بیاہی گئیں۔ خوش' ناخوش' امیر' غریب لیکن سب لڑکیاں اپنے شوہروں کے ساتھ حالات سے نبرد آزما تھیں۔

حنا کے طلب گار رشتے اب کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ جو آتے ان سے بہتر تھا حنا شادی نہ کرے۔

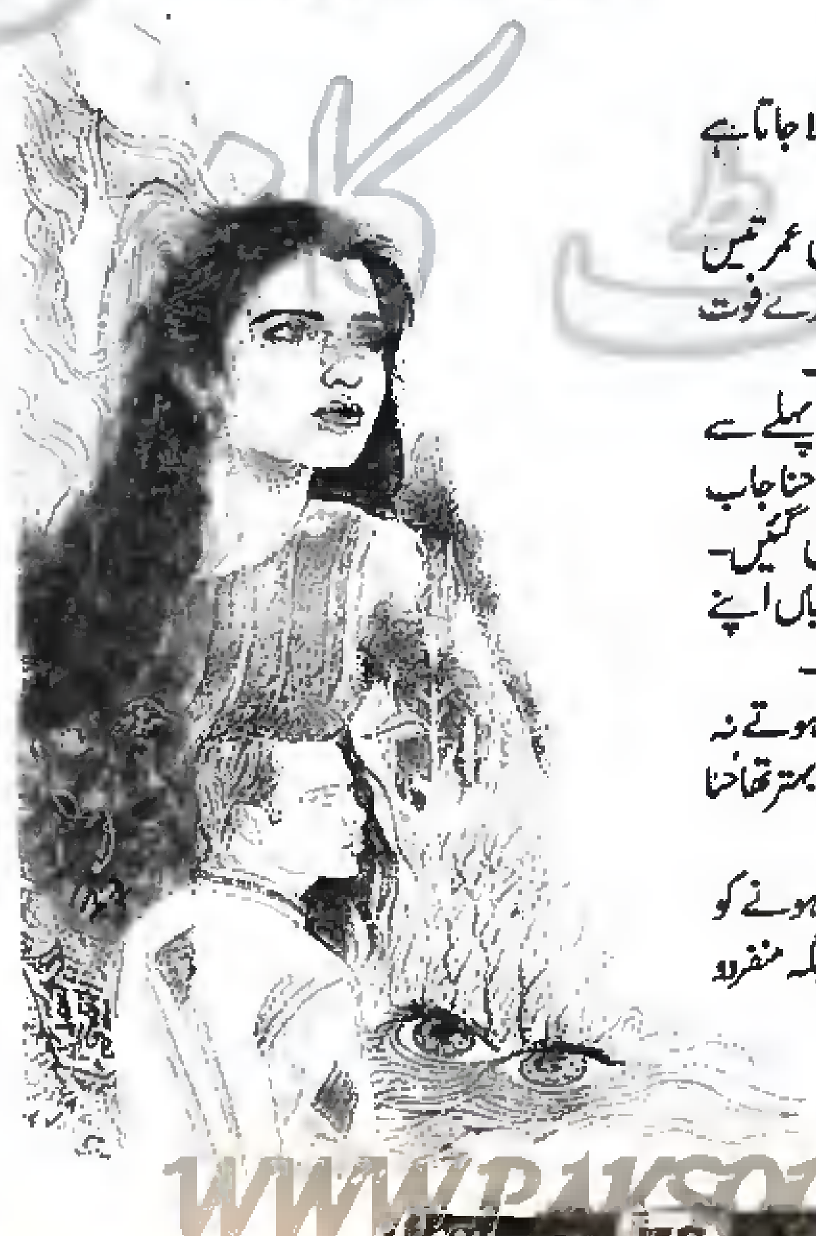
میری کاملیت پسندی کا بت اب مسمار ہونے کو تھا۔ ماں باپ کی لاڈلی' شوہر کی من پسند' ہر جگہ منفرد نمایاں صدیقہ بیماری' تنہائی اور بیٹوں کی بے اعتنائی کا شکار تھی۔ حنا نے کبھی شکوہ نہیں کیا تھا۔ نہ مجھ سے نہ اللہ سے۔ بس جاب اور گھر کا کام' وہ اپنی ذات میں سمٹتی جا رہی تھی۔ بس ایک خاموشی تھی جو روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی یا تنہائی' جو جان لیوا بنتی جا رہی تھی۔

"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو حنا اکیلی کیسے رہے گی۔" یہ سوچ مجھے مجبور کرتی کہ میں ہر جانے والی سے رشتے کی بابت کوشش کروں۔

"آپ کی بیٹی پر بندش ہے۔ آسیبی اثرات ہیں' لڑکے والے کم عمر لڑکیوں کو طلب کرتے ہیں۔"

یہ وظیفہ' یہ دعا' فلاں نسخہ' فلاں میرج بیورو...

میں نے ٹھوکر سے جانا تھا کہ کاملیت پسند ہونا' انسان بالخصوص ایک عورت جب کہ وہ ماں بھی ہو کس قدر خطرناک ہے۔



ایک رشتے والی نے رشتے کی امید دلائی تھی۔ میں تھوڑی پر امید تھی۔ جب میں نے برآمدے سے آتی آوازوں پر دھیان دیا۔

"حنا کی عمر تو گزر گئی ہے۔ آنٹی خوامخواہ چائے پانی پر پیسے خرچ کرتی ہیں۔" یہ بڑی بہو صدف کی آواز تھی۔

"ہاں بھئی باسی کڑھی کو ابال...." ارم کی آواز میں تمسخر تھا۔

یہ میری بہویں' میرے بیٹوں کے دل پر راج کر رہی تھیں۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حنا چپ چاپ یہ سب سن رہی تھی۔ اسی رات اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ کھڑکی کے پاس حنا بیٹھی رو رہی تھی۔ خاموش' بے آواز.... اس کے آنسو میرا دل چیر گئے تھے۔ میں نے رب کو سچے دل سے پکارا۔ ایک خطاکار' عاجز بندی کی حیثیت سے' ایک دکھیاری ماں کی حیثیت سے ہمیں کاملیت پسند تھی میری حنا نہیں۔

اللہ کو میری یہ عادت پسند نہ آئی لیکن حنا کی تابعداری تو سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق تھی۔ سو اس رات ہم دونوں ماں بیٹی کی آزمائش ختم ہو گئی۔

نفیسہ' میری بچپن کی سہیلی تھی' ہم دونوں کو گڑیا گڈے کی شادی کا بہت شوق تھا۔ رشتہ طے ہونے سے لے کر' مکلاوے تک کی رسمیں ہم دونوں سکھیاں سنجیدگی سے نبھاتیں۔

ہمیشہ میری گڑیا ہوتی اور اس کا گڈا۔

میری گڑیا نازک' سنہرے بالوں والی پریوں سا حسن رکھتی اور اس کا گڈا معصوم اور صحت مند۔ لیکن سب کہتے صدیقہ کی گڑیا پر دلہن بن کر بہت روپ آیا ہے تو نفیسہ فخر سے کہتی 'میرے گڈے کا کمال ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میل ملاپ کم ہوتا گیا اور نفیسہ یادوں کی دھول میں گم ہو گئی۔

اس رات جب ہم دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپاتی' شکوے کرتی اور دعائیں مانگتی سو گئیں تو صبح دیکھا' نفیسہ اپنے بیٹے ارسلان کے ساتھ ملنے آئی ہے۔

"میں نے سوچا صدیقہ' تمہیں سرپرائز دوں کب سے تمہارا پتہ ڈھونڈ رہی تھی۔" نفیسہ ویسی ہی تھی۔ لمبے وقت جیسے چھو کر نہیں گزرا اور میں؟

"میں حال ہی میں عمرہ ادا کر کے آئی ہوں۔ خواب میں دیکھا کہ میں اور تم گڈے گڑیا کا بیاہ کر رہے ہیں اس بڑھاپے میں۔ بس! آنکھ کھلی تو تم اتنی یاد آئیں کہ ڈھونڈتی ہوئی پہنچ گئی۔" ہنسوڑ سی نفیسہ نے گھر بھر میں رونق لگا دی۔ میں بھی وقتی طور پر بہل گئی۔ کھانا کھا کر جب ہم دونوں ماضی کی باتیں کرنے لگے تو اچانک نفیسہ کو گڈے گڑیا کی شادی یاد آ گئی۔

"یاد ہے تم نے کتنی منتوں کے بعد اپنی گڑیا کا رشتہ دیا تھا۔ حالاں کہ تمہاری گڑیا کے لیے کتنے طلب گار ہوتے تھے۔" میں پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی۔

"آج میں تم سے وہی گڑیا مانگنے آئی ہوں۔ تم انکار مت کرنا۔" نفیسہ نے میرا ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں کہا۔ میں ایک لمحے کو خاموش ہو گئی۔

"میرا ارسلان نہیں' میرا خاندان سب تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ اگر کمی ہے تو یہ سوچو کہ کامل ذات صرف اللہ کی ہے' ہماری نہیں۔" نفیسہ کی آواز مجھے ہاتف غیبی معلوم ہوئی اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

آج دعائیں مستجاب ہو گئی ہیں۔

میری دعاؤں سے زیادہ میری بیٹی کی تابع داری' استقامت اور صبر اللہ کو پسند آیا جو اس نے حنا کا نصیب اتنا خوب صورت اور روشن کر دیا کہ لوگ رشک کر رہے تھے۔

میں یعنی حنا کی امی' آج عمر کی چھ دہائیاں گزار کر یہ بات سمجھی ہوں کہ کاملیت پسندی ایک کتابی اصطلاح ہے۔ اس کا حقیقی وجود نہیں۔ اس کا مقام ہے تو صرف اس رب کے پاس' جو اول و آخر' ظاہر و باطن کامل ہے مکمل ہے' ہر نقص سے پاک۔ یہ کمی بیشی تو ہم انسانوں کے لیے ہے اور یہی اس زندگی کا حسن بھی۔

☆

فاطمہ عسکری

پیا کے نام کا رنگ

ناولٹ

لال دوپٹہ اڑ گیا رے میرا ہوا کے جھونکے سے
لال دوپٹہ اڑ گیا رے میرا ہوا کے جھونکے سے
مجھ کو پیا نے دیکھ لیا ہائے رے دھوکے سے

خاتون پھوپھی کے صحن سے مینا کی آواز آ رہی تھی۔ دوسری چھت کے تخت پر لیٹا ہوا میں یعنی عادل علی یک لخت اٹھ گیا۔ سینے پر رکھی کتاب گود میں گر گئی۔ دن بھر کی گرمی کے بعد میں —— ٹھنڈی ہوا کھانے اور کل کے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرنے چھت پر آگیا تھا۔ دوبار خاتون پھوپھی کے صحن میں بھی جھانکا مگر مینا نظر نہ آئی۔ خاتون پھوپھی ہی اکیلے گھر میں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ ان سے پوچھنا مناسب محسوس نہ ہوا یا یہ میرے دل کا چور تھا۔ یونہی پڑھتے پڑھتے میں تخت پر لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔ مینا کی آواز پر میں نے نیچے جھانکا تو وہ واقعی لال دوپٹہ پہنے صحن میں گول گول لہرا رہی تھی۔ شاید خاتون پھوپھی نے اس کا نیا جوڑا بنایا تھا۔ اس سے پہلے عادل نے اسے یہ جوڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ سرخ رنگ کے لان کے سوٹ پر دھانی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول بنے تھے۔ دوپٹہ اور قمیص ایک ہی پرنٹ کے تھے۔ بس دوپٹے پر دھانی رنگ کا زین لگا کر دوپٹے کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ شلوار دھانی رنگ کی تھی۔ لان کا عام سا سوٹ جو کسی بھی یوٹیلیٹی بازاروں میں کٹ پیس میں ملتے ہیں۔ لیکن خاتون پھوپھی کی سلیقہ مندی سے وہ مینا پر بہار دکھا رہا تھا۔

میں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ دنیا سے بے خبر اپنی دھن میں نئے جوڑے کی خوشی میں سر دھن رہی تھی۔

"مجھ کو پیا نے دیکھ لیا ہائے رے دھوکے سے۔"

اس نے لال دوپٹے کا کنارہ پکڑ کر ہوا میں لہرایا۔ اچانک خاتون پھوپھی کسی کمرے سے نمودار ہوئیں اور اس کی پیٹھ پر ایک دھموکا جڑ دیا۔

"دھوکے سے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے ہم صحن میں گانے گا گا کر سارے محلے کے لڑکے چھتوں پر اکٹھا کر لو۔ لو بتاؤ 'دونوں وقت مل رہے ہیں۔ آئی جاتی ہواؤں کا گزر ہے اور یہ صاحبہ صحن میں لہرا رہی ہیں۔ اب دوست کے گھر سے مٹرگشت کر کے آچکی ہو تو گھر کے کسی کام میں ہاتھ بٹاؤ۔"

"کیا ہے اماں! سب کچھ تو کر کے گئی تھی۔ آپ بھی خوش نہ ہونے دیا کریں۔" وہ پیٹھ سہلاتی ہوئی بڑبڑائی۔



"ہائیں! خوش ہونے کا یہ کون سا شریفانہ طریقہ ہے۔" خاتون پھوپھی کو حقیقتاً غصہ آگیا۔

"چھوڑیں پھوپھی۔ آپ کی رونا لیلیٰ کو کوئی نہیں دیکھتا۔" میں نے اس کی سانولی سلونی رنگت پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ یہ مداخلت بہت ضروری تھی ورنہ پھوپھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔



"ہاں ہاں خود تو بڑے وحید مراد ہیں نا آپ۔" وہ حسب توقع تپ گئی اور ہاں کا غصہ بھی مجھ پر ہی نکالا۔ میں مسکرا دیا۔

"وحید مراد نہ سہی لیکن ندیم سے تو بہت سے لوگ ملاتے ہیں۔" میں نے اپنی رنگین آنکھیں اس پر جماتے ہوئے کہا۔

"خالی خولی آنکھیں رنگین ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بنگالیوں کے ندیم لگتے ہیں۔" اس نے بھی میری رنگت پہ چوٹ کرتے ہوئے حساب برابر کیا۔ خاتون پھوپھی اسے مجھ سے جھگڑتا چھوڑ کر کچن میں چلی گئیں۔

"چلو ندیم نہ سہی سید نور کہہ لو۔" میں نے اسے چڑایا۔

"آپ کو بھی صائمہ جیسی ہی کوئی ملے گی پٹھان۔" اب وہ صحن میں پڑے تخت پر بیٹھ کر آرام سے لڑنے لگی۔ "مگر نہیں نہیں صائمہ جیسی نہ دیکھیے گا۔ آپ کے ساتھ سوٹ نہیں کرنے کی گوری چٹی بلکہ اپنے جیسی بنگالی دیکھیے گا۔" وہ اپنی دانست میں مجھے چڑانے لگی۔

"ہاں سوچا تو میں نے بھی یہی ہے۔" میں نے بغیر چڑے کہا۔

"کیونکہ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ گاڑی اور بیوی ایسی رکھو جو پاس کھڑی ہو تو اپنی لگے۔"

"اب یہاں عادل سے لڑنے کھڑی ہو گئی مینا! میں تم سے بہت تنگ ہوں۔" خاتون پھوپھی کچن سے نکل کر باہر آئیں اور ڈپٹنے لگیں۔

"آپ مجھے لڑتا دیکھ رہی ہیں عادل بھائی کو نہیں دیکھ رہیں کہ کتنی فضول بکواس کیے جا رہے ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"اچھا اب جاؤ کپڑے بدلو اور آکر کچن سمیٹو اور ہرا مسالا کاٹو۔" پھوپھی نے کہا تو وہ کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"ارے عادل! آج میں نے حلیم بنایا ہے۔ ذرا شبیر بھائی کے لیے آکر لے جانا۔" پھوپھی مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"ارے واہ پھوپھی! اتنی گرمی میں اتنی محنت' ابا کے لیے تو میں لے جاؤں گا لیکن میں آپ کے گھر ہی آ کر کھاؤں گا کیونکہ آپ جو کچھ بھیجیں گی اسے تو ابا اکیلے ہی کھا جائیں گے۔" میں نے کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

"ہاں ہاں آجانا اور ہاں ذرا منو کو میسج کر دو کہ آتے ہوئے چار روٹی تنور سے لیتا آئے... مینا حلیم روٹی سے کھاتی ہے۔"

"منو کو کیوں کہہ رہی ہیں۔۔بے چارہ پہلے ہی پڑھائی کے لیے جگہ جگہ پھرتا ہے۔ اب آپ اسے روٹی کی لائن میں لگا دیں۔ میں لے آؤں گا۔" میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

"چلو ٹھیک ہے ساڑھے آٹھ تک لے آنا۔ مغرب ہونے والی ہے میں بھی نماز پڑھ لوں۔" وہ اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ خاتون پھوپھی مجھ اکیلے کی پھوپھی نہیں تھیں بلکہ پورا محلہ ہی انہیں پھوپھی کہتا تھا۔ لیکن ہمارا گھر برابر میں ہونے کی وجہ سے ہم سے بے تکلفی زیادہ تھی اور اماں ابا دونوں سے ان کا بہناپا تھا۔ اماں اور پھوپھی ایک ساتھ جمعہ بازاروں اور اتوار بازاروں کے چکر لگاتی تھیں۔ سستے سستے کٹ پیس ڈھونڈتیں' گھر آکر ابا کی ٹیلر ماسٹری کام آتی۔ ان کی ڈیزائننگ کی جاتی اور پانچ سے بارہ سال تک کی بچیوں کے ریڈی میڈ سوٹ سیے جاتے۔ جو ابا کے ایک دوست اتوار بازار میں اسٹال لگا کر بیچتے تھے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ اماں ابا دونوں سے ان کا بہناپا تھا۔

یہ گھر جس میں خاتون پھوپھی رہ رہی تھیں' ان کے بھائی کا تھا۔ خاتون پھوپھی اس گھر میں اس وقت آئیں جب ان کے شوہر اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ اس وقت معنز (منو) چار سال کا اور مینا (ماہین) چار ماہ کی تھی۔ خاتون پھوپھی کے بھائی ناصر احمد کے علاوہ ان کا کوئی اور نہ تھا لہٰذا وہ بھائی کے گھر آ

گئیں جن کے اپنے تین بچے تھے۔ ناصر احمد کی بیوی انیسہ نے ان کا آنا زیادہ پسند تو نہیں کیا لیکن ناصر احمد کے آگے نہ بول سکیں۔ ناصر احمد اصولوں والے آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ماں باپ کے بنائے ہوئے اس گھر پر جتنا حق ان کا ہے اتنا ہی ان کی بیوہ بہن کا بھی ہے اور جوانی میں بہن پر پڑنے والی اس افتاد نے انہیں اور بھی بہن کے قریب کر دیا۔ اور عدت گزرنے کے بعد انہوں نے خاتون پھوپھی کو اپنے گھر لانے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

خاتون پھوپھی اور ناصر احمد دونوں بہن بھائی سائنس گریجویٹ تھے۔ خاتون پھوپھی کو اپنی بھاوج کے مزاج کا اندازہ تھا لہٰذا وہ چار سالہ معز کو بھی بہت سمجھا کر رکھتی تھیں کہ وہ ماموں کے بیٹوں کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے اور معز خود بھی بہت حساس بچہ تھا۔ ہمارا محلہ جہاں زیادہ تر روزانہ کا کاروبار کرنے والے لوگ آباد تھے۔ خاتون پھوپھی ان لوگوں کے لیے ایک مسئلے کا حل بن کر محلے میں آگئیں۔ انہوں نے اپنے بھائی کی اجازت سے گھر کی چھت پر موجود اسٹور روم کو صاف ستھرا کر کے محلے کے بچوں کو ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیا۔ ناصر احمد نے بھی بہن کی عزت نفس کا خیال کیا اور انہیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر بہن کو اپنی آمدنی کے لیے کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہوگا تاکہ بیوی کی نظر میں وہ ایک مکمل بوجھ نہ رہے۔ یوں جوانی میں ہی خاتون پھوپھی ایک بردبار عورت کا روپ دھار چکی تھیں۔ دن بھر وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتیں' چھوٹی سی مینا کے ہی ہزاروں کام تھے' منو کا اسکول میں داخلہ کروا کر وہ مطمئن ہو گئیں۔

میری عمر اس وقت چھ سال کے قریب تھی اور میں دوسری کلاس میں آیا تھا۔ دوپہر میں جلدی جلدی ہوم ورک کر کے گلی محلے کے لڑکوں کے ساتھ پوری شام برباد کرنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ابا صبح سویرے دکان پر چلے جاتے' اماں پانچ بچوں میں مصروف۔ مجھے آزادی ہی آزادی تھی لیکن بھلا ہو خاتون پھوپھی کا' ایک روز وہ دروازے پر کھڑی تھیں اور میرا سعید پرچون والے کے بیٹے ساجد سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ ساجد مجھے گالیوں اور ہاتھوں دونوں سے نواز رہا تھا۔ خاتون پھوپھی باہر آئیں اور دونوں کو ایک ایک جھانپڑ رسید کیا اور کان پکڑ کر سیدھا اپنے گھر کی چھت پر لے گئیں اور اپنے ٹیوشن روم میں بند کر دیا اور باہر سے دروازہ بند کرتے ہوئے بولیں۔

''اب دونوں مل کر یہ سوچو کہ یہ دروازہ کھلے گا کیسے؟''

اور اس کے بعد باہر خاموشی ہو گئی۔ میں اور ساجد دونوں ہی چھوٹے تھے۔ تپتی دوپہر میں باہر گلی میں لڑنا اور بات تھی اور اکیلے کمرے میں بند ہونا ہم دونوں کے لیے پہلا تجربہ تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ساجد سے بھی زیادہ کمزور دل تھا۔ ساجد نے دو مرتبہ دروازہ ہلایا پھر صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی گرل پر زور آزمائی کی۔ لیکن یہ ہم کم سن بچوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں تو رونا شروع ہو چکا تھا۔ ساجد لڑائی بھول کر مجھے چپ کرانے لگا۔ جب یہ مشغلہ ختم ہوا تو ہم نے کمرے کی شکل پہ غور کیا۔ یہ کمرہ عام گھروں میں پڑھائے جانے والے ٹیوشنز کے کمروں سے مختلف تھا۔ کمرے میں بہت پرانی مگر بڑی سی ڈائننگ ٹیبل تھی' جس کے گرد مختلف رنگوں اور ڈیزائن کی کرسیاں لگی تھیں دیوار پر ایک طرف بورڈ تھا اور دوسری طرف کچھ تعلیمی پوسٹر لگے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک اور چھوٹی ٹیبل پر ڈکشنری اور کتابیں رکھی تھیں اور ساتھ ہی لوڈو اور کروڑ پتی جیسے گیمز رکھے تھے۔ میں اور ساجد کچھ دیر ٹیچر ٹیچر کھیلتے رہے۔ جب اس سے بور ہوئے تو لوڈو اٹھا لیا کیونکہ کروڑ پتی ہمیں کھیلنا نہیں آتا تھا۔ دماغ تو ہم دونوں کا تیز تھا لہٰذا میں اور ساجد دونوں کھیل میں ایسے مگن ہوئے کہ گھنٹہ گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ ایک گھنٹے بعد پھوپھی ایک چھوٹی سی ٹرے میں تین گلاس شربت لے کر کمرے میں داخل ہوئیں ان کی گود میں چھوٹی سی مینا

بھی تھی۔
"شاباش تم دونوں تو اچھے بچے ہو۔ آرام سے کھیل رہے ہو۔" انہوں نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں شربت دیکھ کر جلدی سے ان کے نزدیک آ گئے۔ انہوں نے ایک ایک گلاس ہم دونوں کو دیا اور خود بھی کرسی پہ بیٹھ کر شربت پینے لگیں۔
"آرام اور تمیز سے پیو۔ شربت کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔" انہوں نے ساجد کو ڈانٹا۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ وہ ہمیں کھیل کھیل میں پڑھاتی اور سمجھاتی رہیں کہ ہم بے مصرف بچے نہیں' ہمارے ماں باپ کم پڑھے لکھے ضرور ہیں لیکن شریف لوگ ہیں۔ ہمیں اس طرح گلی میں جھگڑا کر کے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے کر اپنے ماں باپ کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔
"اچھا یہ بتاؤ تم دونوں کن مضامین میں سب سے اچھے ہو؟" انہوں نے ہم دونوں سے پوچھا۔
"میں ڈرائنگ میں بہت اچھا ہوں۔" ساجد نے خوش ہو کر بتایا۔
"اور تم؟" انہوں نے میری جانب دیکھا۔
"میں میتھس میں اچھا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے اسے پکڑو۔" انہوں نے مینا کو میری گود میں دیا اور خود الماری کی طرف بڑھ گئیں۔ میں نے پہلی بار مینا کو غور سے دیکھا وہ تقریباً" ایک سال کی صحت مند بچی تھی۔ جامنی لان کی جھبلا سی فراک پہنے' صاف رنگت تو نہ تھی مگر اس کے سلونے چہرے پر ایک کشش تھی۔ وہ ہمک ہمک کر ٹیبل پر سے گلاس پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ "یہ لو۔"
خاتون پھوپھی نے چارٹ پیپر ساجد کے آگے رکھا اور ساتھ ہی کلرز' مارکرز اور پنسل' ربر وغیرہ اور میرے سامنے ایک میتھس کی نئی ورک بک رکھی۔
"تم اپنی پسند کی کوئی بھی تصویر بناؤ اور تم اس ورک بک کو جہاں تک حل کر سکتے ہو کرو۔ میں ذرا مینا کو سلا کر آتی ہوں" انہوں نے اپنی بچی میری گود سے لی۔ اور پھر باہر سے دروازہ بند کر کے چلی گئیں حالاں کہ اب ہمارا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ساجد نے واقعی ایک بہت خوب صورت سینری بنائی اور اسے خوب صورت رنگوں سے سجایا اور میں نے ورک بک کو تقریباً" آدھا مکمل کر لیا۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ آئیں تو ہمارا کام دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔
"اب تم اس ڈرائنگ کے کونے پر اپنا نام لکھو۔" انہوں نے ساجد سے کہا "اب اسے سامنے والے بورڈ پر پن سے لگا دو۔" انہوں نے ایک سوفٹ بورڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ساجد نے ایسا ہی کیا۔
"اب شام کو جب پڑھنے والے بچے آئیں گے تو میں انہیں دکھاؤں گی کہ ہمارے محلے میں کتنے ٹیلنٹڈ بچے رہتے ہیں۔ مگر تمہیں کیسے پتا چلے گا' تم لوگ تو آتے ہی نہیں ہو۔"
"میں تو شام کو ضرور آؤں گا۔" ساجد جوش سے بولا۔
"اور میں بھی۔" میں نے کہا۔
"چلو ٹھیک ہے پھر ایک دن نہیں روز آنا پڑے گا۔" انہیں ہمارا جوش بہت بھایا اور یوں ہم خاتون پھوپھی کے ٹیوشن سینٹر آنے لگے اور اس کے چھ سات مہینے بعد کی بات ہے کہ خاتون پھوپھی کے بھائی ناصر احمد کا امریکن ویزا لاٹری میں نام آگیا اور ناصر احمد اپنی بیوی اور تینوں بیٹوں کے ساتھ امریکہ چلے گئے اور یہ گھر خاتون پھوپھی اور ان کے بچوں کا ہی ہو گیا۔ بھائی کے جانے کے بعد خاتون پھوپھی پر جب گھر اور بچوں دونوں کی ذمہ داری آ پڑی تو انہیں ٹیوشن سینٹر کی آمدنی کم لگنے لگی۔
پہلے گھر کے بلز اور کھانے پینے کا خرچہ کم از کم ان کی ذمہ داری نہ تھا۔ لہٰذا اماں نے انہیں ریڈی میڈ سوٹ کی سلائی کا مشورہ دیا اور یہ کام ایسا چل پڑا کہ اب پندرہ سولہ سال بعد بھی اماں اور خاتون پھوپھی اپنے اس چھوٹے سے بزنس میں مگن تھیں۔ معز انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ میں میتھس میں

ایم ایس سی کرنے کے بعد آج کل مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور ساجد فائن آرٹس میں ماسٹرز کرنے کے بعد اپنے بل بوتے پر کسی آرٹ یونیورسٹی لندن میں ایڈمیشن لے چکا تھا میں اور ساجد اپنی زندگی کی ہر کامیابی کا کریڈٹ خاتون پھوپھی کو دیتے تھے۔ نہ اس تپتی دوپہر میں خاتون پھوپھی ہمیں گلی سے پکڑتیں اور نہ ہی ہماری زندگی کو کوئی مقصد ملتا۔ رہ گئی مینا تو وہ اسی سال میٹرک کر کے فرسٹ ایئر میں آئی تھی۔ خاتون پھوپھی کے گھر میرا بلا تکلف۔ آنا جانا تھا کیونکہ اماں اور ان کے مشترکہ بزنس کی وجہ سے اکثر سامان اور پیسوں کے لین دین میں مجھے قاصد بنایا جاتا۔ روزانہ ان کے گھر آنے جانے کے باوجود مجھے مینا میں کبھی کوئی الگ بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

دو سال پہلے کی بات ہے۔ ساجد کی بہن کی شادی تھی۔ اس کے گھر روز گانا بجانا ہو رہا تھا۔ محلے کی لڑکیاں اکٹھا ہو کر رات گئے ہنگامہ مچاتی اور لڑکے باہر خوش گپیاں کرتے۔ میں نے ایک بھی دن مینا کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میری دونوں بہنیں بھی جاتی تھیں۔ آج ساجد کے گھر مایوں کی تقریب تھی۔ گلی میں ٹینٹ لگ رہا تھا۔ میں ساجد کے ساتھ صبح سے لگا ہوا تھا۔ شام کو نہا دھو کر میں نے اور ساجد نے سفید کرتا شلوار پہنا۔ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ زیادہ تر خواتین پیلے رنگ کے ملبوسات میں نظر آ رہی تھیں۔ ایسے میں میں نے مینا کو خاتون پھوپھی کے ہمراہ آتے دیکھا۔ وہ ابھی نویں کلاس میں آئی تھی اور مجھے بچی بچی سی ہی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ گہرے کلر کے ایک چمکیلے فراک میں ملبوس تھی جس کے اختتام پر میرون کلر کی بے حد چمکتی ستاروں کی بیل لگی تھی۔ اس نے سلور کلر کا تنگ پاجامہ اور سلور اور میرون دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ چہرہ اگرچہ ہر قسم کے میک اپ سے مبرا تھا لیکن کانوں میں جھولتے آویزوں نے اسے تھوڑا بڑا بنا دیا تھا۔ جب وہ ہمارے نزدیک پہنچی۔ تو ساجد ایک دم سے سامنے آگیا۔

"آج فرصت ملی ہے تمہیں آنے کی۔" وہ مینا کو ڈپٹتے ہوئے بولا۔

"بس ساجد بھائی! روز اماں سے کہتی تھی چلیں مگر ان کو تو اپنی سلائی سے فرصت نہیں۔" وہ جلدی سے صفائی دینے لگی۔

"ارے بیٹا! روزانہ اس سے کہہ رہی ہوں ہیں، نورین روز جاتی ہیں۔ تم بھی ان کے ساتھ چلی جاؤ مگر مانی ہی نہیں کہ آپ بھی چلیں تو چلوں گی۔ اب گانے بجانے میں ہم بوڑھوں کا کیا کام۔" پھوپھی شرمندگی سے بولیں۔

"آپ فکر نہ کریں پھوپھی! اس کی خبر تو اندر ابھی سب ہی لے لیں گے۔" مجھے نہ جانے کیوں مینا کا باہر کھڑا ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا اور میں چاہ رہا تھا کہ وہ لوگ فوراً اندر عورتوں میں چلی جائیں اور پھوپھی نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ میں اپنے اس احساس کو کوئی نام نہ دے سکا۔ لیکن دوسرے ہی دن میرے جذبات کھل کر سامنے آگئے۔ ہوا یوں کہ میں موٹر بائیک پر گھر کی جانب آرہا تھا کہ میں نے معز کو دیکھا وہ رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے موٹر بائیک روک دی۔ ہم مین روڈ پر اسٹاپ کے پاس تھے۔

"عادل بھائی! آپ گھر کی طرف جا رہے ہیں ناں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں کیوں خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اصل میں ٹیوشنز پڑھانے جانا ہے آپ یہ مینا کو دے دیجئے گا۔" اس نے ایک چھوٹا سا شاپر میری طرف بڑھایا جس میں کون مہندی جھانک رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے تھیلی لے لی اور سیدھا آکر خاتون پھوپھی کے دروازے کی بیل بجائی۔ پھوپھی دروازے پر آئیں تو میں نے کون ان کے حوالے کر دی اور خود گھر آگیا۔ ابھی میں نے فریج سے پانی نکال کر گلاس میں ڈالا ہی تھا کہ اماں آگئیں۔

"جاؤ ذرا معز کے گھر سے استری لے آؤ استری خراب ہو گئی ہے۔"

"ارے اماں! ابھی ابھی تو گھر آیا ہوں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں مجھے دکھائی دے رہا ہے ابھی آئے ہو۔ شام کو لائٹ چلی جائے گی۔"

"اچھا بابا! جاتا ہوں۔" میں نے ناچار اٹھتے ہوئے کہا اور دروازے سے نکل کر پھوپھی کی جانب آگیا اور ان کو مسئلہ بتایا۔

"اچھا رکو میں معز کی ایک شرٹ استری کرلوں پھر لائٹ چلی جائے گی۔ اس کے بعد بھلے شام تک واپس نہ کرنا۔ میرے اور مینا کے کپڑے تو استری ہیں۔" پھوپھی نے کہا۔ مینا پاس ہی کرسی پر بیٹھی اپنے ہاتھ میں مہندی لگا رہی تھی۔ پھوپھی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھالیا اور سرچنگ کرنے لگا۔

"یہ بتاؤ یہ تم لڑکیاں مہندی کیوں لگاتی ہو۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"بس اچھی لگتی ہے۔" وہ بہت انہماک سے اپنے ہاتھوں پر گل بوٹے بنا رہی تھی۔

"اچھا! میں نے تو سنا ہے لڑکیاں اپنے ہاتھ پر کسی کے نام کی مہندی لگاتی ہیں تم کس کے نام کی مہندی لگا رہی ہو۔" میں نے بلاوجہ بات بڑھائی۔

"آپ کے نام کی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ میں نے بے حد چونک کر اس کی جانب دیکھا مگر اس چہرے پر بچپنا تھا اور وہ مکمل طور پر مہندی میں گم تھی۔

"یہ دیکھیں لکھ بھی لیا۔" اس نے میرے سامنے ہاتھ لہرایا۔ جہاں ہتھیلی کے بیچوں بیچ انگریزی میں میرا نام لکھا تھا۔ وہ اب بھی بچپنے سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"پاگل ہوگئی ہو' مٹاؤ اسے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو پھوپھی کی کتنی بدنامی ہوگی۔" میں حقیقتاً گھبرا گیا اور اسے ڈانٹنے لگا۔ پہلے تو نا سمجھی سے وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر ایک دم ہی اس کا چہرہ گلنار ہوگیا اور وہ مجھ سے

نظر چرا کر صحن میں لگے واش بیسن کی جانب بھاگی اور اپنا ہاتھ دھونے لگی۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ واپس پلٹ کر آئی اور میرے پاس رک گئی۔

"تھینک یو عادل بھائی! میں واقعی بہت بے وقوف ہوں۔" وہ سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔

"آپ پلیز کسی سے مت کہیے گا۔" اس کے لہجے میں معصوم سا خوف تھا۔ میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ میں نے نجانے کس احساس کے تحت اس کی انگلیوں کی پوریں پکڑ کر ہتھیلی اپنے سامنے سیدھی کی۔ مہندی اپنا کام دکھا چکی تھی بہت تیزی سے میرے نام کا رنگ اس کی ہتھیلی پر چڑھا تھا میں اس کی ہتھیلی دیکھے گیا۔

"کہہ تو رہی ہوں سوری' میں کسی کو اپنا ہاتھ دیکھنے نہیں دوں گی۔ آپ کہیں تو میں آج شادی میں نہ جاؤں۔" وہ اب تک شرمندہ تھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں بے وقوف' اب بڑی ہوجاؤ۔" میں بمشکل اپنے احساسات سے باہر آیا۔

"یہ لو بیٹا' استری گرم ہے۔ احتیاط سے پکڑنا۔" پھوپھی برآمدے میں آگئیں۔ میں فوراً ہی ان کی جانب مڑ گیا۔

"اچھا پھوپھی! چلتا ہوں شام کو ملاقات ہوگی۔" میں نے ان کے ہاتھ سے استری لیتے ہوئے کہا اور نکلتے نکلتے ایک چور نظر اس پر ڈالی۔ وہ بھی میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملنے پر وہ شرمندہ ہوگئی۔ اس کی نظروں کا حجاب میرے دل کی دنیا بالکل بدل گیا۔ میں باہر نکل آیا لیکن گھر آکر بھی کسی کام میں دل نہ لگا اور شام کا انتظار کرنے لگا۔ ساجد کے ساتھ شادی ہال کے دو تین چکر لگائے۔ مغرب کے بعد گھر آکر تھوڑی دیر لیٹ گیا۔ دن بھر کی تھکن سے نیند آہی گئی۔ اور پھر بہت انتظار کے بعد بارات کا وقت بھی آگیا۔ میں نے کاٹن کا آسمانی کرتا شلوار جس کے گلے پر ہم رنگ دھاگوں سے کڑھائی کی گئی تھی۔ زیب تن کیا۔ دستک کی آواز سن کر میں دروازے کی جانب آگیا۔

"عادل بھائی میں آپ سے کہنے آیا تھا کہ اماں میرے ساتھ بائیک پر جارہی ہیں۔ اس لیے آپ لوگ ان کا انتظار نہ کیجیے گا۔" باہر معز کھڑا تھا

اصل میں ہمارے پاس ایک چھوٹی ہائی روف تھی جس پر اکثر پھوپھی اور مینا ہمارے ساتھ ہی آیا جایا کرتی تھیں۔ معز کی بات سن کر میں حیران ہوا۔

"اور مینا؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ نہیں جا رہی۔ صبح تک اچھی بھلی تھی مہندی وغیرہ بھی لگائی اب کہہ رہی ہے کہ میرے سر میں درد ہے اور باقاعدہ رو رہی ہے۔" معز نے پریشانی سے کہا۔ میرا دل ایک دم بے قرار ہو گیا۔

"لیکن معز! اس وقت پورا محلہ شادی ہال میں ہو گا اس طرح نہ صرف خالی گھر بلکہ خالی محلے میں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔" میں پریشانی سے بولا۔

"ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" معز بھی پریشان ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" ابا بھی باہر آ گئے۔ میں اور معز ان کو صورت حال بتانے لگے۔

"کوئی گل نہیں بیٹا جی! وہ میری بیٹی ہے۔ میں اسے لے آؤں گا تم لوگ اپنی تیاری کرو۔" ابا خاتون پھوپھی کے گھر کی جانب بڑھتے ہوئے بولے اور واقعی تھوڑی دیر بعد وہ مجھے ابا کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ میں ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ میں عقبی آئینے سے اسے گاڑی کی جانب بڑھتے دیکھ رہا تھا اس نے آسمانی رنگ کی بنارسی شیفون کی لمبی فراک پہن رکھی تھی ہم رنگ تنگ پاجامہ اور گولڈن نیٹ کا دوپٹہ جس پر آسمانی بنارسی ربن لگا تھا۔ اگرچہ چھوٹا سا آئینہ اس کے دید کی پیاس مکمل بجھا نہیں پا رہا تھا لیکن میں اس وقت اسے اتر کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ سب لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے بس اس کا انتظار تھا۔ وہ پیچھے اور ابا آگے میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ معز بھی گھر کو تالا لگا کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا اور یوں کچھ دیر میں ہم نزدیک ہی شادی ہال پہنچ گئے۔ ہال پہنچ کر وہ سب سے پہلے گاڑی سے اتری اور تیزی سے ہال میں چلی گئی۔ مجھے لگا وہ مجھ سے بچنا چاہتی ہے۔ ہال میں پہنچ کر میں ساجد کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ کیٹرنگ سے کھانا آ گیا تھا

اسے اتروایا۔ چیزیں چیک کیں۔ دوستوں یاروں سے ہنسی مذاق بھی چل رہے تھے۔ لیکن مجھے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ میرا دل ان سب کے بیچ کہیں بھی نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کو ڈھونڈتا ہوا عورتوں کی جانب چلا آیا اور وہ مجھے سبین' نورین اور محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھی نظر آئی۔ مہندی والا ہاتھ اس نے مٹھی بند کر کے اپنے رخسار پر ٹکایا ہوا تھا اور مجھے ایسا لگا کہ میرے نام کے ساتھ ہی میرا اپنا آپ بھی اس کی مٹھی میں قید ہو گیا ہو۔

"سبین! میں نے تمہیں اپنا موبائل دیا تھا۔" میں نے اپنی بہن کو مخاطب کیا۔

"جی بھائی! وہ امی کے پرس میں ہے میں لا کر دیتی ہوں۔" سبین اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی کیونکہ امی کہیں اور اپنی عمر کی خواتین میں تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی ہے۔ اگرچہ مجھے اس کی یہ گھبراہٹ اچھی لگ رہی تھی لیکن میں اسے نارمل کرنا چاہتا تھا۔

"اور بھئی تم سب کا کیا حال ہے؟" میں نے وہاں بیٹھی سب لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ محلے داری سب کے درمیان تھی لہٰذا ایک حد تک بات چیت ہو ہی جاتی تھی اور سب کچھ نہ کچھ بولنے لگیں۔ بس وہ خاموشی سے بیٹھی تھی۔

"یہ لیں بھائی۔" سبین واپس آ گئی اور موبائل میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ میں نے موبائل تھام لیا۔

"اور مینا' پھوپھی نے یہ چابیاں دی ہیں کہ اپنے پرس میں سنبھال کر رکھ لو۔" سبین نے گھر کی چابیاں اس کی جانب بڑھائیں۔ اس نے بے دھیانی میں اپنا مہندی والا ہاتھ آگے کر دیا۔

"ارے یہ کیا؟" سبین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا لیکن جب میں نے اس کی ہتھیلی کی جانب دیکھا تو اس کی عقل مندی پر حیران ہو گیا۔ اس نے ہتھیلی پر جہاں میرا نام لکھا تھا' وہاں سنی پلاسٹ لگایا ہوا تھا۔

"بس وہ ایسے ہی چھوٹی سی چوٹ لگ گئی تھی۔" اس نے جلدی سے چابیاں پکڑ کر مٹھی بند کر لی اور چور نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں مسکرا دیا۔ تو اس کا چہرہ ایک دم سرخ پڑ گیا۔

"دھیان سے کام کیا کرو۔ ویسے تو تم کوئی کام نہیں کرتیں سارے کام پھوپھی ہی کرتی ہیں۔ اب یہ چوٹ لگا کر پھوپھی کو نخرے دکھاتی رہنا۔" میں نے جان بوجھ کر اسے چڑایا اور ایسا لہجہ اختیار کیا کہ وہ وقتی احساسات سے باہر آ جائے۔

"جی نہیں بھائی! مینا اپنی امی کے ساتھ بہت کام کرواتی ہے۔ جب ہی تو پھوپھی اتنی سلائی کر لیتی ہیں۔" نورین جو اس کی ہم عمر تھی فوراً اس کی حمایت میں بولی۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ میں وہاں سے پلٹ آیا۔

☼ ☼ ☼

بعد میں میں نے اس سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ اس واقعے کا اثر اس کے ذہن سے زائل ہو گیا اور وہ پہلے کی طرح ہی مجھ سے بات چیت کرنے لگی۔ میرا خاتون پھوپھی کے گھر روز کا آنا جانا تھا اگر اس کے کچے ذہن پر اس بات کا کوئی اثر رہ جاتا تو ایسی باتیں بہت جلد گلی محلے میں گردش کرنے لگتی ہیں اور مجھے اپنی اور اس کی دونوں کی عزت بہت پیاری تھی۔

اور آج دو سال گزرنے کے بعد محبت کے پودے نے میرے دل میں عشق کے تناور درخت کا روپ دھار لیا تھا لیکن میں نے اپنے محبوب کو اس آتش سے بے خبر ہی رکھا تھا۔ میں تقریباً" روز ہی اسے دیکھتا تھا۔ کبھی اس کے اپنے گھر میں اور کبھی اپنے گھر میں نورین کے ساتھ۔ وہ خاتون پھوپھی سے بلاوجہ کی فرمائشیں کرتی۔ معز کو نخرے دکھاتی اور مجھ سے تو وہ باقاعدہ لڑنے لگی تھی۔ اگرچہ پھوپھی اور معز دونوں اسے اس بات پر ٹوکتے تھے۔

ان ہی دنوں میں نے سنا کہ خاتون پھوپھی کے بھائی

ناصر احمد اپنے بڑے بیٹے طلال کے ساتھ پاکستان آ رہے ہیں۔ طلال میرا ہم عمر تھا۔ خاتون پھوپھی' بھائی کی آمد کا سن کر بہت خوش تھیں۔ اپنی بچت میں سے انہیں گھر میں کچھ تبدیلیاں کروانی تھیں لہٰذا مجھے اور ابا کو بلا کر مشورہ کرنے لگیں۔ ابا نے انہیں سمجھایا کہ ناصر احمد ایک ڈیڑھ مہینے کے لیے آ رہے ہیں اس لیے زیادہ لمبا خرچا کرنے کی ضرورت نہیں' پھر بھی انہوں نے باتھ روم کو ذرا جدید بنوایا اور بیڈ روم میں کارپٹ وغیرہ ڈال لیا۔ جس سے کمرا کافی خوب صورت لگنے لگا۔

اور پھر ایک روز رات نو بجے کی فلائٹ سے ناصر احمد اور طلال پاکستان پہنچ گئے۔ ناصر احمد اور طلال دونوں ویسے ہی نظر آ رہے تھے جیسے چودہ پندرہ سال امریکہ میں رہنے والے پاکستانی ہو جاتے ہیں۔
پاکستان کی گرمی' پاکستان کی گندگی اور پاکستانیوں کی زبان اور لباس کو اپنی زبان کے تمغے پہناتے ہوئے۔ پاکستان کی مہنگائی میں اے سی افورڈ کرنا خاتون پھوپھی کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن ناصر احمد نے آتے ہی اپنے بیڈ روم میں اے سی لگوایا اور اس عمل میں وہ مجھے حق بجانب بھی لگے کیونکہ ان کے لیے یہ گرمی جھیلنا آسان نہ تھا۔

طلال ایک دو روز میں اپنے امریکن رویے سے خود بخود تھوڑا نیچے آ گیا اور معز کے ساتھ محلے کے لڑکوں سے ملنے جلنے لگا۔ میں چونکہ امتحان کی تیاری میں مصروف تھا لہٰذا میری اس سے ملاقات کم ہی ہو پاتی تھی۔

٭ ٭ ٭

ایک روز میں یونیورسٹی سے گھر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ آج ابا بے وقت گھر پر ہیں اور اماں بھی بڑی متحرک اور مستعد نظر آ رہی ہیں۔ گرمی نے چونکہ میرا حال برا کیا ہوا تھا لہٰذا میں آتے ہی غسل خانے میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد جب باہر آیا تو دیکھا اماں اور ابا دونوں سر جوڑے کرسی نزدیک کیے بیٹھے ہیں۔

"کیا خفیہ میٹنگ چل رہی ہے؟" میں نے تولیہ سے سر جھاڑتے ہوئے کہا۔
"دعا کرو بیٹا' جو سوچ رہے ہیں' وہ پورا ہو جائے۔" اماں نے جوش سے کہا۔
"پتا بھی تو چلے کہ کیا سوچ رہے ہیں؟" میں نے تجسس سے کہا۔
"ہم مینا کے لیے تمہارا رشتہ لے کر جا رہے ہیں۔" ابا نے غور سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ میں حقیقتاً "دنگ رہ گیا۔
"یہ خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟" میں واقعی حیرت زدہ تھا۔
"کل ناصر احمد سے ملاقات ہوئی تھی اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے مینا کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہے۔ بس میں چاہتا ہوں اس کے سوال کرنے سے پہلے میں معز کی ماں سے بات کر لوں۔" ابا نے تفصیل سے جواب دیا' اماں کپڑے بدلنے چلی گئیں۔
"لیکن ابا ابھی تو میرا کوئی مستقبل واضح نہیں ہے۔" میں نے کہا۔
"ہو جائے گا' وہ بھی ہو جائے گا۔ تو نے پڑھ لکھ لیا ہے آگے اس کا نصیب اور اللہ مددگار ہے۔" ابا نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔
"پھر بھی ابا۔" میں ابھی بھی متذبذب تھا۔
"تو بتا' تو دل سے ایسا نہیں چاہتا؟" ابا نے غور سے مجھے دیکھا۔ میں ابا کے اتنے درست اندازے پر حیران رہ گیا۔ وہ بات جو میرے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ تھی اور جس بات کا میرے علاوہ کوئی رازدار نہ تھا اسے میرے ابا نے جان لیا۔
"تو پچھلے دو سال سے اسے پسند نہیں کرتا؟" وہ پھر گویا ہوئے۔ میری آنکھوں میں حقیقتاً "آنسو آ گئے۔ میں ابا کے گلے لگ گیا۔
"ابا آپ کو کیسے پتا ہے؟"
"سب پتا ہے مجھے' میرے بیٹے کے دل میں کیا ہے۔" انہوں نے نہایت گرم جوشی اور محبت سے میرا ہاتھ دبایا۔

"بس تم دعا کرو خاتون بی بی مان جائے۔" انہوں نے کہا اور اٹھ گئے۔ میرا تو رواں رواں دست دعا بن گیا۔ اماں اور ابا نے ابھی دونوں بہنوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے خدانخواستہ انکار کی صورت میں آپس کی دوستی میں کوئی فرق پڑے۔

"جلدی کریں بجت' ناصر احمد آج بیٹے کو لے کر اپنی سسرال کی طرف گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کے آنے سے پہلے ہو آؤں۔" ابا نے اماں کو پکارا۔

"لیجئے میں آگئی۔" اماں اپنے سر پر چکن کی چادر جماتے ہوئے بولیں۔

"کچھ مٹھائی پھل تو لے لیں۔" اماں نے ابا سے کہا۔

"لے کر آیا ہوں گاڑی میں رکھے ہیں جان کر کے گھر میں نہیں لایا بچے سوال کرتے۔" ابا نے جواب دیا۔ دونوں چلے گئے اور میں وہیں برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ جانے کتنی ہی دیر گزر گئی۔

"ہائے بھائی! چھ بج گئے۔ آج اماں نے اٹھایا نہیں۔" اندر کمرے سے سبین آنکھیں ملتی باہر آئی۔ دونوں کالج سے آکر کچھ دیر آرام کرتی تھیں۔

"معلوم نہیں اماں کہاں ہیں۔ میں ابھی آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اماں نہیں ہیں؟ گئی ہوں گی خاتون پھوپھی کے ساتھ کسی بازار' آپ چائے پئیں گے؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"ہاں بنالو' کچھ کھاؤ گی؟ لے کر آؤں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھائی ابھی سموسے تازہ بنے ہوں گے' لے آئیں۔" وہ جلدی سے بولی تو میں مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔ سموسے لے کر واپس آیا تو نہ صرف نورین بھی اٹھ چکی تھی بلکہ اماں ابا بھی واپس آچکے تھے۔ دونوں چھوٹے اس وقت کرکٹ گراؤنڈ میں ہوتے تھے۔

"کیا ہوا ابا؟" جب نورین' سبین اپنے چائے کے کپ اٹھا کر ٹی وی میں منہمک ہوگئیں تو میں نے آہستہ سے ابا سے پوچھا۔

"ہاں' خوش تو بہت ہوئی ہے معز کی ماں لیکن کہہ رہی تھی بھائی سے مشورہ کرکے جواب دوں گی۔" انہوں نے بتایا۔ مگر ان کے لہجے میں ہلکی سی فکر تھی۔

"تم اپنے امتحان کی تیاری پر پوری توجہ دو' سمجھ لو کہ تمہارا یہ امتحان پاس کرنا میری سب سے بڑی خواہش ہے۔" انہوں نے بہت کامیابی سے میری سوچوں کا رخ موڑ دیا۔ صرف چھ دن رہ گئے تھے۔ مجھے اسلام آباد جانا تھا۔ میرا ایک ہی وقت میں دو امتحانوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ کون سی ایسی دعا تھی جو میں نے ان دنوں پڑھ نہ لی ہو۔

میرے جانے سے دو روز پہلے میں رات کے وقت چھت پر بیٹھا تھا تو میں نے طلال کو دیکھا' وہ موبائل کانوں سے لگائے ٹہل ٹہل کر باتوں میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے آہستہ سے ہاتھ ہلایا اور دوبارہ باتوں میں مصروف ہوگیا اور میں بلاوجہ ہی اپنا اور اس کا موازنہ کرنے لگا۔ وہ ایک درمیانے قد کا صاف ستھری رنگت والا خوب صورت جوان تھا۔ تعلیمی قابلیت بھی ٹھیک تھی۔ امریکہ میں کسی نجی ادارے میں جاب کر رہا تھا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جو مڈل کلاس کی کسی لڑکی کا خواب ہوسکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے مینا کی آواز آئی' وہ نیچے سے طلال کو پکار رہی تھی۔ طلال فون بند کرکے مجھے مسکرا کر دیکھنے لگا پھر منڈیر کے پاس آیا۔

"یار! تم کہاں ہو۔ نظر ہی نہیں آتے؟" اس نے مجھ سے شکوہ کیا۔

"بس طلال۔ دو دن بعد مجھے اسلام آباد جانا ہے اسی کی تیاریوں میں ہوں۔ تم سناؤ۔" میں نے خوشدلی سے جواب دینے کی کوشش کی۔

"ہاں ٹھیک ہوں بس پاکستان کی گرمی نے مارا ہوا ہے۔ نیچے سگنل ٹھیک نہیں آتے ہیں تو امی سے بات کرنے اوپر آجاتا ہوں۔" اس نے کہا تو میں ٹھٹک گیا۔ کیونکہ وہ جس انداز میں فون پر بات کر رہا تھا وہ ماں سے بات کرنے کا انداز نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر ہوا کے دوش پر جو ہلکی پھلکی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی وہ مکمل انگریزی میں تھی۔ یقیناً "انیسہ آنٹی سے مکمل بات انگریزی میں نہیں کی جاتی ہوگی۔

"اچھا چلتا ہوں، نیچے کھانے پر میرا انتظار ہو رہا ہے۔" وہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

اسی رات کی بات ہے مجھے اپنے موبائل پر معز کا میسج ملا۔

"عادل بھائی چھت پر آئیں، مجھے ضروری بات کرنی ہے۔" میں اوپر آیا تو دیکھا۔ معز ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ وہ منڈیر پر کود کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا معز؟"

"عادل بھائی! آپ کو پتا ہے۔ ماموں نے طلال بھائی کے لیے مینا کا رشتہ دیا ہے۔" اس نے دبے دبے جوش سے بتایا۔

"اچھا مبارک ہو پھر؟" میں نے اوپری دل سے مبارک باد دی۔

"مگر امی راضی نہیں ہو رہی ہیں۔" اب اس کے لہجے میں فکر تھی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہی ماؤں کی محبت کہ اتنی دور اکلوتی بیٹی چلی جائے گی۔ بھائی چودہ سال بعد آیا ہے میں اپنی بیٹی کو دوبارہ دیکھ پاؤں گی کہ نہیں وغیرہ وغیرہ اور شاید مینا کا کوئی اور بھی رشتہ آیا ہوا ہے ان کے کسی بہت اچھے جاننے والوں کے ہاں سے۔ کہہ رہی ہیں کہ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ مینا اسی شہر میں رہے گی آتی جاتی رہے گی۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں واقعی سمجھ نہیں سکا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

"اصل میں طلال بھائی نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میری سگی بہن وہاں ہو گی تو میرا امریکن امیگریشن آسان ہو گا اور سال بھر میں وہ مجھے وہاں بلا لیں گے۔ نہ صرف مینا کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا بلکہ میرا مستقبل بھی روشن ہو جائے گا۔ لیکن امی سمجھ نہیں رہیں انہیں خدا معلوم کون سی فکر اور ڈر ہے۔ کہہ رہی ہیں۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا نظر آ رہا ہے کوئی بات ہے جو میرے دل کو کھٹک رہی ہے۔ اب بتائیں کیا بات ہو سکتی ہے۔ لڑکا آنکھوں کے سامنے ہے خوب صورت صحت مند، برسر روزگار میں نے تو طلال بھائی میں کوئی بری عادت نہیں دیکھی۔ آپ کی اماں سے بہت دوستی ہے۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ زندگی بدلنے کے ایسے موقع بار بار نہیں ملتے۔ جب میں اور مینا وہاں جائیں گے تو اماں کو لے جانا کون سا مشکل ہو گا۔ آپ پلیز اماں سے بات کریں۔" وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

"اور مینا کیا کہتی ہے اس سے بات ہوئی تمہاری؟" میں نے پوچھا۔

"مینا تو ابھی بچی ہے اس نے کیا کہنا ہے اور مجھے یقین ہے اتنا اچھا رشتہ اسے کیوں ناپسند ہو گا۔"

"اچھا تم چلو میں آتا ہوں۔ ناصر انکل اور طلال ہیں گھر پر؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ لوگ اپنے ننھیال والوں کے ساتھ آج کہیں ویک اینڈ منانے نکلے ہیں۔ آپ بس آجائیں۔" وہ منڈیر سے اترتے ہوئے بولا اور میں تھوڑی ہی دیر میں خاتون پھوپھی کے گھر پر تھا۔

"آج تم کیسے رستہ بھول پڑے۔" پھوپھی مجھے دیکھ کر واقعی خوش ہو گئیں میں واقعی بہت دن بعد ان کے گھر آیا تھا۔

"بس دو دن بعد جانے والا ہوں تو سوچا آپ سے کہوں کہ مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں۔" میں ان کے قریب تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا تم اور ساجد تو ہمیشہ معز کی طرح میری دعاؤں میں رہتے ہو۔" انہوں نے دلی محبت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"مجھے یقین ہے، آپ اب بھی میرے لیے بہت دعا کریں گی۔" میں نے فرط محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"اوہو، محترم عادل شبیر صاحب تشریف لائے ہیں۔ مستقبل کے ایس پی، یا انکم ٹیکس آفیسر، کسٹم آفیسر یا پھر ریلوے کا محکمہ تو کہیں نہیں گیا۔" مجھے اپنے پیچھے سے مینا کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔

"کیا حال ہے۔" میں نے ہلکا سا رخ موڑ کر کہا اور اسے مکمل دیکھنے سے پرہیز کیا۔

"ہمیں کیا ہونا ہے' ماشاء اللہ ٹھیک ہیں بلکہ خوش ہیں۔" اس نے عام سی بات کی لیکن نا معلوم کیوں مجھے اس کا لہجہ خاص لگا۔

"چائے پئیں گے آپ؟ میں لماں اور معز بھائی کے لیے بنانے جا رہی ہوں۔"

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے' جاؤ بناؤ۔" پھوپھی نے کہا اور وہ مڑ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

"پھوپھی میں آپ کے پاس ایک خاص کام سے آیا تھا۔" میں نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو بیٹا۔" انہوں نے میرا چہرہ غور سے دیکھا۔

"معز بتا رہا تھا' مینا کے لیے طلال کا رشتہ آیا ہے۔" میں نے تمہید باندھی۔ انہوں نے بہت حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر معز کی جانب نظر کی۔ مجھے ان کی آنکھوں میں شدید خفگی نظر آئی۔

"تمہیں معز بلا کر لایا ہے؟" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ میں نے جلدی سے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"دیکھیں آپ معز کو غلط مت سمجھیں۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ زمانے کے عین مطابق ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"عادل میں اپنی بھابھی کو جانتی ہوں۔ چودہ سال بعد اسے نند کی محبت ایسے ہی یاد نہیں آگئی ہے یقیناً اس کے پیچھے کوئی اور وجہ ہے۔ بات ابھی کھل نہیں رہی لیکن میں بعد میں پچھتانا نہیں چاہتی۔ معز اور مینا میری زندگی کا کل سرمایہ ہیں۔ میں نے اپنی جوانی کے دن ان بچوں کی پرورش میں ختم کردیے۔ اب میں کسی بھی لالچ میں آکر یہ سرمایہ لٹا نہیں سکتی۔ میری دو دفعہ فون پر انیسہ بھابھی سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے ایسے میٹھے لہجے میں مجھ سے بات کی جو ان کی طبیعت کا حصہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے چودہ سال کی دوری نے مزاج پر فرق ڈالا ہو لیکن اپنی بچی کو اتنی دور بھیجنا میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھیں "اور پھر جب میرے سامنے ایک من پسند رشتہ موجود ہے تو میں اتنی دور کیوں بھیجوں۔" انہوں نے کھل کر بات کی۔

"آپ میری فکر چھوڑیں' معز اور مینا کے مستقبل کو دیکھیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ معز نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اگرچہ میں اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا پھر بھی مجھے یقین تھا کہ وہ شدید حیرت میں ہے۔

"یہ لیں' چائے حاضر ہے۔" مینا نے بہت صحیح وقت پر انٹری دی اور تخت پر لا کر ٹرے رکھی اور سب کو کپ پکڑائے میں نے بھی اس کی طرف دیکھے بغیر کپ پکڑ لیا۔

"کیا بات ہے' کیا کوئی بہت سنجیدہ بات ہو رہی تھی۔" اس نے اپنا کپ لے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہے کوئی مسئلہ؟" پھوپھی نے کہا۔

"مجھ سے مشورہ کرلیں' میں بڑے اچھے مشورے دیتی ہوں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"اچھا چلو تم ہی مشورہ دو۔" میں نے اتنے عرصے میں پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔

"سبین کے لیے کسی نے مجھ سے رشتے کی بات کی ہے۔ لڑکا باہر ہے' خوب صورت ہے اور ایک رشتہ اور ہے' ہمارے رشتہ داروں کا ہم ہی جیسے لوگ۔ تم بتاؤ کہ کون سا مناسب ہے۔"

"ظاہر ہے باہر والا۔ سبین اگر پاکستان سے باہر چلی گئی تو آپ کو اور چھوٹے بھائیوں کو بھی اپنی تقدیر بدلنے کا موقع ملے گا۔ پڑھنے لکھنے کے باوجود پاکستان میں بچے لوگوں کو کیا ملتا ہے' کیا مستقبل ہے ان کا۔ آپ کو مجھ سے زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔" مینا اس وقت مجھے بہت سنجیدہ اور بردبار نظر آئی۔

"تم بھائی کی فکر چھوڑو اگر سبین صرف اپنے لیے سوچے تو اس کا فیصلہ کیا ہوگا تمہارے خیال میں۔" معز نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا اور اس بار مجھے اس کے لہجے میں جذباتیت کے بجائے گہری سنجیدگی محسوس ہوئی۔

"میرا خیال ہے کہ سبین کو باہر جانے کا فیصلہ ہی کرنا چاہیے' اچھی زندگی یعنی ابروڈ کی زندگی تو تقریباً" ہر

لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔" وہ پُرخیال انداز میں بولی۔

"ویسے کون لوگ ہیں، مجھے بھی بتائیں نا۔ کب تک شادی کا ارادہ ہے۔" وہ جوش میں آ گئی۔

"پاگل ہو تم۔" پھوپھی خفگی سے بولیں۔ "ابھی کسی نے تذکرہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ماں باپ سبین سے پوچھے بغیر ہی انکار کر دیں۔ تم سبین کے سامنے کوئی تذکرہ نہ کرنا۔"

"اوکے۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"اچھا پھوپھی میں چلتا ہوں۔" میں نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جاؤ اللہ کی امان میں دیا۔ میں صبح آؤں گی تم سے ملنے۔" وہ پُرخیال انداز میں تھیں۔ معز مجھے چھوڑنے دروازے تک آیا۔

"عادل بھائی میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کروں یا آپ سے سوری کروں۔" اس کے لہجے میں بہت شرمندگی تھی۔

"سوری کرنے کی کیا بات ہے اپنے بارے میں بہتر سے بہترین سوچنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ تم نے سوچا تو کیا برا کیا۔" میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور باہر نکل آیا۔ مینا کا فیصلہ بہت واضح تھا۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

دوسرے دن میں بے دلی کے ساتھ اپنے جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ خاتون پھوپھی اور معز مجھ سے ملنے آئے۔ تھوڑی دیر میں ان کے ساتھ بیٹھا اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اماں اور ابا دونوں بجھے بجھے سے ہیں۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو ابا نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

"یار! تیرے باپ سے ایک غلطی ہو گئی۔ مجھے اس وقت تیرے رشتے کی بات چھیڑنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ بس تو اسے باپ کی محبت کہہ لے۔ مگر دیکھ تیرا یہ امتحان پاس کرنا تیرے باپ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔" ان کا لہجہ گلوگیر تھا۔

"ابا! آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میری پوری توجہ اس وقت اس امتحان پر ہے۔" میں نے اپنے لہجے کو جس قدر ممکن ہو سکتا تھا مضبوط بنایا۔

"جیتے رہو۔" وہ شفقت سے بولے۔

☆ ☆ ☆

آج اسلام آباد میں مجھے تیسرا دن تھا۔ چونکہ اسلام آباد میں ہمارا کوئی رشتہ دار نہ تھا اس لیے میں ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ کل صبح میرا پرچہ ہو چکا تھا۔ لیکن میرا واپس کراچی جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ کل شام ہی سبین نے مجھے بتایا تھا کہ جمعرات کی شام کو مینا اور طلال کا نکاح ہے۔ میں نے ابا سے کہا کہ میں اتنی دور دوستوں کے ساتھ آیا ہوں تو تھوڑا گھوم پھر لوں۔ ابا نے بھی مجھ سے آنے پر اصرار نہیں کیا۔ حالانکہ میرے ساتھ جو چار لڑکے آئے تھے ان میں سے دو اپنے رشتے داروں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ایک امتحان دے کر لاہور کسی عزیز کے گھر چلا گیا تھا اور ایک واپس کراچی کے لیے روانہ ہو چکا تھا اور اس وقت میں اسلام آباد کی سڑکوں پر مٹرگشت کرنے کے لیے بالکل تنہا تھا۔

جمعرات کا دن میرے لیے عجیب سی چبھن لے کر آیا۔ منزل کے بہت پاس آ کر سب کچھ کھو دینے کا احساس تھا۔ رات میں نے پہلی بار نیند کی دو گولیاں لیں اس لیے صبح ذرا دیر سے ہوئی۔ ایک بجے ہوٹل کے کمرے سے باہر آ کر میں نے سامنے ہوٹل پر جا کر اپنے لیے صرف ایک کپ چائے مانگی۔ کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ میرے سیل فون کی بیل بج رہی تھی میں نے دیکھا کہ میرے اسلام آباد میں ٹھہرنے والے دو دوستوں میں سے ایک کا نمبر تھا۔ اس نے بہت جوش میں بتایا کہ اس نے مری گھومنے کا پروگرام بنایا ہے اور اس کے ساتھ اس کے خاندان کے کچھ اور لڑکے بھی ہیں اور مجھے ہر صورت اس کے ساتھ جانا ہے۔ اگرچہ میرے پاس نہ جانے کے ہزار بہانے تھے لیکن میں اس وقت کراچی جانے سے بچ رہا تھا لہٰذا میں نے ہامی بھر لی۔ میرے دوست ہادی کے خاندان کے لڑکے اسی

کے ہم عمر تھے۔ تقریباً "سب ہنسنے بولنے والے" دو دن ان کے ساتھ مزے میں کیسے کٹے پتا ہی نہیں چلا' اتوار کی صبح ابا کا فون آ گیا۔

"آ جا یار!" ان کے اس چھوٹے سے جملے نے مجھے تڑپا دیا اور میں نے فوراً "ہی رخت سفر باندھ لیا۔ ہادی اور اس کے کزنز بھی اب واپسی کا ارادہ کر رہے تھے۔ ہادی میرے ساتھ ہی ڈائیوو سے واپس آیا۔ بس اسٹینڈ پر ابا پہلے سے موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بہت پرجوش انداز میں گلے لگا لیا۔

"پاس ہو گیا میرا بیٹا۔" انہوں نے اعلانیہ انداز میں کہا۔

"ابھی کہاں ابا! ابھی تو اس پیپر کا رزلٹ آئے گا پھر انٹرویو وغیرہ' ابھی تو لمبا پروسس باقی ہے۔" میں ان کی سادگی پر مسکرایا۔

"ہاں ہاں' ہو ہی جائے گا اس میں بھی۔" ان کا جوش کچھ جدا تھا۔ گھر پہنچا تو سبین اور نورین بے تابانہ میرے گلے لگ گئیں۔ اماں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ اتنی محبتوں کا میں کس طرح امتحان لے سکتا تھا۔

"بھائی آپ جلدی سے اپنے دو چار دوستوں کو فون کر دیں۔ وقت بہت کم ہے۔" نورین جوش میں تھی۔

"کیوں بھئی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ابا! آپ نے بھائی کو بتایا نہیں۔" سبین نورین دونوں ابا کی طرف گھوم گئیں۔ ابا پُراسرار سا مسکرا رہے تھے۔

"آج آپ کا نکاح ہے۔" نورین باقاعدہ میرے گلے میں جھول گئی اور دونوں چھوٹے بھائی بھنگڑا ڈالنے لگے۔

"نہیں۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ابا میرا غم غلط کرنے کے لیے ایسا بھی کر سکتے ہیں یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"نہیں کیا؟ دلہن کا جوڑا جا چکا ہے' آپ کا آ چکا ہے۔" سبین چہکی۔

"دلہن کا نام نہیں پوچھیں گے؟" نورین شرارت سے بولی۔

"میں بتاؤں گی۔" سبین نے کہا۔

"نہیں میں بتاؤں گی۔" نورین نے سبین کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا میں ٹکر ٹکر دونوں کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"او جھلیوں بھائی کے صبر کا امتحان نہ لو۔ ہم نے مینا سے تیرا نکاح طے کر دیا ہے۔" ابا نے حقیقت میں دھماکا کر دیا۔ میری دانست میں تو اسے کسی اور کا ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔

"لیکن اس کا نکاح تو جمعرات کو۔۔۔" میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔

"نہیں ہوا۔ خاتون بی بی نے منع کر دیا بلکہ خاتون بی بی سے پہلے معز نے انکار کر دیا۔"

"لیکن کیوں' کیسے؟" میں ابھی تک حیران تھا۔

"وجہ تو مجھے نہیں معلوم بیٹے! بس مجھے اتنا پتا ہے کہ میرے رب نے میرے دل کی سن لی اور آج مجھے میری پسند کی بہو مل جائے گی۔" ابا حقیقتاً "بے حد خوش تھے۔

"ابا میں ابھی آیا۔" میں جلدی سے گھر سے باہر آ گیا۔

"او ٹھہر بیٹا۔" ابا میرے پیچھے باہر آئے۔ "ابھی برابر میں نہ جانا اچھا نہیں لگے گا۔ تمہیں معز سے بات کرنی ہے تو فون کر کے باہر بلا لو۔" ان کی یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے معز کو فون کیا تو وہ بولا۔

"میں کمپیوٹنگ پر ہوں' آپ یہیں آ جائیں۔" میں بائیک اڑاتا ہوا کوان سینٹر پہنچا۔ معز دکان کے باہر ہی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مجھے انتہائی گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔

"عادل بھائی میں اللہ کا جتنا بھی احسان مانوں کم ہے۔" ہم دونوں سامنے چائے کے ہوٹل پر بیٹھے تو وہ سر جھکا کر بولا۔

"لیکن ابھی بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تم لوگوں نے طلال کے رشتے سے کیوں انکار کر دیا۔" میں متجسس تھا۔

"میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔ جس دن آپ

اسلام آباد کے لیے نکلے۔" اسی روز امی نے ماموں جان سے اقرار کرلیا۔ مینا کو بھی بتایا۔ وہ حیران ہوگئی پھر رونے لگی کہ امی میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ امی نے اس سے کہا کہ تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ امریکہ میں رہنا تو ہر لڑکی کی زندگی کا خواب ہے۔ اب اللہ تمہیں اور منو کو اپنی تقدیر بدلنے کا موقع دے رہا ہے۔ میرا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن۔ تم لوگ میری وجہ سے اپنا مستقبل خراب مت کرو۔"

"اچھا! تو اس روز عادل بھائی! یمین کا نام لے کر میری رائے لینا چاہ رہے تھے۔ لیکن امی میں نے جو کچھ کہا تھا وہ یمین کو ذہن میں رکھ کر کہا تھا۔ وہ پانچ بہن بھائی ہیں۔ اگر ایک دو باہر چلے جاتے ہیں تو بھی خالہ خالو کے پاس کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ لیکن آپ کے پاس اگر میں اور منو بھائی نہ ہوں تو... امی میں ایسی خود غرض لگتی ہوں آپ کو؟" وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا تو چونک کر بولی۔ "اور وہ دوسرا رشتہ کس کا تھا جس کا عادل بھائی تذکرہ کر رہے تھے؟"

"خود عادل کا۔" امی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"امی! آپ نے ماموں کو جواب دینے میں بہت جلدی کی۔ ایک بار کھل کر مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔" وہ روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

"یقین مانیے عادل بھائی! مجھے ایسا لگا میں نے اپنے بہتر مستقبل کے جنون میں اپنی بہن کی خوشیاں ختم کر دی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ایسا کروں جو یہ رشتہ ختم ہوجائے۔ دوبارہ مینا کے پاس گیا لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی بھی اور یہ بھی پوچھا کہ کیا مجھے کوئی کام ہے لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں دکھ کی ایک واضح لکیر نظر آرہی تھی۔ شاید میں نے اپنی تمام زندگی میں خدا کو اتنی شدت سے یاد نہیں کیا جتنا اس وقت یاد کیا اور میرے کریم پروردگار نے مجھے مایوس بھی نہیں کیا اور وہ ہوگیا جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ نکاح سے ایک دن پہلے طلال بھائی میرے پاس آئے اور مجھ سے میرا موبائل مانگا۔

"یار! میرے موبائل میں ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔ صحیح کام نہیں کر رہا مجھے امی سے بات کرنی ہے ذرا اپنا موبائل دے دو۔" میں نے انہیں اپنا موبائل دے دیا۔ وہ سم بدلنے لگے۔ میں کہا کہ اس میں بیلنس ہے آپ اس سے بات کرلیں تو کہنے لگے "نہیں اتنا لمبا نمبر ہے مجھے یاد نہیں ہے۔ میری تو سم میں save (محفوظ) ہے اور ایک دوست کو بھی کرنا ہے۔" وہ سم تبدیل کر کے میرا موبائل لے کر چھت پر چلے گئے اور ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے لا کر دے دیا۔ رات میں جب میں بستر پر لیٹا اور اپنے موبائل کی سرچنگ کرنے لگا تو اس کی میموری آؤٹ لوڈڈ تھی۔ اصل میں میرے موبائل میں آٹو ریکارڈر ہے کالز خود بخود ریسیو ہوجاتی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ طلال بھائی نے امریکہ بات کی ہے جس کی وجہ سے میموری فل ہوگئی ہے۔ آپ یقین جانیے کہ میرا ان کی کال سننے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن میرا رحیم پروردگار جو کرتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے۔ انہوں نے پہلی کال کسی نکولین نامی لڑکی کو کی تھی۔ جو انہیں طلال نہیں بلکہ بلال کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور ان کو جلد از جلد واپس آنے کی ہدایت کرتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی ڈلیوری میں پندرہ دن رہ گئے ہیں لہٰذا بلال پندرہ دن سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔" معز نے تھوڑا جھجک کر بتایا۔

"لیکن عادل بھائی! میں حیران تھا کہ وہ طلال بھائی کو بلال کیوں کہہ رہی ہے۔ بلال تو طلال بھائی کا دوسرا جڑواں بھائی ہے جو ان سے چند منٹ بڑا ہے۔ اگر یہ بلال ہے تو پھر طلال کہاں ہے اور یہ کیا راز ہے؟ لیکن اس راز سے پردہ دوسری کال کو سننے کے بعد ہٹ گیا۔ میں نے وہ کال اب تک آپ کو سنانے کے لیے ڈیلیٹ نہیں کی ہے۔" معز نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کچھ سرچنگ کرنے لگا اور کچھ دیر بعد اس نے موبائل کا اسپیکر آن کر کے میز پر رکھ دیا۔ جس میں طلال کی آواز صاف تھی۔

"ہیلو امی! بلال بات کر رہا ہوں۔ کیسی ہیں آپ۔"

"ارے بیٹا! میں بڑی مشکل میں ہوں۔ بلال تم

باپ بیٹا تو پاکستان جا کر بیٹھ ہی گئے ہو۔ اتنا ذرا سا کام تم لوگوں سے نہیں ہو رہا۔" مجھے انیسہ آنٹی کی آواز سنائی دی۔

"بس ابی کل نکاح ہے۔ اس کے کچھ دن بعد ہم واپس آ رہے ہیں۔ طلال کا کیا حال ہے؟"

"وہی حال ہے۔ کبھی تو بالکل ٹھیک ہوتا ہے اور کبھی دیوانوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کا جو میل نرس تھا جسے تم ہائر کر کے گئے تھے وہ بھی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ چھوڑ کیا گیا میں نے خود ہی نکال دیا۔ پورے پانچ سو ڈالر بڑھانے کے لیے کہہ رہا تھا کہ اس کا تو ہر کام بستر پر ہوتا ہے، کچھ بھی نہیں بتاتا جب ذہنی رو ٹھیک نہ ہو۔ بتاؤ کہاں سے اتنی رقم کا نرس رکھیں۔ اب اس کی بیوی آئے گی تو خود ہی دیکھ لے گی۔ نہ یہ ایکسیڈنٹ ہوتا نہ یہ مصیبت پڑتی۔"

"اس کی بیوی؟" بلال بڑی زور سے ہنسا۔ "سچ امی! بڑی معصوم سی لڑکی ہے' نام صرف طلال کا استعمال ہو رہا ہے۔ نکاح تو میرا ہی ہو رہا ہے نا۔" اس کے لہجے میں عجیب سے خباثت تھی۔

"بکواس مت کرو۔ یہ بتاؤ کسی کو شک تو نہیں ہوا کہ تم طلال نہیں بلال ہو تمہاری پھوپھی بہت چالاک عورت ہے۔"

"ہاں ہیں تو چالاک لیکن میں نے اپنا امیج ایسا بنایا کہ پورا گھرانہ ہی بے وقوف بن گیا۔ وہ منو' معز تو یہ سمجھ رہا کہ ہم دو تین مہینے میں اسے امریکہ بلالیں گے۔" ایک اور مذاق اڑاتی ہنسی۔

"بس تم لوگ جلدی کرو۔ لڑکی لے کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو' اس سے پہلے کہ کسی کو شک ہو جائے۔"

"شک کیسے ہو گا میری بھولی ماں ہم دونوں بھائیوں کی ولدیت ایک' تاریخ پیدائش ایک' صورتوں میں بھی بہت معمولی فرق ہے۔ بس میں نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ میرا پاسپورٹ اور گرین کارڈ کسی کے ہاتھ نہ لگے۔ ویسے ماہین بالکل ویسی ہی ہے جیسا آپ نے سوچا تھا۔ پھوپھی نے اسے بٹی کم اور ماسی زیادہ بنا دیا ہے۔ آپ کو نہ صرف طلال کے لیے نرس بلکہ گھر کے لیے میڈ بھی مفت میں ملنے والی ہے۔ داد دیں میری عقل کو جس نے آپ کو یہ آئیڈیا دیا۔"

"اچھا اب بس کرو کوئی سن لے گا۔ تمہارے ابا کہاں ہیں؟ ان کا کیا حال ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں بہن کی محبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔"

"انہیں میں نے ٹھیک سے سنبھال رکھا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ ذرا انک کی خیریت پوچھتی رہیے گا' آخر آپ دادی بننے والی ہیں۔" وہ اپنی بیوی کے بارے میں ہدایت دینے لگا۔

"اچھا' اب میں نیچے جا رہا ہوں۔ اچھا خاصا ہنگامہ ہے نیچے' محلے کے لوگ اکٹھے ہیں اور پھوپھی نے آپ کی بہنوں کو بھی آج بلا لیا ہے۔ وہ لوگ بھی پہنچنے والے ہوں گے۔"

"اچھا خدا حافظ۔" انیسہ نے کہا اور کال منقطع ہو گئی۔ معز نے ایک طویل سانس کھینچ کر موبائل اٹھا لیا۔

"گھر میں اس وقت بہت لوگ جمع تھے۔ نہ صرف ہمارے محلے دار اور رشتہ دار بلکہ انیسہ ممانی کے میکے والے بھی۔ میں نے انیسہ ممانی کے بڑے بھائی کو بلایا۔

انکل آپ جانتے ہیں ہمیں اپنے باپ کی شکل تک یاد نہیں ہے۔ ہمارا جو کچھ ہیں وہ صرف ماموں ہی ہیں۔ آپ ذرا یہ سنیں میں نے موبائل آن کر کے ان کے کان سے لگا دیا۔ وہ جیسے جیسے سنتے گئے ان کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔

"یقین کرو بیٹا! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہاری طرح ہم بھی اسے طلال ہی سمجھے ہوئے ہیں۔" عظیم انکل بولے۔

"میں آپ کو الزام نہیں دے رہا انکل! لیکن آپ بتائیں میں اس وقت کیا کروں۔" میں نے اپنا سارا بوجھ ان کے کاندھوں پر ڈال دیا۔

"یہ تو سراسر گناہ ہے۔ مخبوط الحواس سے تو ویسے ہی نکاح جائز نہیں۔ تم کچھ نہ کرو جو کرنا ہو گا وہ میں خود ہی

کروں گا۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اندر چلے گئے۔ اندر جاکر انہوں نے اعلانیہ انداز میں کہا کہ ان کی بہن کا امریکہ سے فون آیا ہے کہ ان کے بیٹے بلال کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ نکاح کینسل کیا جارہا ہے۔" ان کی بات سن کر بلال اور ناصر ماموں چونک گئے۔ سب افسوس کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں محلے والے رخصت ہو گئے۔ صرف گھر والے رہ گئے۔ عظیم انکل نے میرا موبائل آن کر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ جیسے جیسے لوگ بلال اور انیسہ ممانی کی گفتگو سنتے گئے لوگوں کے چہرے بگڑنے لگے۔ ماموں سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"ناصر احمد تم اپنی یتیم بھانجی کے ساتھ ایسا کر سکتے ہو۔ یہ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔" عظیم انکل گرج کر بولے۔

"اور اس گناہ میں ہمیں بھی شریک کر رہے ہو، تف ہے تم پر ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ غضب خدا کا تمہیں ذرا شرم نہ آئی یہ سب کرتے ہوئے۔" ممانی کے بڑے بہنوئی کا غصہ تو قابل دید تھا۔

"اور اس کے بعد تو عادل بھائی کیا بتاؤں کہ کیا ہنگامہ ہوا۔ سب ہی نے ماموں کو بے عزت کیا سوائے میری ماں کے۔ اور وہ بلال خوب بھڑک رہا تھا کہ ہم کم ظرف لوگ ہیں، جو عرصے سے ان کی جائیداد پر عیش کر رہے ہیں اور اب ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر انہیں خاندان میں بے عزت کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔" اس کے بعد ماموں اور بلال اسی رات اپنا سامان باندھ کر کسی ہوٹل چلے گئے۔ دوسرے دن ان کا فون آیا۔ وہ بہت رو رہے تھے کہ وہ بیوی اور بیٹے کی باتوں میں آگئے۔ اماں نے ان سے کہا کہ وہ جلد یہ مکان بیچ کر ان کا حصہ انہیں بھجوادیں گی تو وہ مزید رونے لگے اور کہنے لگے میں مکان سے کلی طور پر دستبردار ہو رہا ہوں اور اپنا حصہ معز کے نام پر کر رہا ہوں۔ ان کا وکیل باقاعدہ کاغذ لادے گا۔ اگرچہ انہیں اماں نے بہت منع کیا لیکن وہ کہنے لگے کہ اگر تم نے میری یہ بات نہیں مانی تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا۔ یہ تھی کل کہانی۔"

معز نے گہرا سانس لے کر بات ختم کی۔

"سب دنیا کے رنگ ہیں۔" میں نے افسوس ناک انداز میں کہا۔ "معز کیا میں مینا سے مل سکتا ہوں؟" میرے دل میں اچانک مینا سے ملنے کی خواہش شدید ہو گئی۔

"کیوں خیریت؟" معز نے چونک کر کہا۔ "کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ اب بھی ہم اس سے بغیر پوچھے ہی یہ نکاح کر رہے ہیں۔ یقین کریں عادل بھائی میں نے خود اس سے پوچھا ہے اور وہ اس رشتے کے لیے دل سے راضی ہے۔" معز نے میرے خدشات دور کیے۔ "اور ویسے بھی اس وقت ساجد بھائی کی بہن اسے پارلر لے گئی ہوں گی۔" میں دل مسوس کے رہ گیا میری شکل دیکھ کر معز ہنسنے لگا "اچھا رات کو میں کوشش کروں گا کہ وہ آپ سے ملنے پر آمادہ ہو جائے' جائیں آپ گھر جائیں۔ اب رات کو ملاقات ہوگی۔" مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے دل میں پر لگ گئے ہیں۔ دل کی مرادیں ایسے بھی پوری ہوتی ہیں میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کرتا وہ کم تھا۔

☆ ☆ ☆

اگرچہ برابر والے گھر میں ہی جانا تھا لیکن اماں بہن اور نورین کی تیاریاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں اور تو اور ابا بھی چھ بار صحن میں لگے آئینے کے سامنے جاکر اپنی جناح کیپ کو سیدھا کر چکے تھے۔ بالآخر سب کی تیاریاں تمام ہوئیں اور ہم خاتون پھوپھی کے گھر پہنچے۔ جہاں مردوں کا انتظام باہر صحن میں اور عورتوں کا چھت پر کیا گیا تھا۔ محلے کے تقریباً سب ہی بزرگ نظر آرہے تھے۔ مبارک سلامت کے شور میں نکاح ہوا۔ معز نے مجھے محبت سے گلے لگا لیا اور پھوپھی تو باقاعدہ رونے لگیں۔

"رونے کی کیا بات ہے بہن۔ تم سے وعدہ کیا ہے کہ سال بھر بعد رخصتی ہوگی۔ ابھی یہ آنسو بچا کر رکھو ابھی تو مینا سال بھر تک تمہارے پاس ہے۔" ابا نے دلاسا دیا۔

"پھوپھی مینا کو تو بلائیے میں اس کی اور عادل کی تصویریں بنالوں۔" ساجد آج بہت جوش میں تھا۔ وہ واقعی میرا بچپن کا ساتھی تھا۔

"ادھر بیٹھک میں آجائیں۔ عادل بھائی" معز ہمیں شور وغل سے نکال کر پرسکون ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد سبین مینا کا بازو تھامے اندر آئی۔ مینا نے آج آتشی گلابی رنگ کی فراک پہنی ہوئی تھی جس کے کناروں اور دوپٹے پر سبز اور گولڈن کام تھا۔ چھوٹی سی بندیا اور بالوں میں لگے ہوئے گجرے اس کے حسن کو بڑھا رہے تھے۔ ساجد کا کام ختم ہوا تو وہ "بھوک لگ رہی ہے۔" کا شور مچاتا ہوا چلا گیا۔ سبین بھی باہر جاچکی تھی۔ بس معز کھڑا تھا۔

"عادل بھائی ذرا جلدی باہر آیئے گا۔" معز یہ کہتا ہوا دروازہ بھیڑ کر باہر چلا گیا۔

"کیا بات ہے' آج کسی بات پر لڑنا نہیں ہے۔" میں نے پرانے انداز میں بات کی اور اس نے ایک دم ہی سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"لڑنا تو مجھے ہے ہی' آپ نے اگر آج کا دن ہی چنا ہے لڑنے کے لیے تو یہی سہی۔" وہ بھی اپنے پرانے انداز میں بولی تو میں نے گہری سانس لی۔ اس پر اس نئے رشتے کا اثر کم نظر آرہا تھا۔

"آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا تھا کہ آپ میرے لیے کسی اور کے رشتے کی بات امی سے کریں گے۔" وہ تلملاتے ہوئے بولی۔

"کیوں بھئی' تم نے شادی نہیں کرنی تھی کہیں کیا؟" میں حیران ہوا۔

"کوئی اور طلال بھائی کے رشتے کے لیے مجھے یا امی کو کنوینس کرتا تو مجھے اتنا غصہ نہیں آتا جتنا آپ کے گھر آکر امی کو سمجھانے پر آیا۔"

"کیوں؟" میری دلچسپی اس بات میں کم اور اس کے روپ میں زیادہ تھی۔ آنکھوں کا کاجل' ہونٹوں کی لالی اور بالوں کے گجرے مجھے اپنی جانب بلاتے محسوس ہو رہے تھے۔

"کیوں کا کیا مطلب؟" وہ چمک کر بولی۔ "انسان جس سے محبت کرتا ہے۔ کیا اس کے رشتے دوسروں سے کرواتا ہے؟"

"تمہیں کس نے کہا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔" میں واقعی حیران ہوا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں' آپ اپنے اوپر خول چڑھالیں گے تو مجھے معلوم نہیں ہوگا۔ ہم لڑکیوں کی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔" وہ مجھے حیران پر حیران کر رہی تھی "جیسے مجھے اس وقت بھی معلوم ہے کہ آپ میری بات سے زیادہ میرے گجروں پر غور کر رہے ہیں۔" اس کی بات پر میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"تم تو واقعی چند گھنٹوں میں بیوی ہو گئی ہو۔" میں نے چھیڑا۔

"یہ دیکھیں۔" اس نے اپنے حنائی ہاتھ میرے آگے کر دیے۔ نقش و نگار کے درمیان ہتھیلی پر میرا نام لکھا تھا۔ بہت گہرا رنگ تھا۔

"پہلی بار یہ نام میں نے نا سمجھی میں اپنے ہاتھ پر لکھا تھا۔" اب وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ "لیکن جتنے دن اس مہندی کا رنگ میرے ہاتھ پر رہا مجھے لگا یہ نام میرے پورے وجود پر چھا گیا ہے اور میں اس رنگ سے کبھی نکل نہیں سکتی اور بعد میں احساس ہوا کہ میں اس نام کے رنگ میں ہی رنگنا چاہتی ہوں پھر آپ کی بے طلب' بے غرض محبت نے مجھے مزید اپنا اسیر کر لیا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے میرے دل کا امتحان لے رہی تھی۔

"یار! ایک سال کیسے کٹے گا؟" میں نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"جیسے دو سال کٹے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا اور شرما کر سر جھکا لیا۔

عنیزہ سید

محبت خواب جزیرہ

ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقہ میں ایک اپنی والدہ صالحہ بیگم اور بڑے بھائی اورنگ زیب کے ساتھ مقیم تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔

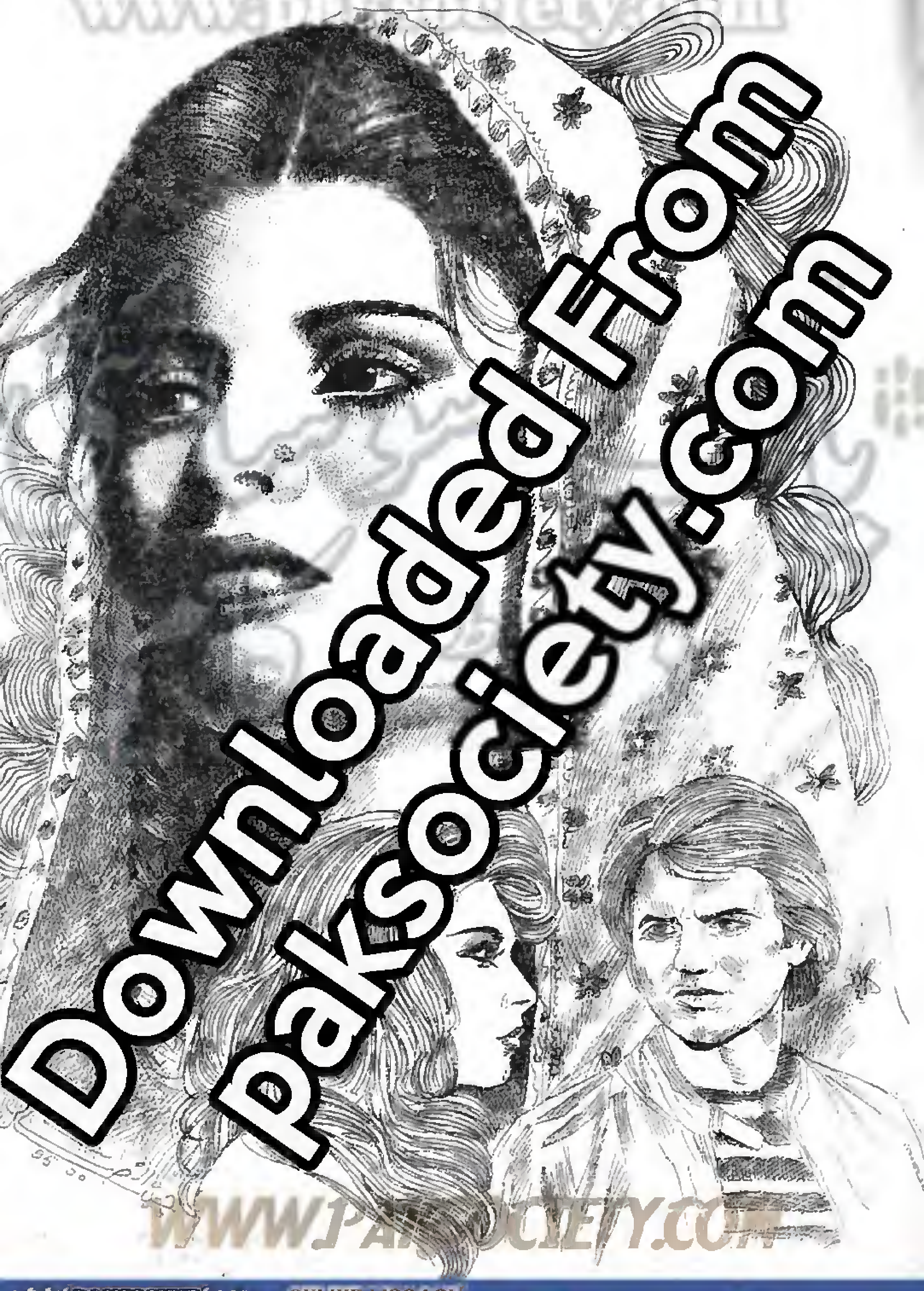
معاذ، رانند، ایبک اور ظفر دوست تھے۔ وہ انجینئرنگ کے طالب علم تھے اور ایک پروجیکٹ پر مل کر کام کر رہے تھے۔ وہ سب ایبک کے گھر پر جمع ہو کر کمبائن اسٹڈی کرتے تھے۔

ایبک کے گھر کے نچلے حصے میں اس کی چچی قمر آرا اپنی بیٹی سطوت کے ساتھ رہتی تھی۔ ایبک کے چچا کا انتقال ہو چکا تھا۔ قمر آرا کی زبان درازی سے ایبک کے دادا عاجز تھے۔ انہوں نے قمر آرا کو اپنے بیٹے کے انتقال کے بعد گھر کے نچلے پورشن میں جگہ دی تھی جو بہت تاریک اور سیلن زدہ تھا۔ قمر آرا کا کردار مشکوک تھا اور وادی میں اس کے کردار کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ صالحہ بیگم، قمر آرا سے نہیں ملتی تھیں۔

قمر آرا شدید بیمار تھی۔ سطوت پڑھائی میں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ایک رات شدید سردی میں ایبک قمر آرا اور سطوت کی گفتگو سنتا ہے تو انہیں استری کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے گھر کی استری انہیں دے دیتا ہے۔ پھر ایبک کو پتا چلتا ہے کہ قمر

مکمل ناول





آرا کریانہ اسٹور کے مالک کی مقروض ہے۔ اب وہ سارا قرض بھی ادا کرتا ہے اور سطوت کو آگے پڑھنے کے لیے کہتا ہے۔ وہ سطوت کو وقت دینے کے لیے اپنے دوستوں سے دور ہوتا ہے تو رائنہ مشکوک ہو جاتی ہے۔ اسے یہ سوچ کر جلن محسوس ہوتی ہے کہ ایبک کی زندگی میں کوئی لڑکی آگئی ہے۔

دوسری اور آخری قسط

یلین اس کی نظروں میں ایبک کی بائیک کے ساتھ لٹکے شاپر سے جھانکتے پھولوں کی جھلک کھب سی گئی تھی۔

"مجھے آج ادھر نہیں آنا تھا لیکن پھر آگئی' صرف تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ میں کل سے سیدھے اور چھوٹے راستے سے واپس گھر چلی جایا کروں گی۔" وہ پھولے ہوئے منہ کے ساتھ روٹھی ہوئی آواز میں اسے بتا رہی تھی۔

"اچھا' لیکن کیوں؟" ایبک نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ویسے ہی۔" اس نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ "مجھے واپسی پر دیر ہو جاتی ہے اور روزانہ امی سے جھڑکیاں کھانی پڑتی ہیں۔"

"واہ!" وہ گھوم کر اس طرف آتے ہوئے بولا جدھر اس نے اپنا منہ موڑا تھا۔ "اتنے دنوں بعد امی کی جھڑکیاں بری لگی ہیں؟"

"بری نہیں لگیں۔" اس نے سر ہلایا۔ "مجھے ان کی عادت ہو چکی ہے اور خود کو پڑی عادتیں بری نہیں لگا کرتیں۔ بے شک بندہ انہیں چھوڑ دینا چاہتا ہو۔"

"صحیح کہہ رہی ہو تم۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جیسے اس راستے سے گھر واپسی کی عادت۔" وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "جو تمہیں پڑ چکی ہے۔" وہ پورے یقین کے ساتھ مسکرایا تھا۔ "اور اب تم چاہے اسے چھوڑ دینا چاہتی ہو لیکن یہ تمہیں بری نہیں لگتی۔"

جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔ اس کی نظریں صاف' کھلے' نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں پر جمی تھیں۔ پرندے جو پورا موسم کسی اور نگر میں گزارنے کے بعد واپس اس وادی میں لوٹے تھے۔ اس کو خاموش پا کر وہ اپنی بائیک کی طرف چلا گیا تھا اور ایک دو لمحوں کے بعد واپس اس کی نظروں کے سامنے آگیا تھا۔

"اچھا چھوڑو' یہ لو۔ میں نے تمہارے لیے بنایا ہے۔" اس نے چونک کر دیکھا' وہ زرد و سفید خود رو ڈیزیز کا ایک چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ زرد پتیوں کے مرکز کے گرد کھلی سفید پتیاں۔ یہ پھول بہار کی آمد پر پوری وادی میں جابجا نمودار ہونے لگتے تھے اور ہوا کے دوش پر ایک مانوس سی خوشبو سارے علاقے میں پھیلی رہتی' کچھ دیر پھولوں کو تکتے رہنے کے بعد سطوت نے نظر اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔

"لے لو' تمہارا برتھ ڈے گفٹ ہے۔" اس نے پھولوں والا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ سطوت نے خفگی سے منہ موڑ لیا۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے ساتھ اپنی سالگرہ منانے کا خیال آیا تھا جب ہی اس نے اس بے وجہ خریداری کے ساتھ وہ ننھا سا کپ کیک اور گلابی' سفید دھاریوں والی منی منی سی موم بتیاں بھی خرید لی تھیں۔ گزرا کل جس میں وہ ایک انجانی سی مسرت میں گرفتار تھی اور مسرت کے ان لمحوں نے شاید واقعی ہی اسے اپنی اوقات بھلا دی تھی' تب ہی تو اس نے وہ بے ہنگم خریداری کر ڈالی تھی۔ جس کی وجہ سے اس گزرے ہوئے کل کی شام اس کا دل اداس رہا تھا۔

ایک ان جانی سی ہتک کے احساس نے رات بھر میں اس کا سرہانہ بھگو ڈالا تھا۔ اور وہ جو اس ساری اداسی کی وجہ بنا تھا' وہی آج اس کے سامنے کھڑا اس کی سالگرہ کے تحفے کے طور پر اسے وہ پھول پیش کر رہا تھا۔ وہ ہوتا کون تھا' آخر وہ ہوتا کون تھا؟ طیش کی ایک نئی لہر

اس کے رگ وپے میں دوڑ گئی۔ تیز گرم خون اس کے چہرے کو سرخ کر گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

"میں بہت احمق ہوں۔" اور وہ اس کے سامنے ایک اونچے پتھر پر بیٹھا اعتراف کر رہا تھا۔ "دل کے بجائے دماغ سے سوچنے کا جو عادی ہوں۔" اس کے چہرے پر دکھ نمودار ہوا۔ "لیکن یقین کرو میں بے حس اور سرد مہر ہرگز نہیں ہوں۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟" ایک بے بس اور بے جان سا شکوہ سطوت کے ہونٹوں سے باہر نکلا۔

"اس لیے کہ میں اپنا حساب کتاب سیدھا رکھنے کا عادی ہوں۔" وہ تیزی سے بولا تھا۔ "میری جیب کی استطاعت کیا ہے۔ میں اس سے غافل نہیں رہنا چاہتا ہوں۔" یہ سطوت کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہ جواب کیوں دیا تھا۔ لیکن یہ ہی اس کے سوال کا جواب تھا۔ وہ بات جو تاج چاچا کے سمجھانے اور اپنے ذہن پر زور دینے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اس وقت لمحہ بھر میں آگئی تھی۔

"تم نے ای کے کھاتے کا حساب چکایا تھا' وہ تم تھے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے الفاظ نکلے تھے۔ حیرت کا ایک سمندر تھا جس میں وہ ہچکولے کھا رہی تھی۔

"ہاں.... وہ میں تھا۔" ایک نے سادگی سے اعتراف کیا۔ "حیرت ہے تم نے ایک بار بھی غور نہیں کیا کہ وہ کھاتہ آپوں آپ کیسے کلیئر ہو گیا۔"

"اس لیے کہ میرا دماغ بہت ہلکا ہے۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ "تم نے دیکھا نہیں' ایک عام سا سادہ سوال بھی بہت دیر میں سمجھ پاتی ہوں۔" پھر اس نے سر اٹھا کر سورج کی کرنوں سے بچنے کے لیے آنکھیں میچتے ہوئے ایک کی طرف دیکھا۔ "تمہیں پتا تو ہے میں نے اسکول میں بھی اسی ہلکے دماغ کی وجہ سے ایک ایک کلاس دو دو سالوں میں پاس کی۔"

"خود کو اور اپنے دماغ کو کوسنا [illegible]" ایک نے کہا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

"کیوں چھوڑ دوں.... میرا دماغ ہے ہی ایسا!"

"اس لیے چھوڑ دو کہ میں کہہ رہا ہوں۔" وہ ایک بار پھر اٹھ کر بائیک کی طرف گیا۔ اب کے وہ اس شاپر سے جس میں سے پہلے اس نے ڈیزیز کا گلدستہ نکالا تھا' کیک کا ڈبہ نکال رہا تھا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ڈبے کا ڈھکن کھولا۔ ایک پاؤنڈ کا چھوٹا سا کیک جو اسٹرابیریز اور چاکلیٹ سے سجا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

"میرے ایک ٹیچر ہیں سر صابر!" کیک پر وہی گلابی اور سفید دھاری دار موم بتیاں سجاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ جنہیں گزرے کل میں اس نے اس کے سامان سے نکال کر واپس چاچا تاج کے شیلف پر سجادی تھیں۔

"رات جب میری سمجھ میں آیا کہ وہ کپ کیک اور موم بتیاں تم سے چھین کر میں تمہارے ساتھ زیادتی کر بیٹھا ہوں تو میں نے سر صابر کو فون کیا۔" ایک ایک کر کے موم بتیاں کیک کے اوپر سجاتا' وہ بولتا رہا تھا۔ "وہ کل اسلام آباد گئے تھے' اور انہیں آج صبح کالج ٹائم تک واپس پہنچنا تھا۔ میں نے سر صابر کو فون کیا اگر وہ اسلام آباد کی کسی بیکری سے میرے لیے ایک پاؤنڈ کا کیک لے آئیں تو میں ان کا بڑا ممنون ہوں گا۔" وہ مسکرا دیا۔

"چلو برتھ ڈے گرل۔ ایک کاٹو۔" اس نے موم بتیاں جلا کر چھری اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

منے سے ایک کپ کیک پر اکیلے سالگرہ منانے میں شاید وہ مزہ نہ آتا جو اس طرح غیر متوقع طور پر سالگرہ منانے میں آ رہا تھا۔ سڑک کنارے پتھر پر بیٹھی وہ کیک کاٹ رہی تھی' ایک تالیاں بجاتے ہوئے اس کے لیے سالگرہ کے گیت گا رہا تھا۔ فضا میں اڑتے پرندے' اردگرد ہوا کے دوش پر سرسراتے ہلکے وزن کے

پودے، جھاڑیاں، جھاڑیوں میں چھپتی نکلتی گلہریاں، چھلانگیں لگاتے بندر، اونچے پہاڑوں سے بہتے جھرنے سب کے سب اس کی خوشی میں خوش نظر آنے لگے تھے۔

پہاڑ کے اوپر سے اپنی بکریوں کا ریوڑ لیے نیچے اترتے ایک سرخ و سفید پٹھان لڑکے نے ذرا دیر کو رک کر ہنستی ہوئی اس لڑکی اور گاتے ہوئے لڑکے کو دلچسپی سے دیکھا اور پھر مسکرا کر آگے چل دیا۔ سطوت نے اس روز ایک سے کتاب کا ایک بھی سبق نہیں پڑھا لیکن اس لمبی گفتگو میں جوان دونوں نے اپنے اپنے پتھروں پر بیٹھے اور پھر اونچے نیچے راستے پر چلتے ہوئے کی، زندگی بھر کے لیے بہت سے سبق چھپے ہوئے تھے۔

"تم کیوں کر رہے ہو یہ سب میرے لیے۔" چلتے چلتے رک کر سطوت نے اس سے پوچھا تھا۔ "بھول گئے ہو کہ میں قمر آرا کی بیٹی ہوں اور میری امی نے تمہارے بابا اور دادا کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا، تم بھول گئے کہ تم، تمہارا بھائی اور تمہاری امی کے میری امی سے کیسے تعلقات تھے۔"

"نہیں، میں بھولا تو نہیں ہوں۔" وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا تھا۔ "لیکن میرا کنسرن تمہاری امی تھوڑی ہیں، میرا کنسرن تو تم ہو۔" وہ اس کے عین سامنے کھڑا ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کنسرن!" سطوت نے ذرا دیر اس لفظ پر غور کیا۔ "اور میں تمہارا کنسرن کیوں ہوں؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔" وہ شانے اچکا کر بولا۔ "یہ تو مجھے خود بھی پتا نہیں ہے۔۔۔ لیکن تمہاری مصیبتیں، پریشانیاں، دکھ، فکر اور مسائل مجھے اچھے نہیں لگتے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم ایک مطمئن اور پرسکون زندگی گزارو۔ جیسی میں، ماما اور اورنگ زیب بھائی گزارتے ہیں۔"

"تم اور تمہارا بھائی ایک مطمئن اور پرسکون زندگی اس لیے گزار رہے ہو کہ تمہاری ماما کا نام قمر آرا نہیں۔" دنیا کی تلخ ترین حقیقت کا بیان کتنا مشکل ہوتا ہے یہ اس روز سطوت کو پتا چلا تھا جب ہی اس نے یہ بات کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"اس میں تمہارا کیا قصور ہے کہ۔۔۔ تمہاری امی کا نام قمر آرا ہے۔" جواب میں وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا تھا۔ "میں نے کہا نا کہ میرا کنسرن تم ہو، قمر آرا نہیں۔"

"تم انجان ہو شاید۔" سطوت نے آنکھوں میں امڈتا پانی دھکیلتے ہوئے کہا۔ "قمر آرا ہی تو میرا قصور ہیں۔" اس کی آواز لرزی۔ "تم نے دیکھا اور سنا نہیں یہ جان کر کہ میں ان کی بیٹی ہوں لوگوں کی نظریں اور لہجے میرے ساتھ بدل جاتے ہیں۔" وہ پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن تم کیوں دیکھو اور سنو گے بھلا۔ وہ بے عزتی، وہ تحقیر، وہ مضحکہ اڑانے کا سا انداز جسے صرف میں ہی محسوس کر سکتی ہوں، تم کیسے کر سکتے ہو۔ تم تو خود ان ہی لوگوں میں سے ایک ہو جو یہ کہتے ہیں کہ مجھے تماشا بننے کا شوق وراثت میں ملا ہے۔" اس کے بھیگے لہجے میں غراہٹ کی جھلک ابھری۔

"میں دیکھتا بھی ہوں اور سنتا بھی ہوں۔" ایبک نے نرمی سے جواب دیا۔ "اسی لیے تو سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگ گیا ہوں۔ اس استہزا، تحقیر، مضحکہ اڑانے کے سے انداز سے تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر جگہ تم اپنی وجہ سے سر اٹھا کر جینا شروع کرو۔ وہ لوگ جو قمر آرا کی بیٹی سمجھ کر تمہارا مذاق اڑانا چاہتے ہیں، تمہاری تحقیر کرنا چاہتے ہیں، تم سے فلرٹ کرنا چاہتے ہیں، ان کے قدم اپنی اپنی جگہ پر رک جائیں اور تم پر نظر پڑتے ہی انہیں محسوس ہونے لگے کہ تم قمر آرا نہیں سطوت سجاد ہو۔ جوان کی طرح کے لوگوں کے منہ توڑنا بھی جانتی ہو اور سر اٹھا کر جینا بھی جسے آتا ہے۔"

سطوت کو ایک ایک کر کے وہ سب کچھ یاد آنے لگا جو ایبک نے اس کے لیے کہا تھا۔ ہاں۔۔۔ وہ اسے ایک

نئے راستے پر ڈال چکا تھا۔ سر اٹھا کر جینے کا راستہ 'بد نظر اور بد لحاظ لوگوں کی پیش قدمیاں روک دینے کا راستہ۔ اس کی نظر اور عقل دونوں ہی کھلنے لگیں۔

"مگر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" سوال ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ آیا۔

"اس لیے کہ شاید میں۔۔۔" وہ کہتے کہتے جھجکا اور پھر رک گیا۔ "شام ہو رہی ہے 'چلو تم اب گھر جاؤ۔" اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے کہا تھا۔

"اور ہاں یاد رکھو کہ بابا کی میرے نام جمع کرائی رقم میں سے مجھے مہینے بھر میں تین ہزار روپے ملتے ہیں اور ماما مجھے کبھی ایک ہزار کبھی پندرہ سو روپے پاکٹ منی دیتی ہیں للذا اب۔۔۔ اپنا ہاتھ روک کر رکھو گی تو تمہارا کام بھی چلتا رہے گا اور میرا بھی۔"

چلتے چلتے اس نے اچانک رک کر کہا تھا 'اور پھر اپنی بائیک پر بیٹھا آگے 'آگے اور آگے بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رانیہ 'ایک کی وال میں وہ کالا نکالنے نکلی تھی جو اس کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ ڈیزی کے جنگلی خودرو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ جو ایک کے بیگ سے باہر جھانک رہا تھا۔ رانیہ کے دل میں کھٹک بن کر اتر گیا تھا۔

"نہیں 'وہ یہاں کسی سے بھی خاص طور سے جا کر تو نہیں ملتا 'ہاں کالج سے نکل کر سیدھا گھر چلا جاتا ہے۔" اسے پتا چلا تھا۔

"وہ کہاں سیدھا گھر چلا آتا ہے۔" صالحہ آنٹی کا بیان مختلف تھا۔ "وہ تو شام ڈھلے گھر آتا ہے۔ پوچھوں تو کہتا ہے کہ کمبائن اسٹڈی میں مصروف تھا۔"

"آپ نے بھی اس سے پوچھا نہیں کہ کس کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کر رہا تھا۔" رانیہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" جواب میں وہ ہنس دی تھیں۔ "کیا میں جانتی نہیں کہ ظفر اور معاذ کے گھر ان امتحانوں کے لیے تم لوگوں کا مرکز بنے ہو گئے ہیں۔"

"وہ۔" رانیہ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ ایک کے متعلق کھٹک گئی تھی پر اتنی وضع داری اس میں ضرور موجود تھی کہ وہ ماں اور بیٹے کے درمیان بھرم اور اعتبار کے رشتے کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔" کیوں اس نے اپنی روش بدل لی ہے 'وہ بھی اچانک اور غیر متوقع طور پر البتہ اس کے اپنے اندر نئے نئے سوال اٹھنے لگے تھے۔ اور وہ ان ہی میں سے ایک سوال اور نک زیب بھائی سے کر بیٹھی تھی۔

"اچھا لوہ تم لوگوں کو بتائے بغیر کہیں نکل جاتا

ہے۔" اورنگ زیب اس کا سوال سن کر یوں خوش ہوا تھا جیسے عرصے بعد کوئی کام کی بات اس کے ہاتھ لگی ہو۔ "لگاتا ہوں رضوان کو اس کے پیچھے تم فکر نہ کرو۔" اس نے رانیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "دو دن میں پتا چلالے گا ایبک کی سرگرمیوں کا۔"

اورنگ زیب کو تو شاید کوئی مشغلہ ملنے والا تھا لیکن رانیہ اس کے اس انداز سے ڈر گئی تھی شاید اسے اس بات کا ذکر اورنگ زیب سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹروں کے دیے سارے پرانے نسخے نکال کر کیوں بیٹھ جاتی ہیں۔" سطوت نے اس روز گھر کی مکمل صفائی ستھرائی کرنے کے بعد امی کو نہلایا تھا اور اب ان کے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔

"وہ جو آخری ایک نسخہ ہے، صرف اسی پر لکھی دوائیں منگوایا کریں نا۔ اتنی دوائیں منگوالیتی ہیں، جن میں سے کھاتی کوئی بھی نہیں، جابجا دیواروں پر کیلوں پر فالتو دواؤں کے شاپر لٹکے رہتے ہیں۔"

"نہیں موافق آتی کوئی بھی دوا تو کیا کروں۔" وہ بے زاری سے بولی تھیں۔ "یہ میری ہڈیاں بھربھری ہو رہی ہیں اور جوڑ سب کے سب سوج چکے ہیں۔ تم تو کالج نکل جاتی ہو، میں سارے گھر میں چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتی پھرتی رہتی ہوں۔ کتنی بار تم سے کہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں نیچے رکھ کر جایا کرو۔ ذرا سی بھی اونچائی تک میرا ہاتھ نہیں پہنچتا۔"

"دوا موافق نہیں آتی تو سوچ سمجھ کر منگوایا کریں نا۔" سطوت کی سوئی ابھی تک دواؤں پر اٹکی تھی۔

"جانتی بھی ہیں کہ کتنی مہنگی آتی ہیں دوائیں۔"

"تمہارے پلے سے نہیں خریدتی دوائیں، میرا بھائی سلامت رہے، جو مجھے دوا دارو کے لیے پیسے بھیجتا ہے، وہ نہ بھیجے رقم تو اس گھر میں جو دال سبزی پکتی ہے، وہ بھی نہ پکے، بڑی آئی مجھے مہنگے سستے کے سبق سنانے والی۔" وہ چلا کر بولی تھیں۔ کنگھی پر سطوت کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ امی کا یہ خواب ٹوٹتا نہیں چاہیے۔

"ہائے۔" وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی وہ کیا کہے کیا نہ کہے کہ امی کراہنے لگیں۔ ان کا سوجن زدہ ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

"ٹیسیں اٹھتی ہیں، ہڈیوں میں اور سن ہو جاتی ہیں انگلیوں کی پوریں، کندھے سے لے کر ہاتھ تک جیسے چیونٹیاں دوڑنے لگتی ہیں جلد کے اندر۔۔۔ کمزوری ہے، یہ سب کمزوری کی وجہ سے ہے، نہ کوئی خوراک ہے میری نہ ہی طاقت والی دوائیں۔ یخنی چھوڑ گوشت کی دو بوٹیاں سبزی دال میں پڑی دیکھے مہینے گزر گئے۔ تیری وجہ سے ہوا یہ سب۔ تیری وجہ سے۔" انہوں نے سطوت کو دھمو کا جڑا۔ "فیس اور کتابوں پر سارے پیسے اٹھا دیتی ہے تو۔۔۔ اسی سے تو میرے کھانے پینے کا سامان آجاتا تھا۔ مار ڈالے گی تو مجھے یوں ہی ایک دن بھوکی پیاسی سسکتی بلکتی۔"

سطوت نے ان کے بالوں میں بل ڈال کر چوٹی کی شکل دی اور چارپائی سے نیچے اترتے ہوئے انہیں گاؤ تکیے کے سہارے لٹا دیا۔ کنگھی میں الجھے بالوں کو نکال کر انگلی پر لپیٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ امی کی خاطر کالج چھوڑ دے یا پھر ایبک کے اصرار پر جاری رکھے۔

"تمہاری امی نے اپنے چاؤ چونچلوں میں تمہیں عمر بھر کچھ نہیں دیا۔۔۔۔ اپنی محبت اور توجہ تک بھی نہیں۔ جب سے تم نے ہوش سنبھالا ہے، گھر کے کاموں میں لگی رہی ہو یا نہیں۔ اسکول تو خیر تم نے اس لیے پڑھ لیا کہ تمہارے ابا داخل کروا دیتے تھے تمہیں۔ باقی کیا کیا تمہاری امی نے تمہارے ساتھ۔ اسکول کالج کی تعلیم چھوڑ کر انہوں نے تو تمہیں لازمی دینی تعلیم بھی نہیں دلائی جب ہی تو اسلامیات کی کتاب میں درج ہر بات تمہارے لیے نئی ہوتی ہے۔"

وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بات کرنے کا عادی نہیں تھا خواہ اس کی الفاظ سننے والے کے دل کے زخم اور بھی گہرے کرتے جائیں۔

"بس اسی لیے۔ اب تم کالج نہیں چھوڑو گی۔"

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ "تم نہیں جانتیں کہ یہ تعلیم تمہارا کتنا بڑا سہارا بننے والی ہے۔ جب کچھ نہیں ہوگا تو تمہارے پاس تب یہ تعلیم ہی تو ہوگی جو اندھیرے میں روشنی کی کرن بن جائے گی۔"

وہ سچ کہتا تھا۔ امی نے بچپن سے لے کر اس کی اس عمر تک اس سے صرف کام ہی کروائے تھے۔ کیسے کیسے دن آئے اور گزر گئے۔ طویل سرما کی طویل ترین راتیں اور سرد ترین دن' بہار اور گرما کے دل خوش کن لمحات۔ لمبی لمبی جھڑیوں والی برساتیں جب پورا پورا دن بارشیں برستی تھیں اور وادی کے نالوں میں۔ پانی کے تیزی سے چلنے اور طغیانی آجانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ لیکن ان سب موسموں کے لطف سے ناآشنا وہ اسکول سے واپسی کے بعد' اس مختصر گھر کے ناختم ہونے والے کاموں میں جت جاتی اور امی ہار سنگھار کر کے گھر سے باہر نکل جاتیں۔ ان کو اپنی سہیلیوں سے ملنے جانا ہوتا' گھر کا سودا سلف لینا ہوتا یا اپنی ضرورت کی چیزیں اور گھر واپسی پر ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے لفافے ہوتے جن میں اکثر کھانے پینے کی چیزیں اور امی کے نت نئے کپڑے اور سنگھار کا سامان بھرا ہوتا۔

"بچی چھوٹی ہے اور تم نے اس پر بوجھ زیادہ ڈال رکھا ہے۔" امی کی پرانی سہیلی محمدی خالہ تھیں جو اکثر اس پر ترس کھا کر امی کی توجہ اس کی طرف دلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ "جب ہی تو یہ پڑھائی میں کمزور رہ گئی ہے اور تم اسے سیپارہ پڑھنے کے لیے بھی میری طرف نہیں بھیجتیں۔"

"ایک میری جان ہے اور سو جنجال چمٹے ہیں اس کے ساتھ۔" امی چمک کر جواب دیتیں "میں گھر کے کام کرنے لگوں تو باہر کے کون کرے۔"

"تم نے صالحہ کو نہیں دیکھا۔ وہ بھی بیوہ ہو چکی ہے۔ تمہاری طرح بچے اس کے بھی چھوٹے ہیں۔ لیکن دیکھ لو' کیسے سلیقے سے سنبھال رکھا ہے اس نے سب کچھ۔"

"میرا منہ نہ کھلواؤ۔" امی تلخی سے کہتیں۔ "سب جانتی ہوں اس کے سلیقوں کو۔ بستی بھر کو اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے اس نے' دن رات سلام کرنے آتے ہیں اس کی چوکھٹ پر' کام گھر بیٹھے ہو جاتے ہیں تو اسے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو میں ہی ہوں جسے ذرا ذرا سے کاموں کے لیے بندے بندے کی منتیں کرنی پڑتی ہیں۔"

"تمہاری اسی بات میں تو سارا راز چھپا ہوا ہے قمر آرا۔ کیوں تم میں وہ اوصاف نہیں ہیں جو سب کو صالحہ کی چوکھٹ پر سلام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جن کا نہ ہونا ــــ تمہیں دکان دکان پھر کر منتیں کرانا پھرتا ہے۔"

محمدی خالہ امی کے مزاج کی پروا کیے بغیر کہتیں اور امی بھڑ جاتیں۔ صالحہ کا تعریف کے پیرائے میں ذکر' انہیں آگ لگا جاتا اور وہ مہینوں محمدی خالہ سے ناراض رہتیں۔

"یہ سطوت جو ہے نا اس کی امی ــــ" اسکول میں سطوت کو دوسرے بچوں کی سرگوشیوں کا نشانہ بننا پڑتا۔ "میری ماما کہہ رہی تھیں' سطوت کی امی اچھی عورت نہیں ہیں۔"

"میرے پاپا کہتے ہیں" سطوت کی امی آوارہ ہیں' مردوں سے تحفے تحائف لیتی ہیں۔" سطوت سے دوستی نہیں کرنی۔' کوئی دوسرا کہتا۔

اور وہ اس دوسرے منہ پھٹ کی زبان کا شکار ہو کر کٹ کٹ جاتی لیکن سوائے زمین کے پھٹنے اور خود کے اس میں سما جانے کی خواہش کرنے کے اپنے لیے کچھ کرنہ پائی تھی۔

اس نے حمام کی ٹونٹی کھول کر اس سے نکلتے یخ پانی کے نیچے برتن دھوتے ہوئے امی کی طرف دیکھا۔ اب جبکہ ان کی ہڈیاں اور جوڑ ان کا ساتھ چھوڑتے چلے جارہے ہیں' پھر بھی انہیں صرف اپنی فکر ہے۔ جبکہ سنا ہے جوان بیٹیوں کی صحت مند ماؤں کو بھی صرف اپنی بیٹیوں کی فکر ہوتی ہے' خود اپنا آپ بھول جاتی ہیں۔ دو گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے اور یخ پانی کا احساس کم ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

"سنا ہے تم اکثر ڈاک خانے والی سڑک پر آتے جاتے دکھائی دیتے ہو۔" اورنگ زیب بھائی نے اس شام اچانک اس سے پوچھا تھا اور یہ بات پوچھنے کے لیے ان کی ٹائمنگ بہت درست تھی۔ ماما کشیدہ کاری میں مصروف تھیں اور ان کا کپڑے سے سوئی نکالتا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔

"ہاں لیے رضوان کا پوچھ رہے تھے کہ اس کا گھر ڈاک خانے والی سڑک کے آس پاس تو نہیں ہے۔" اورنگ زیب بھائی کو مزا آرہا تھا۔ ایبک نے ایک نظر اپنی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ماما پر ڈالی اور پھر اورنگ زیب کی طرف دیکھنے لگا۔

"رضوان نے کیا کہا آپ سے۔" وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔

"اس کا ڈاک خانے والے راستے پر کیا کام بھلا؟" صالحہ نے اورنگ زیب کے جواب دینے سے پہلے حیرت سے کہا۔ "ادھر تو کوئی کم ہی جاتا آتا ہوگا۔ ایسا سنسان راستہ ہے وہ تو۔"

"پاکستان خان ریٹائر ہوگیا ہے، کہیں تم نے اس کی جگہ ملازمت تو نہیں پکڑلی ڈاک خانے میں۔" اورنگ زیب کے لہجے میں تمسخر تھا اور چہرے پر طنز۔

"آپ سے رضوان نے کہا کیا؟" ایبک نے اپنا سوال دہرایا۔

"رضوان سے تو میں نے کہا تھا پتا کرنے کو، مجھے رائنہ نے بتایا تھا کہ تمہاری روٹین کچھ عجیب سی ہوگئی ہے۔ کرتے کیا ہو تم ادھر جا کر؟" اورنگ زیب پوچھ رہا تھا، مسلسل سوال کررہا تھا۔

"واقعی ایسا ہے تو بہت عجیب بات ہے ایبک! تمہارا ادھر کیا کام، وقت ضائع کرنے لگے ہو تم۔" کیا صالحہ کہہ رہی تھیں، ایبک ان دونوں کے سوال اور انداز سن اور دیکھ نہیں رہا تھا۔ سامنے خلا میں دیکھتے ہوئے اس کا ذہن صرف ایک بات سوچ رہا تھا۔ "مجھے رائنہ نے بتایا تھا۔"

وہ کیوں بھول گیا تھا کہ جتنی احتیاط وہ کرتا تھا اس کی وجہ سے وہ باقی دنیا کی نظروں سے بچ بھی جاتا، رائنہ کی نظروں سے نہیں بچ سکتا تھا۔

"تم مجھ سے پوچھ سکتی تھیں، تم نے اورنگ زیب بھائی سے کیوں پوچھا؟" وہ تصور میں رائنہ سے مخاطب تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیونکہ یہ میرا محض ایک خیال تھا اور تمہیں بلاوجہ خیال ظاہر کرنے سے چڑ ہے، تم جو ان لائی کو جیسے ڈیفنڈ کرتے ہو ویسے ہی خود کو بھی کرتے لگتے۔" رائنہ کا انداز بے نیازانہ تھا، جیسے اسے توقع نہ ہو کہ ایبک اس سے اتنا معقول سوال کرے گا۔

"وہ خیال نہیں، قیافے ہوتے ہیں، بے پر کے الزامات ہوتے ہیں جن سے مجھے چڑ ہے۔ اور کیا میں جانتا نہیں کہ تم نے یہ خیال اورنگ زیب بھائی کے سامنے ہی کیوں ظاہر کیا۔ کسی اور سے بھی تو پوچھ سکتی تھیں تم۔۔۔ معاذ اور ظفر ہر وقت تمہارے ساتھ ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر میں۔۔۔ ہر روز ہم ملتے ہیں۔۔۔ تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا؟"

"میں تم سے پوچھتی اور تم مجھے بتا دیتے۔" رائنہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تم ہمارے سوال کرنے کا انتظار ہی تو کررہے تھے۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"اچھا تو تم بتا دو۔" وہ ابرو چڑھا کر بولا تھا۔ "میں کون سا ایسا کام کررہا ہوں جو تم لوگوں سے چھپاؤں گا۔"

"مجھے کیا پتا۔" رائنہ نے بےزاری سے کہا۔

"مجھے پتا ہوتا تو اورنگ زیب بھائی سے کیوں کہتی؟ ان سے بھی اس لیے کہا کہ تمہاری روٹین میں آتی تبدیلی مجھے الجھا رہی تھی، ظفر اور معاذ کو نہیں۔ انہیں تو جیسے پروا بھی نہیں۔"

"اس لیے کہ انہیں دوستی کا وہ معاہدہ یاد ہے جس کے مطابق ہم چاروں ایک دوسرے کے پرسنلز میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ آئی ایم سوری رائنہ! پری نرسری سے لے کر اب تک لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے اور رکھنے کے باوجود تمہاری فطرت میں چھپی لڑکی زندہ رہی۔" وہ تاسف کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"لیکن تم نے برا کیا۔ تم نے بہت برا کیا۔ اورنگ زیب بھائی کے جیسکے کو ہوا دینے کا جرم کر بیٹھی ہو تم اور میں اس کے لیے تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

وہ جذباتی ہو رہا تھا اور افسردہ بھی۔ تیزی سے مڑ کر واپس جانے سے پہلے اس نے ایک نگاہ بھی رائنہ پر ڈالنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"کیا ہوا' ایبک کیوں آیا تھا اتنی رات گئے اور بھی سے ملے بغیر چلا کیوں گیا؟"

رائنہ کی امی نے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گھر کی طرف آنے والی روش پر آتے ہوئے بلند آواز میں اس سے پوچھا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ لائٹ پول کے نیچے اکیلی کھڑی تھی۔ رائنہ نے نظر اٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ پشیمان تھی اور افسردہ بھی۔ وہ جلد بازی کر بیٹھی تھی۔ اسے تحمل سے کام لینا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے پتا کر لیا ہے۔" اورنگ زیب نے سرگوشی کے انداز میں صالحہ سے کہا۔ "عزت کا معاملہ ہے اس لیے رضوان سے نہیں کہا۔ اس بار میں نے خود پتا کیا ہے۔"

"کیا؟" رات کے کھانے کے لیے قیمہ بھونتی صالحہ اس کی طرف مڑی تھیں۔

"وہ کوئی لڑکی ہے' پتا نہیں لڑکی ہے یا عورت' بڑی سی چادر میں چھپی ہوتی ہے اس کے ساتھ ایبک گھنٹوں ڈاک خانے والے راستے پر بیٹھا رہتا ہے۔ دراصل وہ اسی سے ملنے وہاں جاتا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" صالحہ کو یقین نہیں آیا۔ "ایبک چوروں جیسے کام نہیں کرتا۔ غلط یا صحیح جو بھی کرتا ہے' کھل کر اور سامنے آکر کرتا ہے' تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔"

"یہی تو ہوا ہے اس دفعہ۔" اورنگ زیب اسے اسرار کا رنگ دیتے ہوئے بولا۔ "کوئی ایسی بات ہے جب ہی تو معاذ' ظفر اور رائنہ سے بھی چھپانا پڑرہا ہے۔"

صالحہ کے چہرے کی رنگت لمحہ بھر کے لیے زرد پڑی' رائنہ نے بھی تو ان سے یہ ہی پوچھا تھا کہ کیا کبھی ایبک نے انہیں بتایا کہ وہ کس کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کرتا ہے۔ اگر وہ معاذ' ظفر یا رائنہ میں سے کسی کے گھر بیٹھ کر پڑھتا تو رائنہ یہ سوال کیوں پوچھتی۔ انہیں کسی انہونی کے ہونے کا احساس ہونے لگا۔ انہوں نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

"اور مجھے ذرا یہ تو بتائیں کہ آپ کب سے تاج چاچا کے اسٹور سے ادھار سودا منگوانے لگی ہیں۔ ہمارے گھر میں پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔" اورنگ زیب اس دن انہیں حیران بلکہ پریشان کردینے کا تہیہ کر کے آیا تھا شاید۔

"ہائیں!" وہ چونکیں "یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ میں تو کبھی کسی دکان دار سے ایک گھنٹے کا بھی ادھار نہ کروں۔"

"گھنٹے دو گھنٹے کا نہیں مہینے بھر کا ادھار جو ایبک چکاتا ہے مہینہ پورا ہونے پر۔" اورنگ زیب کی آواز میں کھنک پیدا ہوگئی' آج تو مزا ہی آگیا تھا۔

"کیا الف لیلیٰ سنا رہے ہو اورنگ زیب۔" صالحہ الجھ گئیں۔ "کیسا ادھار ہے' جو ایبک چکاتا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی نے بے پر کی اڑائی ہے۔"

"آپ خود پتا کرلیں بے شک۔" میری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جو چور کی سزا وہی میری۔"

"اچھا اچھا کرلوں گی پتا۔" انہوں نے اورنگ زیب کو ٹالا تھا۔ "لیکن ایبک کے سامنے ذکر نہ کرنا ایسی کسی اطلاع کا' چڑ گیا نا تو گھر میں بے زاری پھیلے گی بے کار کی۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اور یوں انہوں نے اورنگ زیب کو تو خاموش کروا دیا تھا لیکن اس ساری شام ان کی الجھی ہوئی نظریں بار بار ایبک کے چہرے اور انداز کو ٹٹولتی رہی تھیں۔ کہاں کچھ معمول سے ہٹ کر تھا۔ جو انہیں علم نہ ہو پایا تھا۔ اور ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ ایبک صالحہ کو سمجھ نہ پاتا' اس کا اپنا ماتھا ٹھنک چکا تھا۔ اورنگ زیب اپنے

مزاج کے مطابق اپنا کام کر چکا تھا۔

٭ ٭ ٭

رات بھر بارش مسلسل برستی رہی تھی، اور دن چڑھنے کے ساتھ دوبارہ برسنا شروع ہو گئی تھی۔

"مت جاؤ آج کالج۔ مجھے بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے ڈر لگتا ہے۔" قمر آرا نے اسے صبح صبح ناشتا تیار کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

"اور مجھے میڈم صدیقہ کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔" وہ دلیے میں دودھ اور شہد ملاتے ہوئے بولی۔

"آج میں نے ٹیسٹ نہ دیا تو وہ اگلا پورا ہفتہ مجھے کلاس سے باہر کھڑا رکھیں گی۔" اس نے دلیے کا پیالہ ان کے سامنے رکھا۔

"تمیز اور سلیقہ تمہیں چھو کر نہیں گزرا۔" قمر آرا جھلا کر بولیں۔ "اتنا نہیں ہوتا کہ پیالے کے نیچے کوئی چھوٹی ٹرے یا پلیٹ ہی رکھ لو۔ گرے گا دودھ، میرے ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔"

"تمیز اور سلیقہ مجھے کسی نے سکھایا ہی نہیں تو آئے گا کیسے۔" وہ لاپروائی سے بولی تھی۔ قمر آرا تلملا کر رہ گئیں۔

"کہا تھا انڈا سخت ابال دینا مجھے، وہ بھی نہیں ہوا تم سے۔"

"انڈے ختم ہو چکے ہیں اور تاج چاچا کے پاس سے ہماری طرف پورے پچیس سو روپے کا راشن آ چکا۔ اب مزید ادھار کی گنجائش نہیں۔" اس نے اٹھ کر میلے سے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس آئینے میں اسے خود اپنی شکل دیکھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

"چار پانچ سو اور بھی بن گئے تو کیا ہوا۔ میرا بھائی چھ سات تاریخ تک بھیج دے گا، تم واپسی پر انڈے لیے بغیر آئیں تو دیکھنا۔" قمر آرا خود ساختہ دنیا میں رہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔

"اب تو آپ مہینے کے باقی دن اپنی تصوراتی مرغیوں کے انڈے ہی کھائیں گی۔ تاج چاچا سے لانے کی تو گنجائش باقی نہیں۔" اس نے ڈھٹائی سے صاف جواب دیا تھا اور کتابیں اور چھتری اٹھا کر گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے ایک کے جیب خرچ کی رقم اچھی طرح یاد تھی۔

لیکن خود اس کے لیے بھی وہ ایک مایوس کن دن ثابت ہوا تھا۔ میڈم صدیقہ اس روز خود غیر حاضر تھیں۔ بارش کی وجہ سے بہت کم طالب علم کالج آئے تھے۔ سائنس بلاک میں بی ایس سی فائنل کی کلاس امتحان کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی اور اس کا سارا وقت آسمان سے گرتے بارش کے قطروں کو گنتے گزر گیا تھا۔

ڈاک خانے والا راستہ ناہموار تھا اور اس پر پھسلن بھی بہت تھی۔ مسلسل برستی بارش نے راستے کے کنارے بیٹھ کر پڑھنے کا موقع بھی کہاں دینا تھا، لیکن وہ پھر بھی کالج سے واپسی پر اسی راستے سے واپس آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی امید، ایک سے آج کی ملاقات اور اس کے دوران ہونے والی گفتگو کی شکل میں چلی آ رہی تھی، لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔

پندرہ منٹ تک چھتری کے نیچے اس پتھر کے پاس کھڑے رہ کر انتظار کرنے کے باوجود وہ نہیں آیا تھا۔ سطوت کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ ایسا نہیں تھا، ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ نہ آئے۔ بارش، طوفان، آندھی نے پہلے بھی اس کا راستہ روکا تھا نہ آج روک سکتے تھے پھر وہ کیوں نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آئے گا، اسے ڈانٹے گا وہ کیوں اس برستی بارش میں ادھر چلی آئی تھی اور پھر اسے اپنی بائیک پر پیچھے بٹھا کر بستی کی حدود تک چھوڑ دے گا، ایسا پہلے بھی دو، تین بار ہو چکا تھا، لیکن یقیناً "وہ ایک مختلف اور مایوس کن دن تھا۔

برستی بارش کے پانی میں تیز قدموں سے چلتی وہ ڈھلوان سے نیچے آ رہی تھی۔ راستے بھر میں اسے کوئی دوسرا ذی روح ملا تھا نہ ہی بستی کے بازاروں اور گلیوں میں کوئی ایسا نظر آیا تھا جس سے وہ پوچھ لیتی کہ ایک اس روز کہاں تھا۔

٭ ٭ ٭

وہ اور رنگ زیب کی بات بے بنیاد اور بے پر کی قرار

دے چکی تھیں، لیکن وہ ایک انجانا سا دھڑکا تھا جو ان کے دل کو لگ گیا تھا۔ تاج خان کے اسٹور کے کاؤنٹر پر کھلے رجسٹر میں درج جس کھاتے دار کے نام پر تاج خان نے انگلی رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر ان کا منہ صحیح معنوں میں کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"یہ یہ یہ..." انہوں نے نظریں صفحے پر جمائے وحشت کے عالم میں تاج خان کو مخاطب کیا تھا۔

"ہاں باجی! یہ ہی وہ کھاتہ ہے جس کا حساب ایک چکاتا ہے۔" تاج خان مسکرا کر بولا تھا۔

"یہ تو قمر آرا کا کھاتہ ہے۔" وہ جیسے خواب کی کیفیت میں بولی تھیں۔

"ہاں ہاں، وہی باجی قمر آرا کا کھاتہ۔" تاج خان نے سر کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"باجی قمر آرا خود..." تاج خان سر پر رکھی کالغانی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے کچھ بتانے جا رہا تھا، لیکن صالحہ کو مزید کچھ سننے کی حاجت تھی نہ ہی اس کی ضرورت باقی رہی تھی۔ بند سیاہ چھاتے کا بٹن کلیتے ہاتھوں سے کھولتے ہوئے وہ اسٹور سے باہر نکل آئی تھیں۔ گیلی سڑک پر بارش کی بوندیں اب بھی برس رہی تھیں۔ فضا میں ہلکے بادل دھنکی روئی کی طرح اڑتے پھر رہے تھے، لیکن صالحہ کے دل اور جسم کے اندر انگارے سے بھر گئے تھے۔

"باجی او باجی!" پیچھے تاج خان اپنی بات پوری کر لینے کے لیے انہیں آوازیں ہی دیتا رہ گیا تھا۔

"کیا خاتا!" صالحہ کے چلے جانے کے بعد جھاڑن والے ڈنڈے کو گھما کر کاؤنٹر پر رکھی چیزیں جھاڑتے ہوئے اس نے سر جھٹکا تھا۔ "بات ہی پوری نہیں سنا صالحہ باجی... ابھی تو ان کو بتاتا تھا، باجی قمر آرا ڈاکٹر منور کا دوا چھوڑ کر کسی حکیم کا دوا کھانے لگا ہے۔"

اور تاج خان کی بڑبڑاہٹ سے آگے بہت آگے صالحہ پیچ و تاب کھاتی گھر کی سمت چلتی چلی جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میں جانتا ہوں۔ رائنہ نے اچھا نہیں کیا۔" ظفر نے تاسف سے سرہلاتے ہوئے کہا تھا۔ "اسے تمہارا معمول کی روٹین سے ہٹ جانا بہت کھل رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس روز مجھے یہیں اسی گیراج میں ہونے والی اس کی گفتگو سے ہو گیا تھا۔"

ایبک اور ظفر، ظفر کے گھر کے باہر گھاس کے خالی قطعے پر بیٹھے تھے۔ بازو کمر سے پیچھے لے جا کر گھاس پر پھیلائے، ٹانگیں سیدھی کیے ایبک سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آسمان پر ابھی بھی ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ دوسرا دن تھا جب وہ ڈاک خانے والے راستے کی طرف نہیں گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سطوت عین اس وقت اس راستے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ آسمان پر نظریں جمائے وہاں کیا دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

"محسوس تو میں اور معاذ بھی کر رہے تھے، لیکن یار! یہ تمہاری اپنی زندگی ہے۔ تم جو چاہو کر سکتے ہو۔" ظفر نے اپنے اور ایبک کے درمیان چھائی خاموشی کو توڑنے کی خاطر کہا۔ "رائنہ کو آپس کی بات کسی سے بھی نہیں کرنی چاہیے تھی، مجھ سے اور معاذ سے بھی نہیں۔ کجا اورنگ زیب بھائی۔ کیا ہم سب اورنگ زیب بھائی کے مزاج سے واقف نہیں...؟"

"رائنہ ان کے مزاج سے واقف ہے۔ جب ہی تو اس نے صرف ان سے پوچھا۔" ایبک کی نظریں ابھی بھی آسمان پر جمی تھیں۔ "اسے یقین تھا کہ اورنگ زیب بھائی جستجو میں لگ جائیں گے۔ اس لیے ان کا انتخاب کیا۔"

"اس نے برا کیا، بہت برا۔" ایبک نے تاسف سے کہا۔ "ظفر! مجھے لگ رہا تھا جیسے میں زندگی میں کوئی مقصد پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ رائنہ نے میری تمام تر کوشش خاک میں ملا ڈالی۔" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

"احمق ہے رائنہ... بلوان دوست، شاید وہ تم پر باقی سب سے زیادہ حق سمجھتی ہے اسی لیے جذباتی

ہو گئی۔" اس نے رائنہ کی وکالت کرنے کی ایک کمزور سی کوشش کی۔

"اپنا حق جتانے کی خاطر دوسروں کے خواب توڑنے کی کوشش کس زمرے میں آتی ہے۔" ایبک نے ظفر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "گناہ کے یا جرم کے؟"

"تم بھی جذباتی ہو رہے ہو اس وقت۔" ظفر نے کہا۔ "ایک عام سے معاملے کو ایسی انتہا پر لے جانا بھی تو جذباتی پن ہی کہلاتا ہے نا۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے نا کہ رائنہ کے اٹھائے ایک عام سے معاملے کی وجہ سے کسی کا کیا نقصان ہوا ہے ہم اسی لیے اس کو اتنا لائٹ لے رہے ہو۔"

ایبک اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنی پتلون سے چپکے گھاس کے تنکوں کو جھاڑنے لگا۔ اسے ابھی اپنے گھر واپس جانا تھا۔

"اورنگ زیب نے نہ جانے کس رنگ میں ماما کو یہ خبر سنائی ہو گی۔" یہ بات سوچ کر ہی اس کا دل گھر جانے سے ڈر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اس بستی کے باقی سب مرد ختم ہو چکے تھے جو قمر آرا تم پر کل کے بچے پر ڈورے ڈالنے بیٹھ گئیں۔" ایبک جتنا بھی خوف ناک قیافہ لگا لیتا مگر یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صالحہ اس سارے معاملے کو یہ رخ دیں گی۔

"مطلب' ماما' مطلب' آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" ایسا جھٹکا کھانے کے بعد وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

"مطلب تم نہیں جانتے ایبک!" صالحہ کے دل میں آگ لگی تھی۔ ان کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ "مطلب میں جانتی ہوں۔" وہ دانت پیس رہی تھیں۔ "تم تو ابھی چھوٹے ہو' ناتجربہ کار اور لاابالی۔ قمر آرا تو بڑے بڑوں کے ہوش اڑا دینے کا فن جانتی ہے۔ او میرے خدا!" انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

ایبک دم بخود بیٹھا' صالحہ کو بولتے تلملاتے' کوسنے اور صلواتیں سناتے دیکھ اور سن رہا تھا۔ صالحہ' قمر آرا کے ماضی کے البم میں جھانکتی ایک ایسی نادیدہ کیچڑ میں چھری چلا رہی تھیں جس سے اڑتے کیچڑ کے سب چھینٹے ایبک کو اپنے بے داغ کردار پر پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔

"اس کی ہڈیوں میں ابھی بھی اتنا دم خم ہے کہ وہ ڈاک خانے والے دشوار اور ناہموار راستے پر تم سے ملاقاتیں کرنے پہنچ جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس راستے کا انتخاب بھی اسی نے کیا ہو گا' وہی جانتی ہے کہ ان ظرف کم ہی کوئی جاتا آتا ہے۔"

ایبک کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے صالحہ طیش بھرے لہجے اور وحشت زدہ چہرے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا تھا۔

"ساری زندگی دوسروں کی جیبیں خالی کرا کر اپنا گھر بھرتے عمر گزر گئی اس کی' اب کوئی تجربہ کار' باشعور مرغا پھنسانے کی عمر تو رہی نہیں' تو اس نے تمہیں پھنسا لیا۔ کتنی رقم خرچ کر چکے ہو ابھی تک اس پر' بتاؤ تو ذرا۔۔۔ تاج خان کے پچھلے کھاتے جو تم نے کلیئر کیے' وہ تو میں آج دیکھ آئی اور کیا اور کتنا لٹا چکے ہو اس پر' بتاؤ تو ذرا۔" صالحہ چلا رہی تھیں۔

"غضب خدا کا!" انہوں نے ایبک کی مسلسل خاموشی سے مایوس ہو کر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ "میں اس سے کہتی رہی' نئے کپڑے خرید لو' تمہارے سویٹر پرانے ہو چکے' جوتوں کی سلائیاں نکل گئیں' بار بار مرمت کرواتے ہو بہتر نہیں کہ جوتوں کی نئی جوڑی خرید لو' موٹر سائیکل خراب ہے' ایک دن لگا کر اس کو ٹھیک کروا لو۔۔۔ مگر میری اس نے ایک نہیں سنی' سنتا بھی کہاں۔۔۔ اس پر تو اس کمینی کا عشق سوار تھا۔ اپنی جیب سے نکال کر اس پر لٹاتا رہا اور مجھ اندھی کو خبر ہی نہیں ہوئی۔"

اورنگ زیب کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اگلے کئی ہفتوں تک کے لیے اسے موضوع مل گیا تھا۔ جس کو لے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



— کہ اس معاملے کو ماما سے ڈسکس کرے گا اور اپنی موہم سے بھی۔ اسے تو آج رات ہی یہ ساری اسٹوری سنانی تھی۔ کتنا مزا آئے گا اس کو..... وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

"دس سال پہلے بھی اس نے تمہاری ہی عمر کے جمال کو پھنسا لیا تھا۔ اس کا اپنا کوئی بیٹا ہوتا تو اسی عمر کا ہوتا جتنا جمال تھا۔ کرنل حبیب اللہ کا بیٹا' یاد ہے نا؟" انہوں نے ایک بار پھر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

"یاد ہے ماما! میں نے ہی تو سب سے پہلے آپ کو بتایا تھا۔" اورنگ زیب کو ایسی باتیں کہاں بھول سکتی تھیں۔

"کیا کیا جتن کر کے کرنل صاحب نے اپنی پوسٹنگ یہاں سے کروائی تھی۔ بچہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا' کیا کرتے بے چارے' اس وقت بھی سب لوگوں نے لعنت بھیجی تھی اس قمر آرا پہ۔ مگر مجال ہے جو اتنی سی بھی شرمندہ ہو جائے۔" صالحہ نے ایک کی طرف دیکھا' جسے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

"اب مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش کیوں بیٹھے ہو' بولتے کیوں نہیں؟ کیسے بولو گے' تمہارا راز تو چوراہے میں پھوٹنے والی ہانڈی کی طرح کھل گیا۔ جانتی ہوں میں' ہوشیاریوں اور چالاکیوں کے سارے سبق تمہیں پڑھا چکی ہوگی تمہیں وہ قمر آرا..... مگر وہ بھی بھول گئی اور تم بھی بھول گئے کہ تم میرے بیٹے ہو۔ نیت کی صاف اور اللہ' رسول کی غلام عورت کے بیٹے۔ مجھ سے تمہارا یہ راز کیسے چھپا رہ سکتا تھا....."

کمرے میں شدید گھٹن کا احساس بڑھنے لگا تھا۔ ایک کو لگا اس کا سانس بند ہو رہا ہے' وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"استغفار' استغفار..... اس دوزخی عورت کو اپنی جوان بیٹی تک کا بھی خیال نہیں جسے سارا دن گدھوں کی طرح گھر کے کاموں میں جوتے رکھتی ہے....." کمرے سے باہر نکلتے ہوئے صالحہ کے الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے۔

"وہ بے چاری تو گدھوں کی طرح کام کرتے کرتے گدھی ہی بن کر رہ گئی' ڈفر اور ڈمب۔" اورنگ زیب کہہ رہا تھا۔ "سنا ہے کالج میں بھی اس کے گریڈز ایوریج سے نیچے ہی رہتے ہیں' رضوان بتا رہا تھا۔"

ایک کی سماعت اورنگ زیب کے انکشافات کی حد سے باہر چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا۔" رائنہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس روز ظفر اور معاذ نے اسے آڑے ہاتھوں لے رکھا تھا۔ ایک چار کے اس گروپ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر چکا تھا اور دوستی کے مضبوط پرانے رشتے میں ایک ایسی دراڑ پڑتی نظر آ رہی تھی جس کو نجانے کبھی بھرنا بھی تھا یا نہیں۔

"میں نے سنا تھا کہ لڑکیوں کی اگر دوسروں کے معاملات میں بے وجہ کی دلچسپی لینے کی عادت ختم ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتی ہیں۔" معاذ دکھ سے کہہ رہا تھا۔

"سارا قصور اورنگ زیب بھائی کا ہے' میں نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنا بڑا فتنہ ثابت ہوں گے۔" رائنہ نے اپنی صفائی دینے کی کمزور کوشش کی۔

"تم جانتی تھیں اور اچھی طرح جانتی تھیں۔" معاذ نے دانت پیسے۔ "قصہ صرف اتنا ہے کہ تم ایک کو اپنی زمین سمجھتی تھیں اور تمہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ وہ اس زمین پر کسی اور کے لیے پھول کاشت کرنے لگا تھا۔ بس اتنی ہی سی بات ہے....."

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" رائنہ کے پاس اپنے دفاع کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

"تم نے ایک کو ہرٹ کیا ہے رائنہ! تمہاری وجہ سے ہم دونوں بھی اس سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔" ظفر مایوسی سے بولا۔ "جس دوستی کی مثال سب دیتے تھے اس کو تمہارے تجسس کے ناگ نے ڈس لیا ہے۔ اس نے کسی سے بھی بات تک کرنی چھوڑ دی ہے۔"

"میں نہیں جانتا اورنگ زیب بھائی اور صالحہ آنٹی

نے اسے کیا کہا ہے؟" معاذ نے سر ہلایا۔ "لیکن جو بھی کہا ہے، وہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہے، میں نے آج تک کبھی اسے اتنا خاموش اور افسردہ نہیں دیکھا۔ بتاؤ اب تم اس سارے کی تلافی کیسے کرو گی۔"

"میں... میں صالحہ آنٹی سے خود بات کروں گی، میں انہیں بتاؤں گی، وہ ایک غلط فہمی تھی۔ مجھے دوستی کا بھرم رکھنا آتا ہے، یقین کرو۔" رائنہ نے بے ربط الفاظ میں بات کرنے کی کوشش کی۔

"کسی ایسے وقت میں اس کے گھر مت چلی جانا، جب وہ گھر پر موجود ہو۔ اسے اور بھی برا لگے گا اور شاید تمہیں بھی اچھا نہ لگے۔" ظفر اسے سمجھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کالج کے ایڈمن آفس سے فائنل امتحان کے لیے رول نمبر سلپس مل رہی تھیں۔ اس روز بی ایس سی فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹس کی کالج آمد کی وجہ سے خاصی گہما گہمی تھی۔ سطوت نے ایڈمن آفس کے کوریڈور میں اکیلے کھڑے ایبک کو دیکھا، وہ نوٹس بورڈ پر لگی ڈیٹ شیٹ دیکھ رہا تھا۔

پچھلے کئی روز سے وہ ڈاک خانے والے راستے پر نہیں آیا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا، کوئی مسئلہ تھا، پریشانی تھی یا پھر اس کا دل اس معمول سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ سطوت کا دل چاہا، وہ اسے کچھ تو بتائے۔ اسی امید پر کہ وہ سطوت پر نظر پڑ جانے پر اس کی طرف آئے گا، اس نے وہیں کھڑے کھڑے اردو لازمی کا پیریڈ چھوڑ دیا تھا، لیکن پندرہ منٹ بعد وہ اس کی سمت آنے کے بجائے دوسری طرف مڑ گیا تھا۔

سطوت نے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو تھوڑی دیر کے لیے بند کیا اور پھر گھاس کے قطعے پر رکھے سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔ وہ اتنے روز شاید خواب دیکھتی رہی تھی، شاید اس روز اس کی آنکھ بہت دنوں بعد کھلی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ ایبک کی بہترین دوست رائنہ پارکنگ لاٹ میں کھڑی سر پر رکھے ہیلمٹ کا تسمہ ٹھوڑی پر تیزی سے چڑھا کر اپنی بائیک پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے عجلت میں بائیک کو کک ماری تھی اور بائیک پارکنگ سے نکال کر کالج کے گیٹ کی طرف لے گئی تھی۔

"یہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہے۔ اسے ایبک کی دوستی میسر ہے اور جسے ایبک کے ساتھ اٹھنے، بیٹھنے، گھومنے، پھرنے اور باتیں کرنے کے لیے ڈاک خانے والا راستہ نہیں اپنانا پڑتا۔ یہ کھلے عام اس کے ساتھ گھومتی، خوش گپیاں کرتی نظر آتی ہے اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔" سطوت کو رائنہ پر رشک آنے لگا۔

"یہ گزرے کل میں بھی ایبک کے ساتھ تھی اور آنے والے کل میں بھی اس کے ساتھ ہو گی۔ دونوں ایک سے مضمون جو پڑھتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

رائنہ اسے چوائن لائی کے آفس میں بیٹھے فائنل ڈسکشنز کرتے چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ گھنٹے دو گھنٹے سے پہلے اٹھنے والا نہیں تھا۔

ایبک کے گھر کے احاطے میں داخل ہو کر بائیک سیڑھیوں کے نیچے کھڑی کر کے وہ صالحہ آنٹی تک پہنچنے کے لیے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنا چاہتی تھی، لیکن چار ہی سیڑھیاں چڑھنے پر لکڑی کی سیڑھیوں کے سبز ریلنگ سے لٹکتے ایک لفافے نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے جھک کر لفافے کو ہاتھ لگایا، وہ پتنگ کی ڈور کی مدد سے ریلنگ کے ساتھ بندھا تھا۔

رائنہ نے تیزی سے لفافے میں ہاتھ چلایا۔ لفافہ کاغذ کی چھوٹی چھوٹی ان گنت کترنوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایسی کترنیں تھیں جو کسی نازک چیز کی پیکنگ میں اسے دباؤ سے بچانے کے لیے بھری جاتی ہیں۔ رائنہ نے لفافے کو ہاتھ میں لیا اور لاشعوری طور پر کندھے سے لٹکتے بیگ میں اڑس لیا۔ "واپسی پر سڑک کنارے لگے کوڑا دان میں ڈال جاؤں گی۔" اس نے سوچا تھا۔

صالحہ آنٹی سے اس روز کی ملاقات سے اس کے اندر کا جرم کا احساس کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ صالحہ آنٹی اس بات کو تو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہی تھیں،

جو رائنہ نے اورنگ زیب سے کہی تھی' ایبک سے ناراضی کی ان کے پاس اپنی وجہ تھی اور بقول ان کے وہ ان کے گھر کا معاملہ تھا۔ رائنہ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"تم تو دوست ہو اس کی' وہ بھی قریبی اور پرانی' ایبک کا رویہ بدلے گا تو تم تو چونکو گی ہی۔" صالحہ آنٹی نرم لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"گویا مسئلہ کچھ اور تھا۔" واپسی کے لیے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ "وہ بلاوجہ ہی دل گیر ہوئی۔ لیکن پھر ایبک مجھ سے کیوں منہ پھلائے پھر رہا ہے اور چار کے گروپ سے خود کو علیحدہ کر لینے کی کیا وجہ ہے۔" پھر اس کا ذہن ایک نئے نقطے پر اٹک گیا اور اسی نقطے پر سوچتے ہوئے وہ کاغذ کی کترنوں والا لفافہ سڑک کنارے لگے کوڑادان میں ڈالنا بھول گئی۔

☆ ☆ ☆

"وہ یقیناً" خواب ہی تھا۔" جنگلی ڈیزیز کے مرجھائے ہوئے پھولوں کو اسلامیات اختیاری کی کتاب میں رکھتے ہوئے سطوت نے بالآخر پندرھویں روز ہار مانتے ہوئے فیصلہ کر لیا تھا۔

نہ تو کوئی ڈاک خانے والے راستے پر آتا تھا نہ ہی تاج چاچا کے اسٹور پر حساب چکاتا تھا۔ لوگ ٹھیک کہتے تھے' مسلسل تنہائی اور مشکلات سے انسان طرح طرح کے اوہام میں پڑ جاتا ہے۔ سطوت کے ایسے ہی ایک وہم کا نام ایبک تھا اور اب اسے باقی کی پوری زندگی اس وہم کے فسوں سے خود کو نکالنے کی کوشش کرنا تھی۔

دن گزرتے اور موسم بدلتے چلے جا رہے تھے۔ بی ایس سی فائنل کے امتحان آئے اور ہو کر ختم بھی ہو گئے۔ ظفر اور معاذ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے اسلام آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے اور رائنہ ایک ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ چاروں ایک بار پھر کہیں اکٹھے مل بیٹھ سکیں۔ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی گرد کا صاف ہونا بہت ضروری تھا' مگر وہ ایبک تھا جس نے صالحہ کی ڈانٹ ڈپٹ اور بدگمانی کے نتیجے میں خود پر پڑنے والے کیچڑ کے چھینٹوں کو صاف کرنے کی ایک بار بھی کوشش نہیں کی تھی۔

اس نے صالحہ کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا تھا' بس خود میں گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔ صالحہ کے پاس اب اس کی خبر لانے کو اورنگ زیب اور رضوان کے علاوہ اور اعتبار والے چند لوگ تھے اور انہیں ہر جگہ سے یہ ہی رپورٹ ملتی تھی کہ ایبک نہ ڈاک خانے والے راستے پر دکھا گیا نہ ہی کبھی تاج خان کے اسٹور کے قریب سے گزرا تھا۔ قمر آرا کے کھاتے میں قمر آرا کی طرف ادھار روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا اور ایک دن جلد ہی ایسا بھی آنے والا تھا جب تاج خان نے قمر آرا کو مزید ادھار سودا دینے سے انکار کر دینا تھا۔

صالحہ کو اطمینان ہونے لگا تھا۔ ایبک اپنے کمرے میں گھسا پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے امتحان کے دوران ہی وہ جرمنی میں رہنے والے اپنے چچازاد بھائی سے ایبک کے مستقبل کے بارے میں معاملات طے کر چکی تھیں۔ انہوں نے اس سے بات بھی کر لی تھی' اسے جرمنی جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا' ان کے ناتجربہ کار' بے ضرر اور معصوم بیٹے کے لیے بس اتنی ہی ڈوز کافی تھی۔

☆ ☆ ☆

ظفر کے گھر کے گیراج میں دیوار سے ٹیک لگائے وہ نیچے فرش پر بیٹھا تھا۔ گیراج میں روشن کم طاقت کے انرجی سیور کی روشنی اس کے چہرے کے خدوخال کو واضح کرنے کے لیے ناکافی تھی' لیکن اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھا معاذ دیکھ سکتا تھا کہ وہ اداس تھا اور دکھی بھی۔

"تم نے غلط کیا ایبی۔ تمہیں صالحہ آنٹی کو سب سچ سچ بتا دینا چاہیے تھا۔"

"کیوں بتاتا۔" اس نے گردن موڑ کر معاذ کی طرف دیکھا۔ "انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی کب' وہ تو کنفرڈ تھیں کہ ادھر ادھر سے سن کر وہ جو سوچ رہی

تھیں' وہ بالکل ٹھیک تھا۔"

"غلط فہمیاں تو پیدا ہی دور کیے جانے کے لیے ہوتی ہیں یار! وہ بھی ماں اور بیٹے کے درمیان' آنٹی کی غلط فہمی دور کرنے میں تمہیں کیا مسئلہ تھا۔" ظفر کا سایہ گیراج کے اندر آکر ان دونوں پر پڑنے لگا۔

"اگر وہ مجھے زندگی کے ان بائیس سالوں میں ڈھنگ سے نہیں جان پائیں تو کیا ان چند لمحوں میں جان جاتیں۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بہتر ہوتا اگر خود پر وہ گھٹیا اور ناقابل برداشت الزام سننے سے پہلے میں مر جاتا۔"

"الزام تو انہوں نے قمر آرا پر لگایا تھا یار! تم پر تو نہیں۔" ظفر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"وہ بھی قمر آرا کے ماضی کے کارناموں کی وجہ سے' تمہیں تو وہ معصوم سمجھتی ہیں شاید۔"

"بدگمانی اتنی شدید ہو جائے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ دے' انسان کو بصارت سے محروم کردے اور وہ اپنے سامنے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چیزوں کو اپنی مرضی کی شکل دینے لگے تو ایسے شخص کو چیزوں کی اصل شکل سمجھائی نہیں جا سکتی۔ قمر آرا کا ماضی کیا تھا' اگر ہم بغیر اس کا حال دیکھے اسے صرف ماضی کی نظر سے دیکھتے رہیں گے تو پھر تو وہ ہمیشہ کے لیے مطعون ہی ٹھہرے گی نا۔" ایبک جیسے نیند میں بول رہا تھا۔

"گویا تم قمر آرا کو بھی ویسا نہیں سمجھتے جیسی وہ مشہور ہیں۔" ظفر حیرت سے بولا۔

"میں قمر آرا کی وکالت نہیں کر رہا' مجھے ماما سے ایسی تنگ نظری اور بدگمانی کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بھی وضاحت لیے بغیر قمر آرا پر الزام دھر دیا۔ ماما خود کو اعلا ظرف سمجھتی ہیں' مگر در حقیقت ان کا ظرف بلند نہیں ہے۔"

"تم صالحہ آنٹی کو "لارجر دین لائف" فریم میں جڑا ایک امیج سمجھتے ہو ایبک! جب کہ کوئی بھی انسان اتنا پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ ذاتی تعصبات ہر کسی کے ساتھ چمٹے ہوتے ہیں۔" ظفر اسے وہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جو وہ سمجھنا چاہتا ہی نہیں تھا۔

"ماما نے میری نظر میں اپنے امیج کو ہمیشہ کے لیے لیٹ ڈاؤن کر دیا ہے' لیکن وہ میری ماں ہیں' میں انہیں لیٹ ڈاؤن نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ جو توقع مجھ سے رکھتی ہیں میں اس پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"فرار حاصل کر رہے ہو یہاں سے' ہے نا!" معاذ نے اسے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

"تم نے اسے بھی کچھ بتایا ہے کہ ہو کیا رہا ہے' جس کی وجہ سے تھوڑے سے دنوں میں حالات کا نقشہ بدل گیا۔"

"اسے سوچنے اور سوچ کر سمجھنے کی عادت نہیں ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "وہ ہر طرح کے حالات کی عادی ہو جانے کی غیر معمولی صلاحیت کی مالک ہے۔ میں اسے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

ظفر اور معاذ نے کم روشنی میں دیوار پر پڑتے ایک دوسرے کے سائے کی طرف دیکھا۔ وہ جس ایبک کو ہمیشہ سے جانتے تھے' وہ فیصلہ کر لینے کے بعد اسے بدل دینے کا عادی نہیں تھا' وہ دونوں جان گئے تھے کہ اس معاملے پر ایبک کو جتنا ان دونوں کے سامنے حال دل سنانا تھا' وہ سنا چکا تھا۔ اس سے آگے وہ ایک لفظ بھی نہیں بولنے والا تھا۔

"یہ تمہارے لان میں آگ کیوں روشن ہے؟" ایبک نے گیراج کے اٹھتے ہوئے شٹر کے عین نیچے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"صرف آگ نہیں' یہ وہ سالانہ بون فائر ہے' جو ہم سال کے اس حصے میں مناتے ہیں۔ آج تمہارے لیے خصوصی بون فائر کا اہتمام کیا ہے میں نے۔" ظفر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ایبک اور معاذ بھی ظفر کے پیچھے چلتے لان میں آگئے۔ روشن آگ کے قریب رائنہ کھڑی اس میں خشک ٹہنیاں اور پتے جھونک رہی تھی۔ آگ کی روشنی میں ایبک اور رائنہ کی نظریں لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے سے ملیں' رائنہ کی نظروں میں افسردگی تھی اور ایک التجا بھی۔

"میں جذباتی ہوں اور ضرورت سے زیادہ بول جانے والا شخص بھی ہوں۔" ایبک نے آگ کے اس الاؤ کے قریب بیٹھتے ہوئے رائنہ سے کہا۔

"میرا یقین کرو۔ میرا مقصد وہ نہیں تھا جو ہو گیا۔" رائنہ کے لہجے میں مجرموں کی سی شرمندگی تھی۔

"ہو سکتا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "واقعات کو رونما ہونے کے لیے وجوہات چاہیے ہوتی ہیں۔ تمہارا تجسس میرے گھر والوں کی نظروں میں مجھے منہ کے بل گرانے کی وجہ بن گیا۔" اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ ہوتا رہتا ہے۔"

"میں نے صالحہ آنٹی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" رائنہ کے لہجے میں ایبک سے زیادہ شکستگی تھی۔

"اور وہ نہیں مانی ہوں گی۔" ایبک کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔ "ان کو ماننا بھی نہیں چاہیے تھا، تعصب کی عینک سے چیزوں کا منظر ویسا ہی نظر آتا ہے جو ہم نے سوچ لیا ہوتا ہے۔ مجھے ماما سے بھی کوئی گلہ نہیں۔" الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔

"کم آن بچو۔" معاذ نے تالی بجاتے ہوئے ان تینوں کو اسی طرح مخاطب کیا جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ "آج کی رات آخری رات ہے۔ کل صبح طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ دنیا بدل جانے والی ہے۔"

ہر سال بون فائر کے دوران اس قسم کے اعلان کرنا بھی معاذ کی عادت تھی، مگر یہ پہلا موقع تھا جب ان چاروں میں سے ہر کوئی جانتا تھا کہ آنے والے کل میں واقعی دنیا بدل جانے کو تھی۔

"ایبک جرمنی جا رہا ہے۔ مجھے اور ظفر کو اسلام آباد میں ایڈمیشن مل چکا ہے۔ اور رائنہ تم۔" معاذ نے رائنہ کی طرف دیکھا۔ "تم اپنے پیرنٹس کے ساتھ لاہور جا رہی ہو کیونکہ تمہارے ڈیڈی نے کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں نے کہا نا، آج کی رات آخری رات ہے۔ کل صبح طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ دنیا بدل جانے والی ہے۔۔۔۔"

"لیکن کچھ لوگ ہیں، جن کے لیے ہر دن کا نیا سورج کبھی بھی اپنے ساتھ کچھ نیا لے کر نہیں آتا۔" معاذ نے قریب بکھری چھوٹی چھوٹی خشک ٹہنیاں اور جھاڑ جھنکار روشن الاؤ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک سی زندگی گزارے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک دن دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔" وہ ایک انگریزی نظم کا ترجمہ سنا رہا تھا۔

"اور ایسے ہی چند لوگ میرا غم ہیں۔" معاذ نے نظم کا اگلا حصہ سنایا۔

"ایسے ہی چند لوگوں کے لیے میں جینا چاہتا تھا۔" ظفر روشن الاؤ پر نظریں جمائے بولا۔

"لیکن مجھ کو جینے نہیں دیا گیا۔"

ایبک نے ہاتھ میں پکڑا آخری خشک چرمراتا پتہ آگ میں اچھالا۔

✡ ✡ ✡

بہار کے بعد برسات گزری اور وادی میں ایک بار پھر سرما کا موسم اترنے لگا تھا۔ قمر آرا کے جسم کے جوڑ کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے جا رہے تھے اور ہڈیاں ہر روز پہلے سے زیادہ بھربھری اور نرم۔ سرما کے آغاز پر کپڑے بدلتے ہوئے ان کے کندھے کا جوڑ اتر گیا اور ریڑھ کی ہڈی کا ایک مہرہ بھی اپنی جگہ چھوڑ گیا۔ سطوت نے کالج جانا چھوڑ دیا۔

پشاور سے قمر آرا کا بڑا بھائی ایک رات کے لیے آیا تھا۔ وہ مصر تھا کہ قمر آرا اور سطوت اس کے ساتھ پشاور چلی جائیں۔ وہاں قمر آرا کا بہتر علاج ہو سکتا تھا، مگر قمر آرا وہ جگہ چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھیں، مایوس ہو کر سطوت کے ماموں نے کچھ رقم قمر آرا کے اکاؤنٹ میں ڈلوائی اور واپس چلا گیا۔

ماموں کی دی ہوئی رقم سے چند مہینے علاج معالجے اور خوراک کے ساتھ نکل گئے اور اس کے بعد گھر میں ایک بار پھر فاقوں نے ڈیرا ڈال لیا۔

"ہاتھ پیر ہلانے پڑیں گے، آسمانوں سے من و سلویٰ کوئی بھی اس گھر میں نہیں اتارے گا۔" قمر آرا کا سارا دن چیخ چیخ کر سطوت کو اکسانے میں گزر جاتا اور

سطوت کرسی پر بیٹھی میز پر سجے ایک ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر مانیٹر کی اسکرین دیکھتے گزارتی۔

"سمجھ میں نہیں آتا یہ منحوس کدھر سے تمہارے ہاتھ لگ گیا۔" قمر آرا کا بس سطوت پر نہ چلتا تو وہ اس مانیٹر کو کوسنے لگتیں۔ "جانتی ہوں... میں تمہارے ہاتھ پیسے پکڑاتی رہی اور تم ان پیسوں سے اپنے لیے یہ منحوس مشغلے خرید کرلاتی رہیں۔ خوب تم نے پیسے برباد کیے اور مجھے کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

وہ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے آگے کھسک کر اس بے جان اسکرین کو دیکھنے کی کوشش کرتی جس پر بھی سطوت کی نظریں ادھر ادھر ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ سطوت انہیں کبھی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کمپیوٹر اور کتابیں' اس استری کی طرح اسے اپنی دہلیز پر پڑی ملی تھیں جس نے ایک رات انہیں سردی سے بچایا تھا۔

"ارے میں تو کہتی ہوں پڑھنا پڑھانا تو تم نے ہے نہیں' یہ جو کتابوں کا ڈھیر بستوں میں بند کر کے الماری پر رکھ چھوڑا ہے' جا اسے ہی ردی میں بیچ آجا کر۔ کچھ تو پیسے مل جائیں گے۔" اس کی بے حسی قمر آرا کو مصلحت آمیز لہجہ اپنانے پر مجبور کر دیتی۔

"یہ کتابیں؟" سطوت کی نظر مانیٹر سے ہٹ کر الماری پر سجی کتابوں پر جا ٹھہرتی۔ "ان کے اندر تو میری سانس بند ہے۔ ان کے ساتھ میری زندگی کے چند خوش گوار دن خواب کی طرح جڑے ہیں۔ ان کے صفحوں پر تو زندگی ہنستی ہے اور کھیلتی ہے۔ میں اپنے سانس' اپنے خواب اور ہنستی کھیلتی زندگی کیسے ردی میں بیچ سکتی ہوں امی!" وہ زیر لب کہتی۔

"کچھ اور بیچنے کو بچا ہے اس گھر میں تو کہیں' میں ابھی جا کر بیچ آتی ہوں۔" وہ نظر اٹھا کر قمر آرا کی طرف دیکھتی۔

"محمدی بتا رہی تھی' نیچے وادی میں ننھے بچوں کا نیا اسکول کھلا ہے' اسکول والے کم پڑھی لڑکیوں کو بھی ٹیچر بھرتی کر رہے ہیں' جا۔ محمدی کے ساتھ جا کر ایک درخواست تو بھی دے آ۔" قمر آرا کو نیا خیال سوجھا۔

"میں میٹرک سیکنڈ ڈویژن۔" وہ سوالیہ نظروں سے قمر آرا کو دیکھتی "عمر بھر مر مر کے پاس ہونے والی ایک لڑکی کو اس بستی کا کون سا استاد نہیں جانتا ہو گا۔ مجھے کون دے گا نوکری۔"

لیکن پھر ایک دن محمدی خالہ اسے زبردستی گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے ہی گئیں۔ بستی کے عام لوگ اپنی بچیوں کو نوکری کی اجازت نہیں دے رہے تھے اور اسکول کھولنے والوں کو ٹیچرز کی فوری ضرورت تھی' سو سطوت کو ہاتھوں ہاتھ اسکول میں نوکری مل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سنا ہے۔" اورنگ زیب نے آتش دان میں جلتی آگ پر ہاتھ سینکنے کے بعد انہیں آپس میں رگڑتے ہوئے بات شروع کی۔ صالحہ نے کشیدہ کاری کے فریم سے نظر اٹھا کر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

"اب یہ کچھ نیا سن آیا۔" انہوں نے دل میں سوچا۔

"وہ جو جانے سے پہلے ایبک نے بتایا تھا کہ وہ اپنا کمپیوٹر' کتابیں اور سی ڈیز' کسی جونیئر طالب علم کو دے آیا تھا' وہ اس نے کالج کے کسی بچے کو نہیں دی تھیں۔"

"اچھا تو پھر کسے دے دیں؟" صالحہ کو اورنگ زیب کی یہ نئی کہانی ذرا بھی دلچسپ نہیں لگی تھی۔

"یہ تو پتا نہیں۔" اورنگ زیب نے سر ہلایا۔ "لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کہیں انہیں بیچ کر رقم چچی قمر آرا کو نہ دے گیا ہو۔"

"حد کرتے ہو تم بھی اورنگ زیب!" صالحہ نے فریم صوفے پر پٹخ دیا۔ "ایک بار علم ہو جانے پر میں نے باز کی طرح اس پر نظر رکھی' وہ کب قمر آرا سے مل سکا ہو گا اور کہاں۔" "یہاں نیچے گھر میں؟"

اورنگ زیب نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر وہاں ڈاک خانے والے راستے پر؟" انہوں نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتنی فرصت میں نے اسے ملنے دی تھی کیا؟" اورنگ زیب نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

"وہ بھی اپنی کم عمری، معصومیت اور بھولے پن میں اگر وہ قمر آرا کی بچھے دار باتوں میں آ ہی گیا ہوگا تو پھر میرے ایک دفعہ سمجھانے پر دیکھا نہیں تھا کیسا گم صم ہوگیا۔ شرمندگی اس کی نظروں سے جھلکتی تھی۔ تمہیں تو بے کلی کی سننے اور آگے سنانے کی عادت ہی ہو چکی ہے۔" صالحہ کا دل ایبک سے جدائی پر بوجھل تھا، قمر آرا والے قصے پر دل کا ملال ابھی تک نہیں گیا تھا اس پر اورنگ زیب کی باتیں۔

"آپ نے بڑا عقل کا کام کیا ماما!" ماں کو یوں غصے میں آتے دیکھ کر اورنگ زیب نے بات بدلی۔ "جو فنانٹ ایبک کو یہاں سے نکالنے کی کی۔"

"کیا عقل کا کام کیا۔" صالحہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں بولیں۔ "میری تو عقل مت سب ماری گئی اس انہونی کو سن کر یوں افراتفری میں اسے یہاں سے نکالنے کی پڑ گئی مجھے کہ اس کے رزلٹ تک کا انتظار نہ کرنے دیا۔ یہاں سے دیکھ بھال کر جاتا تو اچھی سے اچھی یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا تھا اسے۔ رزلٹ دیکھا تھا اس کا۔" انہوں نے اورنگ زیب کو جتایا۔

"پورے ڈویژن میں ٹاپ کیا اس نے، اتنے نمبر کوئی دو جنم میں لے کر دکھائے جتنے اس نے لے لیے پھر بھی اپنی مرضی کی یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے سکا۔ میرے فیصلوں پر سر جھکا دیا بس....."

"اس کی ڈگری کے ساتھ جرمنی کی کسی بھی یونیورسٹی کا نام لگا ہوگا تو یہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، فکر کیوں کرتی ہیں آپ؟" اورنگ زیب نے سر جھکا۔

"فکریں تو جیسے میری جان کو چٹ کر رہ گئی ہیں۔" صالحہ زیر لب بولیں۔ "اب تم بس تیاری پکڑو، میں نے بھائی جان سے بات کرلی ہے۔ اگلے مہینے ہم کراچی جا رہے ہیں، میں اور تم... باراتی۔ گھر میں بہو آجائے گی تو میرے دل کو بھی رونق کا کچھ احساس ہونے لگے گا۔" انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

☆ ☆ ☆

اوپر والے گھر میں دلہن آگئی تھی۔ محرابی برآمدے میں جس کے سامنے باریک تیلیوں سے بنی نازک چقیں تنی رہتی تھیں۔ اب وہ چقیں اوپر اٹھی اور بندھی رہتی تھیں اور سجی بنی اور نئی نویلی دلہن برآمدے کے ستونوں اور لکڑی کی ہری ریلنگ کے ساتھ کھڑی نظر آتی تھی۔ اسکول کے لیے جاتے آتے سطوت ایک بار سر اور نظر اٹھا کر اسے ضرور دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنے دھیان میں چلنے لگتی۔ اس کے روزانہ کے اس معمول کے دوران کبھی کبھار اورنگ زیب بھی اسے نظر آجاتا، مگر اورنگ زیب کا بھائی کہاں تھا اسے کچھ پتا نہ چل سکا تھا۔ بی ایس سی فورتھ ایر کے اسٹوڈنٹس کالج سے مکمل رخصت ہو چکے تھے۔ اسکول میں اس کے ساتھ کی ٹیچرز اسے بتاتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر مزید پڑھائی کے لیے بڑے شہروں کی طرف چلے گئے تھے۔ ایبک اور اس کے تینوں دوست بھی اسی سلسلے میں وہاں چلے گئے ہوں گے، اس نے خود سے سوچ لیا تھا۔

ڈاک خانے والے راستے اور تاج چاچا کے اسٹور کی باتیں دن گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید خواب ہوتی چلی جارہی تھیں، لیکن وہ اسکول کی پرنسپل تھی جو کبھی کبھار اسے اپنے آفس میں بلا کر اچنبھے کا اظہار ضرور کرتی تھی۔

"میں نے سنا تھا تم اسکول میں ایک عام درجے کی طالبہ تھیں۔" وہ کہتیں۔ "اور کالج کی تعلیم بھی تم مکمل نہ کرپائیں، لیکن تمہاری جنرل نالج، میتھس کی کیلکولیشنز اور انگریزی کی شدھ بدھ کافی اچھی ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے تم عام درجے کی طالبہ کیسے رہ گئیں۔"

"جب کیلکولیشن کی سمجھ آنے لگی، ڈکشنری رٹ لینے کا سبق پڑھنے کو ملا اور سامنے والے پتھر پر بیٹھے شخص نے جنرل نالج کے خزانے میرے کانوں میں ڈالنے شروع کیے، وہ نصف رات سے ذرا پہلے کا وقت۔"

وہ پرنسپل کے سوال کے جواب میں سر جھکائے خاموشی کی زبان میں جواب دیتی۔ "اس کے بعد بارہ بجے کا گھنٹہ بجنے میں ذرا سا وقت ہی باقی رہتا تھا۔ ابھی تو

انج کی کلاسوں میں سزاؤں سے بچ کر سر اٹھا کر بیٹھنے کا سلسلہ ہی شروع ہوا تھا کہ بارہ کا گھنٹہ بج گیا اور میرے رتھ بان دوبارہ سے مینڈک بن گئے' میرا رتھ ایک عام سے کدو میں تبدیل ہو گیا اور میرا سنہری کرنوں والا لباس چیتھڑوں کی شکل اختیار کر گیا۔"

اس کی نظروں کی اداسی پرنسپل کو اپنے دل پر اثر کرتی محسوس ہوتی۔

"کیا بات ہے سطوت سجاد' تم اتنی خاموش طبع کیوں ہو؟" وہ اپنا سوال بدل دیتیں۔

"میں نے اپنی امی سے کہا بھی تھا ڈاک خانے کا راستہ طویل اور دشوار ہے' مجھے ادھر جانے سے ڈر لگتا تھا' وہ نہیں مانیں اور انہوں نے مجھے اس راستے پر بھیج دیا۔ دیکھیں میڈم! مجھے اس راستے پر جانے کی سزا ملی ہے۔ مجھے وقت کے بھیڑیے نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں اور خونخوار دانتوں میں دبوچ لیا ہے۔" وہ پرنسپل کو اپنے خاموش طبع ہونے کی وجہ بتانا چاہتی تھی مگر بتا نہیں پاتی تھی۔

"ویل ڈن سطوت سجاد!" پرنسپل اس کی مسلسل خاموشی پر گہرا سانس لیتے ہوئے کہتیں۔

"Keep working hard" (محنت جاری رکھو) میں تمہارے کام سے خوش اور مطمئن ہوں حالانکہ تمہیں ٹیچنگ کے لیے ہائر کرنا ایک بہت بڑا رسک تھا۔" وہ اسے جتاتا نہ بھولتیں۔

"تمہاری کلاس کا ششماہی رزلٹ اچھا آیا تو میں تمہارے لیے اضافی بونس کی بھرپور سفارش کروں گی۔"

اور یہ بھی تو ڈاک خانے والے راستے پر بیٹھ کر پڑھنے والے اسباق کا کمال ہی تھا ناکہ سال میں دوبار اس کی تنخواہ میں اضافہ اس کی کارکردگی کی وجہ سے ہوا تھا۔ سطوت اس خواب سے نکلنے کی کتنی ہی کوشش کرتی' کیسے نکل سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم جانتے ہو' تم میرے ساتھ اچھا نہیں کرتے ہو۔" صالحہ فون پر ایک سے مخاطب تھیں۔

"اب میں نے کیا کیا ہے ماما؟" وہ دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

"دنوں مجھ سے بات نہیں کرتے ہو' کبھی کوئی خط بھی نہیں بھیجتے۔" وہ گلہ کر رہی تھیں۔

"میں ای میل بھیجتا تو ہوں ماما... اورنگ زیب بھائی آپ کو پڑھا دیتے ہیں۔"

"جانے دو ای میلز کو... جو بات طویل خطوط میں تھی' وہ ای میلز میں کہاں۔ نپے تلے لفظ وہ بھی رومن انگریزی میں... نہیں' میری تسلی نہیں ہوتی۔" وہ سر ہلاتیں۔

"چھوڑیں ہاتھ سے لکھے خطوط کو ماما..." اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب کون لکھتا ہے خط اور ویسے بھی خط لکھوں تو آپ تک پہنچے کیسے۔ پاکستان خان کے بعد بستی کے لیے آج تک کوئی ڈاکیا مقرر نہیں کیا۔ محکمہ ڈاک نے..."

"میں منگوالوں گی یا پھر خود لے آیا کروں گی جا کر۔ تم لکھو تو سہی۔" انہوں نے بے قراری کے عالم میں کہا تھا۔

"آپ جائیں گی' ڈاک خانہ والے راستے پر..." وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ "میری مانیے ادھر جانے کا کبھی سوچیے گا بھی مت۔ وہاں پر ایک ایسا ونڈر لینڈ آباد ہے جس میں داخل ہونے کے بعد انسان خود سے باہر نکل نہیں پاتا' ہاں نکال کر باہر پھینک دیا جائے تو اور بات ہے۔"

"پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم۔" صالحہ جھنجلا کر بولی تھیں۔ "میری بات غور سے سنو' یا تو مجھے ہر دوسرے دن فون کیا کرو یا پھر خط لکھا کرو تفصیل سے... اتنی دور بیٹھی ماں کی یاد نہیں آتی تمہیں کیا۔ میں کیسے زندگی گزار رہی ہوں۔ کن مسائل کا سامنا کر رہی ہوں۔ کچھ جانتے بھی ہو تم؟"

"اب آپ اموشنل بلیک میلنگ کرنے لگی ہیں۔" وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ "کیا میں جانتا نہیں کہ آپ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی عادی ہیں' ایسی

نپی تلی زندگی جس میں مسائل آپ کے قریب پھٹکنے سے بھی ڈرتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز ابھرا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایبک صالحہ کے مزاج کو ٹھیک ہی جانتا تھا' لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ حالات بدل جاتے ہیں۔ عمر ڈھلنے کے ساتھ مزاج بھی ڈھل جاتے ہیں اور صالحہ اسی عمل سے گزر رہی تھیں۔

گھر میں بہو اور وہ بھی بہو کی شکل میں اپنی بھتیجی اپنی دوسراہٹ کے خیال سے لائی تھیں۔ جس نے کچھ عرصہ تو نئی شادی کے چاؤ چونچلوں میں گزار دیا اور پھر ان کے گھر کے بندھے ٹکے اصولوں اور معمول میں دخل انداز ہوگئی۔ وہ ان کے سگے بھائی کی بیٹی تھی' لیکن میدانوں کی مکین' ان برف پوش پہاڑوں میں گھری اس بستی کی مخصوص چال سے چلتی زندگی اسے موافق آرہی تھی نہ ہی پسند۔

"ایسا لگتا ہے۔ آپ لوگ ابھی بھی انیس سو ساٹھ' ستر کی دہائی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس علاقے میں موبائل کے سگنلز کا حال کراچی کی ہڑتالوں جیسا ہے جو آئے روز شٹر بند کرادیتی ہے۔" اس کے چہرے پر تمسخر ابھرتا اور سٹلائٹ ٹی وی کا تو تصور ہی نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی پیدائش سے لے کر اب تک پی ٹی وی کے پروگرام نہیں دیکھے' آپ لوگ کیسے اتنے ذوق و شوق سے دیکھ لیتے ہیں اس حکومتی تسلط میں جکڑے چینل کو۔" اس کے لہجے میں بے زاری اپنے عروج پر محسوس ہوتی۔

"آپ نے لگتا ہے عمر بھر گملوں میں سبزیاں اگا' پکا اور کھلا چھوڑیں' دن رات سبزی کھا کھا کر اورنگ زیب کا ذہن بھی آلو جیسا موٹا ہوچکا ہے۔ مخصوص باتوں کے علاوہ کچھ اور سوچتا ہی نہیں ہے۔"

صالحہ بہو کے بھاشن سنتیں' ان کی طبیعت پر بوجھ پڑتا مگر تحمیں سمجھ دار' اسی لیے پہلے پہل کی چند ایک بار کے سوا اس کی کسی بات سے اختلاف تو کیا جواب دینے سے بھی گریز کرتیں۔

"کہاں ہے وہ مختلف سرگرمیوں سے بھرپور زندگی؟" انہوں نے کئی بار مریم کو اورنگ زیب سے بھی الجھتے سنا۔ "جس کا حال تم اور ایبک مجھے فون پر سنایا کرتے تھے۔"

جواب میں اورنگ زیب آئیں بائیں شائیں کرنے لگتا' اس پر بیوی کے حسن' ذہانت' تعلیم اور رہن سہن کا رعب پڑ چکا تھا اور اب شاید اس نے دنیا کو رضوان کے بجائے بیوی کی نظر سے دیکھنا شروع کردیا تھا۔

"ایبک ہوشیار نکلا۔" وہ اورنگ زیب کو اکساتے ہوئے کہتی۔ "جانتا تھا نا' کالج کے بعد یہاں کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ وہ کیا کرسکتا تھا۔ اسی باپ' دادا کے زمانے سے چلتی آرہی کمپنی میں ریسرچ آفیسر لگ جاتا۔ جب ہی کنویں کا مینڈک بننے کے بجائے لمبی اڑان بھر کر نکل گیا' اس مہذب اور ترقی یافتہ ملک کا باسی بننے اور تم۔" وہ اورنگ زیب کی طرف دیکھتی۔ "تم کیوں نہیں سوچتے یہاں سے نکلنے کا... لوگ آگے کی طرف جاتے ہیں' تم — اتنا پیچھے رہ کر کلرکوں جیسی زندگی گزارنا چاہتے ہو۔"

صالحہ سب سنتیں اور خواہش کرتیں کہ ان کے کان بند ہوجائیں۔ یہ ہی وہ مسائل تھے جن کا تذکرہ انہوں نے ایبک سے کیا تھا۔ جسے اس نے باتوں میں اڑا دیا تھا۔ ان کا وہ دوستوں جیسا بیٹا دیارِ غیر میں جاکر یوں غیر بنتا جارہا تھا جیسے یہاں کے معمولات اس کے لیے اجنبی ہوں۔ وہ سب کچھ سمجھ اور محسوس کررہی تھیں' لیکن خاموش تھیں' جانتی تھیں کہ وقت نے حالات کی ڈور ان کے ہاتھ سے نکال کر دوسرے ہاتھوں میں تھمادی تھی۔

پھر مریم کے دن رات مغز ماری کا نتیجہ آہستہ آہستہ سامنے آنے لگا۔ اورنگ زیب بیوی کے ساتھ اس کی کسی سہیلی کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کراچی گیا اور سسر کے کہنے پر وہیں کسی ایسی کمپنی میں

انٹرویو دے آیا، جس کا کام ٹی پلانٹیشن کمپنی کے فیلڈ سروے ڈیپارٹمنٹ سے ملتا جلتا تھا۔ انٹرویو کامیاب رہا اور اورنگ زیب کا اتنے سال کام کا تجربہ بھی۔ میدانوں کی باسی بہو نے میدان مار لیا تھا۔ اورنگ زیب کا دل پہاڑوں میں گھری اس بستی سے اٹھ گیا تھا۔

"تمہیں جانا ہے، تم جاؤ، میں ادھر ہی رہنے پر مجبور ہوں۔" اورنگ زیب چاہتا تھا، وہ بھی اس کے ساتھ کراچی چلیں۔

"کیا کریں گی یہاں اکیلی رہ کر آپ؟ اور پھر مجبوری کیا ہے آپ کی؟" اورنگ زیب کو ان کے جواب نے مایوس کیا تھا۔

"یہ گھر۔ یہ گھر میری مجبوری ہے۔"

"کیوں مجبوری ہے یہ گھر؟ بیچیں اسے اور چلیں میرے ساتھ۔"

"کیسے بیچ ڈالوں، یہ مشترکہ جائیداد ہے، اکیلا اوپر کا پورشن کون خریدے گا۔" انہیں اورنگ زیب کی عقل پر غصہ آیا، لیکن وہ اسے پیتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولیں۔

"مشترکہ ہے تو کیا ہوا، آپ بات نکال دیں کہ بیچ رہی ہیں۔ نیچے والے چاہیں تو خود خرید لیں گے یا پھر نکلنا پڑے گا انہیں۔"

"وہ خرید سکتی ہے کیا؟" صالحہ نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں خرید سکتیں، ادھر ادھر کے عاشقوں سے کم مال تو نہیں بٹور رکھا انہوں نے۔ ہمارے ایک تک کی جیب خالی کر ڈالی، وہ تو اس جیسے کئی مکان خرید سکتی ہوں گی۔ آپ ایسا کریں جائیں، ان سے خود بات کریں۔" اورنگ زیب کی اس بات نے انہیں بری طرح بھڑکا دیا تھا۔

"میں اور اس سے جا کر بات کروں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔" وہ غصے سے لرزتے ہوئے بولیں۔ "اتنے برس گزر گئے میں نے اس پر نگاہ تک نہیں ڈالی کہ کہیں میری نظر پلید نہ ہو جائے، تم مجھے کہہ رہے ہو کہ جاؤں اور اس کے گھر میں بیٹھ کر اس سے بات

کروں۔" ان کے لہجے میں نفرت تھی۔ حقارت تھی یا کراہیت۔ اورنگ زیب فیصلہ نہ کر پایا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ کو اس مشترکہ جائیداد کی چوکیداری کا شوق چرا رہا ہے نا تو کیجئے اپنا شوق پورا، جب دل بھر جائے تو بتا دیجیے گا۔ ہم آکر آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

اورنگ زیب کے بجائے اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر جواب دیا تھا اور اورنگ زیب کو بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ اندر کمرے میں لے گئی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ میرے ساتھ؟" انہوں نے دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنے حال پر غور کرنے کی کوشش کی۔ "میں سینائل ہو رہی ہوں، ضدی اور خر دماغ یا پھر میرا دل اب اس بستی سے دور کہیں اور لگنے والا نہیں۔" لاشعور میں چھپے اسی خوف کے تحت انکار کر رہی ہوں یا وجہ کچھ اور ہے۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد بھی انہیں اصل وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

قمر آرا، دن بہ دن پہلے سے زیادہ بیمار، کمزور اور چڑچڑی ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے جسم کا ہر عضو بے کار اور کمزور ہو رہا تھا سوائے زبان کے۔ زبان جو طاقت ور تھی اور ہمہ وقت انگارے چبائے رکھتی تھی۔

سطوت، قمر آرا، گھر اور نوکری کی ذمہ داریاں نبھاتے ہلکان ہو جاتی، لیکن قمر آرا کی زبان تھی جو شعلے اگلتے نہ تھکتی تھی۔ وہ سطوت کو طعنے، کوسنے اور گالیاں دیتیں اور اس تقدیر سے گلے کرنے میں وقت گزارتیں جس نے انہیں عمر بھر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے نہیں دی تھی۔

"اللہ کا خوف کرو قمر آرا! اس بچی بے چاری پر سارا غصہ نکال دیتی ہو، جو خود یتیم ہے اور بے آسرا اور جسے تمہارے مزاج نے عمر بھر اپنی مرضی سے سانس تک نہیں لینے دیا۔ کیسی ماں ہو تم جو اسے کوسنے اور

بددعائیں دیتے نہیں تھکتیں' کیا تمہارا دل ان کے آنے والے وقت سے خوف نہیں کھاتا۔"

ممی خالہ کبھی ادھر کا چکر لگاتیں تو قمر آرا کو احساس دلانے کی کوشش کرتیں۔ لیکن قمر آرا کو اپنی ذات کے علاوہ جیسے ہر چیز سے بیر تھا اور اس بیر کا سارا طیش سطوت پر نکلتا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو ماما کو وہاں اکیلے نہیں چھوڑ آنا چاہیے تھا۔ تنہائی اس عمر میں ان کے لیے بہت بری ثابت ہو سکتی ہے۔" لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ایک' اورنگ زیب کے سامنے بیٹھا تھا۔ مہذب' جدید اور بڑے شہر میں آکر اورنگ زیب کا رابطہ دنیا کے ہر کونے سے جڑ چکا تھا۔ اس وقت ایک اسکائپ کال پر اس سے بات کر رہا تھا۔

"تم جانتے ہو' وہ ضدی ہیں اور من مانی کرنے کی عادی بھی۔" اورنگ زیب لاپروائی سے بولا۔ "انہیں صرف اس مشترکہ جائیداد کے غم نے وہاں روک رکھا ہے' ورنہ آہی جاتیں میرے ساتھ۔"

"ان کا پوائنٹ درست ہے اور وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان کے لیے کیا بہتر ہے۔ آپ کو وہاں سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ نے انہیں تنہا چھوڑ دیا۔" اورنگ زیب نے دیکھا' اس کا لاابالی' زندگی سے بھرپور' موج مستی کا دلدادہ' شوخ و شنگ بھائی ایک سنجیدہ اور دھیمے مزاج کے مرد میں ڈھل چکا تھا۔

"تم ایسا کرو' تم واپس آجاؤ' ڈگری تمہاری مکمل ہو چکی' اب تو واپس چلے آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ آؤ اور آکر پھوپھو کے ساتھ رہو۔" اورنگ زیب کے بجائے مریم نے جواب دیا تھا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" اورنگ زیب احساس شرمندگی پر امکان کے چھینٹے پڑے۔ "ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ۔۔۔"

"پلیز اورنگ زیب بھائی بس کریں۔" ایک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "اب تو سننا چھوڑ دیں۔" اورنگ زیب جھینپ گیا۔

"رہی بات میرے واپس آنے کی۔" پھر وہ مریم سے مخاطب ہوا "تو میں تو وہاں سے نکالا گیا۔ ہوں' واپس کیسے آسکتا ہوں۔" اس نے کہا تھا اور کچھ لمحے بعد سائن آؤٹ کر گیا تھا۔

"سب کے پاس اپنے اپنے بہانے ہیں۔" اس کے سائن آؤٹ کر جانے کے بعد مریم نے اورنگ زیب کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ "دیکھو تو اب کتنے سکون سے اس نے بہانا کر دیا کہ اس کو تو وہاں سے نکالا گیا تھا۔ صاف تم پر اور پھوپھو پر طنز کر رہا تھا۔"

"بات یہ نہیں ہے کہ وہ پھوپھو کے رویے پر ناراض ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی قمر آرا بوڑھی اور بیمار ہو چکی ہے۔" مریم کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"شٹ اپ مریم! شٹ اپ!" اورنگ زیب نے خود کو کہتے سنا تھا۔

☆ ☆ ☆

سرما کے وہ مختصر دن تو ادھر ادھر کے کاموں میں گزر جاتے تھے' لیکن وہ راتیں تھیں جو طویل تھیں اور تنہائی کے احساس سے بھرپور۔ وہ ساری ساری رات کروٹیں بدلتی رہتیں' مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور بھاگی پھرتی۔ ان کا جسم لیٹے لیٹے دکھنے لگتا اور پھر وہ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتیں اور کبھی کمروں میں ٹہلنے لگتیں۔ مسلسل تنہائی ان پر یاسیت اور قنوطیت کی کیفیت طاری کر رہی تھی۔

وہ بھی ایسی ہی ایک بے خواب رات تھی جب وہ بے خوابی کا شکار ہو کر مختصر سے برآمدے میں ٹہلنے لگی تھیں۔ لکڑی سے بنی محرابوں پر چقیں تنی تھیں' پھر بھی برف پوش پہاڑوں سے آتی یخ بستہ ہوا تیر کی طرح جسم میں کھبی جاتی تھی۔ گرم اونی شال میں لپٹی وہ یوں ہی ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھیں' جب انہیں محسوس ہوا کہ قریب ہی کہیں کسی ذی روح کی دھونکنی کی طرح سانس چلنے کی آواز خاموشی کی چادر کو پھاڑنے

لگی تھی۔ انہوں نے چونکنا ..... ہوتے ہوئے دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر اس سانس کی آواز تھی کہ بلند ہی ہوتی چلی جارہی تھی۔ جیسے کوئی مشقت بھرا کام کیا جارہا ہو۔
صالحہ گھبرا کر برآمدے میں رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گئیں۔ لحہ بہ لحہ سانس کا وہ زیروبم رات کے سناٹے میں پہلے سے زیادہ بلند آواز پیدا کررہا تھا۔ پھر اس میں ایک ایسی اذیت کی آہ شامل ہوگئی جیسے کسی جانور کا گلا کاٹا جارہا ہو' جیسے کوئی نزع کے عالم میں سختی سے آسانی چاہ رہا ہو۔ صالحہ کی آنکھیں وحشت اور خوف کے مارے جیسے ابل کر باہر آنے کو تھیں۔ دھونکنی کی طرح چلتے سانس میں آہیں' سسکیاں فریاد اور منتیں شامل ہونے لگیں۔ یقیناً" وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھیں یا پھر اس تنہا بے آباد گھر میں کوئی غیر مخلوق آن بسیرا کر بیٹھی تھی۔
اس شدت کی سردی میں بھی وہ سرتاپا پسینے میں بھیگ گئی تھیں۔ دعائیں' آیتیں' سورتیں' انہیں جو کچھ بھی یاد آرہا تھا' وہ ورد کیے چلی جارہی تھیں۔ حلق میں اٹکے کسی سانس کے اتار چڑھاؤ کی سی وہ آواز رات گزرنے کے ساتھ ساتھ پہلے سے ہلکی اور ہلکی ہوتی چلی گئی۔
بستی کی مسجد سے مولوی نیاز محمد نے فجر کی اذان کا آغاز کیا۔ صالحہ کانپتے بدن پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی اٹھ کر غسل خانے کی طرف چل دیں۔ کمپنی کا ملازم بچہ ابراہیم گزشتہ رات پانی کے گرم حمام میں لکڑیاں سلگا کر گیا تھا۔ غسل خانے کی ٹونٹی میں سے گرم پانی نکل رہا تھا۔ انہوں نے دل پر قابو پاتے ہوئے وضو کیا اور تولیے سے ہاتھ منہ خشک کرکے نماز کی چوکی پر جاکر کھڑی ہوگئیں۔ وہ پورے دھیان سے رکوع و سجود میں مشغول رہنا چاہتی تھیں' تاکہ دھیان پھر اس رونگٹے کھڑے کردینے والی آواز پر نہ جانے پائے۔ کمرے کے اندر وہ اس آواز کی رسائی سے محفوظ تھیں۔ سلام پھیر کر انہوں نے آتش دان میں موجود لکڑیوں کو آگ دکھائی اور واپس جاء نماز پر آکر بیٹھ گئیں۔ اب وہ تسبیح کرنے میں مگن تھیں۔ ان کا دھیان ہر طرح کی آواز سے ہٹ چکا تھا۔ صبح کے ساڑھے سات اور پونے آٹھ بجے کے درمیان انہوں نے اٹھ کر جاء نماز تہ کی اور چائے بنانے کی غرض سے کچن کی طرف آگئیں۔ وادی میں ابھی تک گھور اندھیرا اور سناٹا پھیلا تھا۔ پہاڑوں پر بکھرے مکانوں میں کہیں کہیں جلتی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔
"امی!" اس تاریکی اور سناٹے میں کہیں ایک دل چیرتی آواز ابھری اور صالحہ کے ہاتھ سے ساس پین کا گرم ڈھکن چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

☆ ☆ ☆

"مت رو میری بچی... شکر کر' اللہ نے اس کی مشکل آسان کردی۔" محمدی خالہ سطوت کو اپنے ساتھ لگائے تسلی دے رہی تھیں۔ "دیکھ رہی تھی نا' کیسے دو دن سے حلق میں اٹکی تھی اس کی جان' کیسے تڑپتی تھی' کیسے سر پٹختی تھی ادھر سے ادھر۔ شکر کر' معافی ہوئی اس کی اور آسانی مل گئی۔" وہ سطوت کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ اپنے کانوں کو بھی ہاتھ لگارہی تھیں۔
"اتنی سختی' اتنی اذیت سہ گئیں وہ محمدی خالہ! اگلے جہان میں امی کی اب تو بخشش ہوجائے گی نا!" اس کی ماں اسے کتنی پیاری تھی۔ اس وقت اس کو صرف اس کی بخشش کی فکر تھی۔
"جان جس کی امانت تھی' اس کو لوٹ گئی۔" محمدی خالہ نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ اب وہ جانے اور اس کا مالک جانے۔ تم بس جتنی دعا کرسکتی ہو کرو اور قرآن پاک پڑھ کر اس کی روح کو بخش دو۔ اللہ اس کے لیے آسانیاں فرمائے گا۔"
اس کی ماں نے ساری عمر اس کو ذہنی اور جسمانی اذیت دینے میں گزاردی تھی۔ اپنی محرومیوں' بے بسی اور خواہشات کی ناکامی کا غصہ وہ اس پر نکال دیتی تھیں۔ ان ہاتھوں کی مار سہتی اور اس زبان سے گالیاں سہتی' وہ اس عمر کو آپہنچی تھی۔ اس کا کوئی بھی عمل'

کوئی بھی کوشش اس کی ماں کے منہ سے اس کے لیے کلمہ خیر یا دعا نہ نکال سکی تھی۔ پھر بھی وہ اس معذور کمزور وجود کی جو ہمہ وقت چارپائی پر دھرا رہتا تھا' اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اس سے جدائی نے اسے ڈھا دیا تھا۔

"اللہ اپنے بندوں کے لیے آسانیاں کرتا ہے سطوت!" اسکول کی پرنسپل نے اس سے قمر آرا کی تعزیت کرتے ہوئے کہا تھا۔ "تم نے بہت سختیاں سہیں' شکر کرو سر پر اپنی چھت موجود ہے اور تم اپنی محنت کی کمائی کھاتی ہو۔ اللہ آگے بھی تمہارے لیے آسانیاں ہی کرے گا۔"

"کیسی آسانی اور کہاں کا سکون!" چند ہی دن بعد دوبارہ اسکول میں ڈیوٹی پر لوٹتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ "جب آپ کا اپنا کوئی سر پر رہے نہ اردگرد کہیں موجود ہو تو پھر زندگی کیسی۔" اسکول سرما کی چھٹیوں کے بعد اسی روز کھلا تھا۔ ننھے منے بچوں کی معصوم باتوں نے اسے وقتی طور پر بہلا دیا۔ لیکن واپسی پر وہی تنہائی اور سناٹا' صبح کا صاف کیا گھر جوں کا توں صاف ستھرا' سمٹا دیکھ کر اس کا دل اڑنے لگتا' نہ گالیاں رہی تھیں' نہ بددعائیں' نہ طعنے' نہ ہی کوسنے۔ وہ باقی کا وقت بستر پر اوندھی لیٹی آنسو بہانے میں گزار دیتی۔

☼ ☼ ☼

"سنا ہے چچی قمر آرا گزر گئیں۔"
اورنگ زیب نے فون کال پر صالحہ سے پوچھا تھا۔ اورنگ زیب کے سوال نے انہیں وہ بھیانک رات یاد کرا دی تھی۔ جب عین ان کے گھر کے نیچے ایک روح قفس عنصری سے پرواز کر جانے کے لیے بے قرار تھی اور قفس سے چھٹکارا نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے جھرجھری لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"بس اب تو بڑا کانٹا نکل گیا۔" اورنگ زیب کہہ رہا تھا۔ "آپ کو چچی قمر آرا ہی سے مسئلہ تھا نا' اب آپ ان کی بیٹی سے بات کیجیے۔ یقیناً" ترکے میں بہت کچھ چھوڑ گئی ہوں گی اس کے لیے۔ کہیے اس سے کہ یا تو اوپر والا پورشن بھی خرید لے یا مکان بیچنے دے آپ کو۔ پھر اس کا حصہ دے دلا کر جان چھڑائیے اپنی اور ہمارے پاس چلی آئیے۔"

صالحہ نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے اورنگ زیب کو اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے خدا حافظ کہہ کر فون کا چونگا کریڈل پر رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ہی دن تھے نا' اسی طرح کے دن۔" وہ ڈاک خانے والے راستے پر بڑے پتھر پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ "جب زندگی کے سبق پڑھنے پڑھانے کا آغاز ہوا تھا" اس نے سامنے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر راستوں اور جھاڑیوں میں جابجا اگے ڈیزی کے زرد مرکز والے سفید پنکھڑیوں سے سجے پھولوں کو دیکھتے ہوئے سوچا اور ایک لمبا سانس لیتے ہوئے ان کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

"ایسے ہی دن تھے جب خواب سفر کا آغاز ہوا تھا۔ ایک ایسا سفر جو کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ جس کی کوئی منزل ہوتی ہے' نہ ہی جائے منزل' ایک ایسا سفر جس میں ہمراہی نظر کا دھوکا ثابت ہوتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہیولے بن کر غائب ہو جاتے ہیں۔" نظر سے التباس کا سفر' جس میں مڑ کر دیکھو تو گاہ بگاہ مسرت سرخوشی اس خود فریبی کی دنیا میں ستاروں کی طرح جگمگاتی نظر آتی ہے اور پھر تاریکی' ناامیدی اور مایوسی کی پگڈنڈیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ تاریکی' مایوسی اور ناامیدی جو میرے جیسی لڑکی کا مقدر ہیں۔ اس نے پتھر سے آگے بل کھاتی سڑک کو دیکھا۔ اسی راستے پر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے' ہنستے مسکراتے' اس نے سطوت کو کتنی باتیں بتائی تھیں۔ اسے دنیا سے متعارف کروایا تھا۔ اسے سر اٹھا کر جینا سکھایا تھا۔ اس کی نظریں گزرے منظروں میں کھو گئیں۔ ہوا میں کھوئی آوازوں میں اس کی سماعتیں گم ہو گئیں۔

"میں بہت نالائق ہوں' میرا دماغ بہت ہلکا ہے۔" اس نے کئی بار ایمان داری سے اعتراف کیا تھا۔

"جو کوئی بھی تمہیں ایسا کہتا ہے' یہ اس کی بھول ہے۔" نیلی جینز پر مہرون سویٹر اور سیاہ جیکٹ پہنے وہ لڑکا اسے بتا رہا تھا۔

"دنیا میں ہر انسان کو اللہ نے ذہن عطا کیا ہے۔ ذہن کی استطاعت میں فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن استطاعت کا پتا بھی تو تب چلے نا جب اسے استعمال کیا جائے۔ تم ایک فضول سی بات پر یقین کرنے سے پہلے ذہن کو استعمال تو کر کے دیکھو۔"

"کوئی فائدہ نہیں' میں نے بہت کوشش کر کے دیکھ لی۔" وہ مایوسی سے سرہلاتی' میڈم صدیقہ کہتی ہیں کہ انہیں میرا آئی کیو لیول بھی صفر پر کھڑا محسوس ہوتا ہے۔"

"غلط کہتی ہیں وہ۔" وہ بلند آواز میں کہتا۔ "وہ کالج کی سب سے کام چور استاد ہیں۔ اسٹوڈنٹ پر محنت کرنے سے گھبراتی ہیں۔ تمہارا آئی کیو لیول اچھا خاصا ہائی ہے۔ ہاں تمہارا ذہن ضرور کمزور ہے۔"

"نہیں جی' ایسا کوئی بھی نہیں کہتا۔ کوئی نہیں مانتا۔" وہ سرہلاتی۔

"کیوں نہیں کوئی کہتا اور مانتا۔" وہ سنجیدہ ہو جاتا۔ "ادھر دیکھو میری طرف' میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم بہت ذہین لڑکی ہو' تمہارا دماغ بھی تیز ہے اور حافظہ بھی' آزما کر دیکھ لو۔"

اس نے آزما کر دیکھا بھی تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کو چیزیں پوری تفصیل اور درستی کے ساتھ یاد ہونے لگی تھیں اور اس نے ان ہی میڈم صدیقہ کو حیران بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ اس کے پڑھنے کے لیے کورس کی کتابوں سے ہٹ کر اور کتابیں بھی لانے لگا تھا۔ اسٹوری بکس' معلوماتی کتابیں' چھوٹے چھوٹے انسائیکلوپیڈیا' پکچر ڈکشنریز اور اٹلس' کیا تھا جو سطوت کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا تھا جو اسے یاد نہ رہ جاتا تھا۔ صرف سکھانے والے کا طریقہ ہی تو مختلف تھا۔ وہ سب کچھ سیکھتی اور جانتی چلی گئی۔

"چلو اچھا ہوا' میرے اندر بھی کوئی ایک خوبی پیدا ہوئی۔" پہلی بار تحریری ٹیسٹ میں سب سے زیادہ نمبر لینے پر اس نے کچھ شرماتے اور جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہارے اندر ایک نہیں' ایک ہزار ایک خوبیاں موجود ہیں' تم ایکسپلور (دریافت) تو کر کے دیکھو۔" جواب میں وہ اس کا ٹیسٹ پڑھتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔

"تم میرا دل رکھنا چاہتے ہو نا!" اس نے سوال کیا تھا۔

"میں بھلا تمہارا دل کیوں رکھنا چاہوں گا۔" وہ بے نیازی سے بولا تھا۔

"اس لیے کہ تم خود دل کے بہت اچھے ہو۔" سطوت نے برملا اعتراف کیا تھا۔ جواب میں وہ کچھ دیر اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

"تم نے کبھی ورڈز ورتھ کو پڑھا ہے۔" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں!" وہ منہ بنا کر بولی۔ "یہ وہی ہے نا جس کی ایک نظم انگریزی لازمی کی کتاب میں شامل ہے۔ اللہ جانے کیسی انگریزی لکھتا تھا۔ ذرا جو پلے پڑ جائے۔"

"ارے پاگل! بہت بڑا شاعر ہے ورڈز ورتھ۔ تم اس کی انسلٹ کر رہی ہو۔" وہ ہنسا۔

"ہو گا' مجھے کیا۔" وہ سر جھٹک کر بولی تھی۔ "مجھے تو بس اس کی نظم کی سمری نہ لکھنی پڑ جائے امتحان میں۔"

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا تھا۔ "پتا ہے' تمہیں دیکھ کر مجھے ورڈز ورتھ کی نظم یاد آجاتی ہے۔"

"ہیں۔!" وہ حیرت سے بولی تھی۔ "وہ کیوں۔ کیا ہے اس میں۔" اور اس نے اسے نظم سنانا شروع کر دی تھی۔

The fall of water that doth make
A murmer near the silent lake
This little baya quite road
That holds in shelter thy abode
In truth together do ye seem
Like something fashioned in a dream

(یہ جھرنے کی طرح بہتا پانی
خاموش جھیل کے قریب گونجتی گنگناہٹ
چھوٹی سی خلیج اور پرسکون سڑک
جہاں قائم ہے تیری پناہ گاہ
حقیقت میں بنی ہیں ایک دوجے کے لیے)

وہ ان منظروں میں کھوئی زیرلب وہ نظم دہرا رہی تھی۔ اس کے سر سے چادر کھسک گئی تھی اور بالوں کی لٹیں ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھیں۔

The lake the bay the water fall
And thee the spirit of them all

(جھیل، خلیج، آبشار
اور تم ان سب کی روح)

کون کہتا تھا اس کا دماغ ہلکا اور حافظہ کمزور تھا۔ اس نے نظم کی لائنیں دہراتے ہوئے سوچا، وہ جو اسے خوابوں کے جزیرے میں چھوڑ کر جاچکا تھا، اس نے اسے حافظہ تیز کرنے کی اتنی مشقیں کرائی تھیں کہ

اب شاید ہی اسے کوئی چیز [illegible] ہو، وہ بھی جس نے اسے زندگی سے متعارف کروایا تھا اور زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے اکیلی چھوڑ گیا تھا۔

پیروں میں جوگرز پہنے ہاتھ میں چھڑی پکڑے، بڑی چادر میں لپٹی صالحہ ڈاک خانے سے ہو کر واپس آرہی تھیں، جب راستے میں انہوں نے اس لڑکی کو پتھر پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کی گود میں ڈیزی کے پھول رکھے تھے اور وہ سامنے خلا میں دیکھتی زیرلب کچھ دہرا رہی تھیں۔

صالحہ ایک لمبے عرصے کے بعد اتنی چڑھائی چڑھ کر ڈاک خانے گئی تھیں۔ انہیں ایبک کے نام ایک خط پوسٹ کرنا تھا۔ جاتے ہوئے بھی وہ جگہ جگہ بیٹھ کر سانس لینے کے بعد دوبارہ چلنا شروع کرتی رہی تھیں اور اب واپسی پر بھی ان کا سانس پھول رہا تھا۔ کچھ دیر میں رک کر انہوں نے بے خودی کے عالم میں بیٹھی

اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ قمر آرا کی بیٹی تھی۔ لیکن وہ یہاں کیا کر رہی تھی۔ شاید ماں کی طرح سرراہ چلتے ہوؤں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے بیٹھی تھی۔

پھر انہوں نے اپنے ہی خیال پر لاحول پڑھی۔ وہ لڑکی بے ضرر تھی اور مرنجان مرنج، انہوں نے کبھی اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی تھی، اور نگ زیب اور رضوان سے بھی نہیں۔"

"مگر وہ اس راستے پر یوں اکیلی کیوں بیٹھی تھی۔" وہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہیں اور پھر چھڑی کے سہارے چلتی آگے نکل گئیں۔

ان کے پیچھے پتھر پر ڈیزی کے پھول گود میں رکھے لڑکی بے خودی کے عالم میں ان نظموں کی لائنیں دہرا رہی تھی، جو اسے بار بار یاد کرائی گئی تھیں اور جو اس سے بارہا سنی گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اگلی بار صالحہ نے اسے اپنے گھر کے نیچے پچھواڑے کے صحن میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ غالباً "نہانے کے بعد ہلکی دھوپ میں بیٹھی تھی۔ اس روز صالحہ کو صبح سے ہی

سر کے درد نے گھیر رکھا تھا اور گھر کا خالی پن انہیں ہولائے جا رہا تھا۔ اتوار کے دن کمپنی کا دفتر بند تھا اور اس کے وہ ورکرز جو دن میں ایک آدھ بار افسروں کے حکم پر ان کے گھر کا چکر لگا کر کسی ضرورت کے بارے میں پوچھ لیتے تھے وہ بھی چھٹی منا رہے تھے۔

"وقت ہے کہ گزارے نہیں گزرتا اور وحشت ہے کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔" نشست گاہ کی کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں۔ اسی دم نیچے صحن میں بیٹھی لڑکی کی آسمان پر کچھ تلاش کرتی نظریں آسمان سے واپس آتے ہوئے ان سے ٹکرا گئی تھیں۔ صالحہ کی نظروں میں شاید اس کے لیے کوئی پیغام چھپا تھا اور اس کی نظروں میں اس پیغام کا جواب تھا۔

* * *

"منگوچیاں کھائیں ہی کبھی تم نے؟" صالحہ نے چولہے پر رکھی ہانڈی میں مسالا بھونتے ہوئے پوچھا تھا۔

"منگوچیاں... وہ کیا؟" چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر ٹرے رکھے چاول چننے میں مشغول لڑکی نے سر اٹھا کر کچن کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔

"تمہاری تو بھئی پکانے اور کھانے کے معاملے میں بھی نالج بہت محدود ہے۔" مسالے میں مٹر ڈال کر بھوننے کے بعد اس میں پانی ڈال کر انہوں نے ہانڈی پر ڈھکن لگایا اور ڈائننگ روم میں آگئیں۔ "کھلاتی کیا رہیں تمہاری اماں تمہیں ساری عمر؟"

"وہ تھوڑی پکاتی اور کھلاتی تھیں' یہ کام تو میں کرتی تھی۔" اس نے چاول کے دانے منہ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اچھا!" ٹیبل کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔ "اور کیا پکاتی کھلاتی تھیں تم بھلا؟"

"ایک روز آلو میں بینگن' اگلے روز بینگن میں آلو' ایک روز دال میں کدو' اگلے روز کدو میں دال۔" اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"اچھا!" صالحہ نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔ "تمہاری اماں کو تو گوشت بہت مرغوب تھا' وہ بھی بڑے کا' وہ آلو بینگن' دال کدو... کہاں کھاتی ہوں گی؟"

"بڑے کے گوشت پر ہی تو انہوں نے بینک بیلنس' زمین' پیسہ سب لٹا دیا۔ جب ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گئیں تو یہ ہی کچھ کھانے کو ملنا تھا نا۔"

وہ اداسی سے مسکرائی تھی۔ جواب میں صالحہ نے بھی اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ تنہائی اور تنہائی کی وحشت ان دونوں کو جنہوں نے ایک ہی چھت کے تلے اوپر نیچے رہنے کے باوجود ایک دوسرے کو ڈھنگ سے دیکھا تک نہ تھا۔ ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ دونوں کے درمیان بنا کچھ کہے سنے ایک نامحسوس سا تعلق جڑ چکا تھا اور یہ سب اتنی خاموشی سے ہوا تھا کہ "سنا ہے" کے آغاز کے ساتھ خبریں سنانے والوں کو بھی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

* * *

"تم ایسا کرو' اپنا ضروری سامان اٹھاؤ اور ادھر اوپر ہی آجاؤ مستقل۔" اس کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے صالحہ نے سطوت سے کہا تھا۔ "کیا رات کو اکیلی سونے کے لیے نیچے چلی جاتی ہو' ادھر تم ڈرتی ہو' ادھر میں ڈر کے مارے سو نہیں پاتی۔" ان کے لہجے میں دوستی اور تعلق بے تکلفی اور خلوص کی انوکھی آمیزش صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا!" اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا تھا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" اگلے ہی لمحے وہ مان گئی تھی۔

"چلو... ایسا کرتے ہیں' ابھی اٹھا لاتے ہیں تمہارا سامان۔" سیڑھیاں اتر کر صالحہ نے اس گھر کے دروازے کی قدم بڑھا دیے تھے' جس میں عمر بھر داخل نہ ہونے کی قسم کھائے بیٹھی تھیں۔

"آپ... آپ رہنے دیں' میں خود' میں خود اٹھا لاؤں گی۔" ان کے عقب سے سطوت کی ہچکچاہٹ بھری آواز سنائی دی تھی' لیکن وہ اس کی سنے بغیر داخل

دروازے کی کنڈی کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نشست گاہ کی سینٹر ٹیبل پر چائے کے کپ پڑے پڑے ٹھنڈے ہو رہے تھے اور وہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھیں۔

"ایک کا ڈیسک ٹاپ مانیٹر اس کی کتابیں' اس کے بچپن سے سنبھالے کھلونے' سب کے سب اس کے گھر میں کیسے چلے گئے۔" صالحہ سوچ رہی تھیں۔

سطوت کے گھر میں داخل ہوتے ہی جس چیز پر ان کی پہلی نظر پڑی تھی' وہ ایبک کے مانیٹر کی کھلی اسکرین تھی جس پر اس کی تصویر صاف نظر آ رہی تھی۔

"کیا واقعی وہ یہ سب چیزیں قمر آرا کو دے گیا تھا۔" ان کا دل شش و پنج میں گرفتار تھا۔ "اس کا مطلب اورنگ زیب کا خیال درست تھا۔" وہ سوچ رہی تھیں۔

"یہ اس کا گھر ہے' وہی گھر جس کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی کبھی کبھار ہی ہوتی تھی اور آج میں اس گھر میں بیٹھی ہوں۔ مگر وہ یہاں نہیں ہے۔ کہتے ہیں' اعلا تعلیم حاصل کرنے سمندر پار چلا گیا وہ۔ ارے جانا تھا' ضرور چلا جاتا۔ میں نے کون سا روک لینا تھا' مگر جاتے جاتے بتا کر جاتا' ایک بار... چند لمحوں کے لیے الوداعی ملاقات تو کر جاتا۔" صالحہ کے عین سامنے صوفے پر بیٹھی سطوت سوچ رہی تھی۔

"پتا نہیں بات شروع کہاں سے ہوئی تھی۔" اپنے خیالوں میں گم صالحہ بڑبڑائی تھیں۔

"بات..." اب کے سطوت نے بے خیالی میں کہا تھا۔ "بات تو صرف ایک استری سے شروع ہوئی تھی۔"

"استری..." صالحہ نے چونک کر دیکھا تھا اور ایک بار پھر دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

لاہور آجانے اور یونی ورسٹی میں ایم ایس سی میں داخلہ مل جانے کے بعد رائنہ کی زندگی اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ اسے پہاڑوں میں گھری اس وادی میں گزاری زندگی پر بعض اوقات ہنسی آنے لگتی۔

"کیسے محدود اور مخصوص دن تھے وہ بھی' باہر کی ترقی یافتہ زندگی سے دور' لگی بندھی روٹین اور ہم اس میں بھی کتنے خوش رہا کرتے تھے۔" اسے خود پر حیرت ہوتی۔

یونی ورسٹی کے نئے دوستوں اور استادوں نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ان سب کے سامنے جوائن لائی اور دوسرے استادوں کا علم پانی بھرتا محسوس ہوتا تھا۔ لاہور آجانے کے بعد ظفر اور معاذ سے رابطہ رہتا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی ادارے میں پڑھ رہے تھے۔ ایبک کے بارے میں ان ہی سے پتا چلتا تھا۔

"اس بستی کی محدود زندگی ہی تو تھی جس میں' میں ایبک کو پہلا اور آخری شخص سمجھے بیٹھی تھی۔ وہاں ہوتی تو اب تک ایسا ہی سمجھ رہی ہوتی۔" کبھی کبھی اس کو خیال آتا۔

"ایبک سے کہنا' اب غصہ چھوڑ دے۔ کتنی معمولی سی بات تھی جس پر ناراض ہو کر اس نے گروپ سے علیحدگی اختیار کر لی اور ابھی تک مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں اسے۔" اس نے ظفر اور معاذ کو ایبک کے لیے پیغام بھی دیا تھا' لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

"لگتا ہے وہ ابھی تک بستی کے ہیرو ورشپ دنوں میں زندگی گزار رہا ہے۔ ہاں بھئی' ٹھیک ہے اس چھوٹی سی بستی کا ہیرو تو وہی تھا نا۔" وہ سوچتے سوچتے مسکرا دیتی۔ اسے ایبک کی ناراضی' اس کا بچپنا محسوس ہوتی تھی اور اسی وجہ سے اس کے دل میں آہستہ آہستہ ایبک کے لیے جگہ کم ہوتی گئی تھی۔

لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔ اسے گرمی کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے پاس ملائیشیا جانا تھا۔ ایک نئے ملک کی سیر کے تصور نے رائنہ کو خوشی کے احساس میں جکڑ رکھا تھا اور وہ جانے کی تیاریوں میں

مصروف تھی۔

"جانے سے پہلے اپنے کمرے کی صفائی اچھی طرح کر کے جاؤ' جو فالتو چیزیں ہیں انہیں ایک جگہ اکٹھی کر جانا' میں پھینک دوں گی۔" یہ اس کی ماما کی خاص ہدایت تھی۔

ان فالتو چیزوں میں جو وہ ایک جگہ اکٹھی کر رہی تھی' وہ بیگ بھی تھا جو ایک عرصے سے اس کی اٹیچی میں یوں ہی مڑا تڑا رکھا تھا۔ کپڑے کے اس بیگ پر کشمیری کڑھائی کی ہوئی تھی اور یہ بیگ اس کے بابا تھتیا گلی سے اس کے لیے خرید کر لائے تھے۔

"ہائے یہ بیگ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔" اس نے بیگ نکال کر دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہاں لاہور میں تو سب اسے دیکھ کر اچھل ہی پڑیں۔" وہ بیگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی سلوٹیں نکالنے لگی۔ ہاتھ کے دباؤ کے نیچے اسے محسوس ہوا کہ بیگ کے اندر کچھ چیزیں رکھی ہیں۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی اور اس کی نظروں کے سامنے ایک پرانا منظر گھوم گیا۔ ایک کے گھر کی سیڑھیوں کی ہری ریلنگ سے لٹکا وہ شاپر جس میں کاغذ کی کترنیں بھری تھیں۔

"اف!" اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "اس وقت سے اب تک یہیں رکھا ہے' میں اسے پھینکنا بھول ہی گئی۔" اس نے مڑا تڑا شاپر باہر نکالا اور اس میں موجود کترنوں کو مٹھی میں دبوچ کر دیکھنے لگی۔ ان کترنوں میں کچھ ایسا غیر معمولی تھا۔ جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ مختلف رنگوں کے کاغذوں کی کترنیں تھیں اور ہر کترن پر الفاظ درج تھے۔ رائنہ کو سب کام چھوڑ کر ان کترنوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔ تقریباً" ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ ہر رنگ کی کترنوں کو آپس میں جوڑ کر ان پر لکھا ایک پورا پیغام پڑھنے میں مصروف تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے تو تمہیں ہائی لینڈ گرل والی نظم صرف ورڈز ورتھ سے متعارف کرانے کے لیے سنائی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نظم کے الفاظ میری اور تمہاری کہانی بن جانے والے ہیں۔ میں یوں یہ جگہ چھوڑ جاؤں گا اور تم پہاڑوں کی باسی لڑکی ان ہی پہاڑوں میں بسی رہ جاؤ گی۔

زندگی ایک ایسی چیز ہے جس کے کل کے بارے میں آپ کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ انسان کے ارادوں' مفروضوں اور منصوبوں کو شکست دینے میں زندگی اور وقت سے زیادہ باکمال سورما کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

خیر میں تمہارے لیے یہ پیغام اس شکل میں اس لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ مجھے تمہیں پیغام دینے کا کوئی اور ذریعہ اور موقع مل نہیں پا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سیڑھیوں کی ریلنگ سے لٹکتے اس لفافے پر کسی اور کی نظر نہیں پڑے گی۔ پڑ بھی گئی تو اسے کوئی اہمیت نہیں دے گا ہاں... مگر تم ہو' جس کے لیے ہر غیر اہم چیز بھی بہت اہم ہوتی ہے اور تم ہی ہو جو پیغام رسانی کے اس انوکھے طریقے کو سمجھ بھی جاؤ گی۔

تم نے اتنے دنوں میں جب ہم ڈاک خانے والے راستے پر پتھروں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے تھے۔ مجھ سے کتنی ہی بار پوچھا کہ میں تمہارے لیے وہ سب کیوں کر رہا تھا جو میں نے کیا۔ میں نے ہر بار تمہیں ہنس کر ٹال دیا۔ لیکن آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ جس روز میں نے تمہیں پہلی بار تاج چاچا کے اسٹور پر کھڑے دیکھا تھا۔ اسی روز میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ مجھے کسی کو ایک اور قمر آرا بننے سے بچانا ہے۔

میں نہیں جانتا' مجھے یہ خیال کیوں آیا لیکن بعد میں سوچنے پر مجھے لگا۔ تم قمر آرا کی بیٹی ہو۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' جو کچھ قمر آرا' ماضی میں کرتی رہیں' اس میں بھی تمہارا کوئی قصور نہیں تھا' مگر حالات کی چکی نے قمر آرا کو کم' تمہیں زیادہ اس بے قصوری کی سزا میں پیسا۔ تم نے زندگی کے ہر میدان میں صرف قمر آرا کی بیٹی ہونے کی وجہ سے مار کھائی۔

میں کوئی فرشتہ نہیں تھا سطوت سجاد! جیسا کہ تم اکثر

مجھے کہتی تھیں۔ میں ایک عام اور معمولی سا انسان تھا جس کے دل میں خدا نے پہلے تو تمہاری ہمدردی کا جذبہ جگایا اور اس کے بعد۔۔۔
"ہاں مجھے آج اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کے بعد۔ مجھے تم سے محبت ہوگئی۔"
دنیا کا سب سے انوکھا پیغام پڑھتے پڑھتے رائنہ اس جملے پر آ کر رک گئی تھی۔ "گناہ۔۔۔ وہ گناہ تھا۔ جو میں نے کیا۔ اس کے دل نے کہا تھا اور پھر آگے کی عبارت پڑھی۔
"اور اپنی محبت کے لیے' اپنی محبوبہ کے لیے تو انسان کچھ بھی کرتا ہے نا۔ میں بھی تمہارے لیے وہ سب اسی لیے کرتا تھا۔ کالج سے نکل کر ڈاک خانے والے راستے پر جانا اور گھنٹوں تمہیں پڑھاتے رہنا' اس لیے کہ مجھے یہ گوارا نہ تھا۔ تمہاری میڈم تمہیں سزا کے طور پر برآمدے میں کھڑا کر دیں اور ہر دوسرا شخص تمہارا انداق اڑاتا رہے۔
ملج چاچا کے اسٹور پر ملج چاچا ایک غیر مرد تمہیں باتیں سنائے' یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ میں تمہیں ہر بری نظر' ہر بے ہودہ خیال سے بچا لینا چاہتا تھا۔ چاہتا تھا تم میں اتنا اعتماد پیدا ہو جائے کہ تم دنیا میں کسی بھی طرح کے حالات اور انسان کا سامنا کر سکو۔"
میں جانتا ہوں کہ میرے اس بے اختیار جذبے اور عمل نے تمہیں بے خودی کی کیفیت عطا کر دی۔ تم۔۔۔ تمہارے حالات اور تمہارے مسائل کیا تھے۔ تم خود فراموشی کے عالم میں گرد و پیش سے بے خبر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ لیکن مجھے ادراک تھا' میں جانتا تھا کہ اس سارے کی کسی کو ذرا سی بھنک بھی پڑ جانے پر کیا طوفان اٹھ سکتا تھا اور جو خدشہ مجھے تھا ہوا بھی ویسا ہی۔
رائنہ۔۔۔ میری بچپن کی دوست کے ذرا سے تجسس نے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا دیا۔ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا کہ میرے گھر والوں کو جب میری سرگرمیوں کی خبر ہوئی تو انہوں نے اس کی وجہ کس کو قرار دیا اور میں تمہیں بتاؤں گا بھی نہیں۔ میرے یوں اچانک یہاں سے چلے جانے سے ہی تمہیں ایک ایسی نہ ختم ہونے والی تکلیف پہنچنے والی ہے کہ میں اس کے ساتھ کوئی اور تکلیف وہ بات نہیں جوڑنا چاہتا۔ کیونکہ میں نے خود پر لگنے والے اس الزام کی تردید بھی اسی لیے نہیں کی کہ اس کی وجہ سے تمہاری ذات سب کی اٹھنے والی انگلیوں سے بچ سکتی تھی اور میں' تمہاری ذات اور تمہارے نام کا ہی تو محافظ بننا چاہتا تھا۔
سو میری پیاری ہائی لینڈ گرل۔۔۔ محبت جس کو روز اول سے ایک جرم قرار دیا جا چکا ہے۔ میں اس جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں اور اس کی پاداش میں مجھے کالے پانی کی سزا بھی سنائی جا چکی ہے۔ میں خاموش ہوں' احتجاج کرنے کے بجائے چپ چاپ اس سزا کو قبول کر چکا ہوں' کیونکہ میری چپ ٹوٹنے کی ذرا سی بے احتیاطی کے نتیجے میں کہیں تمہاری ذات نشانہ نہ بننے لگے۔
میں نہیں جانتا کہ زندگی میں کبھی تمہیں دیکھ بھی پاؤں گا یا نہیں۔ بہتر ہے نہ دیکھ پاؤں' کیونکہ میں اپنی نظروں میں تمہارے لیے صرف محبت اور احترام سموئے رکھنا چاہتا ہوں۔ اب جو تم کبھی سامنے آئیں تو ان نظروں میں شرمندگی اتر آئے گی اور یہ اٹھ بھی نہ پائیں گی۔
میری مالو۔۔۔ یہ پیغام پڑھ لینے کے بعد حقیقت سے نظر چرانے کے بجائے اسے قبول کر لینا۔ ایک خواب کے سحر میں زندگی گزارنے کے بجائے جو حقیقت ہے اسے مان لینا۔ تم تو میری بات آمنا و صدقنا کہہ کر مانتی ہو نا۔ یہ بھی مان جاؤ گی' مجھے یقین ہے' مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم میرا یقین ٹوٹنے نہیں دو گی۔ اور کبھی دوبارہ ڈاک خانے والے راستے پر مجھے تلاش کرنے نکل نہیں جاؤ گی۔ کیونکہ ڈاک خانے کا راستہ وہم تھا اور میں صرف ایک خواب۔۔۔

☆ ☆ ☆

"میں جانتی ہوں' میں سب جانتی ہوں!" صالحہ نے اپنے سامنے بیٹھی رائنہ سے کہا تھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

"میں اسی روز جان گئی تھی جس روز سطوت کے گھر کے دروازے کی کنڈی کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ اس روز مزید جان گئی تھی جب برسوں پہلے گھر سے رات گئے استری اٹھ جانے کا عقدہ کھلا تھا اور جانتی ہو' اس دن کے بعد سے آج تک میں مسلسل ایک احساس جرم میں گرفتار ہوں۔ میں نے گمان کا ارتکاب کیا۔ میں بدظنی کا شکار ہوئی اور میں نے اپنے ہی بیٹے کو ناکردہ گناہ کی سزا دے ڈالی۔"

"میرا اپنا یہ ہی حال ہے آنٹی! اور جب سے مجھے پتا چلا ہے میں ڈیڈی کے پیچھے پڑی تھی کہ مجھے آپ کے پاس لے جائیں۔ انجانے میں مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا ہے آنٹی۔" رائنہ بے قراری سے بولی۔

"سطوت کے گھر جاکر دیکھو رائنہ! ایبک کے مانیٹر پر اس کی تصویر روشن رہتی ہے وہ۔ ایبک کی کتابوں کو حرز جاں بنا کر رکھا ہوا ہے اس نے۔ میں اس لڑکی کو دیکھتی ہوں اور میرا دل ایک شکنجے میں آجاتا ہے۔ اس کی تو دنیا ہی وہ ہوگا جسے میں نے اس کی ماں کا شکار جان کر غیظ و غضب کے عالم میں یہاں سے دور بھیج دیا۔" صالحہ کے لہجے میں دکھ تھا اور تڑپ بھی....

"جو میں نے پڑھا ہے آنٹی! کاش وہ میں اس روز سیڑھیوں کی ریلنگ سے اتار کر نہ لے جاتی۔ کاش اس پر میری نظر نہ پڑی ہوتی' تو پھر بھی شاید ان گزرے وقتوں میں سطوت کے پاس جینے کے لیے کوئی ایسا احساس باقی رہ گیا ہوتا جو اسے زندگی جینے کا حوصلہ دیے رکھتا۔" رائنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میرے بیٹے کے معصوم جذبات' کھرے اور سچے احساسات...." صالحہ نے روتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیسا کیسا دل نہ دکھا ہوگا اس کا' جب میں نے اس پر قمر آرا کے جال میں پھنس جانے کا الزام لگایا ہوگا۔ میں نے ماں ہو کر اس کو اتنا ہلکا کیسے جان لیا کہ اسے رشتوں اور عمروں کے احترام سے باغی قرار دے دیا۔"

"آپ کی آنکھوں پر قمر آرا سے بدگمانی کی پٹی چڑھی تھی آنٹی! آپ نے ادھوری بات سن کر پوری کہانی مرتب کرلی۔ آپ کے پاس تو پھر کوئی جواز تھا' میرے پاس کیا جواز تھا۔ ڈیزی کے پھولوں کی ایک جھلک اور ایبک کا اپنے معمول سے ذرا ہٹ جانا' میں کون ہوتی تھی تجسس میں پڑ کر اس کا پردہ توڑنے والی۔" وہ ٹھیک ہی مجھ سے ناراض تھا۔ وہ ٹھیک ہی مجھ سے ناراض ہے۔"

اس کا دل خلش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"میں نے اس کا محبت میں بسا دل توڑ دیا۔ دوست کبھی میرے جیسے بھی ہوتے ہیں۔ اب تو ایبک کیا میں خود کو بھی معاف نہ کرسکوں گی۔"

اسے خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اور سامنے بیٹھ کر کاغذ کے رنگ دار ٹکڑے میز پر جوڑے ان پر لکھے اس انوکھے پیغام کو پڑھتی صالحہ کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔

رائنہ نے ایک اداس نظر ان پر ڈالی اور پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر چل دی۔

* * *

وہ اپنے گھر کی دہلیز پر نیلے رنگ کے روغن شدہ لکڑی کے پرانے دروازے کے کواڑ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ شال نے اس کے چہرے کے گرد ہالا بنا رکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت ٹھہر چکی تھی۔ بالائی منزل کی سیڑھیاں اتر کر کوئی نیچے آرہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ رائنہ تھی۔ ایبک کی دوست جس پر اسے ہمیشہ رشک آتا تھا اور شاید عمر بھر آتا رہنا تھا۔ نہ جانے کس خیال کے تحت وہ رائنہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ کا رنگ دوستانہ تھا۔

زندگی میں انسان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے' جب دل تمام گلوں' شکوؤں' رشک' حسد' نفرت' ناپسندیدگی جیسے احساسات سے ماورا ہو جاتا ہے۔ سطوت پر بھی ایسا ہی وقت آچکا تھا۔ ایسا ہی وقت ہوتا ہے جب آپ کے دشمن بھی ولی بن جاتے ہیں۔ جب ہی تو اس کی مسکراہٹ کے جواب میں رائنہ خود سے

پہلی بار اس کی طرف بڑھی تھی۔

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری سطوت!" اس نے جھک کر سطوت کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا تھا۔ "میں نے انجانے میں تمہارا بہت بڑا نقصان کر دیا۔" سطوت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی نظروں میں کب سے ٹھہری حیرت بڑھنے لگی۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" رائنہ نے اس کی حیرت بھری نظروں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا اور مڑ کر گیٹ کی طرف چل دی تھی۔

"اس بے چاری نے تو میرا ایسا کچھ نہیں بگاڑا۔" سطوت اسے جاتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ "پھر یہ کس بات کی معافی مانگ کر گئی ہے۔" اس کی بالکل بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر اس کے بعد صالحہ آنٹی تھیں جو اسے ڈیزی کے پھول چننے پر لگا دیتیں۔ اسے ان پھولوں کے ہار پرونے کو کہتیں اور فرمائش کرتیں کہ وہ ڈیزی کے ہار گلے میں پہن کر اور سر پر سجا کر انہیں وہی نظمیں سنائے جو اس روز وہ ڈاک خانے والے راستے پر بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

"آپ کو بھی ورڈز ورتھ پسند ہے۔" وہ ان نظموں کی لائنیں سناتے ہوئے حیرت سے ان سے پوچھتی تھی اور وہ جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کرتیں۔

"یہ تو بتاؤ، تمہیں اتنی مشکل انگلش اتنے صحیح تلفظ کے ساتھ کس نے بولنا سکھائی۔"

☆ ☆ ☆

چند دن بعد جب وادی میں بہار اپنے پورے جوبن پر اتر آئی تھی، ظفر اور معاذ، صالحہ سے ملنے آئے تھے۔

"آپ کے گھر کا منظر وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا آنٹی!" معاذ نے دھلے کپڑے الگنی پر ڈالتی سطوت کو دیکھتے ہوئے صالحہ سے کہا تھا۔ "مگر افسوس کہانی کا مرکزی کردار غائب ہے۔"

"مطلب یہ ہوا کہ وہ جو سنتے آئے تھے کہ شک اور بدگمانی، انسانی زندگیوں اور ان کی محبتوں کو یکسر بدل ڈالتی ہیں، وہ بالکل درست تھا۔" ظفر کے لہجے میں افسردگی تھی اور صالحہ کے چہرے کی پشیمانی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

"مجھے اور ظفر کو اس نے جانے سے پہلے ساری حقیقت بتا دی تھی، لیکن آپ کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔" معاذ نے صالحہ سے کہا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں منع کیا تھا اس نے؟" وہ تڑپ کر بولیں۔

"اسے آپ پر رنج تھا۔ آپ نے اسے صفائی کا ذرا سا بھی موقع دیے بغیر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اسے آپ سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس کا دل زخمی ہو چکا تھا اور شاید اس گھر سے ہمیشہ کے لیے اٹھ بھی گیا تھا۔" ظفر کے دل میں اپنے دوست کی بے بسی کا دکھ بسا تھا۔

"میں نے بہت غلط کیا۔" صالحہ کہہ رہی تھیں۔ "ساری عمر کی بدگمانی کی پٹی نے اپنی گرہ میری آنکھوں پر ایسی سخت باندھ رکھی تھی کہ میں اسے اتار سکی، نہ ہی اس کے پار دیکھ سکی۔ اپنے بیٹے کے بے مثال کردار پر شک کے چھینٹے میں نے اپنی زبان سے ڈالے۔ میں جس نے خود اپنے ہاتھوں اس کے کردار کی تعمیر کی تھی۔"

پھر انہوں نے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ "کیا کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے میری بدگمانی پر معاف کر دے۔"

☆ ☆ ☆

"ماما! سنا ہے کہ قمر آرا کی بیٹی سطوت آپ کے ساتھ رہ رہی ہے اور وہ بھی ہمارے گھر میں۔۔۔" صالحہ نے فون کے چونگے پر ابھرتی اور تنگ زیب کی آواز سنی اور سامنے بیٹھی سطوت کی طرف دیکھا جو سلائی مشین سامنے رکھے ان کی قمیص سی رہی تھی۔

"ہمارا نہیں، یہ اس کا بھی گھر ہے۔" انہوں نے

پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "اور ہاں قمر آرا نہیں چچی قمر آرا کہا کرو۔ وہ تمہاری عمر کی تو نہیں تھی جو ایسے بے جھجک نام لیتے ہو۔"

"واہ۔ آپ تو بہت مہربان ہو گئیں نچلی منزل والوں پر۔" اورنگ زیب کے لہجے میں تمسخر جھلکا۔ "خیر" پھر وہ اصل بات پر آتے ہوئے بولا۔ "اب تو آپ اس لڑکی سے بات کر کے وہ گھر بیچ سکتی ہیں نا!" وہ قریب کھڑی مریم کو ایک آنکھ دبا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب یہ گھر بسے گا، بکے گا نہیں۔" اورنگ زیب کی ماں نے اسے اس سے پہلے اتنا حیران کبھی نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہم نے بچپن میں ایک ساتھ ایک خواب دیکھا تھا، ہمارا لڑکپن اس خواب کو تعبیر میں ڈھالنے کے لیے وسائل جمع کرتے گزرا اور ہماری جوانی کا آغاز اس کی تعبیر پر کام کرنے سے ہوا۔ خواب سچا ثابت ہو سکتا تھا۔ تعبیر میں ڈھل سکتا تھا، لیکن اس سے پہلے ہی ہم ادھر ادھر بکھر گئے۔ خواب کا ڈھانچہ وہیں میرے گھر کے گیراج میں پڑا رہ گیا۔"

ایبک ظفر کی ای میل پڑھ رہا تھا۔

"سمجھ تو تم گئے ہو گے۔" ہاں وہی گاڑی جسے مکمل کرنے کے بعد ہم شمسی توانائی کے ذریعے چلانے والے تھے۔"

ایبک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی۔

"گزرے کل پر نظر ڈالو تو ہنسی آتی ہے۔ وہ عدد کنٹرولرز، چارج ائڈ اسکوپ ایک کمپیوٹر انگلور تھم.... ہاہا.... ہمارا افار مولا اور تکنیک ایک چھوٹا موٹا موٹر بائیک تو بنا سکتی تھی۔ مگر میرے ابا کی پرانی گاڑی کو شمسی توانائی سے چلنے کے قابل کہاں بنا سکتی تھی۔"

وہ پڑھتے پڑھتے رک کر ہنسا۔

"مگر کل گزر چکا۔" اگلی لائن سکرول کرنے پر لیپ ٹاپ اسکرین پر روشن ہوئی۔ "اور ہم سب اب آج میں موجود ہیں۔ ہم چاروں کا آج جو گزرے کل سے بہت آگے آ چکا ہے۔ میں مکینیکل انجینئر، معاذ آٹو موبائل انجینئر اور خود تم طبیعات کے ایسے ماہرین کے سامنے آئے ہو جو آٹو موٹیو انڈسٹری میں کام کر رہا ہے۔ شمسی توانائی سے چلنے والی کار بنانے کی مہم میں شریک ہماری چوتھی ساتھی رائنہ گھروں کی اندرونی سجاوٹ کا فن سیکھ چکی ہے۔ ذرا سوچو۔"

اس سے آگے ظفر نے ایک ایسی شکل بنائی تھی جس کو دیکھتے ہی سنجیدہ سوچ کا خیال آتا تھا۔

"کیا یہ عمر، تعلیم اور تھوڑا بہت تجربہ بچپن میں دیکھے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں۔ کیا ہم اب اس ادھورے ڈھانچے کو مکمل کرنے کے لیے بہتر حیثیت میں نہیں ہیں۔ ہمارے پاس پہلے سے زیادہ علم، استطاعت اور سرمایہ ہے۔ اگر ذرا سوچنے کے بعد میری بات دل کو لگے تو میں تمہاری واپسی کی تاریخ کی اطلاع کا منتظر رہوں گا۔"

اس نے لمبا سا سانس کھینچتے ہوئے ظفر کی میل سے نظر ہٹائی اور اپنے فون پر بجتی اس کال کی گھنٹی کی طرف متوجہ ہوا جو واٹس ایپ کے ذریعے اسے کی جا رہی تھی۔ اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف اس کے بچپن کا دوسرا دوست معاذ تھا۔

"میں پچھلے دنوں گھر گیا تو صالحہ آنٹی سے بھی ملنے چلا گیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "یار! میں تو انہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ کتنی بوڑھی، کمزور اور تنہا ہو چکی ہیں۔"

ایبک کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی۔

"اورنگ زیب بھائی نے کراچی چلے جانے کے بعد پلٹ کر ان کی خبر تک نہیں لی۔ یار! مائیں اپنے بچوں کو پال پوس کر اس لیے تو بڑا نہیں کرتیں کہ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر دور دیس جا بسیں۔"

اس کا دل بھر آنے لگا۔

"میں جانتا ہوں ایبک! تمہیں صالحہ آنٹی پر رنج ہے۔ دل میں گلہ بھی ہو گا، شکایتیں بھی ہوں گی مگر میرے دوست، ماؤں سے کیسے گلے اور کہاں کی شکایتیں، بڑے ہو نے پر کہیں بھی چلے جاؤ، کچھ بھی بن جاؤ، پوری دنیا میں ایک ہی تو دل ہوتا ہے جو ہمارے

لیے بے لوث اور پرخلوص دعائیں کرتا نہیں تھکتا اور وہ ہماری ماؤں کا دل ہوتا ہے یار۔۔۔ ماؤں سے ناراض ہو کر خود سکون سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ بھی تمہارے جیسے بیٹے۔"

معاذ کہہ رہا تھا اور ایبک سن رہا تھا۔ اس کے وجود کے اندر ہی کہیں اس کے آنسو بکھر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

سوکھی سرخ ثابت مرچیں برآمدے میں بچھے کپڑے پر بکھری تھیں اور وہ فرش پر بیٹھی ان کی خشک ڈنڈیاں توڑ رہی تھی۔ یوں ہی کام میں مگن اپنے خیالوں میں گم اس نے پل بھر کو سر اٹھا کر دیکھا تھا اور اس کی نظریں جیسے خلا ہی میں ساکت رہ گئی تھیں۔

"اور جو صالحہ آنٹی کو کبھی پتا چل جائے کہ میں ان کے بیٹے کے سحر میں اتنی بری طرح گرفتار ہوں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی دن ایک بار تو وہ مجھے اپنے سامنے کھڑا نظر آتا ہے اور پھر میں اس التباس کو تکتی ہی چلی جاتی ہوں تو وہ کیا سوچیں گی۔ انہیں کتنا برا لگے گا۔" اس نے سوچا تھا۔ "جب ہی تو وہ مجھے ٹوکتی رہتی ہیں کہ تم گھنٹوں بیٹھی خلا میں کیا دیکھتی رہتی ہو۔"

مرچیں اس کی گرفت سے نکل کر واپس کپڑے پر جا لڑھکیں۔ اس نے سر جھٹک کر دھیان ہٹانا چاہا۔ لیکن اس کا التباس ضدی تھا اور اتنا زور آور کہ نظروں کے سامنے سے ہٹنے کے بجائے تیز قدموں سے اسی کی طرف چل رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ اس کے سر کی طرف جھک گیا تھا سو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

"کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ میں تمہیں خواب میں نہ دیکھوں۔" وہ اس پر جھکا کہہ رہا تھا۔ "مگر یہ کیسا خواب ہے 'انوکھا اور ناقابل یقین۔ تم میرے گھر میں یوں بیٹھی ہو جیسے یہ تمہاری ہی تو ملکیت ہو۔" وہ اس پر جھکا جیسے خود فراموشی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"بھاگ جاؤ ہائی لینڈ گرل' بھاگ جاؤ یہاں سے' کیونکہ اگر تم یوں ہی خواب بنی یہاں بیٹھی رہیں تو میں یہاں رک نہ پاؤں گا۔ بھاگ جاؤ پلیز۔۔۔ مجھے میری ماں

کی خاطر یہاں رہنا ہے۔ میں دل کے سب شکوے بھلا کر دور دیس سے چلتا ان ہی کے لیے تو یہاں آیا ہوں۔"

سطوت نے نظر چراتے ہوئے اوپر دیکھا۔ وہ اب تک اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس بار شاید وہ التباس جن بن کر اسے چمٹنے کو آیا تھا۔

"ڈنڈیاں توڑ لیں سطوت!" سامنے والے کمرے سے صالحہ کی آواز سنائی دی۔ "ٹوٹ گئی ہیں تو یہ کپڑا لو اور مرچیں اس میں باندھ دو۔ کمپنی سے ملازم آتا ہے تو چکی پر بھیج کر پسوا لیں گے۔"

وہ اپنے دھیان میں بولتی' کمرے کا جالی وار دروازہ کھول کر باہر نکلی تھیں اور نظر اٹھا کر دیکھنے پر ساکت ہو گئی تھیں۔ جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی اپنی جگہ پر ساکت وجود تھے۔

☼ ☼ ☼

"سنا ہے آپ ایبک کی شادی چچی قمر آرا کی بیٹی سطوت سے کر رہی ہیں۔" اورنگ زیب فون کا چونگا کان سے لگائے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

"ہاں ٹھیک سنا تم نے۔" صالحہ نے شادی کے کارڈ سے بندھی سرخ اور سنہری ڈوری کستے ہوئے جواب دیا اور اپنے کان اور کندھے کے درمیان دبا ریسیور نکال کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"اب شادی کے کاموں کے لیے تو میں نے رضوان کو خاص طور سے بلا کر گھر ہی میں رکھ لیا ہے' تاکہ میرا کام بھی ہوتا رہے اور تمہیں پل پل کی خبر بھی پہنچتی رہے اور کسی کو یہاں اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ تمہیں یہاں کی تفصیلات بتا سکے۔"

"ایبک واپس آ گیا۔ دنیا کی سب سے ناممکن شادی طے ہو گئی' کارڈ تک چھپ گئے اور مجھے آپ نے بتانا تک گوارا نہ کیا۔" اورنگ زیب جواب تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں تمہیں نہیں بتایا۔" وہ لاپروائی سے بولیں۔ "میں نے سوچا مہذب شہروں سے دور۔۔۔ اس غیر ترقی یافتہ دور افتادہ بستی میں ہونے والی ایک معمولی سی روایتی شادی میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو کہاں دلچسپی ہو گی۔ میں بتاؤں' تم دلچسپی نہ لو' میں بلاؤں تم شادی میں شرکت کرنے نہ آؤ تو میرا دل بہت برا ہو جائے گا۔ اسی لیے نہیں بتایا۔"

وہ صاف گوئی سے بولیں اور ترقی یافتہ مہذب شہر میں بیٹھے پہاڑوں کے باسی اورنگ زیب کا دل چاہا اسی وقت سب پابندیاں توڑ کر واپس اس بستی میں پہنچ جائے جہاں سرما میں برف گرتی تھی اور بہار میں ڈیزی کے پھول اگتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"دیکھی کیسی طویل بحثیں کیا کرتے تھے ہم سب معجزے رونما ہونے کے بارے میں۔" معاذ نے گاڑی کے پہیوں پر نئے وہیل کپ چڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"یاد ہے۔" گاڑی کے نچلے حصے میں مرمت کا کوئی کام کرتے ایبک نے جواب دیا تھا۔ "تاریک راتوں میں شمعیں روشن کر کے روحوں کو بلاتے تھے اور ان سے پوچھتے تھے کہ اگر معجزے رونما ہوتے ہیں تو کیا کبھی ہماری گاڑی بھی بن جائے گی۔" وہ لیٹے لیٹے باہر کو کھسکا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گریس کے داغ لگ چکے تھے۔

"بیٹا! اگر سطوت کے ساتھ تمہاری شادی ہو جانے کا معجزہ رونما ہو سکتا ہے تو پھر اس گاڑی کا بننا اور چلنا کون سا مشکل کام ہے۔"

ظفر نے منہ میں دبا پیچ کس نکال کر ٹول باکس میں رکھتے ہوئے کہا اور رائنہ کے قریب کھڑی سطوت کی طرف دیکھا۔ جس کے ہاتھوں پر حنائی پھول سجے تھے اور سر پر کرن لگا گلابی دوپٹا تھا۔

"یاد کرو وہ دن جب سیڑھیوں کی ریلنگ کے ساتھ دنیا کے انوکھے ترین پیغام کو پتنگ کی ڈور سے باندھ کر

فرار ہوئے تھے تم۔۔۔" رائنہ نے مسکرا کر کہا۔ "اگر اس روز میں کاغذ کی وہ کترنیں اپنے ساتھ نہ لے جاتی اور وہ سطوت کے ہاتھ لگ جاتا تو کیا معلوم سطوت تم سے مایوس ہو کر اپنے ماموں کے پاس ہی جا چکی ہوتی۔ کیوں سطوت؟"

اس نے سطوت کی طرف دیکھا جو اس کی بات سن کر مسکرا رہی تھی اور مسکراتے ہوئے ایبک کی طرف دیکھ رہی تھی اور ایبک نے بھی اسی لمحہ اس کی طرف دیکھا تھا۔ سطوت کی بھوری مائل سنہری آنکھوں سے سورج کی کرنیں ٹکرا رہی تھیں اور سورج کی ان کرنوں سے منعکس ہو کر وہ اور بھی سنہری نظر آنے لگی تھیں۔

"ہاں یہ معجزہ ہی تو ہے۔" دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں۔

✲ ✲ ✲

" Here We Go "

فضا میں معاذ کی بلند آواز گونجی تھی اور ایک ننھے سے ہجوم کی شکل میں کھڑے لوگوں کی تمام تر توجہ معاذ کی آواز کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس ہجوم میں بچے، بڑے اور بوڑھے سب شامل تھے۔ معاذ، ایبک، رائنہ اور ظفر کے گھر والوں سمیت ان کے اسکول، کالج کے اساتذہ اس چھوٹی سی بستی کے اکثر مکین اس علاقے سے نئی نئی نشریات شروع کرنے والے ایف ایم ریڈیو کا عملہ، چند نجی ٹی وی چینلز کے نمائندے اور علاقے کے عوامی نمائندے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر معاذ تھا اور ایبک اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ظفر اور رائنہ گاڑی کی کھلی چھت سے سر باہر نکالے کھڑے تھے۔ ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ایک زوردار آواز نکالتے ہوئے اس چھوٹے سے میدان کے اندر چکر لگانے لگی۔ ہجوم سے تالیوں اور سیٹیوں کی آواز بلند ہوئی اور بچوں کے ہاتھوں سے چھوٹے رنگ برنگ غبارے غبارے فضا میں بلند ہوئے۔ شمسی توانائی سے چلائی جانے والی گاڑی کا پہلا تجربہ کامیاب رہا تھا اور ان چاروں کا پرانا خواب حقیقت میں ڈھل کر سب کے سامنے آ چکا تھا۔

✲ ✲ ✲

"محبت اگر ایک جزیرہ ہے تو میں اپنی پوری عمر اس جزیرے میں گزارنے کو تیار ہوں۔" ایبک نے ڈاک خانے والے راستے کی طرف مڑتے ہوئے کہا تھا۔

"اور محبت اگر ایک خواب ہے تو میں تاعمر آنکھیں موندے یہ خواب دیکھنے کو تیار ہوں۔" ایبک کے ساتھ چلتی سطوت مسکرا کر بولی تھی۔ اس کی آواز میں اور اس کی چال میں جو اعتماد اس روز تھا، وہ ڈاک خانے کی طرف جانے والے راستے نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میری سویٹ ہائی لینڈ گرل! شاید میں اس خواب جزیرے میں جس کا نام محبت ہے میں رہنے کے لیے ہی تو واپس لوٹ آیا ہوں۔" ایبک نے پیار سے سطوت کی ناک کو چھوتے ہوئے کہا اور پھر اپنی نظروں کے سامنے اوپر جاتے راستے کو دیکھنے لگا۔

"چلو اپنے اپنے خواب جزیرے کی طرف جانے والے راستے کو ڈیزی کے پھولوں سے، اپنی ہنسی کی آوازوں سے اور تمہاری آنکھوں میں جلتی خوشی اور سکون کی جوت سے سجاتے ہیں۔"

اس نے سطوت کا ہاتھ تھاما اور وہ اپنی محبت کے رازدار اس راستے پر چل دیے جہاں کوئی دوسرا کم ہی جاتا نظر آتا تھا۔

ثانیہ الطاف ہاشمی

کیسا فیصلہ

"بس کردوں امی۔" تھاپیوں (اپلوں) سے پوری دیوار بھر کر اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

وہ لکڑیوں کے بجائے اپلوں سے آگ جلاتے تھے۔ اپنی بھینسوں سے دودھ بھی مل جاتا تھا اور بالن بھی۔ یہی اس کا اور والدین کا آسرا تھیں۔ گھر کے صحن میں بندھی تینوں بھینسوں سے ان کا روزگار جڑا تھا اس لیے ان کی حیثیت بھی گھر کے افراد کی سی تھی۔ آمنہ نے بھوری کو تھپکا اور اٹھ گئی۔ اب اگلا کام بھینسوں کو پانی پلانے کا تھا جو اس کے ذمے تھا۔ امی ابا اتنا مشقت کا کام کرنے سے گھبراتے تھے۔ اب یہ ذمے داری آمنہ نے لے لی تھی۔ پانی پلا کر وہ کھری چارپائی پر لیٹ کر رسالے پڑھنے لگی تھی کیونکہ آج کل وہ دسویں کے پرچے دے کر فارغ تھی۔ گھر کے کام کاج سے فراغت کے بعد رسالے پڑھنا اس کا مشغلہ تھا۔

شام ہوگئی تھی۔ سامنے کمہاروں کے برگد کے درخت پر پرندوں کا شور مچ گیا تھا۔ یہ شور آمنہ کو بہت بھاتا تھا۔ اس کی شام اس شور کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک دن جلال ماموں کے بیٹے کے عقیقے میں انہیں رات رہنا پڑ گیا تھا' شام کو آمنہ اتنی اداس پریشان ہوگئی تھی کہ امی کو پوچھنا پڑا تھا کہ کیا ہوا ہے اور وجہ جان کر وہ اسے گھور کے رہ گئیں پھر اگلے دن واپسی پر وہ شام سے پہلے ہی برگد کے درخت پر نظریں جما کر کھڑی ہوگئی۔ امی کو اس کے مشغلے کا پتا تھا سو وہ اس وقت کچھ کہتی نہیں تھیں۔ چڑیوں کا شور اب آہستہ آہستہ تھم رہا تھا۔ اس میں ایک عجیب طرح کا سوز تھا' جو آمنہ کو سحر زدہ کرتا تھا۔

امی تندور سے روٹیاں نکال چکی تھیں' پانی ٹھنڈا کر کے چارپائی پر برتن لیے بیٹھی تھی۔ آمنہ آلو گوشت کے سالن کو چولہے سے اتار لائی۔ ابا نماز پڑھ کر آچکے تھے۔ وہ یہ کام نماز پڑھنے کے بعد کرتی تھی۔ امی سالن کٹوریوں میں ڈالنے لگیں تو اس نے گرم گرم خستہ روٹی خود ہی چنگیر میں ڈال لی اور روٹی کے ٹکڑے کو کترنا شروع کر دیا پھر ایک بوٹی اٹھا کر کھانے لگی۔ سالن واقعی مزیدار تھا اور ساتھ ٹھنڈا پانی لطف کو دوبالا کر رہا تھا۔

امی اور ابا اپنی باتوں میں مگن تھے سو وہ اپنے رزلٹ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوگی۔ بس رزلٹ کا انتظار تھا پھر کالج میں داخلہ لینا تھا' بس نمبر اچھے ہونے چاہئیں اس کے نمبر اچھے ہی ہوں گے' وہ جانتی تھی۔ سو وہ سب عشاء کی نماز کے بعد ہی سو جاتے تھے ___ ہلکی ہلکی ہوا لگنا شروع ہوگئی تھی۔ مزیدار کھانا اور ٹھنڈی ہوا اس کی آنکھیں بند کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح ہی صبح امی لسی کا مٹکا تیار کر کے مکھن بڑے اسٹیل کے کٹورے میں رکھ رہی تھیں۔ ابا جی لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ٹکڑے آگ جلدی پکڑتے تھے۔ بڑی لکڑیاں دیر تک سلگتی رہتی تھیں وہ نلکے سے منہ ہاتھ دھو کر امی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ انہوں نے محبت سے بال سنوارے اور پراٹھا اور اس پر مکھن کا بڑا سا پیڑا دھر دیا۔ وہ پراٹھا کھانے لگی اور لسی کا بڑا گلاس ساتھ رکھ لیا۔ امی اور ابا جی دودھ پتی پیتے تھے۔ لسی دوپہر کو' وہ صبح صبح لسی پیتی تھی'



دوپہر کو کسی مہمان یا آئے گئے کے لیے دودھ بچ جاتا تو کپ بھر ہی لیتی۔ امی دودھ ڈال کر اب دیگچی میں چائے کی پتی اور چینی ڈال رہی تھیں۔ وہ جھاڑو اٹھا کر اندر کچے کمرے میں لیپے ہوئے فرش پر جھاڑو دینے لگی۔

پلنگوں کی قطار پر پڑے ہوئے دوہڑے ٹھیک کیے سرہانے ترتیب سے رکھے پھر پٹی کا کپڑا درست کیا اور پانی چھڑک کے جھاڑو دی۔ پھر باہر سے نیم اور امرود کے پتوں کو اکٹھا کیا اور برتن سمیٹ کے نلکے کے نیچے رکھ دیے۔ ابا جی گھاس لینے چلے گئے اور امی کسی مرگ پر تعزیت کے لیے نکل گئیں۔ کام سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آ گئی۔ پلنگ پہ بچھی چادر کے نیچے رسالے میں سے اچھے اچھے اشعار چھانٹنا کھانوں کی تراکیب نوٹ کرنا اس کا شوق تھا۔ خواتین والوں نے مزے دار کھانے پکانا اسے سکھا دیا تھا۔

وہ امی کو بھی بتاتی تھی۔ سامنے چھوٹی چھوٹی کچی دیواروں کے پار صحن کے اختتام پر دور دور تک فصلیں ہی فصلیں تھیں۔ تازہ ہوا کے جھونکے پانی کی نمی خود میں سموئے کمرے میں آ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ فصلوں کو پانی دیا جا رہا ہے ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ وہ اٹھ کے باہر آ گئی۔ آٹا گوندھ کے رکھ دیا تھا۔ امی سبزی لے کے آنے ہی والی تھیں۔ ساجھے نائی کی سبزیوں کے کھیت میں سے تازہ سبزی سستے داموں سارا گاؤں خرید لیتا تھا۔ بیلوں سے کدو توری اور ہری مرچیں کتنی بار اس نے خود توڑی تھیں۔ امی اور وہ جا کر سبزی چن لاتے تھے۔ بیل سے الگ ہوئی سبزی کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔

آج امی بھنڈی لائیں تو اس نے جلدی سے بھنڈیاں چڑھا دیں۔ امی روٹیاں لگانے لگیں۔ تندوری روٹی کی خوشبو اس کے ارد گرد چکرانے لگی۔

ابا گھر آ گئے۔ کل رزلٹ بھی آنے والا تھا یعنی ایک دن باقی تھا۔ صرف ایک رات اور صبح یا اللہ خیر کرنا۔

اس کی ضلع بھر میں اول پوزیشن آئی تھی یعنی پورے اوکاڑہ ڈسٹرکٹ میں پہلی پوزیشن، سب سے زیادہ نمبر، امی نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ ابا جی شہر سے لڈوؤں کی بڑی مقدار ساتھ ہی لائے تھے۔ امی چینی کی پلیٹوں میں لڈو بھر بھر کر سارے گاؤں کا منہ میٹھا کروا رہی تھیں۔ نائی رشیداں، چاچا چھیما، مولوی ادریس اور چودھری بالے سمیت سب نے ابا جی کو مبارک باد دی تھی۔ ان کی بیٹی نے سب کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ اخبارات میں اس کی تصویر چھپی تھی۔ امی اور ابا بہت خوش تھے۔ وہ اکلوتی بیٹی ہی تھی مگر بیٹے سے بڑھ کر نکلی تھی۔ چودھریوں نے اسے دو سوٹ بھجوائے تھے۔ گھر بلا کر عزت دی تھی۔ اس کا مستقبل روشن تھا۔

ابا جی اب اسے شہر کے کالج میں داخل کروانے کا سوچ رہے تھے۔ ہاسٹل کی سہولت موجود تھی مگر اصل

مسئلہ خرچا تھا۔ وہ بھی پورا ہو ہی جاتا تھا کیونکہ انہیں بیٹی کو پڑھانا تھا۔ شہر کے رشتے داروں نے مبارک بادیں دی تھیں۔ ماموں جمال آئے تھے مٹھائی کا ڈبہ لے کر' خالہ زرینہ نے جوڑا دیا تھا۔ آج پھر تانگہ گھر کے سامنے رکا تھا۔ دوسرے گاؤں سے چک 26 سے چاچا منیر' چاچی اور بہادر علی اترے تھے۔ بڑے رجب کی بیگم بھابی صغریٰ بھی آئی تھی۔ چاچا جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

آمنہ اندر سے لسی میٹھی کر کے لے آئی۔ تانبے کے گلاسوں میں سب کو لسی دی گئی۔ امی اور ابا جی مہمان داری میں کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ مٹھائی کھاتے ہوئے چاچا جی باتیں بھی کر رہے تھے۔

"دوسرے پنڈ تک لوگوں کی زبانوں پر چرچے ہیں کہ بھئی بڑے چنگے نمبر لیے ہیں تیری دھی نے۔" چاچا منیر نے عجیب سے انداز میں کہا۔

امی اور ابا سرہلا کر رہ گئے۔ پتا نہیں تعریف تھی کہ تنقید' کام تو اچھا کیا تھا اس نے' ہوتی تو تعریف ہی چاہیے تھی۔ وہ نلکے پر برتن مانجھنے لگی۔

بہادر اندر اس کی کتابوں کو کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا منگیتر بھی تھا۔ خود میٹرک میں فیل ہو کر یہ صدمہ دل پہ لے لیا تھا۔ اسکول چھوڑ کر زمین داری میں لگ گیا تھا۔ یہ چھٹا سال تھا اسے اسکول چھوڑے ہوئے۔ امی دیسی مرغیوں کا پتا کرنے چلی گئیں۔ چند لمحوں بعد چار پانچ مرغیوں کو پروں سے پکڑے اندر داخل ہوئی تھیں۔ ماسی سکینہ ہی مرغیاں پالتی تھی' سارا دن فصلوں سے دانہ دنکا چگتی تھی اس کی مرغیاں۔ ابا جی بسم اللہ پڑھ کر مرغیاں ذبح کر دی تھیں پھر رات بھر کے گوشت بنا۔ آمنہ اور امی گوشت صاف کر رہی تھیں' چاچی اور ان کی بہو سامنے ابا جی سے باتیں کر رہی تھیں رجب کی بیوی ہمیشہ کی طرح سہمی ہوئی سی تھی۔

لکڑیاں جلا کر گوشت پکا پھر روٹیاں لگ گئیں۔

چارپائیاں بچھ گئیں۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ وہ بھی روٹی کھا رہی تھی۔ امی نے بہادر علی کو تری اور بوٹیوں سے بھرا سالن دیا تھا' آخر کو اس گھر کا جوائی بھی تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے تیور اس وقت بگڑے بگڑے سے تھے' عجیب تناؤ بھری خاموشی تھی' وہ اپنے ساتھ بھی کچھ نہیں لائے تھے بس عجیب سی تعریف کی تھی۔ چاچی کا لہجہ پتا نہیں کیسا تھا اسے بالکل نہیں بھایا۔

بہادر علی بظاہر ہنستا نظر آتا تھا مگر اس کے سرخ و سفید چہرے پر نجانے کیا تھا جو اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اسے اپنا منگیتر' بچپن کا منگیتر پیارا تھا۔ دونوں مل کے کھیلتے تھے مگر ہمیشہ امی اور ابا نے ہی ان کی دلداریاں کی تھیں۔ انہیں سنا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ حکمران ہوں اور امی ابا اور وہ خود رعایا۔ چاچا چاچی' ابا سے مل کر رخصت ہوئے تھے۔ تانگہ کچے راستے پر دھول اڑاتا دور چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

امی اور ابا باتیں کر رہے تھے' وہ سن رہی تھی اُن کے رویے کی باتیں۔

"پتا نہیں صابرہ! بھا منیر کو کوئی گل بری لگ گئی ہے یا پتا نہیں کیا؟" آمنہ سرخ پایوں والے پلنگ اٹھا اٹھا کر اندر رکھنے لگی۔ سارے برتن اکٹھے کر لیے کام کافی زیادہ تھا' پتیلے میں کافی سالن بچ گیا تھا۔ جو اس نے کھالے کے نیچے رکھ دیا۔ ابا اور وہ شہر جا کر کالج کا پتا کر آئے تھے۔ فیس بھی مناسب تھی اور آمنہ صبح سے آ کر شام' عصر تک سوٹ بھی سی سکتی تھی پھر فائدہ ہاسٹل کا۔ اسے گھر ہی واپس آنا تھا۔ سفید براق یونیفارم' دستے قلم' سب وہ لے آئی تھی۔

ابا جی نماز پڑھنے نکل گئے۔ امی باہر مٹی کا چولہا جلانے لگیں' باہر سائیکل رکنے کی آواز آئی تھی۔ بہادر آیا تھا امی سے ملا اور سیدھا اس کے پاس چلا آیا وہ پلنگ پہ بیٹھی اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش خوش اسے مستقبل کے سارے منصوبے بتا رہی تھی۔

"تائی نے تجھے زیادہ ہی سر چڑھا رکھا ہے آمنہ۔"

وہ کیا کہہ رہا تھا؟ سر چڑھا رکھا ہے؟

"کیسے ....؟" وہ حیران سی ہو چلی تھی۔ "کیسے سر چڑھا رکھا ہے بھلا؟" وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

"بس سن لے تو شہر نہیں جائے گی پڑھنے۔ ابا نے منع کیا ہے۔ پہلے بھی سارے پنڈ میں تیرا نام گونج رہا ہے۔ مجھے نہیں پسند یہ سب' تو بس پڑھائی چھوڑ دے۔" وہ ماں کا پیغام لے کر آیا تھا۔

امی ہاتھ دھو کر اندر آ گئیں۔ "امی' دیکھیں کیا کہہ رہا ہے بہادر علی میں پڑھنا چھوڑ دوں۔" وہ ماں کو شکایتی انداز میں بتا رہی تھی۔

بہادر امی کی طرف بھی کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پوری آنکھیں کھولے جان چکی تھی کہ تیور بدل چکے ہیں۔ وہ حکم سنا چکا تھا' دھونس جما چکا تھا اب تماشا دیکھنا باقی تھا۔

ابا نماز پڑھ کر آ گئے تھے کمرے کا سرد ماحول دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے" تو چپ کر پتر! جیسے تو کہے' بیٹھ تو سہی۔" ابا نے ماحول کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔ "تو بیٹھ تو سہی' جا آمنہ کی ماں اس کے لیے پانی لا۔"

جس طرح سے وہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آمنہ کو بے حد برا لگ رہا تھا' امی پانی لے آئیں تو اس نے امی کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"ناں چاچی ناں' ہم خود بہن بیٹیوں والے ہیں' ہمیں اس جیسی آزاد خیال لڑکی کی ضرورت نہیں۔ فیصلہ ہو گا اور ابھی ہو گا' میری ماں بڑی پریشان ہے' ایسی تو آمنہ جو صرف کتابیں پڑھنا جانتی ہو گھر چلانا نہیں۔" اس کے غیض و غضب میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ابا جی پلنگ پر ڈھے سے گئے تھے بھتیجے سے گستاخانہ گفتگو کی امید نہیں تھی۔ سورج تمام تر تابناکیوں سمیت ڈوبا جا رہا تھا' ویسے ہی بوڑھے والدین کا دل بھی۔ مگر بہادر علی صرف بول رہا تھا۔ سن رہا تھا نہ سمجھ رہا تھا۔ صرف سنا رہا تھا' ان کی قابل ستائش کامیابی طعنے میں تبدیل ہو چکی تھی' وہ تو گھر کے کام کاج بھی کرتی تھی' اپلے بھی تھاپتی تھی' روٹی بھی بیل لیتی تھی پھر یہ اعتراض کیسا؟ اچانک اس میں ... اتنی خامیاں کیسے نکل آئی تھیں کہ وہ احساس کمتری کا مارا بہادر اتنا بزدل بن گیا تھا کہ ایک عورت سے ڈر گیا تھا۔ بڑوں کی تذلیل کر چکا تھا' بیٹھے بیٹھے وہ نتیجے تک پہنچ گئی تھی۔

اسے ایسے شخص سے شادی نہیں کرنی تھی' جو شوہر ابھی بنا نہیں تھا مگر اتنی پابندیاں' اتنی حدیں مقرر کر رہا تھا۔ شادی کے بعد کیا کیا امتحان نہ لیتا۔ اگر وہ چار ایکڑ زمین کا مالک تھا تو وہ بھی اپنے خوابوں' اپنے احساسات کی وارث تھی اور یہ حق کسی کو نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اس کے والدین سے بدتمیزی سے پیش آئے اور اس کی آنکھوں سے خواب نوچے۔

بہادر سائیکل اٹھا کے جا رہا تھا۔ امی اور ابا جی اسے روکنے کو اٹھنے لگے تھے مگر اس نے انہیں روک دیا تھا۔ جانے والوں کو بھی کوئی روک سکا ہے بھلا؟ اور وہ جا رہا تھا۔ وہ رات اس نے تارے گنتے اور سوچتے میں گزاری۔ امی اور ابا جی دونوں جاگ رہے تھے۔ رشتہ اپنوں کا تھا' اچھا تھا مگر اکلوتی بیٹی حق پر تھی۔ اس کے خوابوں کو آگ میں جھونکنا تو دور اسے رلانا بھی مشکل تھا۔ کیا برائی تھی آمنہ کے آگے پڑھنے لکھنے میں' جھوٹی انا اور جھوٹی غیرتیں۔

اس وقت غیرت کیوں نہیں آئی جب اپنے گھر کی بہو' عزت کو سلیم گھسیٹ کر سڑک پر لے آیا تھا۔ گندی گالیاں بکتا تھا۔ گندے الزام لگاتا تھا اس وقت کیوں نہیں؟ جب کوئی عورت ترقی کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے با اختیار ہونے لگتی ہے تو اس نام نہاد عزت کے رکھوالوں کو غیرت یاد آ جاتی ہے۔

آمنہ نے فیصلہ کر لیا تھا' اس نام نہاد منگیتر سے خلاصی کا۔ اسے زمینیں نہیں چاہیے تھیں' اپنی عزت چاہیے تھی' خوابوں اور احترام سمیت۔ فجر کی اذانیں بلند ہوئیں تو اس نے بستر چھوڑا اور نلکے پر منہ ہاتھ دھوئے' وضو کیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔

ابا جی اور امی بھی نماز پڑھنے اٹھ گئے تھے۔ ابا جی مسجد اور امی چھپر تلے نماز ادا کر کے لسی بلونے میں لگی تھیں۔ تھوڑی دیر میں سورج طلوع ہوا اور کچے صحن میں پراٹھوں کی خوشبو ہلچل مچانے لگی۔ ناشتہ کر کے

اس نے کالج میں داخلے کی تیاری پکڑ لی۔ اپنے سرٹیفکیٹس کتابیں وغیرہ بیگ میں ڈال لیں۔ ابا جی نے سفید رنگ کا صافہ خاص طور پر نیل لگوا کر سر پر لے لیا۔ ہلکے سے نیل لگے صافے میں ان کا سرخ و سفید چہرہ بہت بھلا لگتا تھا۔ امی گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔ ابا جی اور وہ شہر کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

آمنہ کا داخلہ ہاتھوں ہاتھ ہوا تھا۔ وظیفے کے پانچ ہزار بھی ملنے تھے۔ وہ بہت خوش تھی اور ابا جی بھی خوش تھے۔ کالج والوں نے بڑی عزت دی تھی اور اپنے کالج میں اس کے داخلے کو اعزاز سمجھا تھا۔ آمنہ پھولی نہیں سمائی' جی چاہا اڑ کر آسمان کو چھو آئے مگر زیادہ اچھلنے سے ہڈیاں ٹوٹنے کا خدشہ تھا' اس لیے آہستہ آہستہ اچھل رہی تھی۔ بہادر علی کا تنتنا اسے یاد بھی نہیں رہا تھا۔ ابا جی بھی سب بھولے ہوئے تھے۔ واپسی پر امی کے لیے جلیبی اور اندرسے خرید کر دونوں باپ بیٹی واپس لوٹ آئے۔

شام کو صحن میں پانی کا تروکا لگا کے چارپائیاں بچھائے' وہ تینوں باتوں میں مشغول تھے۔ ابا جی کا خیال تھا' تائے سے بات کر کے بہادر کی عزت افزائی کروائیں گے کیونکہ وہ اوکھا ہو کے گیا تھا۔ آمنہ ابھی چپ تھی اور چاچی بہادر علی کو ساتھ لیے لپک جھپک پہنچ گئی تھیں' ان کا غصے کا بھی وہی عالم تھا۔

"کیوں پڑھا رہے ہیں' دھی کی کمائیاں کھانی ہیں' برادری میں رواج نہیں' بہادر نے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔" اور امی اور ابا جی نے انہیں بیٹی کو نہ پڑھانے کے معاملے میں صاف جواب دیا تھا۔ "رشتہ توڑنا ہے تو سوچ سمجھ لیں ہم بھی سوچ لیتے ہیں۔"

ابا جی بہت دکھی سے ہو گئے تھے۔ ان کے تیور ایسے بھی بدل سکتے تھے' یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔ خون سفید ہونے میں وقت نہیں لگا تھا۔ چاچا جی سے تسلی کی امید تھی مگر وہ بھی بول کر ہکا بکا کر گئے تھے۔ "ابھی اور اسی وقت پڑھائی ختم کر کے تینوں بھینسوں اور گھر سمیت بہادر کے نام لکھ دیں۔" ابا جی کی کمر جھک گئی مگر بہادر کو وے کر وہ کہاں جاتے پھر اگلے دن وہ آمنہ سے مرضی پوچھنے چلا آیا' اسے امید نہیں تھی۔

"مجھے تم سے شادی نہیں کرنی تم جا سکتے ہو اور آئندہ یہاں کوئی فیصلہ سنانے مت آنا' میرے والدین زندہ ہیں۔ وہ جو میرے بارے میں سوچیں گے' مجھے منظور ہو گا۔" وہ دوٹوک الفاظ میں کہتی چلی گئی۔

"لے سن لے چاچی! ابھی سے یہ حال ہے تیری دھی کا۔" وہ طعنے دینے لگا۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ بہادر! مجھے تم سے شادی کبھی نہیں کرنی ہماری طرف سے انکار ہے۔"

وہ مزید بکواس کرتا چلا گیا تھا۔

نہ پھر چاچا جی آئے نہ بہادر' دونوں طرف خاموشی تھی۔ وہ کالج جاتی تھی اور پڑھتی تھی۔ امی اور ابا جی معاملہ اللہ پر چھوڑ چکے تھے کوئی ہو گا آمنہ کی قسمت کا تو آ جائے گا۔ آمنہ فرسٹ ایئر سے سیکنڈ ایئر میں آ چکی تھی' اٹھارہ سے اکیسواں سال تھا۔ امی اور ابا کو فکر لگ گئی تھی' وہ بہت فکر مند رہتے تھے۔ چاچے کا یہ حال تھا کہ اگر ان کی آنکھ بند ہو گئی تو؟

پھر مختار علی کا رشتہ آیا جس کے اپنے تھوڑے سے کھیت تھے اور اپنا پولٹری فارم۔ ساتھ کے گاؤں کا مختار پڑھا لکھا نہیں تھا۔ چٹا انگوٹھا چھاپ آدمی بھی نہیں تھا پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اس کی ماں اور وہ چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ابا جی چارے کی پنڈ (گھٹڑی) لیے اندر آئے تو اس نے آگے بڑھ کر چارا سر سے اتار لیا۔ وہ سمجھ دار اور سلجھا ہوا آدمی تھا۔ چھبیس ستائیس برس کی عمر میں دونوں بہنوں کو بیاہ کر اس کی ماں اور وہ خود اکیلے رہتے تھے۔ اماں جی بھی مختار کی طرح ملنسار تھیں۔

آمنہ نے امی کے پوچھنے پر ہاں کر دی تھی۔ مختار لوگ چند دن بعد مٹھائی' پنیاں اور خشک میوہ جات کی بہت بڑی مقدار بطور شگن دے گئے تھے۔ ابا جی مطمئن تھے۔ مختار کی طرف سے پڑھنے کی بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جتنا چاہتی' پڑھ سکتی تھی۔ وہ خود آمنہ کو کالج چھوڑنے کو راضی تھا اور دوسری گھٹیا قسم کی لالچ سے پر باتیں بھی نہیں کی تھیں۔ انسان بولتا

ہے تو اس کا پتا چلتا ہے وہ بولے تھے اور پتا چلا تھا کہ وہ اچھے مخلص لوگ تھے۔

رشتہ طے ہوتے ہی بہادر علی نے رولا ڈال دیا تھا۔ اس کی منگ تھی، اسی کا حق تھا۔ آمنہ کا رشتہ کہیں نہیں ہو سکتا تھا مگر آمنہ کی نظروں سے وہ گر چکا تھا۔ اس کا لالچ اس کے سارے پردے چاک کر چکا تھا۔ وہ آمنہ سے آمنہ مختار ہو گئی تھی۔ مختار کا کچا پکا بڑا سا گھر اس کا خواب محل بن چکا تھا۔ بہادر علی کا پختہ گھر نما حویلی بہت دور رہ گئی تھی بہت دور۔

☼ ☼ ☼

"کیوں کیا تم نے ایسا۔" آج امی کی طرف اس کا دوسرا دن تھا جب بہادر علی گھپ اندھیرے کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ "کیا میں تم سے محبت نہیں کرتا تھا تم میرے لیے امی سے ذرا سی معذرت نہیں کر سکیں کیا ہو جاتا۔"

"تم۔" اس کے خیال میں اسے تائی سے اتنی بدتمیزی کے باوجود معافی بھی مانگنا چاہیے تھی۔ حیرت ہے بھئی، وہ اندر ہی اندر مسکرائی۔

مختار اس سے کبھی بھی کسی سے معافی مانگنے کا نہیں کہتے اور نہ ہی اماں جی نے اتنی اکڑ پال رکھی تھی کہ بہو سے معافیاں منگواتی پھرتیں، کتنے وقت پر اس نے بہادر علی نام والے بزدل کو جانا تھا۔ یہ اللہ کا کرم نہیں تو کیا تھا ورنہ آج بہادر علی جیسے غصیلے شخص سے جوتے الگ کھاتی اور معافی تو نجانے کس کس سے منگواتا پھرتا۔

ابھی بھی وہ اپنی ماں کے غرور کے بت ٹوٹنے کا شکوہ کر رہا تھا۔ اسے آمنہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اس معافی کا دکھ تھا۔ جسے مانگنے سے، جھکنے سے اللہ نے اسے بچا لیا تھا۔

مختار تو پڑھی لکھی آمنہ کا ساتھ پا کر خوشی سے گال سرخ کیے پھرتا تھا۔ "میری بیوی گاؤں کی سب سے پڑھی لکھی عورت ہے۔" وہ تو پولٹری فام کے حوالے سے بھی اس سے مشورے مانگتا پھرتا تھا حالانکہ وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ اور اماں جی نے بھی محبت کی تھی اس سے اور جواب میں اس نے بھی محبت کو محبت سے ضرب دے کر اسے دگنا کر دیا تھا۔

"پچھتا رہی ہو۔" بہادر علی کی نگاہوں نے اس کی خاموشی کا اپنا ہی مطلب نکال لیا تھا

"سنو بہادر علی! مختار میری پہلی اور آخری محبت ہیں۔ میں صرف مختار سے محبت کرتی ہوں اور ہاں آئندہ اگر تم نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو انجام کے ذمہ دار خود ہوں گے۔ مختار کو میرا کسی دوسرے سے بات کرنا پسند نہیں۔ مجھے تم اور اب چلتے پھرتے نظر آؤ بلکہ نکلو یہاں سے۔" اس نے اسے باہر کرنے کے بعد دروازہ بند کر لیا تھا۔

یوں ہی دروازے کھلے رکھنے سے کوئی بھی اندر آ سکتا تھا۔ ایسے ہی دل کے دروازے کھلے دیکھ کر بہادر علی جیسے بھی اندر جھانک سکتے ہیں۔ دل کے دروازے صرف اسی کے لیے کھلے رہنے چاہئیں، جو دل میں رہنے کے قابل ہو۔ سنہری شام سیاہ اندھیرے میں بدلنے والی تھی۔

"کیا سوچا جا رہا ہے۔" وہ دیوار کے پار کھیتوں میں نجانے کیا ڈھونڈنے یا شاید آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی کہ پیچھے سے مختار نے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔ اس نے بہادر کا شکوہ من و عن کہہ سنایا، زور کا قہقہہ پڑا تھا دونوں کا۔

کچھ فیصلے اگر بروقت کر لیے جائیں، سوچ لیا جائے تو کتنا اچھا ہوتا ہے نا ورنہ تو ٹوٹے دلوں میں کرب اور آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا رہ کیا جاتا ہے۔ مختار کے پیچھے موٹر سائیکل پہ بیٹھے ہوئے اس نے سوچا۔

بہادر علی کرائے کے کھیتوں کو پانی لگا رہا تھا۔ اس نے اسے اک نظر دیکھا ضرور تھا اور یہ آنکھیں بتاتی تھیں کہ نارسائی کس کے حصے میں آئی تھی۔ اس نے اطمینان سے مختار کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور آگے دیکھنے لگی کیوں کہ پیچھے تو دھول مٹی کا طوفان رہ گیا تھا بس۔

☼

صائمہ شاہد

شہر دل کی گلیوں میں

میرا دل بہت اداس تھا۔ میں یوں ہی سڑک پر نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کی یخ بستہ رات میں سرد چاند بھی بادلوں کے حلقے میں میرے ساتھ ہولیا۔ کچھ دیر میں یوں ہی چلتا رہا۔ کچھ لمحوں بعد چاند نے نہ جانے کس سے شرما کے بادلوں میں اپنا منہ چھپالیا تھا۔ اک چاند کا میں بھی تمنائی تھا۔۔۔ لیکن وہ نفرت کے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ کاش! کوئی میرا بھی تمنائی ہوتا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہتا۔ جیسے چاند کے ساتھ چاندنی۔۔۔

ناولٹ



ادھر چاند چھپا' ادھر چاندنی بھی اوجھل ہوئی۔ تنہائی کا احساس پوری شدت سے جاگا تھا۔ لبوں نے بلا اختیار ابن انشاء کی نظم گنگنائی۔

شہر دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی۔۔۔ بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی
جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے۔۔۔ روح و جاں میں بستی ہے
شہر دل کی گلیوں میں۔۔۔ سرد سرد راتوں کو
زرد چاند بخشے گا۔۔۔ بے حساب تنہائی
بے حجاب تنہائی
شہر دل کی گلیوں میں

پتا نہیں میں کس سمت جارہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کس طرف جانا چاہیے تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا کرنا چاہیے تھا۔

مجھے نہیں خبر میرا جینا کیا؟ میرا مرنا کیا؟ میرا ہونا کیا؟ میرا نہ ہونا کیا؟

اگر اس سے دس گنا دولت بھی میرے پاس آجائے تو بھی کیا ہوگا؟ میرے اپنے تو میرے پاس نہیں آسکتے۔ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے' لیکن نہ تو سچی خوشی خریدی جاسکتی ہے اور نہ ہی خالص محبت۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنی ساری دولت' ساری نیک نامی وار کر ان خواب سی آنکھوں میں سارے جہاں کی خوشیاں اور اپنے لیے ڈھیر ساری محبت بھر دیتا۔ مگر نہیں ان آنکھوں میں میرے لیے صرف نفرت تھی۔ بے انتہا



نفرت۔۔۔ پتا نہیں اسے میری کم صورتی سے نفرت تھی یا پھر میرے نامکمل وجود سے۔۔۔؟ میں نے اپنی ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھا' وہ میری ہتھیلی کی لکیروں کا عکس تو تھی' مگر مقدر نہ تھی۔۔۔ "کاش وہ میرا مقدر ہوتی۔"

اچانک وہ سبز آنکھیں میرے خیالوں میں مخل ہوئیں۔ پتا نہیں ان آنکھوں میں ایسا کیا تھا جو مجھے اپنی جانب کھینچتا۔ کچھ کہتی ہوئی' کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہوئی پاگل آنکھیں۔ ان آنکھوں میں میرے لیے نفرت نہیں تھی۔ نہ ہی ہمدردی اور ترحم تھا۔ شاید۔۔۔۔ شاید میرے لیے پسندیدگی تھی۔ اور میں اپنے ہی خیال پہ ہنس دیا۔ یہ پسندیدگی بھی ہمدردی کی ہی صورت ہوگی۔

میں یونہی سڑک پہ ٹھوکریں مارتا جارہا تھا۔ گھرے ہوتے بادل دیکھ کر میں واپس ہولیا۔ جو برسنے کو تیار تھے۔ کھڑکی سے باہر رات بھیگ رہی تھی اور کھڑکی کے اندر میرا من۔

☼ ☼ ☼

آسٹریلیا میں ٹی ٹوئنٹی کرکٹ میچز ہو رہے تھے۔ سعد خود تو کرکٹ کا دیوانہ تھا ہی' ساتھ میں مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ ناچار ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اگرچہ آفس میں کام بہت تھا۔ لیکن سعد کے آگے میری ایک نہیں چلتی تھی۔ ایک لاکھ افراد کی گنجائش کے حامل اس اسٹیڈیم کو آسٹریلیا کا قدیم ترین اسٹیڈیم ہونے کے علاوہ تاریخی وسماجی حیثیت کے باعث آسٹریلیا میں کھیلوں کا ۔۔۔ "مرکز" بھی قرار دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں کھیلوں کے شائقین آسٹریلیا آمد پہ "میلبورن" کرکٹ گراؤنڈ کی سیر کرنا نہیں بھولتے۔

میں حیرت سے اس شاہکار کو دیکھ رہا تھا۔ "ایم سی جی" کو پاکستانی کرکٹ تاریخ میں بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان نے اپنا آئی۔ آئی سی سی ورلڈ کپ اسی گراؤنڈ پر جیتا تھا۔ اس وقت اسٹیڈیم میں 87 ہزار سے زائد شائقین موجود تھے جو کہ "ایم سی جی" گراؤنڈ میں سب سے زیادہ شائقین کی آمد کے چند ریکارڈ میں شامل ایک ریکارڈ ہے۔

میچ شروع ہوچکا تھا اور خلاف معمول سعد خاموشی سے پاپ کارن کھا رہا تھا۔ ورنہ تو اس کی زبان ایک لمحے کو بھی خاموش ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔

گیمز میں دلچسپی ہونے کے باوجود میں میچز بہت کم دیکھتا تھا۔ میچز نہ دیکھنے کی وجہ وقت کی کمی اور شاید اہم وجہ میرے اندر کا احساس کمتری تھا' جسے میں نے بڑی مشکل سے تھپک تھپک کے سلایا تھا' مگر اس وقت وہ ابھر کر سامنے آجاتا اور اپنے نامکمل ہونے کا احساس اور بھی گہرا ہوجاتا۔ مگر سعد کی ضد کے آگے ہار ماننی پڑی۔ میں پہلی بار کسی میچ کو یوں اسٹیڈیم میں بیٹھ کے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ کرکٹ کا مجھے جنون کی حد تک شوق تھا۔

مجھے تو خواب بھی کرکٹ کے ہی آتے تھے۔ کبھی میں خود کو لندن میں "اوول اور لارڈز" کرکٹ گراؤنڈ تو کبھی "سپر اسپورٹس پارک سینچورین" تو کبھی مانچسٹر کے "اولڈ ٹریفورڈ" میں خود کو بیٹنگ کرتے دیکھتا تو کبھی افریقہ میں "سہارا اوول سینٹ جارج" میں خود کو بالنگ کرواتے دیکھتا۔ کبھی مخالف ٹیم کے مقابلے میں چار رنز کی ضرورت ہوتی اور بال صرف ایک ہوتی اور میں شاندار چوکا لگا کر ٹیم کو جتوا دیتا تو کبھی آخری بال پہ زبردست چھکا لگا کے کامیابی حاصل کرتا اور مزے کی بات میچ کا اختتام ہمیشہ میرے ہاتھوں چوکے یا چھکے پہ ہی ہوتا۔ اور ناقابل یقین حد تک ہر میچ میں فتح میرا مقدر ہوتی۔ مگر یہ تو خوابوں کی باتیں ہیں۔ خوابوں میں تو ہر ناممکن بات ممکن ہوتی ہے۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ "خواب ہماری ناآسودہ خواہشیں ہوتی ہیں۔"

میں نے اپنے لیے اور خود سے وابستہ لوگوں کے لیے جو خواب دیکھے تھے' وہ تعبیر بن کر میرے سامنے آ ٹھہرے۔ ڈھیر ساری دولت' شہرت' عزت اور ہر طرح کی آسائشیں۔ مگر نہیں تھے تو۔۔۔ میرے اپنے ہی

میرے پاس نہیں تھے۔ آج اگر اماں' ابا ہوتے تو کتنا خوش ہوتے مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر... وہ مجھے مزید ترقی' عمر درازی اور خوشیوں کی دعائیں دیتے... اور اب... اب تو میرے لیے کوئی دعا کرنے والا بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں میں کس کی دعاؤں سے یہاں تک پہنچا تھا۔ پتا نہیں کون مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھے ہوئے تھا۔ میں نے تو خود کبھی اپنے لیے دعا نہیں مانگی تھی۔ کیا خبر وہ میرے لیے دعائیں مانگتی ہو... یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ میرا انتظار کرتی ہو۔ میں اپنی آنکھوں میں نئے خواب سجا رہا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ ہر خواب پورا نہیں ہوتا' اپنے ہی خیالوں میں مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ میچ کب ختم ہوا۔ حسب معمول پاکستان فائنل ہار چکا تھا اور ہم منہ لٹکائے واپس اپنے ہوٹل آگئے۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن ہم ہوٹل راماداان میں تھے۔ ہم مزید دو دن آسٹریلیا میں رک گئے تھے۔ سارا دن ہم نے ہاربر برج' ڈارلنگ ہاربر' سڈنی کرکٹ کلب اور سینٹ میری کیتھی ڈرل کی خاک چھاننے میں گزارا... اور اب رات کے نو بجے... "راماداان" کے کمرے میں آتے ہی سعد تو تھک ہار کے سو گیا۔ مگر میں کچھ دیر آرام

کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔ دراصل میں کیتھی ڈرل میری سینٹ کی پراسرار پتھریلی عمارت کو تنہائی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد بائیں جانب ڈارلنگ ہاربر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ ہے۔ میں نے یوں ہی فٹ پاتھ پہ پیدل چلنا شروع کر دیا اور چلتا ہی چلا گیا۔

"سنڈے نائٹ" تھی۔ اسی لیے خوشبوؤں سے اٹی ہوئی اور رنگوں سے سجی ہوئی تھی۔ صاف وشفاف چمکتی دمکتی سڑکوں پہ نوجوان اور نوخیز جوڑوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ کچھ شوقین مزاج بوڑھے بھی اس یخ بستہ اور رنگین رات سے لطف اندوز ہونے کے لیے گھروں سے نکل آئے تھے۔ چمکتے دمکتے حسین چہرے... آنکھیں خوشی سے چھلک رہی تھیں۔ اک اک ادا میں سرمستی' شوخی بسی ہوئی۔

سینٹ میری کیتھیڈرل اور بوٹینیکل گارڈنز کہیں پیچھے ہی رہ گئے تھے۔ اور میں اپنے ہی خیالوں میں اتنا راستہ پیدل طے کر چکا تھا۔ ٹیکسی کا ملنا اس وقت محال تھا اور بس سروس بھی رات کے اس پہر بند ہو چکی تھی۔ بادل نخواستہ واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ کچھ آگے جا کے ٹیکسی مل گئی۔

غور سے دیکھنے پر ڈرائیور ذرا معقول آدمی لگا۔ دیکھنے میں تو ایشیائی لگتا تھا۔ کچھ دیر وہ بیک مرر سے مجھے گھورتا رہا۔

"آپ ایشیائی لگتے ہیں؟" آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا۔

"جی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کہاں سے ہیں؟"

"پاکستان سے۔" میرے جواب سے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی لہر ابھری۔

"آپ انس علی خان ہیں نا!" وہ آنکھوں میں یقین لیے پوچھ رہا تھا اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔

کیا یہ کوئی جن زادہ ہے؟ یا دلوں کی باتیں جاننے والا میرے دل میں ایک لمحے کو خوف کی لہر اٹھی۔

"آپ وہی انس علی خان ہیں نا! جنہوں نے "دیار غیر" ناول لکھا تھا؟" اوہ تو یہ معمہ اب حل ہوا۔

"جی میں وہی انس علی خان ہوں۔" مجھے حیرت ہوئی کہ میں اتنا مشہور رائٹر تو نہ تھا کہ ہر راہ چلتا مجھے پہچان لیتا۔ میں کبھی کبھار ہی لکھتا تھا۔ میں نے لکھنے کو پیشہ نہیں بنایا تھا۔ بس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے لکھتا تھا۔ یہ واحد کام تھا جو میں اپنی خوشی اور دلی آمادگی کے ساتھ کرتا تھا۔ میرا صرف ایک ناول اور ایک افسانوں کا مجموعہ آیا تھا یا پھر ایک انٹرنیشنل میگزین میں آرٹیکلز لکھا تھا۔

"میں نے آپ کا ناول پڑھا ہے۔ میرے جیسے

ہزاروں نوجوانوں کی کہانی ہے یہ۔۔۔ جو میری ہی طرح اپنے ملک کو، اپنے لوگوں کو چھوڑ کے دور دیس میں روزی کے چکروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

''آپ کے ناول کے کردار ''سلینہ'' کی طرح میری ''سلینہ'' بھی میرا انتظار کرتے کرتے پیا دیس سدھار گئی اور میں۔۔۔'' اس نوجوان کی گہری سیاہ آنکھیں نم ہو گئیں۔

''وہ یہی سمجھتی رہی کہ میں شاید بہانے کر رہا ہوں واپس نہ لوٹنے کے مگر وہ پگلی کیا جانے، یہاں سے رہائی آسانی سے نہیں ملتی۔۔۔ اور میری ماں۔۔۔ میری ماں ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کے چلی گئی۔۔۔ اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔''

''دیکھو جوان!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''جو تم کر سکتے تھے اپنوں کے لیے وہ تم نے کیا، باقی اللہ کو دائمی جدائی منظور تھی تمہارے اپنوں سے تو کیا کیا جا سکتا تھا؟ اگر تم پاکستان میں ہوتے خالی ہاتھ، بے روزگار تب بھی تمہاری ماں کو بچھڑنا ہی تھا تب تمہیں زیادہ پچھتاوا ہوتا کہ تم ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ تم خالی ہاتھ ہوتے تو کیا تب بھی ''سلینہ'' تمہاری ہو جاتی؟''

''نہیں۔۔۔ نہیں وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ مرتے دم تک میرا انتظار کرتی، مگر زمانے کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔'' وہ اک دم تڑپ سا گیا۔ محبت کرنے والے یوں ہی خوش گمان ہوا کرتے ہیں۔

راما وان آ چکا تھا میں نے میٹر دیکھ کر کرایہ دیا۔ اگلے روز نو بجے ہماری واپسی کی فلائٹ تھی۔

✲ ✲ ✲

پھر سے وہی روٹین۔۔۔ آفس ورک۔۔۔ گھر اور تنہائی۔ میں نے اپنا کیا ہوا کام (محفوظ) کیا اور لیپ ٹاپ آف کر دیا۔ جانے کیوں میں آج کچھ بے چین سا تھا۔ کام کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے گلاس وال سے باہر دیکھا تو برف پڑ رہی تھی۔ اوسلو کے باشندے شدید برف باری سے بے نیاز اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ یہاں کے لوگ دیگر برفانی علاقوں کے باشندوں کی طرح سرخ و سفید اور اونچے لمبے ہوتے ہیں۔ ان کی ـــــ آنکھوں میں سمندر کی نیلاہٹ ہے۔ جبکہ بالوں کا رنگ اخروٹی، براؤن اور سفید ہوتا ہے۔

میری آنکھوں میں چھم سے وہ سبز کانچ سے کٹارا نین اتر آئے۔

اور میں نیلے لوہے کے گیٹ والے کچے پکے آنگن میں پہنچ گیا، جس کا آدھا اگلا حصہ پختہ تھا، جبکہ پچھلا حصہ قدرے نیچا اور کچا تھا۔ اس کچے حصے میں لگا ''نیم'' کا درخت اور درخت کی ایک ہولی اور مضبوط شاخ میں پڑا جھولا اور جھولے پر بیٹھی وہ جھیل سی سبز آنکھوں والی ننھی سی پری کچھ فاصلے پر ہانڈی چولہے پر چڑھائے ساگ پکاتی پھپھو۔۔۔ اور اک طرف ساگ کے تڑکے کے لیے پیاز کاٹتی بھابھی جان۔۔۔ مجھے وہ آنگن، اس میں بسنے والے لوگ، وہاں گزرے سب ہی اچھے، برے مناظر بے طرح یاد آئے۔

✲ ✲ ✲

وہ جون کی کوئی تپتی دوپہر تھی جب میں چچا کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ چچا کے گھر میں میرے جیسے لنگڑے اور یتیم کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چچا تو مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر کیا کرتے؟ چچی سے بہت ڈرتے بھی تو تھے اور ان ہی کے روز، روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کے مجھے یہاں چھوڑنے آئے تھے۔ پھپھو نے گلے لگا کے مجھے ڈھیر سا پیار کیا۔ اپنے بھائی کو یاد کر کے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا فیروزی شلوار قمیص میں اپنے اخروٹی بالوں کو بمشکل پونی میں قید کیے وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر چچا کو دیکھتے پر آنکھوں میں شناسائی کی لہر ابھری۔

''ماموں ابا۔۔۔'' پُرجوش انداز میں بھاگتی ہوئی چچا کی گود میں زبردستی گھس گئی۔

"میری دمی کیسی ہے؟"
"ٹھیک ہوں۔ ماموں ابا! میرے لیے کیریاں لائے ہیں؟"
"ہاں ہاں لایا ہوں۔ میں اپنی دمی رانی کی فرمائش کیسے بھول سکتا ہوں۔"
"کہاں ہیں کیریاں؟" اس کی سبز آنکھیں چمک اٹھیں۔
"عمنا..." پھوپھو کے تنبیہی لہجے پر وہ جھجک گئی۔ "چاچو کو سلام کرو۔"
"چاچو... کون چاچو...؟" اس کی آنکھوں میں چاچو کے نام پہ جگنو سے چمک اٹھے۔
"یہ...؟" اس نے تفصیل سے میرا جائزہ لیا تو اسے خاصی مایوسی ہوئی۔ شاید میرا ہینڈ حلیہ اس کے مروجہ چاچو کے حلیے پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔
"دادو' یہ سچ مچ میں چاچو ہے؟" اس نے گویا تصدیق چاہی۔
"ہاں تو اور کیا... نقلی چاچو ہے؟" پھپھو اور چچا ہنسے۔
"لو اتا سا (اتنا سا) لڑکا اور چاچو؟" وہ گلابی ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے کھی کھی کرنے لگی۔ اور پھر رک کر بولی۔
"چاچو کوئی ایسے ہوتے ہیں؟"
"تو اور کیسے ہوتے ہیں؟"
"چاچو تو بابا جیسے بڑے بڑے ہوتے ہیں جیسے... جیسے سامنے والوں کے چاچو نان (ریحان) ہیں۔" اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کے بہت سوچ سمجھ کے جواب دیا۔ اور اس کی باتیں سن کے سب ہنس دیے۔
"پہلے چاچو چھوٹے ہوتے ہیں' پھر بعد میں بڑے ہوتے ہیں جیسے ابھی تم چھوٹی ہو' پھر بڑی ہو جاؤ گی۔" پھپھو نے اسے سمجھایا۔
"آ... اچھا۔ پھر میں مما کو بتا کر آتی ہوں کہ ہمارے گھر چھوٹا سا چاچو آیا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر وہاں سے بھاگ گئی۔
"بہت شرارتی ہے میری پوتی' اکلوتے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس لیے بھی بہت ضدی ہو گئی ہے' جانتی ہے نا کہ ہر فرمائش پوری ہو گی۔ اریج اور احد بھی اسی کی عمر کے ہو کے اس دنیا سے گئے تھے۔ اب اس کی بہت فکر رہتی ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے ویسے ویسے ہماری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔" پھپھو افسردہ ہوئیں۔
"بس آپ پریشان نہ ہوا کریں' اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ اسے ضرور صحت مند زندگی دے گا ان شاء اللہ۔"
"ان شاء اللہ..." پھپھو نے بھی دل کی گہرائیوں سے دہرایا۔
کھانا کھا کے شام کی چائے پی گئی' پھر چچا جانے کے لیے پر تولنے لگے۔ جاتے سے چچا نے میرے ہاتھ پہ سو روپے کا نوٹ رکھا اور گلے لگا کے رو دیے۔ میں بھی افسردہ ہو گیا۔

✲ ✲ ✲

میرے یہاں آنے پہ سوائے اظہر بھائی اور پھپھو کے کوئی خوش نہ تھا۔ خصوصاً پھوپھا جان کا پارہ تو مجھے دیکھتے ہی آسمان کو چھونے لگتا۔
جانے انہیں مجھ سے اتنی نفرت کیوں تھی۔ شاید میں تھا ہی اس قابل کہ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ لوگوں کی نفرتیں برداشت کروں۔ پھر بھی پھپھو میرے لیے مضبوط سہارا تھیں۔ وہ مجھے اپنے مہربان وجود کی پناہ میں لے لیتیں' یوں جیسے سڑک کنارے کھڑا بوڑھا برگد کا درخت کسی تھکے ماندے مسافر کو اپنے سائے میں پناہ دیتا ہے۔
لیکن بہت سی باتیں' بہت سے دکھ میں پھپھو سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ جس کمرے میں' میں سوتا تھا اس کی کھڑکی پچھواڑے قبرستان میں کھلتی۔ میں کیسے کہتا کہ اس کھڑکی سے مجھے کس قدر خوف محسوس ہوتا ہے۔ سفید کپڑوں میں سائے سے چلتے' پھرتے دکھائی دیتے اور میں سہم سہم جاتا۔

میں کیسے کہتا کہ۔۔۔ کمرے کی بوسیدہ دیواروں کے جگہ جگہ سے اکھڑے رنگ و روغن میں مختلف ڈوبتی ابھرتی شبیہیں مجھے کس قدر ڈراتی ہیں؟ اور خوف میری روح میں سرایت کر جاتا ہے۔ گرمیاں تو جیسے تیسے گزر گئیں۔ بوسیدہ سا پنکھا گھرر گھرر کرتا ہوا دماغ میں ہتھوڑے برساتا، لیکن اوپری منزل پر ہونے کی وجہ سے کھڑکی میں سے ہوا کا گزر رہتا تھا تو میں پنکھا بند کر دیتا۔ کم از کم شور سے تو نجات ملتی۔

لیکن سردیاں۔۔۔ شکستہ کھڑکی کے ٹوٹے پٹ سے آتی ٹھنڈی یخ ہوا ہڈیوں میں اتر کر گودا تک جما دیتی۔ ایسے میں پتلا سا لحاف ریت کی دیوار ثابت ہوتا اور پھر یہ خوف کہ کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے۔۔۔ پورا وجود سر سمیت لحاف میں گھس جانے پہ مجبور کرتا۔

اور میں روز رات کو سونے سے پہلے سوچتا کہ پھپھو سے کہوں گا کہ مجھے اس بوسیدہ سے پرانے اور آسیب زدہ کمرے میں ڈر لگتا ہے۔ مجھے وہاں بھوت نظر آتے ہیں۔ لیکن پھوپھا کا ردعمل سوچ کر ہمت نہ کر پاتا۔ پہلے دن سے ہی پھوپھا نے مجھے اس کمرے میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ پھوپھو نے بہت واویلا مچایا کہ بچہ اس کاٹھ کباڑ والے کمرے میں رہے گا۔ جہاں چوہے' چھپکلیاں اور الابلا ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں' مگر پھوپھا کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

"تم پریشان نہ ہونا' اک دو دن جیسے تیسے اس کمرے میں گزار لو۔ جب تمہارے پھوپھا کا غصہ ٹھنڈا ہو گا تو میں تمہیں اپنے کمرے میں سلا لیا کروں گی۔" پھوپھو نے میرے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

لیکن پھوپھا کا غصہ کبھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے وہ گرم توے پہ جا بیٹھتے اور پھپھو مجھے ان کے عتاب سے بچانے کے لیے ادھر ادھر چھپا دیتیں۔

✡ ✡ ✡

مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔ یہ بات پھوپھا اچھی طرح جانتے تھے۔ جب ہی تو ان کا حقہ گرم کرنے کی اور چھت سے لکڑیاں لانے کی ذمہ داری میری تھی۔

"چل اوئے! اوپر سے بالن لا اور میرا حقہ تازہ کر (گرم کر) آیا بڑا پڑھاکو۔ کتابیں پڑھتا ہے۔ ہونہہ۔۔۔ اسکول میں کیا پڑھ کے آتا ہے؟ جو گھر میں بھی کتابیں لے کر ڈرامے کرتا ہے۔ جتنا مرضی پڑھ لے کاکے۔۔۔ رہے گا تو لنگڑا لولا ہی۔ تو نے کون سا بی اے پاس کر کے افسر لگ جانا ہے۔" ان کا غصہ کم ہونے میں ہی نہ آتا۔

"ائے ہائے۔۔۔ کیوں بچے کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ کر دیتا ہے تمہارا حقہ بھی گرم' اتنی باتیں سنانے کی کیا لوڑ ہے؟" پھپھو فوراً" میری مدد کو پہنچتیں۔

"تو چپ رہا کر۔ تیری وجہ سے میں اسے برداشت کرتا ہوں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا؟" پھپھو شیرنی ہی تو بن جاتیں۔ اور میں شرمندہ سا ہو جاتا۔

"ورنہ میرا منہ مت کھلوا۔۔۔ یہ بھی ان ہی لوگوں کا خون ہے۔ جو بہنوں کے حصے کی زمینیں ہڑپ کر جاتے ہیں۔" پھوپھا نے کاری چوٹ کی اور پھپھو تو تڑپ ہی اٹھیں۔

"ارے میں جانتی ہوں تمہارے دل کا بغض' یہی ہوس تمہیں مارے ڈالتی ہے۔ اسی بات کا دکھ نکالتے تم بچے سے۔۔۔ ارے میرے گھر میں کس چیز کی کمی ہے؟ کیا قیامت آ گئی جو میں نے اپنے حصے کی زمین اپنے غریب بھائیوں کو دے دی۔ اس اک کلے (ایک ایکڑ) زمین سے تو یہاں محل کھڑے ہو جانے تھے' جس کے لالچ میں مرے جا رہے ہو۔" میں زمین میں گڑ جاتا کہ اس سارے جھگڑے کی بنیاد میں ہوں۔

وہ تو اظہر بھائی کے آنے پہ ہی یہ قصہ ختم ہوتا۔ اظہر بھائی کے دروازہ پار کرتے ہی پھوپھا کا لہجہ یک دم بدل جاتا۔

"ارے بھلیے لوکے۔۔۔ میں تو یوں ہی بات کر رہا تھا' وہ تو جیسے تیری مرضی۔۔۔ خواہ مخواہ میں غصے میں آ جاتی ہے تو بھی۔" شاید بڑھاپا یوں ہی جوانی کے سامنے ماند پڑ

جاتا ہے۔ بات ادھر ادھر ہو جاتی۔

وہ تو اظہر بھائی خود مجھے اسکول داخل کروا کے آئے تھے ورنہ پھوپھا تو کبھی مجھے اسکول جانے ہی نہ دیتے۔ جتنی دیر اظہر بھائی گھر پہ ہوتے، مجھے پڑھنے کا موقع مل جاتا' ورنہ تو پھوپھا مجھے کسی نہ کسی کام سے دوڑائے ہی رکھتے۔ وہ میرا خیال تو رکھتے تھے مگر ان کے انداز میں لاتعلقی اور بے نیازی تھی' میں کبھی بے تکلف ہو کے ان سے بات نہیں کر پایا۔ شاید ان کا مزاج ہی ایسا تھا۔

رہیں بھابھی تو ان کا انداز میرے لیے نیوٹرل تھا۔ مجھے دیکھ کے کبھی ان کے ماتھے پر تیوری چڑھی اور نہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ آئی۔

عینا۔۔۔ عجیب موڈی لڑکی تھی۔ پل میں تولہ' پل میں ماشہ۔ جی میں آتا تو گھنٹوں میرے ساتھ کھیلتی رہتی اور جو میں تھک جاتا تو رو رو کے آسمان سر پہ اٹھا لیتی اور پھوپھا جن کی وہ بے حد لاڈلی تھی "جن" کی طرح حاضر ہو جاتے اور آتے ہی مجھے دو چار ہاتھ جڑ دیتے اور مجھے مجبوراً اس کے ساتھ گھنٹوں کھیلنا پڑتا۔ کبھی چھپن چھپائی' کبھی لڈو۔

اور جو موڈ نہ ہوتا تو پاس سے گزرنے پر بھی پھوپھا سے ٹھکائی یقینی ہو جاتی اور جو کبھی جی میں آتا تو کہانیوں پہ کہانیاں سنانے کی فرمائش جاری رہتی' میں ایک کے بعد ایک کہانی سناتا جاتا' مگر اس کا جی بھرنے میں ہی نہیں آتا۔

✡ ✡ ✡

یوں روتے ہنستے بہت سے مہینے گزر گئے۔ میں خوب دل لگا کر پڑھتا۔ میں اظہر بھائی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر کلاس میں فرسٹ پوزیشن میری ہی ہوتی۔ سو اس بار تو بورڈ میں ٹاپ کرنے پر اظہر بھائی نے مجھے اسپیشل بچوں والی سائیکل دلا دی تھی۔ جس سے مجھے

بہت آسانی ہو گئی تھی۔ ایک روز اسکول سے واپس گھر آیا تو سناٹے کا راج تھا۔ صرف "کنیزاں بی" تھیں گھر "کنیزاں بی" کہنے کو تو ایک ملازمہ تھیں' مگر گھر کے آگ فرد کی حیثیت رکھتی تھیں۔

"کنیزاں بی" سب لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"ارے تمہیں نہیں پتا کیا؟ لو میں تو بھول ہی گئی۔ تمہیں کیسے پتا ہو گا؟ تم تو ابھی اسکول سے آئے ہو۔" انہوں نے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

میرے دل میں تجسس جاگا۔ "بتا بھی دیں اب مجھے کیا نہیں پتا؟"

"عینا کی چھوٹی بہن آئی ہے۔ سب لوگ اسپتال اسے لینے گئے ہیں۔" وہ بہت خوش تھیں۔

"کیا۔۔۔ سچ؟" میں بھی خوش ہو گیا۔ شام تک کڑے انتظار کے بعد پھوپھو' عینا اور پھوپھا آ گئے' لیکن بھابھی اور بھائی ابھی اسپتال میں ہی تھے۔

"اونچھ۔۔۔ انچھ تمہیں پتا ہے؟ ہمارے گھر اک ننھی سی فیری آئی ہے۔ پرستان سے پریاں آئی تھیں اور اسے ہمارے پاس چھوڑ گئیں۔" وہ آتے ہی شروع ہو گئی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ پریاں آئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"بابا بتا رہے تھے۔ میں نے بابا سے کہا کہ مجھ سے کیوں نہیں ملیں پریاں؟ بابا نے مجھے بتایا ہی نہیں' میں نے انہیں دیکھنا تھا؟" وہ اداس ہو گئی اور مجھے ہنسی آ گئی۔

"انچھ! کیا پریاں مجھے بھی یوں ہی مما' بابا کے پاس چھوڑ گئی تھیں؟ پھر وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟ کیا میں انہیں یاد نہیں آتی؟" اس کا سوال مجھے مشکل میں ڈال گیا۔

"مجھے کیا پتا' تب کون سا میں یہاں تھا۔" میں نے سوچ کے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔۔۔ فیری ہے کیسی؟" میں نے اس کی اداسی دور کرنے کی خاطر پوچھا۔

"بہت پیاری۔۔۔ بالکل میرے جیسی۔" وہ جوش سے بولی اور میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"ہنسے کیوں؟" فوراً سوال حاضر۔

"ویسے ہی۔"
"اچھا۔ چلو ہم آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔" فرمائش کی گئی۔
"پھوپھو کو پتا چل گیا تو ڈانٹ پڑے گی۔" میں نے ٹالنا چاہا۔
"نہیں پتا چلے گا جب ہی ڈانٹیں گی نا! ہم چپکے سے نکل جائیں گے۔ بابا سے پیسے لے لیے تھے میں نے۔" وہ جو کرنے کی ٹھان لیتی' وہ پورا کر کے چھوڑتی' انکار کرتا تو کچھ خبر نہ تھی کہ کیا قیامت آتی سو ساتھ و یسے ہی ہو لیا۔
آج تو وہ بہت خوش تھی۔ جب ہی تو اپنے لیے آئس کریم لیتے ہوئے ایک کپ میرے لیے بھی لے لیا تھا۔ ورنہ ایسی فیاضی کی توقع نہیں تھی اس سے۔ وہ لینے والوں میں سے تھی۔ دینے والوں میں سے نہیں اسٹور کے باہر پڑے بینچ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔
"ایک بات کہوں؟" اس کا خوش گوار موڈ دیکھ کر میں نے کہا۔
"ہاں کہو" اس کے انداز میں شان بے نیازی تھی۔
"تم مجھے "ونچھ" نہ کہا کرو۔"
"تو اور کیا کہوں؟"
"ونس کہا کرو۔ تمہاری وجہ سے محلے کے سارے بچے مجھے انچھ۔ مگر مچھ کہہ کر چھیڑتے ہیں۔"
"اوہو گندی بات ہے نا؟ کسی کا الٹا نام لینا۔ اگر دوبارہ کسی نے کہا تو مجھے بتانا۔"

٭ ٭ ٭

ننھی پری گھر آگئی تھی' وہ واقعی پری تھی۔ سبز جھیل سی آنکھیں اس پر لانبی پلکیں' گلابی ہونٹ' دودھ کی سی سفید رنگت' بالکل روئی کی گڑیا معلوم ہوتی' سارا دن سوتی رہتی یا پھر روتی رہتی۔ نام کے مسئلے نے سر اٹھایا تو ہر کسی کی الگ رائے تھی۔
"بھئی میں نے تو گڑیا کا نام سوچ لیا ہے۔ کوئی جو بھی کہے میں یہی نام رکھوں گی۔" پھوپھو نے اعلان کیا۔

"تم تو رہنے ہی دو۔ رکھ دو گی اپنے دور کی کسی فلمی ہیروئن یا پھر کسی مصنفہ کا نام۔" پھوپھا کیونکر چپ رہتے۔
عینا کا نام بھی پھوپھو نے رکھا تھا۔ پھوپھو "قرۃ العین حیدر" سے بہت متاثر تھیں' سو اٹھا کے رکھ دیا اپنی پوتی کا نام۔
"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی جو بھی کہے میں تو "نور الھدیٰ" رکھوں گی گڑیا کا نام۔"
"اف دادو۔ اتنا مشکل نام مجھ سے تو کہا ہی نہیں جائے گا۔"
"آجائے گا کہنا بھی۔ پہلے پہل مشکل ہوتی ہے' پھر ٹھیک ہو جائے گا۔"
"میں تو بس اسے فیری ہی کہوں گی۔" یہ عینا کا فیصلہ تھا۔ پھر گھر میں سب "عینا" کی دیکھا دیکھی گڑیا کو فیری ہی پکارنے لگے۔
عینا پہلے پہل فیری کے آنے سے بہت خوش تھی' مگر پھر آہستہ آہستہ اس سے ۔۔۔۔ جلنے لگی' کیونکہ عینا کو محبتوں میں اس کی شراکت ہرگز گوارا نہ ہوئی۔

٭ ٭ ٭

وقت کے ساتھ ساتھ عینا کی مجھ سے نفرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ شروع میں تو' میں اسے موڈی سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔ مگر وہ مجھے اذیت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ نہ صرف مجھے' بلکہ فیری کو بھی چھپ چھپا کے دو لگا ہی دیتی۔ اس کا غصہ فیری پہ نکلتا یا پھر مجھ پہ۔ صرف وہ ہی نہیں بلکہ مجھ سے نفرت کرنے والے دو اور کرداروں میں بھی اضافہ ہو چکا تھا اور وہ تھے پھوپھا کے والد فیاض خان اور ان کا بیٹا اودفیاض۔
فیاض خان اپنی فیملی کے ساتھ فرانس میں مقیم تھے۔ چھٹیوں میں ان کا پاکستان کا چکر ضرور لگتا۔ اب کے عینا اپنی اکلوتی پھوپھو سارہ آپی کے آنے پہ بہت خوش تھی۔ چونکہ وہ خوش تھی اس لیے میں بھی خوش

تھا۔ میں آپی سارہ اور ان کی فیملی سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ سارہ آپی بالکل پھوپھو جیسی تھیں۔ نرم و شفیق۔ اور ان کے شوہر فیاض خان بالکل پھوپھا جیسے تھے' کرخت مزاج اور ان کا اکلوتا بیٹا داؤد بھی اپنے باپ اور نانا پہ تھا۔

فیاض خان باقی سب کے ساتھ تو بہت نرمی سے پیش آتے مگر مجھے دیکھتے ہی ان کے ماتھے کی تیوری چڑھ جاتی۔ میں ان کے سامنے سہما سہما رہتا اور داؤد.... داؤد کی عہنا سے گاڑھی چھنتی۔ دونوں ہم مزاج جو تھے۔ دونوں ہی بہت ذہین تھے۔ تب ہی مجھے تنگ کرنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتے۔

☆ ☆ ☆

"اے لنگڑے! کیا کر رہے ہو؟" میں پچھلے صحن میں نیم کے درخت کے نیچے بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ جب وہ دونوں دبے قدموں وہاں پہنچے۔

"پڑھ رہا ہوں۔" میں نے بے چارگی سے جواب دیا۔ میں جانتا تھا کہ اب میری کم بختی آجائے گی۔

"شش۔ آہستہ بولو۔ پتا نہیں ہے کہ دوپہر کا وقت ہے' سب سو رہے ہیں۔" عہنا ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔

"اسے کون سی عقل ہے کہ کب کیسے بات کرنا ہے۔" داؤد نے مذاق اڑایا۔

"چلو ہمارے ساتھ۔ چاچے شیدے کے باغ سے کیریاں توڑ کے لاتے ہیں۔" عہنا نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"لیکن میں پڑھ رہا ہوں۔" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ تپتی دوپہر میں چاچے شیدے کے باغ تک جانے کا سن کر میں جھجک گیا تھا۔

"نہیں جاؤ گے ہمارے ساتھ تو پھر نانا کو شکایت لگا دیں گے' کیا سمجھے؟"

"ہاں۔ ہاں۔" عہنا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

مجھے مجبوراً ان کے ساتھ جانا پڑا۔ ان شیطانوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ جھوٹ موٹ کی شکایتیں لگا لگا کے مجھے ڈانٹ پڑواتے رہتے تھے۔ انہوں نے چوری چوری بغیر آواز کے سائیکل نکالی۔ خود تو دونوں سائیکل پہ سوار ہوگئے اور مجھے اس گرم دوپہر میں ان کے پیچھے پیدل جانا پڑا۔ چاچا شیدا ظہر کی نماز کے بعد آرام کرنے چلا جاتا تھا۔ اس لیے کیریاں توڑنے کے لیے یہ وقت مناسب تھا۔ میں ہانپتا کانپتا وہاں تک پہنچا۔ دونوں مزے سے چھوٹی نہر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر برس پڑے۔

"کتنی دیر سے ہم یہاں بیٹھے ہیں اور تم نواب زادوں کی طرح اتنی دیر میں یہاں پہنچے ہو۔"

"ہاں تو اور کیا۔ چاچا شیدا آجاتا تو۔؟" داؤد کی ہر بات میں ہاں ملانا عہنا کا فرض تھا۔

"چلو اب جلدی سے ہمیں کیریاں توڑ کے دو۔"

میں نے نیچی نیچی شاخوں سے دو چار کیریاں توڑ کے دیں۔

"ہوں ہوں' اک دم فضول۔ یہ بھی کوئی کیریاں ہیں۔ ذرا بڑی بڑی توڑ کے دو۔" داؤد نے وہ کیریاں پکڑ کے ٹھونک بجا کے دیکھیں اور پھر ناک بھوں چڑھا کے دور پھینک دیں۔

"وہ والی توڑ کے دو۔" عہنا کا اشارہ جس جانب تھا' وہ کیریاں میری پہنچ سے دور تھیں۔

"لیکن وہاں تک تو میرا ہاتھ ہی نہیں جائے گا۔"

"تو یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ تم یوں کرو گدھے بن جاؤ۔ میں تمہاری پیٹھ پہ چڑھ کے کیریاں توڑ لوں گا۔" داؤد کے پاس ہر مشکل کا حل تھا۔

"آہا۔ داؤد! تم خود کیوں نہیں گدھے بن جاتے؟" عہنا پرجوش ہوئی۔

"لیکن مجھے تو گدھا بننا آتا ہی نہیں۔"

"مجھے بھی گدھا بننا نہیں آتا۔" میں نے بھی فوراً جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں' میں بتا دیتا ہوں کہ گدھا کیسے بنا جاتا ہے۔" وہ مجھے گدھا بنانے پہ تلا ہوا تھا۔

"میں اپنی بیساکھی سے کیریاں توڑ دیتا ہوں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو جلدی کرو' کہیں چاچا شیدا نہ

آجائیے۔" عینا نے کہا اور میں نے شکر ادا کیا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں ایک ہاتھ سے آم کی ایک شاخ کا سہارا لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں بیساکھی پکڑے کیریاں توڑ رہا تھا۔ جب گرج دار آواز سنائی دی۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو ٹانگیں کپکپا گئیں۔
چاچا شیدا میرے سر پہ کھڑا تھا اور دونوں شیطان غائب تھے۔ چاچے شیدے نے اس وقت تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کے بھگا دیا۔ مگر شام کو پھوپھا سے میری شکایت لگ چکی تھی۔ خدا جانے کہ یہ شکایت چاچے شیدے نے لگائی تھی یا ان شیطانوں نے، لیکن پھوپھا سے مار کھا کے میرا جسم نیلو نیل ہو گیا۔ پھوپھو نے بہت مشکل سے مجھے ان کے ہاتھوں سے چھڑایا اور میں تنہائی میں اپنے زخموں پہ مرہم رکھتے ہوئے رو دیا۔

☼ ☼ ☼

داؤد کے جانے سے جہاں عینا اداس ہو گئی تھی۔ وہیں میں نے اس شیطان سے جان چھوٹ جانے پر شکر ادا کیا۔ بے شک عینا ضدی تھی، مگر اتنی شرارتی بھی نہیں تھی، جتنی وہ داؤد سے مل کر ہو گئی تھی۔ ویسے بھی میں اس کی شرارتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔ لیکن داؤد... خدا کی پناہ... شیطان کا بھائی لگتا تھا وہ۔ گھر میں سکون اور خاموشی تھی۔
دن یوں ہی گزرتے چلے گئے۔ خبر ہی نہ ہوئی کہ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ نفرتیں سہتے سہتے میں نے جوانی اور اس نے لڑکپن سے نوجوانی میں قدم رکھا تھا۔ دل اس کی کج ادائیاں سہتے سہتے جانے کب اس کا بیمار بن بیٹھا، مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ یہ دل کے معاملے بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ متاثر ہونے والے کو خبر ہی نہیں ہوتی۔
وہ بہت بدل گئی تھی اور ان دنوں وہ امور خانہ داری سیکھ رہی تھی اور اس تبدیلی کی وجہ پھوپھو جان تھیں۔ بے شک وہ سب کی لاڈلی تھی۔ مگر پھوپھو جان لاڈ ہی لاڈ میں بچوں، خصوصاً" لڑکیوں کو بگاڑنے کے حق میں نہیں تھیں۔"
اسے سلیقہ شعاری سکھانے میں بذات خود دلچسپی لیتی تھیں۔ پھوپھو کو کڈ کڑے لگائی پھوہڑ لڑکیاں سخت ناپسند تھیں۔ عینا کی کم بختی آئی ہوئی تھی۔ وہ اکثر باورچی خانے میں پسینے سے شرابور، حال سے بے حال مختلف پکوان پکاتے ہوئے ملتی۔ پھوپھو اس پہ قیامت کی نظر رکھے ہوئے تھیں۔ ایک ایک جنبش پہ ٹوکتیں اور وہ خوب جھنجلائی ہوئی رہتی اور اس کا غصہ ظاہر سی بات ہے، مجھ پر یا فیری پر نکلتا۔ لیکن اب یہ راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ پھوپھو اس کی بدتمیزیوں کا سختی سے نوٹس لے رہی تھیں۔ نتیجتاً" غریب برتن نشانہ بنتے۔ روز کچن میں کچھ نہ کچھ ٹوٹتا۔
اس دن شدید گرمی تھی۔ میں کالج سے واپس آیا تھا گھومتے ہوئے دماغ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو قہقہوں کی برسات نے استقبال کیا۔ تیز دھوپ سے کمرے میں داخل ہونے کے بعد میری آنکھیں چند لمحوں کو تو کچھ دیکھ ہی نہیں پائیں۔ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو عینا کو اپنی طرف ناگواری سے دیکھتے پایا۔ قہقہوں کو بریک لگ چکی تھی۔ یہ "عینا" کی سہیلیوں کا گروہ تھا۔ میں ان ہی قدموں واپس ہولیا۔
"یہ کون ہے؟" کسی نے پوچھا۔
"ہمارا سرونٹ ہے۔" نخوت سے جواب دیا گیا۔
"چچ چچ چچ... بے چارہ... اس کی ٹانگ کو کیا ہوا؟" سوال کیا گیا۔
"اسے پولیو ہو گیا تھا بچپن میں۔ میری دادو نے ترس کھا کے اپنے گھر رکھ لیا۔"
میرے قدم جہاں تھے، وہیں تھم گئے۔ دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ مجھ سے کھڑا نہ ہوا گیا۔ بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹا۔ میرے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ شاید اس کی محبت کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ یہ انداز... یہ نخوت و نفرت نئی تو نہ تھی، مگر جانے کیوں دل اس قدر ٹوٹ کے بکھرا تھا۔ یہ نفرتیں تو میری زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھیں۔ پھر کیوں اس قدر درد ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھوپھو کو جانے ایسا کون سا دکھ تھا کہ انہوں نے گھل گھل کے جان ہی دے دی۔ بیمار تو رہتی ہی تھیں، مگر بیماری اتنی شدید بھی نہیں تھی کہ جان ہی لے لیتی۔ مجھے لگا میں اک بار پھر یتیم ہو گیا ہوں۔ اک بار پھر سے بے سائباں ہو گیا ہوں۔ میں بلک بلک کے رو دیا۔ میں شاید پھپھو کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے رو رہا تھا۔ اپنے بے اماں ہونے پہ..... میں کتنا مفلس ہوں' میرے سارے اپنے مجھ سے اک اک کر کے چھنتے جا رہے ہیں۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا' کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی۔ پھر تقدیر میرے ساتھ اتنا برا کیوں کر رہی تھی؟

میں نے کبھی اللہ سے گلہ نہیں کیا تھا۔ نہ اپنے ادھورے پن کا۔ نہ یتیم ہونے کا۔ نہ ہی لوگوں کی اذیت دیتی نفرتوں کا۔ مگر اس بار مجھے اپنے اللہ سے گلہ ہوا۔ آخر کیوں؟ کیوں اللہ؟ ہر بار میرے ساتھ ہی کیوں؟

کیوں میرے سارے اپنے مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہیں؟ میں پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ سب رو رہے تھے ایک دوسرے کے آنسو پونچھ رہے تھے مگر میرے آنسو کسی نے نہ پونچھے۔

بہت سے دن یوں ہی اداس اور بے کیف سے گزر گئے۔ میں نے پہلے بھی بہت بار سوچا تھا کہ یہاں سے چلا جاؤں مگر ہر بار محبتیں نفرتوں پہ غالب آجاتیں' میرا دامن پکڑ لیتیں اور میرے پاؤں کی زنجیر بن جاتیں۔ یہی محبتیں میرے جسم میں لہو بن کے دوڑتی تھیں۔ یہی محبتیں میرا حوصلہ بن جاتیں۔ ان ہی کی وجہ سے میں لوگوں کے نفرت اور ذلت بھرے رویے سہ لیتا۔ اور اب جبکہ محبتیں مجھ سے روٹھ گئی تھیں تو میرے پاس یہاں رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

"ممّا! یہ کیوں ہر وقت ہمارے سروں پہ سوار رہتا ہے مجھے جتنی اس انسان سے نفرت ہے یہ اتنا ہی میرے سامنے آتا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے شوٹ کر دیتی۔" میرے خیالوں میں کسی کی آواز گونجی۔

"بس بیٹا میں تو خود تمہاری دادو اور بابا کی وجہ سے چپ تھی ورنہ کب کا اسے چلتا کر دیتی۔" چند روز قبل ماں بیٹی کی گفتگو میرے دل و دماغ میں گونجی اور میرے فیصلے میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اب تو مجھے یہاں سے چلے ہی جانا چاہیے۔

سو رات کے تیسرے پہر میں نے ضروری کتابیں اپنے کپڑے اور استعمال کی چند چیزیں سمیٹ کر بیگ میں بھریں۔ اس گھر سے میں نے جو سب سے قیمتی چیز اپنے ساتھ لی تھی' وہ پھپھو' ابا اور اماں کی چند تصویریں تھیں۔

اس گھر کے سوئے مکینوں پہ الوداعی نظر ڈالی۔ تمام یادوں کو سارے خوش گوار و ناخوش گوار لمحوں کو اسی آنگن میں چھوڑا اور خاموشی سے وہاں سے نکل آیا۔ مگر پیدل چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ چچا نے تو پھپھو سے پہلے ہی رخت سفر باندھ لیا تھا۔ ماموں اور ممانی کے دلوں میں تو بہت جگہ تھی مگر ان کے دو کمروں کے کچے مکان اور درجن بھر بچوں کے درمیان شاید میں اپنے لیے جگہ نہ بنا سکوں رہ گئے چھوٹے ماموں تو چھوٹی ممانی اپنے سسرالی رشتہ داروں سے ان کی غربت کی وجہ سے ملنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں' بجا کسی کو اپنے گھر میں مستقل جگہ دیتا۔ ویسے بھی میں اب مزید کم ظرف لوگوں کے احسانوں سے اپنے کندھوں پر بوجھ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔

بعض لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کوٹ کوٹ کر محبت بھر دیتا ہے تاکہ وہ ہر کسی میں بلا تفریق پیار بانٹیں اور شاید ایسے ہی مخلص لوگوں کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔ مجھ سے گنے چنے پیار کرنے والوں میں سر عبید اللہ بھی شامل تھے۔ مجھ سے ہی کیا؟ وہ تو بلا امتیاز اور بغیر کسی صلے کے اپنے ہر اسٹوڈنٹ سے یونہی پیار کرتے تھے۔

ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا ناروے میں سیٹلڈ لائف گزار رہا تھا اور چھوٹا بیٹا لندن میں بار ایٹ لاء کر رہا تھا۔ سر عبید اللہ اور ان کی نرم خو شفیق سی بیگم

تنہا رہتے تھے۔ ان کے گھر کے دروازے ہر وقت ہر کسی کے لیے کھلے رہتے۔ لیکن میں اس پہ انہیں تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو رات مسجد میں گزاری اور صبح پہلی سواری سے شہر کا راستہ لیا۔

وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ انہوں نے فوراً مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ ایسے ہی تھے بے غرض اور مخلص۔

میرے فائنل ایگزامز ہو چکے تھے اور اسی دوران سر عبید اللہ کی ریٹائرمنٹ بھی ہو گئی تھی۔ اور اب وہ اور ان کی بیگم اپنے بڑے بیٹے کے پاس جانے کی تیاری میں تھے۔ میں ان کے جانے کا سن کر اداس ہو گیا۔ مگر انہوں نے مجھے تسلی دی کہ وہ وہاں جا کے مجھے بھی اپنے پاس بلالیں گے۔ اور تب تک میں ان کے مکان میں ہی رہوں۔ اس طرح وہ بھی بے فکر رہیں گے۔ میں نے اس دوران جاب ڈھونڈلی تھی۔ جب میں انہیں الوداع کر رہا تھا تب تک میرا رزلٹ آچکا تھا۔ اس بار بھی پوزیشن میری ہی تھی۔ سر عبید اللہ نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔

ٹھیک تین ماہ دس دن بعد میں نے ناروے کی سر زمین پہ قدم رکھا۔

✿ ✿ ✿

میں نے حیرت سے بلند و بالا عمارتوں سے گھرے اس روشنیوں کے شہر کو دیکھا۔ اوسلو کا ساحلی شہر کہر اور دھند میں لپٹا جگمگا رہا تھا۔ سمندر میں ڈوبی روشنیاں دھند کی وجہ سے جگنو بن کر چمک رہی تھیں۔ یہاں کے باشندے سڑکیں عمارتیں نظارے سب اجنبی تھے یہاں تک کہ آسمان بھی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ میں اپنی ہی سوچوں میں جانے کب تک یونہی کھڑا رہتا کہ اچانک مجھے پیچھے سے دھکا لگا۔ اس اچانک افتاد پر میں بوکھلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا' کسی نے میرا اکلوتا بیگ جھپٹا مار کے چھینا اور اندھا دھند بھاگتا ہوا ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا یا کچھ سمجھتا ایک اور لڑکا اس اچکے کے پیچھے بھاگتا ہوا گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ بھی شاید اسی کا ساتھی تھا۔ میں ان کے پیچھے بھاگ بھی نہ سکا اور تہی داماں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

اس بیگ میں تو میرا سب کچھ تھا۔ ابا' اماں کے ساتھ میرے بچپن کی تصویریں جن میں' میں صحت مند تھا۔ اماں کا کانپتا ہوا بے فکر چہرہ' ابا کی بے ریا شفاف ہنسی۔ اس بات سے بے خبر کہ آنے والے وقت میں ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا جس کے لیے وہ دنیا کی ہر نعمت اور ہر خوشی خرید لینا چاہتے تھے' وہ اپنوں کے پیار اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے بھی ترسے گا۔

میری ڈائری جس میں' سر عبید اللہ کا کانٹیکٹ نمبر اور ایڈریس تھا' مجھے یہاں پہنچتے ہی انہیں کال کرنی تھی۔ ان ہی کے سہارے میں اس دور دیس آگیا تھا۔ جہاں کے لوگ' جہاں کے رستے' گلیاں' گھر' زمین آسمان سب کچھ اجنبی تھا۔

میرے پاس تو کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ میں تھک کر فٹ پاتھ پہ بیٹھ گیا کہ غم کی شدت سے مجھ میں کھڑے رہنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ یہ بھی شکر تھا کہ میرے کاغذات اور کرنسی میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں تھی۔ اسی وقت کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ وہی تھا جسے میں اچکے کا ساتھی سمجھا تھا۔

"لے اڑا میرے دوست؟" اس نے مایوسی سے کہا۔ "میں بہت بھاگا اس کے پیچھے مگر وہ تو جانے کہاں غائب ہو گیا۔" وہ اس اچکے کا ساتھی نہیں تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں بیساکھی دیکھ کر میری مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ خاصا باتونی تھا اور اگلے بیس منٹ میں وہ میرا سارا بائیوڈیٹا مجھ سے اگلوا چکا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں پاکستانی ہوں ——— تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پہ بضد ہو گیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد میں

اس کے ساتھ جانے پہ راضی ہوگیا۔ اور یوں اس دیس میں سر چھپانے کو ٹھکانا مل گیا' اور میں نے تشکر سے آسمان کی جانب دیکھا۔ اس رحمٰن کی رحمانیت پہ یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔ ایک راہ بند ہوئی تو اس نے سو راہیں کھول دیں میرے لیے۔

سعد کا فلیٹ "گرن لان" میں تھا۔ یہاں ہر جانب پاکستانی لوگ رہتے ہیں۔ پاکستانی لباس' پاکستانی کھانے' پاکستانی دکانیں ہیں لیے تو اس چھوٹا پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ اکثر نارویجن بھی پاکستانی اشیائے خوردونوش کی دکانوں پر خریداری کرتے نظر آتے۔ پاکستانی کھانے نارویجن قوم میں بہت مقبول تھے خصوصاً "سموسے" "پکوڑے"۔ کچھ دنوں میں سعد کے توسط سے ایک جنرل اسٹور پہ ملازمت بھی مل گئی۔ میں سعد کا بہت مشکور تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ بولا۔

"میں جانتا ہوں اس سے آگے تو کیا کہے گا' یہی نا کہ سعد! میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ میں ہمیشہ تمہاری خدمت کروں گا وغیرہ وغیرہ ہے نا۔" وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر نقل اتارنے لگا۔

"میں اس وقت تمہارے بور قسم کے ڈائیلاگ سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔" اس کے اپنائیت بھرے انداز پہ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

"ہاں اگر خدمت ہی کرنی ہے تو چلو میرے پاؤں دباؤ۔" وہ صوفے پہ پاؤں پسار کے بیٹھ گیا۔

"جی نہیں میں کیسی خدمت میں بالکل نہیں کرسکتا۔" میں نے ہری جھنڈی دکھائی۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تم میری خدمت کرو گے۔ خدمت تو خدمت ہی ہوتی ہے چاہے ایسی ہو چاہے ویسی ہو۔"

"مگر میں نے کب کہا کہ میں تمہاری خدمت کروں گا؟"

"لو جی اتنا بڑا جھوٹ اللہ جی۔۔! زمین کیوں نہ دھنس گئی۔ آسمان کیوں نہ گر پڑا اس قدر سفید جھوٹ پہ۔" وہ دہائیاں دینے لگا۔

"اللہ کا خوف کرو۔ زمین کا دھنسا کوئی عام بات ہے کیا؟ کتنی تباہیاں لاتا ہے اپنے ساتھ یہ زمین کا دھنسا کوئی خیر کے الفاظ بولو۔" میں دہل ہی تو گیا تھا اس کی بات پہ۔

"او میرے استاد جی! غلطی ہوگئی۔ معافی دے دو۔" وہ باقاعدہ کان پکڑ کر بولا۔

"اچھا' چلو جلدی سے اٹھو۔ پیٹ پوجا کرتے ہیں۔ آج میری جاب کی خوشی میں کھانا میری طرف سے۔" پہلے دن سے ہی میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود میرے کھانے کا بل بھی سعد ہی دیتا تھا۔

میں سعد کے جیسا باتونی نہیں تھا اس لیے اس کے بارے میں زیادہ نہیں جان پایا مگر میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس تنگ و تاریک فلیٹ میں کیوں رہ رہا ہے؟ وہ بھی بیشتر پاکستانیوں کی طرح یہاں روپیہ کمانے ہی آیا ہوگا اور اب اپنی فیملی کے لیے ایک ایک روپیہ سینت سینت کر رکھتا ہوگا۔ مجھے احساس تھا کہ میں اتنے دنوں سے اس پہ بوجھ بنا ہوا ہوں اور وہ بھی اس دیس میں جہاں بے حسی کی انتہا تھی۔ جہاں کوئی اپنا کسی اپنے کا بوجھ برداشت نہیں کرتا۔ جہاں ایک ایک روپیہ دانتوں سے پکڑنا پڑتا ہے۔ ہمارے تعلق میں تو پھر صرف ہم وطنی مشترک تھی۔

"ارے یار! آج تو تو نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ جی چاہتا ہے خوشی کے مارے تیرا منہ چوم لوں۔ آج تو اپنی عید ہوگئی۔ چلو آج "چاچے اچھو" کے ریستوران کا صفایا کرتے ہیں۔" وہ خوشی کے مارے قلانچیں بھرنے لگا۔ وہ ایسا ہی تھا سادہ دل بے ریا مخلص معصوم اور شرارتی۔ بقول کسی کے "پاکستانی جہاں بھی چلے جائیں اپنی چھوٹی سی دنیا بسا لیتے ہیں۔" یہاں بھی ہلتی چولوں والے میز کے گرد بوسیدہ کرسیوں پہ بیٹھ کے اپنا پاکستان یاد آ گیا۔

"قیمہ کے پراٹھے' سری پائے' شاہی حلیم' چانپیں' ہریسہ' تلے ہوئے جھینگے' مغلئی بریانی' آم اور میٹھے میں شیر خورمہ اور انناس کی پڈنگ" سعد نے

جو آرڈر دینا شروع کیا تو چپ ہونا ہی بھول گیا اور بے ساختہ میرا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا۔ جو اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حیرت بھی ہوئی کہ اس چھوٹے سے ریستوران میں یہ سارے کھانے بیک وقت مل جاتے ہیں۔

"تم آرڈر کرو۔" اس نے مینیو کارڈ میری طرف بڑھایا۔

"نہیں میں نے کچھ نہیں منگوانا۔" میری آواز بمشکل حلق سے نکلی۔

"اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میرے ساتھ کھانے میں ہاتھ بٹاؤ گے تو تم غلط سوچ رہے ہو۔ یہ سب تو میں نے اپنے لیے منگوایا ہے۔ اس میں سے تمہیں ایک نوالہ بھی نہیں ملے گا۔"

"تم بھینسے ہو گیا۔ جو سارا کھانا ہڑپ کر جاؤ گے؟ تمہارا معدہ جھیل نہیں پائے گا اتنا بوجھ۔"

"اٹس مائی اسٹامک ڈیئر! تو اپنی فکر کر۔"

بیرا ابھی تک آرڈر کا منتظر تھا۔ میں نے بند ہوتی دھڑکنوں کو پھر سے ترتیب دیا اور ایک سستی سی ڈش آرڈر کر دی۔ بیرے نے حیران ہو کے پہلے مجھے پھر سعد کو دیکھا۔ اس نے آرڈر نوٹ کیا اور چلا گیا۔

"ابھی تو میں نے اور بھی بہت کچھ منگوانا تھا مگر تمہاری مسکین صورت پہ ترس آ گیا۔" گویا اس نے زیادہ آرڈر نہ کر کے مجھ پہ احسان عظیم کیا ہو۔

میں اس لمحے کو کوس رہا تھا جب میں نے سعد کو کھانے کی آفر کی تھی۔

جیسے جیسے بیرا میز پہ پلیٹیں لا کے چنتا گیا ویسے ویسے میرا حلق خشک ہوتا گیا۔

وہ اطمینان سے کھانا کھا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں ہوٹل والے بل ادا نہ کرنے کی صورت میں میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ کیا پتا مجھ سے برتن دھلوائیں۔ مجھے تو برتن بھی دھونے نہیں آتے۔ کیا خبر مجھ سے جھاڑو لگوائیں پر میں جھاڑو کیسے دے پاؤں گا؟ اور اللہ جانے مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔

پولیس۔ مجھے اپنی حرکت قلب بند ہوتی محسوس ہوئی۔ اپنے ملک کی پولیس ہوتی تو ہو پچاس دے کے جان چھوٹ جاتی مگر سنا ہے یہاں کی پولیس بہت سخت ہے۔

"تم کھا کیوں نہیں رہے؟" اس نے میری توجہ کھانے کی جانب دلائی۔

"بس ایسے ہی۔" میں نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ بھوک ہڑتال کا ارادہ ہے کیا؟"

اب اسے کیا بتاتا کہ میری بھوک کیوں اڑ گئی ہے۔ وہ کیا سوچتا کہ میں اتنا تنگ دل ہوں لیکن کھلا دل بھی تو ان ہی کا ہوتا ہے، جن کی جیب بھی کھلی ہو۔

اس نے کندھے اچکائے اور دوبارہ کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اس نے اپنی بھوک کے مطابق کھانا کھایا اور باقی کا پیک کروا لیا۔

"میں جا رہا ہوں، مجھے کسی سے ملنا ہے۔" وہ پیک کیا ہوا کھانا ساتھ ہی لے گیا۔ اس کے جانے پہ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے میری درگت بنے۔ میں اپنی ہی سوچوں میں اسے کاؤنٹر تک جاتا دیکھ ہی نہ سکا۔ میں ذہن میں لفظوں کو ترتیب دیتے ہوئے اور اپنے اندر ہمت جمع کرتے ہوئے کاؤنٹر تک گیا۔ بل مانگا مگر... مگر یہ کیا؟ بل تو ادا ہو چکا تھا۔ اور میرا کب سے رکا ہوا سانس بحال ہو گیا۔

میرے دل میں اپنے اعلا ظرف دوست کے لیے عقیدت اور بھی بڑھ گئی جس سے بظاہر میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اور یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ میرا اعلا ظرف دوست اگلی اسٹریٹ میں رہنے والے بے گھر اور بے اماں لوگوں کے لیے روز ہی یہاں سے کھانا پیک کروا کے لے جاتا تھا۔

✲ ✲ ✲

میں پہلی بار سعد کے ساتھ اس کے گھر آیا تھا۔ چار منزلہ خوبصورت آف وائٹ "ولا" دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ کیا یہاں بھی پاکستانیوں کے اتنے خوب صورت

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ولاز ہیں؟ ولا کی چھت کے شیڈز سی پنک کلر کے تھے۔ گیٹ سے اندر دور تک ایک چوڑی روش بل کھاتی جا رہی تھی۔ جو برچ کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ روش کے گرد ننھی کیاریوں میں گلاب ڈیفوڈلز ٹیولپ اور وائٹ للی کے پھول خاص ترتیب سے لگے بہار دکھا رہے تھے۔ انتہائی خوب صورت اور وسیع و عریض لان۔۔۔ روش کا اختتام پورٹیکو میں ہوتا تھا۔ پورٹیکو کے ستون سی گرین کلر کے تھے۔ وسیع گیراج اور گیراج میں کھڑی نئے ماڈل کی شیورلیٹ' میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"واؤ۔۔۔ ارے یار! یہ تمہارا ہی گھر ہے نا؟"

"جی نہیں۔۔۔ یہ میرا نہیں میرے باپ کا گھر ہے۔"

"ایک ہی بات ہوئی تمہارا یا تمہارے باپ کا۔"

"ایک بات کیسے ہوئی؟ یہ میرے باپ کا گھر ہے نا! تو ان ہی کا ہے صرف۔ اس میں میری محنت کی کمائی کا ایک روپیہ بھی شامل نہیں۔ میرا گھر وہ ہوگا جو میں خود اپنی محنت سے بناؤں گا۔" میں اس قدر مبہوت تھا کہ ٹھیک سے سعد کی بات سن ہی نہیں پایا۔

"واؤ۔۔۔ آسم!!" یار' تم تو بے حد امیر ہو۔ پھر مفلسوں کی طرح چھوٹے سے فلیٹ میں کیوں رہتے ہو؟

"یہ دیکھنے کے لیے کہ مفلس لوگ زندگی کیسے گزارتے ہیں۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا مگر اس کے چہرے پہ مذاق کا شائبہ تک نہ تھا۔

جب ہم ٹی وی لاؤنج سے ہوتے ہوئے تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اچانک میری نظر شیشے کی طرح چمکتی دو گولیوں پر پڑی۔ پہلے تو یہ گمان ہوا کہ شاید براؤن کلر کا کوئی ڈیکوریشن پیس رکھا ہے۔ مگر جب اس ڈیکوریشن پیس میں تھوڑی سی حرکت ہوئی تب مجھے اپنی حرکت قلب بند ہوتی محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہ چمکتی گولیاں بے جان ڈیکوریشن پیس نہیں بلکہ جیتے جاگتے گدھے کے سائز کے بل ڈاگ کی آنکھیں تھیں۔ بل ڈاگ ٹی وی لاؤنج کے براؤن کلر کے قالین' براؤن پردوں اور براؤن فرنیچر کا اس طرح سے حصہ بنا ہوا تھا گویا وہ اور کمرہ لازم ملزوم ہیں۔ اس ٹی وی لاؤنج میں اس بل ڈاگ کا امیج پرسنل روم تھا گویا جب اس کلی وی لاؤنج میں آنے اور ٹی وی دیکھنے کا موڈ ہوتا تو اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

"ارے رے۔ تم نے اتنی خوف ناک چیزیں بھی رکھی ہوئی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر بندے کا دم ہی نکل جائے؟"

"ایسے شوق مجھے نہیں میرے ڈیڈی کو ہیں۔ انہیں انسانوں سے زیادہ جانوروں سے پیار ہے۔"

سعد مجھے اپنی لائبریری میں لے گیا۔ جس کا فرنیچر صندل کی لکڑی کا تھا۔

"تم جب تک یہاں سے اپنی پسند کی کتابیں چن لو تب تک میں کسی سے کلی کا کہتا ہوں۔ پھر ہم اچھا سا ڈنر کریں گے۔" وہ چلا گیا اور میں کتابیں دیکھنے لگا۔

یہاں تو کتابوں کا جہاں آباد تھا۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی۔ یہ لیو ٹالسٹائی کی "اینا کرینینا" تھی۔ ساتھ والے خانے میں لینن کی دنیا آباد تھی۔ کہیں شیکسپیئر' سڈنی شیلڈن' شیلے کیٹس براجمان تھے تو وہیں برنارڈ شا' کارل مارکس تو وہیں ٹیگور اور قاضی نذرالسلام بھی تھے۔ فارسی کے شعراء اردو ادب کے قد آور نام اور جانے کون کون تھا جنہیں میں جانتا تک نہ تھا۔ "وار اینڈ پیس" نکال کر میں نے ٹیبل پہ رکھا۔

"رابندر ناتھ ٹیگور" کے ہم عصر عظیم بنگالی شاعر قاضی نذرالاسلام کی "بوندو لہرا نما کہانی" اٹھائی تو مجھے ان کی نظم دریدو (غیرت) یاد آگئی یہی نظم میرا ان سے تعارف کا باعث بنی تھی نظم کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

اے غربت تو نے مجھے عظیم بنا دیا ہے
اے غربت تو نے بمثل مسیح مجھے وقار بخشا ہے
میرا پندار میری چشم عریاں میری زبان تجھ پہ نثار
تیری شدت نے میری دنیا کو تیغ بنا دیا ہے

اے میرے بچے' جان پدر
میں تجھے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دے سکتا
تو پھر تجھ سے پیار کرنے کا مجھے حق
غربت میری دہلیز پہ گریہ کناں ہے

میری بیوی میرے بچے کی طرح
تو اب میں چین کی بانسری کیسے بجا پاؤں گا
میں لفظوں کی دنیا میں کھو سا گیا۔ اتنے میں سعد بھی آ گیا۔ کچھ دیر بعد کافی بھی آ گئی۔ کافی پینے کے ساتھ ساتھ کتابوں پر تبصرہ بھی کیا جا رہا تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد سعد مجھے اپنے اسٹوڈیو لے گیا۔ جس کے ایک حصے میں اس کی ذاتی پینٹنگز آویزاں تھیں، ساتھ ہی تصویر کشی سے متعلق سامان، برش، کینوس، کلرز وغیرہ ترتیب سے رکھے تھے۔ دوسرے حصے میں بڑے بڑے مصوروں کی پینٹنگز آویزاں تھیں، ایک نظر میں تو مجھے ساری پینٹنگز فضول لگیں۔ میری توجہ تو صرف ایک پینٹنگ نے اپنی جانب مبذول کروائی۔
اس پینٹنگ کا سائز بہت چھوٹا تھا۔ بس یہی کوئی نو انچ کے قریب لمبی اور تقریباً آٹھ انچ چوڑی، اس میں ایک بوڑھے شخص کا چہرہ دکھایا تھا، جس کے آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اور چہرے پر درماندگی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔
سعد نے مجھے بتایا کہ اس پینٹنگ کا نام "ربی" ہے اور اس کے آرٹسٹ کا نام ریمبراں ہے۔ دیکھنے میں یہ پینٹنگ چھوٹی سی ہے مگر آرٹ کے قدر دانوں کے نزدیک اس کی موجودہ قیمت کم از کم بھی دس لاکھ ڈالر ہے۔ اور میں حیرت سے مرنے والا ہو گیا۔
"جب میں نے اے لیول میں ٹاپ کیا تھا تب ڈیڈی نے یہ پینٹنگ مجھے گفٹ کی تھی۔ اس وقت اس کی قیمت چار لاکھ ڈالر تھی۔"
"واہ بھئی۔۔۔ تم امیر لوگوں کے بھی کیا کہنے۔" گو کہ مجھے آرٹ سے بالکل بھی لگاؤ نہیں تھا مگر ان پینٹنگز کی قیمتیں سن کر میں ان میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔
سعد مجھے "ریمبراں" کی "کرانسٹ آن کراس" اور "برگوماسٹر سکس" کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے پاس "پابلو پکاسو، برونزینو، ڈیریز، بیپن، بیلو، لیوس نیبوکل اور فرانسسکو زبرن جیسے نامور مصوروں کی آرٹ کلیکشن تھی۔"
"یہ سلواڈور ڈالی کی پینٹنگ ہے۔ جس نے پگھلتے ہوئے پنیر سے متاثر ہو کر اس لینڈ اسکیپ پر پگھلتی ہوئی گھڑیاں بنا ڈالی تھیں۔"
"پگھلتی ہوئی گھڑیاں۔۔۔؟ سنا تھا مگر آج دیکھ بھی لیا کہ آرٹسٹ پاگل ہوتے ہیں۔" ان عجیب و غریب پینٹنگز کو دیکھ کر میں جو اپنی ہنسی دبائے ہوئے تھا اب اپنے قہقہے کو روک نہیں پایا۔
"یہ پاگلوں والا مقولہ تو رائٹروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور ان پر فٹ بھی آتا ہے۔" وہ کب سے مجھے منہ بناتے دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے بدلہ چکا دیا۔
"اچھا یہ حسینہ کون ہے؟"
"لیونارڈو ڈونچی کی مونالیزا کی کاپی ہے جسے ایک مشہور آرٹسٹ نے بنایا ہے۔" سعد نے یوں فخر سے بتایا گویا یہ کارنامہ اسی کا ہو۔
"لو یہ ہے مونالیزا؟ میں نے اس کے حسن اور مسکراہٹ کے بڑے چرچے سنے تھے۔ یہ تو لگتا ہے جیسے زبردستی گدگدی کر کے اسے ہنسایا جا رہا ہو اور یہ اس نے اپنی گال میں کیا دبا رکھا ہے؟"
"بہت ہی بدذوق ہو تم تو۔ چلو اب نکلو یہاں سے، اب میں مزید اتنے عظیم مصوروں کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ نکل لو پتلی گلی سے، کہیں مارے ہی نہ جاؤ میرے ہاتھوں سے۔" اس نے مجھے مکا جڑ دیا۔
"او کے یار جسٹ کڈنگ۔ او ہاں، یاد آیا۔ تم نے مجھے ڈنر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔"
"ہاں ہاں جانتا ہوں تم بہت پیٹو ہو، چلو کھانا لگ چکا ہو گا۔"
کھانے کی میز پر سعد کے والد پہلے سے موجود تھے۔
"اوہو آیئے آیئے۔۔۔ آج صاحبزادے گھر پر کیسے نظر آ رہے ہیں؟"
"السلام علیکم!" میں نے انہیں سلام کیا مگر سعد نے تو یہ تکلف بھی نہیں کیا۔ اور نہ ہی ان کی بات کا جواب دینا ضروری خیال کیا۔ میرے سلام کے جواب میں ان کی گھنی بھنوؤں کے درمیان لکیریں کھنچ گئیں۔

انہوں نے میرے سلام کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"پتا نہیں تم کن کن کنگلوں فقیروں کو اٹھا کے گھر لے آتے ہو۔" ان کے لہجے میں انتہائی حقارت اور نفرت تھی۔ میں شرمندگی سے زمین میں گڑ گیا۔

"ڈیڈی۔۔ یہ میرا دوست ہے۔" سعد احتجاجاً بولا۔

"اونہہ دوست ۔۔ ان ہی جیسے دوستوں نے تمہارا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔ ایسے لفنگوں کی وجہ سے تم اپنا مستقبل داؤ پر لگا رہے ہو۔ دیکھنا! بہت پچھتاؤ گے ایک دن۔

دیکھو۔۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہارے مستقبل کے لیے ہی تمہیں مشورے دیتا ہوں۔ مان جاؤ اور بزنس میں انٹرسٹ لو۔" اب کے وہ قدرے رک کر نرمی سے ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کے مشوروں کی۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں آرٹسٹ بننا چاہتا ہوں۔" سعد کے نقوش بھی بگڑے۔

"ہونہہ آرٹسٹ ۔۔ یہ بھی کوئی پروفیشن ہے؟ فارغ اور نکمے لوگوں کے کام ہیں یہ۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار میز پر پٹکا اور وہاں سے چلے گئے۔

"آئی ایم سوری یار۔" دکھ سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کوئی بات نہیں میں نے تو بالکل بھی مائنڈ نہیں کیا۔ ویسے بھی میں تو اس سے بھی شدید نفرتیں سہنے کا عادی ہوں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔" ہم کھانا کھائے بغیر ہی فلیٹ واپس آ گئے۔

☼ ☼ ☼

سعد کی مما مقامی لارڈ "ولیم جیف" کی بیٹی تھی اور والد پاکستانی تھے۔ دونوں کلاس فیلو تھے۔ دوستی رفتہ رفتہ محبت میں بدل گئی۔ سعد کی مما خاندانی کیتھولک تھیں لیکن اسلام کی حقانیت سے شروع سے ہی متاثر تھیں۔ اور پھر آخر وہ دن آ گیا جب انہوں نے شب کی تاریکیوں سے نکل کر اجالوں میں قدم رکھا۔ ان کا اسلامی نام زینب رکھا گیا۔ سعد کے نانا اعلا ظرف انسان تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی کے اس فیصلے کو کھلے دل سے تسلیم کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود بھی اسلام سے متاثر تھے۔ سعد کی نانی ایک ترکش خاتون تھیں۔ رحمان حجازی ہر لمحہ دو کو چار بنانے کی فکر میں رہنے والے انسان تھے۔

شادی کے تیسرے سال سعد پیدا ہوا۔ بیٹی کی شادی کے بعد لارڈ "ولیم جیف" نے ساری بزنس ایمپائر بیٹی اور داماد کے حوالے کر دی۔ اس دوران رحمان حجازی نے بھرپور محنت سے خود کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا تھا۔ رحمان حجازی بھی ان کے محل نما گھر شفٹ ہو گئے۔ بظاہر دونوں میاں بیوی مل کر بزنس چلا رہے تھے۔ زینب خاتون اپنے شوہر پر اپنے آپ سے بھی زیادہ اعتبار کرتی تھیں۔ وہ لارڈ صاحب مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مشرقی لوگ ہمیشہ بے ریا اور صاف دل کے مالک ہوتے ہیں دوسروں کے اعتبار و اعتماد اور جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن دونوں بھول گئے تھے کہ "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔"

رحمان حجازی نے زینب خاتون کے اعتماد کا فائدہ یوں اٹھایا کہ نامحسوس انداز میں انہیں بزنس سے دور کرتے گئے اور جانے کب سارا بزنس و جائیداد اپنے نام کروا لیا اور جب زینب خاتون پہ اس دھوکے کا انکشاف ہوا تو وہ اپنے اعتماد و محبت کا خون ہوتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکیں اور زبردست ہارٹ اٹیک کے بعد خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اس وقت سعد چھ سال کا تھا۔

لارڈ صاحب بیٹی کی وفات کے بعد ڈھے سے گئے۔ وہ چاہتے تو رحمان حجازی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتے لیکن سعد کی محبت میں انہیں یہ سب گوارا نہ ہوا کہ سعد ماں کے بعد باپ کی محبت کو بھی ترسے۔ رحمان حجازی دھوکے باز سہی مگر اولاد کے معاملے میں اتنے سفاک نہیں ہو سکتے اور بیٹے کی محبت کے آگے تو انہوں نے واقعی گھٹنے ٹیک دیے۔

لارڈ صاحب دل و جان سے سعد کی پرورش میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے سعد کی پرورش خالص

مشرقی انداز میں کی۔ انہیں نہ صرف اردو زبان پہ عبور حاصل تھا بلکہ پاکستان کی علاقائی زبانوں سے بھی واقفیت تھی۔ جیسے جیسے سعد شعور کی حدوں میں داخل ہوتا گیا' اس کے اپنے والد سے اختلافات بڑھتے گئے۔ بہت کچھ وہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سمجھ گیا تھا۔

لارڈ صاحب کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ پاکستان میں اس کا ددھیال خاصا بھرا پُرا تھا۔ اتنے سارے اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی میں یہاں بالکل تنہا تھا۔ پاکستان اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

اپنے وطن اور ہم وطنوں کی محبت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے ڈیڈی کو کئی بار قائل کرنے کی کوشش کرچکا تھا کہ وہ اپنا بزنس پاکستان منتقل کرلیں لیکن وہ مان کے ہی نہ دیے' بقول ان کے "پاکستان میں سوائے دھول مٹی' دہشت گردی اور لوٹ مار کے رکھا کیا ہے؟" ان ہی اختلافات کے باعث وہ اپنے ڈیڈی سے الگ اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ اسے اپنے زور بازو پہ پورا بھروسہ تھا۔ اسٹڈی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب کرتا اور یوں اپنے اخراجات پورا کرتا۔

☼ ☼ ☼

"تم بزنس کیوں نہیں کرلیتے؟" ایک دن سعد کو بیٹھے بیٹھے جانے کیا سوجھی کہ مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

"میں اور بزنس؟" میں نے حیرت سے سعد کو دیکھا۔

"ہاں تم۔"

"کیوں مذاق کررہے ہو' یار! میں بزنس کیسے کرسکتا ہوں؟ نہ میرے پاس سرمایہ اور نہ ہی صلاحیتیں اور سوجھ بوجھ اور پھر میں اپنے ادھورے وجود کے ساتھ کیا کرسکتا ہوں؟"

"جسٹ شٹ اپ۔ تم اپنے دماغ سے یہ خناس نکال نہیں سکتے؟ ان فیکٹ تم بہت سے مکمل لوگوں سے ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ ہر انسان مکمل ہوتا بھی کب ہے؟ کوئی نہ کوئی خامی تو ہر انسان میں ہوتی ہی ہے۔ سو اپنی خامیوں کو بیٹھ کر گنتے رہنے سے بہتر ہے ان خامیوں کو نظر انداز کرکے اپنی چھپی ہوئی خوبیوں کو استعمال میں لایا جائے۔ اور رہی بات صلاحیت یا قابلیت کی تو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ تم بلاشبہ انتہائی جینئس ہو۔ بس تھوڑی سی ہمت کرنی پڑے گی۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اتنا سرمایہ آئے گا کہاں سے؟"

"وہ میں تمہیں دوں گا۔" سعد کے لیے گویا کوئی مسئلہ' مسئلہ ہی نہ تھا۔ اس نے چٹکی بجاتے ہی حل پیش کیا۔

"لیکن تم کہاں سے دو گے؟"

"وہ میرا پرابلم ہے تمہارا نہیں۔ سمجھے... میں نے سوچ لیا ہے۔ میں "ربی" ہیلپ کروں گا۔ اس سے جو سرمایہ ملے گا اس سے تم ایک اچھا سا بزنس اسٹارٹ کرسکتے ہو' بلکہ ہم دونوں' سرمایہ میرا محنت تمہاری کیسا؟"

"بہت برا۔ آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ جو نہ تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ بزنس کامیاب ہی ہوگا اور پھر ہم کون سا بزنس اسٹارٹ کریں گے؟ سوری بھئی مجھے تو کوئی آئیڈیا نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ کھڑے کردیے۔

"ایک تو تم نے سوچ لیا ہے کہ تم نے کبھی بھی کچھ اچھا نہیں سوچنا۔ بلندی تک پہنچنے کے لیے پہلی سیڑھی پر قدم رکھنا پڑتا ہے نا ــــ اور بزنس کون سا ہوگا' یہ میں تمہیں بتاؤں گا اور گارنٹی بھی میں دوں گا تمہیں۔"

"ارے بھئی' سرمایہ تمہارا۔ آئیڈیا تمہارا۔ گارنٹیاں تمہاری... تو پھر مجھے کیوں بیچ میں گھسیٹ رہے ہو' بزنس بھی تم ہی کرو۔"

"ارے بھولے بادشاہ! بزنس ہی کرنا ہوتا تو ڈیڈی کا کہا نہ مان لیتا' خوامخواہ میں ناخلف و نافرمان ہوا پھرتا ہوں۔ مجھ سے حساب کتاب نہیں ہوتے۔"

"لیکن یار! "ربی" تو تمہارے ڈیڈی نے تمہیں

گفٹ دیا تھا۔ وہ کیوں سیل کرو گے تم؟ اور پھر تمہیں وہ پسند بھی ہے اور تمہارے ڈیڈی مان جائیں گے؟" میں پس و پیش کر رہا تھا۔

"کہا نا' ساری پرابلم میری ہے۔ تم بس تیاری پکڑو۔"

"لیکن....."

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔ اس لیکن کو اپنی زندگی سے نکال دو اور آگے بڑھ کے اپنے حصے کی خوشیاں زمانے سے چھین لو میرے دوست۔" وہ چلا گیا اور میرے لیے سوچوں کے نئے در وا کر گیا۔

اور پھر انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں ضرور چھینوں گا۔ آخر زندگی مجھے موقع دے رہی ہے تو میں فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔

☼ ☼ ☼

کامیابی کا پھل ہمیشہ محنت کے درخت پہ ہی لگتا ہے۔ سعد کا سرمایہ تھا اور میری محنت' دن رات کی محنت کی بدولت میں بلندی کی سیڑھی پہ سیڑھی چڑھتا گیا اور کچھ قسمت نے یاوری کی کہ میں آج ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ درمیان میں کیسی کیسی رکاوٹیں آئیں۔ کتنی پریشانیاں آئیں۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ہر کامیاب آدمی بہت سی رکاوٹیں عبور کر کے کامیاب کہلاتا ہے۔ کامیاب ہونا آسان نہیں ہوتا۔ ساری آسانیاں قربان کرنی پڑتی ہیں۔ جیسے ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے اسی طرح ہر مشکل میں میری دوڑ سعد تک ہوتی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ سعد کا سارا سرمایہ اُسے لوٹا دیا۔ اب اس بزنس کا میں بلا شرکت غیرے مالک تھا۔

میں جو کبھی دولت کو خوشیوں کی وجہ سمجھتا تھا' آج جب میں خود بے انتہا دولت کا مالک ہوں تو اس بے بہا اور بے مول دولت کی حقیقت سمجھ میں آگئی ہے۔ یہ تو بس ایک چمکتا دھوکا ہے۔ ساری زندگی انسان زر کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے ذلیل و خوار ہوتا ہے اور اپنے آپ کو آخری حد تک گرانے سے بھی باز نہیں آتا۔ مگر جب یہ بے وفا دولت ہاتھ آجاتی ہے تو خبر ہوتی ہے کہ یہ نرا خسارا ہے۔ یہ چمکتی چیز تو نرا اندھیرا ہے۔ نرا عذاب۔ مگر ایک بات ہے۔ یہ اپنے مالک کی بہت عزت کرواتی ہے۔ کہیں ذلیل نہیں ہونے دیتی۔ گناہ گار ہوتے ہوئے بھی گناہ گار نہیں کہلانے دیتی۔

سعد کے اپنے ڈیڈی سے تعلقات بہت بہتر ہو گئے تھے۔ کچھ انہوں نے خود کو بدلا تھا۔ کچھ میرے سمجھانے بجھانے پہ سعد نے خود کو بدلا تھا۔ اس نے اپنے ڈیڈی کا آفس سنبھال لیا تھا اور فری ٹائم میں وہی اس کا پرانا شوق۔ وہ اور پینٹنگ.....

اب تو سعد کے ڈیڈی میرے ساتھ بھی بہت شفقت سے پیش آتے۔ اب اللہ جانے وہ میری موجودہ حیثیت کی وجہ سے میری عزت کرتے تھے یا انہوں نے واقعی دوسروں کی عزت کرنا سیکھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پنک ٹریک سوٹ میں وہ گلابی سی گڑیا بلا شبہ وہی تھی۔ اچانک صبح انتہائی خوب صورت دل کش اور پرسکون لگنے لگی۔ وہ اپنی پونی ٹیل جھلاتی تیسری بار میرے قریب سے گزری تو ہر بار کی طرح اس بار بھی میں نے اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی تھی یا پھر شاید مجھے ہی ایسا لگا۔ کافی عرصے سے یہی روٹین تھی۔ میں اور سعد صبح جاگنگ کے لیے اس پارک میں آتے اور یوں ہماری ملاقاتیں رہتی تھیں۔ فجر کی نماز تو عرصہ ہوا چھوٹ چکی تھی۔ لیکن جاگنگ ضروری ہوتی تھی۔

آج سعد نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی ہو یا نہ مگر میں اسے دیکھ کر ضرور چونک گیا تھا۔ بلاشبہ وہ میرے لیے اجنبی تھی مگر ایک اپنائیت کا سا احساس مجھے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ ہوتا ہے نا۔ یوں ہی کسی کو دیکھ کر اپنے ہونے کا احساس۔ ان آنکھوں میں جانے کیسا سحر ہے؟ کیسا جادو ہے۔ وہ جو میں سالوں سے کسی اور کی آنکھوں کے سحر میں گرفتار تھا' چاہتے

ہوئے بھی ان آنکھوں کے سحر سے خود کو نہ بچا سکا مگر اب اچانک ان دو نینوں نے مجھے ان آنکھوں کے سحر سے آزاد کر کے اپنے سحر میں جکڑ لیا اور میں نے جو سالوں سے اپنے دل کو تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ وہ جانے کیوں ہمک ہمک کر ان نشیلے نینوں کی چاہ کرنے لگا۔

دوسرے روز میں لاشعوری طور پر جلد ہی پارک پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں بینچ پہ بیٹھ کے اس کا انتظار کرنے لگا۔ سبز نینوں کا ارتکاز محسوس کر کے میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے شاید ہیلو۔ کہا تھا۔ ایک مسکراہٹ میری جانب اچھال کر وہ جا چکی تھی۔ میں گڑبڑا گیا مجھے اپنی سماعت کا دھوکا محسوس ہوا۔ وہ تو چلی گئی تھی مگر اپنی خوشبو اور آنکھیں میرے پاس ہی چھوڑ گئی تھی۔

راہ چلتے ہوئے اکثر یہ گماں ہوتا ہے
وہ نظر چھپ کے مجھے دیکھ رہی ہو جیسے
کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے
تو نے آنکھوں سے کوئی بات کہی ہو جیسے

میں گنگنانے لگا۔

وہ بازگشت دن بھر میرا پیچھا کرتی رہی۔

"ہیلو۔" رات کو بستر پر لیٹا تو پھر سے وہ لمحہ نظروں کے سامنے آن ٹھہرا۔ یوں لگا میرے ارد گرد جھرنے سے بہنے لگے ہوں۔ اتنی مدھم اور شائستہ آواز۔ میں جو ان آنکھوں کے سحر میں گرفتار تھا اب اس آواز کے فسوں میں جکڑنے لگا۔ ایک عجیب سا احساس دن بھر ستاتا رہا یوں جیسے میں کسی کی نظروں کے حصار میں ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل میں اس سے ضرور بات کروں گا۔

☆ ☆ ☆

"کیا آپ یہاں سونے کے لیے آتے ہیں؟"

میں بینچ پر آج پھر اپنے ہی خیالوں میں بیٹھا تھا۔ اور آج پھر ذرا جلدی پارک آگیا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس آواز پہ چونک گیا۔ وہ شرارت بھری نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"جی نہیں میں تو واک کرنے آتا ہوں۔"

"مگر میں تو دو دنوں سے آپ کو یونہی مراقبہ کرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ آپ رائٹر ہیں نا۔۔؟"

ارے! یہ تو سچ مچ کی ساحرہ ہی ہے۔ "جی کبھی کبھار لکھتا ہوں لیکن پروفیشنل رائٹر نہیں ہوں مگر آپ کیسے جانتی ہیں؟"

"آپ کے مراقبہ کرنے کے انداز سے۔" میں کھسیا گیا۔

"مجھے سب پیار سے ہادی بلاتے ہیں۔"

"اور مجھے "انس علی خان" کہتے ہیں۔"

"کہیں آپ وہی انس علی خان تو نہیں جو ایک انٹرنیشنل نیوز پیپر میں آرٹیکلز لکھتے ہیں۔" اس کی جھیل سی آنکھوں میں استعجاب تھا۔

"جی آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔"

"ارے! آپ کے آرٹیکلز تو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور آپ کا ناول بھی میں نے پڑھا ہے اور میری مما بھی آپ کو شوق سے پڑھتی ہیں۔ آپ کا ناول بہت زبردست تھا۔ لیکن اس کے بعد آپ کا کوئی اور ناول یا کچھ بھی پڑھنے کو نہیں ملا۔"

ارے یہ لڑکی تو اپنی فین ہی نکلی۔ مجھے خوش گوار سی حیرت نے گھیر لیا۔ سب کچھ کسی کہانی کے جیسا لگ رہا تھا۔

"بس وقت کی کمی کے باعث اس طرف توجہ ہی نہیں دے پایا۔" میں نے گھسا پٹا بہانہ بنایا۔

"ارے وقت تو الاسٹک کی طرح ہوتا ہے جتنا کھینچیں گے اتنا ہی نکلے گا۔ آپ کے فینز آپ کی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں۔ کم از کم اپنے فینز کے لیے آپ تھوڑا سا وقت تو نکال ہی سکتے ہیں نا!"

"جی ان شاء اللہ کچھ نیا ضرور لکھوں گا۔" دل اس کی فرمائش پہ بلیوں اچھلا تھا۔

"وعدہ!" ان آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

"جی جی وعدہ۔"

"پکا والا وعدہ؟"

"جی بالکل پکا وعدہ۔" میں اس اپنائیت پہ کھل سا اٹھا۔

تو ہم اجنبی نہیں تھے۔ یک طرفہ ہی سہی آشنائی تو تھی اب اس آشنائی کو دو طرفہ ہونے میں کتنی دیر لگتی؟

"یہ میری مما کی طرف سے۔" پاس ہی کیاری سے سفید گلاب توڑ کے میری جانب بڑھایا۔

"تھینکس۔" میں بس اتنا ہی کہہ پایا۔

"میں مما کو آپ کے بارے میں بتاؤں گی تو وہ بہت خوش ہوں گی۔ وہ آپ کی بہت بڑی فین ہیں۔"

"میری طرف سے انہیں تھینکس کہیے گا۔"

"سنیے...!" میں واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اس پکار پہ رک گیا۔ ایک پل کو میرا دل مٹھی میں آگیا' مجھے لگا شاید وہ میرے ادھورے وجود پہ ترس کھائے گی۔ میرا دل چاہا وقت یہیں تھم جائے۔ میں کبھی پلٹ کر ان آنکھوں میں اپنے لیے ترحم اور ہمدردی نہ دیکھ سکوں مگر وقت بھلا کب کسی کے لیے تھما ہے۔ مجھے پلٹ کر دیکھنا ہی پڑا۔

"یہ میری طرف سے۔" اس نے ایک اور سفید گلاب میری طرف بڑھایا۔ اب کے میں تھینکس بھی نہ کہہ سکا۔ ایک سرشاری سی دل میں اتر کر ایک نیا اعتماد بخش گئی۔ میں بیساکھی ٹیکتا چل دیا۔ میں جو اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا' یوں اس سے آشنائی ہو جائے گی میں نے سوچا نہ تھا۔

"یاہو۔" اس کی پہنچ سے دور ہوتے ہی میں نے نعرہ لگایا۔ شاید قدرت کو یوں ہی منظور ہوگا۔ آج کا دن بہت خوب صورت گزرنے والا تھا اور شاید آنے والے دن بھی...

☆ ☆ ☆

"ہیلو...!" مسٹر جونز نے مسکرا کے کہا۔

"ہیلو۔ خیریت؟ بہت دنوں بعد نظر آرہے ہیں؟" مسٹر جونز بھی مستقل واک کے عادی تھے۔

"بس میری طبیعت خراب تھی۔" میں نے رک کر ان کی خیریت دریافت کی۔ اتنے میں سعد ہانپتا کانپتا بھاگتا ہوا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کے اس نے ہاتھ ہلایا اور پاس آ کے بریک لگا دی۔

"خیریت جناب! آج آپ کی صبح اتنی جلدی ہو گئی؟"

"ہائے... کیا بتاؤں ہائے ہائے۔" اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ پاس پڑے بینچ پہ بیٹھ کے اپنا سانس درست کرنے لگا۔

"اب بتا بھی چکو۔ اگر ہائے ہائے کرتے رہے تو... جب تک تم نارمل ہو گے تب تک کھڑے کھڑے میرا سانس پھول جائے گا۔"

"تو کس نے کہا ہے کھڑا ہونے کو۔؟" میں آگے بڑھ کے بینچ پہ بیٹھ گیا۔

"اپنی درد بھری داستان کہاں سے شروع کروں میرے دوست؟ اس درد بھری کہانی کو سن کر تم آٹھ آٹھ آنسو روؤ گے۔"

"بے فکر رہو میں نہیں رونے والا۔ جلدی سے اپنی درد بھری کہانی سناؤ پھر میں اس کہانی پہ کہانی لکھوں گا۔ ابھی کل ہی ایک پری نے مجھ سے کہانی لکھنے کی فرمائش کی ہے۔"

"کیا بات ہے تمہاری۔ کہانی پہ کہانی لکھو گے اور یہ پری کا کیا چکر ہے ڈیئر؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"کیوں تم سے مطلب؟"

"اچھا اچھا' سمجھ گیا خواب میں دیکھی ہوگی ورنہ یہاں تو گوری چمڑی والے پھیکے شلجم ہی نظر آتے ہیں۔" اس نے پاس سے گزرتی دو گوری لڑکیوں کو دیکھ کر آہ بھری۔

"تم اپنی داستان سنانے والے تھے' وہ بھی دکھ بھری۔"

"ہائے... کیا یاد کروا دیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں خواب میں پریاں نظر آتی ہیں۔ مگر مجھے تو ایک چڑیل چمٹ گئی ہے۔ نہ دن کو چین لینے دیتی ہے' ہر وقت کہیں نہ کہیں بھگائے رکھتی ہے اور تو اور راتوں کو بھی خواب میں آکر ڈراتی رہتی ہے۔ چڑیل صاحبہ

خود تو اتنی ٹھٹھرتی سردی میں واک کرنے کی شوقین ہیں ہی مجھے بھی ساتھ گھسیٹ لیتی ہے۔ لو، وہ صاحبہ خود ہی آگئیں۔"

میں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو "وہ" روش پہ تیز چلتی آرہی تھی۔

"ایں! یہ تو وہ پری۔" میں نے جلدی سے اپنی پھسلنے والی زبان دانتوں تلے دبائی۔ مگر سعد کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑجاتا وہ قریب آگئی۔

"السلام علیکم!" اس نے سلام میں پہل کی۔

"وعلیکم السلام۔" مشترکہ جواب دیا گیا۔

"کیسے ہیں آپ...؟" سوال کا نشانہ میں تھا اور سعد تو حیرت سے منہ کھول کر دیکھنے لگا۔

"فرسٹ کلاس۔ آپ کیسی ہیں؟"

"تو گویا آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟" سعد کو بھی ہوش آیا جو بدھوؤں کی طرح کبھی مجھے اور کبھی اسے دیکھ رہا تھا۔

"اتنا زیادہ بھی نہیں جانتے۔ یہ ریگولر واک کرنے آتی ہیں اور میں بھی، اس لیے بس ہائے ہیلو۔" میں نے جلدی سے وضاحت دی۔ اور سوالیہ انداز سے سعد کو دیکھا۔

"یہ ہادی ہے... یہ تو پتا ہی ہو گا آپ کو؟ یہ میری کزن ہیں۔ اس کی ماما، بابا کی فرسٹ کزن ہیں۔ اور ہائر اسٹڈی کے لیے یہاں آئی ہیں۔" سعد نے اس کا تعارف کروایا۔ "اور ہادی یہ میرے بہت اچھے اور بہت پیارے دوست "انس علی خان" ہیں۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ یہ بہت اچھے ہیں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ بہت بڑے رائٹر بھی ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ اتنے ڈیسنٹ اور نائس انسان، تمہارے جیسے چغد کے دوست بھی ہیں۔"

"لو جی، آپ محترمہ مجھے چغد کہہ رہی ہیں۔ ان ڈیسنٹ اور نائس بندے سے پوچھ لیجیے کہ ابھی میں آپ کی کتنی تعریفیں کر رہا تھا کہ "میری پیاری سی کزن مجھے بالکل بھی تنگ نہیں کرتی نہ ہی لائبریری کے چکر لگواتی ہے۔ نہ ہی خوابوں میں بھوت بن کر ڈراتی ہے اور نہ ہی صبح صبح گرم بستر سے اٹھا کر اتنی سردی میں واک کرنے کی فرمائش کرتی ہے۔"

"توبہ! تم سے تو اللہ سمجھے۔ اب میں بھی انہیں نہیں بتاؤں گی کہ تم شیطان کے چیلے ہو اور میری ناک میں دم تو بالکل بھی نہیں کرتے۔ اور نہ ہی وقت بے وقت مجھ سے پراٹھے بنوانے کی فرمائش کرتے ہو۔" اس کے اس انداز پہ میں کھل کے ہنس دیا۔

"اب چلو سعد کے بچے۔ مجھے یونی بھی جانا ہے۔"

"ہاں بھئی چلو۔ مجھے کون سا شوق ہے سردی میں ٹھٹھرنے کا۔" سعد فوراً کھڑا ہوا۔

"اب تو روز ہی آپ سے ملاقات رہا کرے گی۔" اب کے اس کا مخاطب میں تھا۔

"جی بالکل۔" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"ہاں یاد آیا۔" وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"آپ نے کچھ نیا لکھا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں لکھا۔"

"آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے شکوہ آمیز انداز میں کہا۔

"ان شاء اللہ میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔ مگر اتنے عرصے بعد کچھ لکھنے میں مشکل تو ہو گی نا؟" میں نے چور نظروں سے سعد کو دیکھا جو معنی خیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اوکے۔ مگر لکھیے گا ضرور اور کوئی آپ کو پڑھے نہ پڑھے مگر میں آپ کے لفظ پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"اوکے اللہ حافظ۔" اس نے کہا۔

"اللہ حافظ۔" میں نے زیر لب کہا۔

جب وہ چل دی تو سعد نے ہاتھ منہ پھیر کر مجھے انگلی دکھائی گویا اشارہ تھا کہ تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا بچو۔ "اب جو سعد کے ہاتھوں میری درگت بنتی وہ الامان۔"

✲ ✲ ✲

پچھلے پورے ایک گھنٹے سے سعد میرا دماغ چاٹ رہا

تھا۔
"یار ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔"
"تو پھر کیسا ہے...؟"
"کیسا بھی نہیں۔"
"تم دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن کان کھول کر سن لو میں بے وقوف نہیں ہوں۔"
"کیوں مذاق کر رہے ہو؟ جو چیز آل ریڈی 'ریڈی میڈ' ہو اسے مزید کیسے بنایا جا سکتا ہے۔"
"یہ آنکھوں میں چمک۔ چہرے پہ رونق اور دل و دماغ میں خوش کن خیالات ایسے ہی تو نہیں ہیں؟ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی اور مجھے لگتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔"
میں نے چونک کر سعد کو دیکھا اور اس نے میرا چونکنا پکڑ لیا۔
"دیکھا میں نہ کہتا تھا کچھ نہ کچھ ہے۔ جب ہی تو اس بات پہ تمہارے بے سرے منہ پہ ایک دم کیسی رونق آئی ہے۔ یہ ہونٹ بات بے بات یونہی نہیں مسکرا اٹھے۔ پہلے تو تم اتنے خوش اخلاق نہیں تھے۔"
"میں پہلے بھی ایسا ہی خوش اخلاق و خوش مزاج تھا۔ بس تم نے غور اب کیا ہے اور اب میری جان چھوڑو اللہ کے بندے۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں ابھی۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
"تم کام کا بہانہ نہ بنا کر مجھے ٹال نہیں سکتے۔ میں تم سے سچ اگلوا کر ہی رہوں گا۔"
"اچھا... تم مجھے بتا ہی دو کہ تم میرے منہ سے کیا سننا چاہتے ہو اور میں تمہیں وہ سنا کر جان چھڑاؤں اپنی۔"
"یہی کہ تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے اور تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ یار! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کتنا مزہ آئے گا۔ تمہاری شادی میں بینڈ باجے کے ساتھ تمہیں گھوڑی پہ بٹھا کے، ہم باراتی بن کے جائیں گے اور... اور۔"
"اور وہ دھڑام سے بیڈ سے نیچے گر جائیں گے اور آنکھ کھل جائے گی۔"
"کتنے ظالم ہو تم۔ تم سے مجھ معصوم کی اتنی سی خوشی بھی نہیں دیکھی جاتی۔"
"سوچتے ہیں تمہاری خوشی کے بارے میں بھی... اور اب اپنی معصوم شکل لے کر نو دو گیارہ ہو جاؤ۔" میں نے اس سے جان چھڑائی۔
"ہرا۔ آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔" سعد نے نعرہ لگایا۔
"پٹو گے تم مجھ سے۔"
"تمہاری خوشی کے لیے پٹنا بھی منظور۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

میں آفس میں بہت مصروف تھا۔ "ویلز" سے ڈیلی گیشن آیا ہوا تھا۔ بہت بڑی ڈیل ہوئی تھی۔ انہیں سی آف کرنے کے بعد میں ضروری کام نمٹا رہا تھا کہ سیکریٹری نے کارڈلیس پہ کسی خاتون کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے انہیں اندر بھیجنے کو کہا۔
"مے آئی کم ان...!" دھیمی اور وہی مسحور کن آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا اور خوش گوار حیرت میں ڈوب گیا۔
"ارے آپ... پلیز آیئے آیئے۔ آپ یہاں کیسے؟" میں بوکھلا گیا۔
"کیوں کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟"
"میرا مطلب تھا کہ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔" بوکھلاہٹ میں بے ربط جملے ادا ہو رہے تھے۔
"لازم تو نہیں کہ جو پہلے نہ ہوا ہو وہ کبھی بھی نہ ہو۔"
"جی ہاں یہ تو ہے۔" میں نے احمقانہ پن سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
"پلیز تشریف رکھیں۔" مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔
"میرے خیال میں، میں تو تشریف رکھے ہوئے ہی

ہوں ہاں البتہ آپ ضرور تشریف رکھیے آپ کا اپنا آفس ہے۔" اس کے لب مسکرار ہے تھے۔ اور میں شرمندہ ہو گیا۔

"احمق' چغد۔ کیا ہو گیا ہے بھئی۔ ٹین ایجرز والی حرکتیں کیوں شروع کر دیں؟ کیا پہلی بار کسی حسین لڑکی سے ملے ہو؟" میں نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔

"کیا لیں گی آپ۔ گرم یا ٹھنڈا؟" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بلیک کافی منگوائیں۔" میں نے کارڈلیس کا بٹن دبا کے سیکریٹری کو گرما گرم بلیک کافی اور ریفریشمنٹ کا سامان اندر بھیجنے کا آرڈر دیا۔

"ویسے کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟" میں نے بات کا آغاز کرنے کے لیے یونہی فضول سا سوال کیا۔

"لائبریری آئی تھی۔ مجھے اپنا تھیسس کمپلیٹ کرنے کے لیے کچھ بکس چاہیے تھیں۔ سوچا آپ سے بھی ملاقات ہو جائے۔"

"گڈ۔ اچھا کیا آپ نے جو میرے آفس کو بھی رونق بخش دی۔ کیسی جا رہی ہیں آپ کی کلاسز؟"

"اے ون.... میں تو اپنی اسٹوڈنٹ لائف کو بہت زیادہ انجوائے کرتی ہوں ویسے بھی یہاں کی اسٹڈی ہمارے ہاں کی اسٹڈی سے بہت ڈیفرنٹ ہے۔" اس نے تفصیلی جواب دیا۔

"او کے.... میری بیسٹ وشز آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کرے آپ یوں ہی قدم بہ قدم آگے بڑھتی رہیں اور اک دن ایسا آئے کہ دنیا آپ کے قدموں کے نیچے ہو۔" میں نے اسے دل سے دعا دی۔

"لیکن میں دنیا کے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔ آپ کی طرح دنیا کو اپنے قدموں تلے روندتے ہوئے تن تنہا آگے بڑھتے رہنے سے دنیا والے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جبکہ زندہ رہنے کے لیے دنیا والوں کا ساتھ ناگزیر ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اور ہاں.... کیا صرف آپ کی بیسٹ وشز ہی میرے ساتھ ہیں؟"

"کیا مطلب....؟" میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ کیا آپ کی کوئی اور فیلنگز میرے ساتھ نہیں؟"

میں نے چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی لودیتی کانچ سی آنکھیں تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں یا شاید میں ہی غلط سمجھ رہا تھا۔ مس مہتھلدا کافی کے ساتھ ناشتے کے لوازمات لیے اندر آنے کی اجازت چاہ رہی تھی۔ میں نے سر ہلا کے اجازت دی۔

"گڈ آفٹرنون سر۔" اس نے ناشتے کی ٹرے ٹیبل پہ سجا دی۔

"تھینک یو...." میں نے رسماً کہا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر خاموشی کا وقفہ رہا۔

"لازم تو نہیں کہ جیسا ہم سوچتے ہیں ویسا ہی دوسرے بھی سوچیں۔" میں نے ویٹ بال کو گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اگر ہماری سوچ اچھی ہو اور دوسروں کو اس

سوچ کو اپنانے میں کوئی حرج یا نقصان بھی نہ ہو' بلکہ فائدہ ہی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم دوسروں کو قائل کرلیں۔"

"ہر کسی کی پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر ہماری تقدیر۔۔۔ ہماری تقدیر ہماری سوچوں کے تابع نہیں ہوتی۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔ میں اسے کوئی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔

'میں نہیں مانتی اس بات کو۔۔۔ میں تو اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ ہماری خواہشات' ہمارے خوابوں' آرزوؤں اور سوچوں میں پختہ یقین شامل ہو تو یہی یقین ہمیں ہماری منزل تک لے جاتا ہے۔ مانا کہ تقدیر ہماری آرزوؤں کے تابع نہیں ہوتی۔ مگر تقدیر ہماری دعاؤں کے تابع تو ہوتی ہے۔ کامل یقین سے مانگی گئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ دعائیں ہی تو تقدیر بدلنے پہ قادر ہیں۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں' مگر حقیقت بہت کڑوی ہے۔" میں نے سر چیئر کی پشت سے ٹکا دیا۔

"حقیقت جو بھی ہو۔۔۔ مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ سچے اور خالص جذبے کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ میں جانتی ہوں کہ لفظ آپ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ آپ لفظوں سے من چاہا کھیل کھیلتے ہیں۔ کسی بھی بات کو اپنے من چاہے معنی پہنا دیتے' مگر دوسروں کے پُر خلوص اور خوب صورت جذبوں کو آپ شک کی عینک سے پرکھ کر غلطی پر ہوں گے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" میں جان کر بھی انجان بن گیا۔

اور اس لمحے میرے دل کو کچھ ہوا۔ میری نظریں اس کی روشن اور پرامید آنکھوں سے ہوتی ہوئی اپنے ادھورے وجود پہ آکے ٹک گئیں۔ بس یہیں آکے تو میں ہمیشہ ہار جاتا تھا۔ میرے ادھورے وجود نے مجھے کہاں کہاں نہیں ہرایا تھا۔ کہاں کہاں نہیں رلایا تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے اپنے ادھورے ہونے کا بہت شدت سے احساس ہوا۔ ورنہ تو میں نے اپنی ذات میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے بہت جتن کیے تھے اور اب تو میں بھول بھی چکا تھا کہ بیساکھی کے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔۔۔ یہی میرا سہارا ہے۔ اسی کے ساتھ میرا وجود مکمل ہوتا ہے۔ یہ میرے دکھ' سکھ اور تنہائی کی ساتھی تھی۔ میں نے اپنے ادھورے وجود کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ نہ صرف جینا بلکہ لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے میں نے منزل تک جانے والا راستہ بھی پکڑ لیا تھا اور اب جبکہ میں بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرتے یہاں تک پہنچ گیا تھا تو کانچ جیسی آنکھوں والی دھان پان سی لڑکی نے مجھے میری اوقات یاد دلادی تھی۔

زندگی میں پہلی بار کوئی مجھ سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ کوئی پہلی بار میرے وجود کو اہمیت دے رہا تھا اور مجھ پہ شادی مرگ جیسی کیفیت طاری تھی۔ نہ خوش ہو سکتا تھا اور نہ ہی۔۔۔ خوش ہوتا بھی کیسے؟ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ میں کیسے خوش ہو سکتا تھا۔ میری خوشیاں بھی میری ذات کی طرح ادھوری تھیں۔

"جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے سنبھل کے کہا۔

"جانتی ہوں۔۔۔ بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں' تب ہی تو ایسا کہہ رہی ہوں۔"

"یہ جاننے کے باوجود بھی کہ میں نامکمل انسان ہوں؟"

"جی ہاں' یہ جاننے کے باوجود بھی۔۔۔" اس کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

"آپ شاید مجھ پہ ترس کھا رہی ہیں؟"

'میں آپ پہ نہیں بلکہ اپنے آپ پہ ترس کھا رہی ہوں۔ بعض لوگ بظاہر مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہوتے ہیں جیسے میں۔۔۔ میں اپنی ذات کی تکمیل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں آپ کے اندر کے باکردار' مکمل اور خوب صورت انسان سے محبت کرتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں یقین کے دیے جگمگا رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

میں اسے ناامید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ امید کے آخر سرے پر بے یقینی ڈیرہ ڈالے ہوتی ہے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ بے یقینی کتنی بری چیز ہے۔ اس کا دکھ کتنا گہرا ہوتا ہے۔ آنکھیں بنجر کر دیتا ہے۔ دل کو پتھر کر دیتا ہے۔ باہر کی دنیا میں خواہ کوئی بھی موسم ہو۔ مگر دل کی دنیا میں اک ہی موسم ٹھہر جاتا ہے۔ ہجر کا موسم اور آنکھوں میں برسات کا موسم اور پھر چاہے کچھ بھی کرلو' یہ رت بدلتی ہی نہیں۔ میں ان کانچ سی سبز آنکھوں کو ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتا تھا اور پھر میں نے اچانک فیصلہ کرلیا۔

☆ ☆ ☆

اور پھر زندگی کا عنوان ہی بدل گیا۔ زندگی بہت خوب صورت ہوگئی اور میں بہت خوش تھا۔ میں پہلی بار زندگی سے اپنے حصے کی مکمل خوشیاں کشید کررہا تھا اور وہ... اک نازک سی لڑکی... اس کے چہرے پہ بکھرے رنگوں کو میں حیران ہو کے دیکھتا اور سوچتا کہ "کیا محبت انسان کو اتنا خوب صورت بنادیتی ہے؟"

ہر دم سنجیدہ رہنے والی لڑکی بہت شوخ و چنچل ہوگئی تھی۔ سب کچھ جیسے خواب سا تھا اور میں اپنے خوابوں کی دنیا میں رہنے والی اس حسین پری کے دل میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار کسی کو محبت دے رہا تھا' ورنہ تو ہمیشہ میں نے دوسروں سے لیا ہی لیا تھا۔ پہلے چچا' پھر پھپھو... سر عبید اللہ پھر سعد اور اب یہ لڑکی۔ ہر اس موڑ پہ جہاں میں گرنے لگتا تھا' میرا اللہ کسی نہ کسی کو مجھے تھامنے کے لیے بھیج دیتا تھا اور میں پھر بھی "اللہ" سے اپنی تنہائی کا اپنے ادھورے وجود کا اپنی محرومیوں کا گلہ کرتا رہا۔ مجھے احساس ہورہا تھا کہ میں کس قدر ناشکرا تھا۔

میں ہادی کے لیے ایک ولا لینا چاہتا تھا' مگر وہ تھی کہ مان کے نہیں دے رہی تھی۔ اس میں بھی سعد کی طرح محب وطن بوڑھی روح گھسی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل... کرنے کے بعد ہر صورت خود بھی پاکستان واپس جائے گی اور مجھے بھی لے جائے گی۔ اسے اپنی محبت کی طاقت پہ بھرپور ناز تھا اور مجھے اپنے آپ پہ بھروسا۔ چلیں دیکھیں گے کہ کون کس کو قائل کرتا ہے؟ کس کی محبت زور آور ہے؟ ایک بار تو پاکستان جانا ہی تھا نا! بھئی ہادی کے والدین سے ملنے۔

☆ ☆ ☆

لاہور ایئرپورٹ سے نکلے ہی تھے دھیان ذرا سا ادھر ادھر ہوا اور میرا ایک بیگ غائب ہوگیا۔ میں نے خوب واویلا مچایا' مگر ہادی پر ذرا جو اثر ہوا ہو۔ سوچا پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے' لیکن اس سوچ پر عمل در آمد مہنگا پڑ سکتا تھا۔ لینے کے دینے پڑ جاتے تو؟

"الوؤں کی طرح کھڑے کیا دیکھ رہے ہیں؟ ٹیکسی روکیں۔"

"کیا؟" میں اپنے بیگ کا غم غلط کررہا تھا جس میں ہادی کے گھر والوں کے لیے قیمتی تحائف تھے۔ اس بات پہ چونک اٹھا۔ "ہم ٹیکسی پر جائیں گے؟"

"تو کیا جہاز پہ جائیں گے؟ آپ کی شاہی سواری بہت شان دار ہوتی ہوگی مگر عالی جناب اس وقت ہمیں ٹیکسی میں ہی جانا ہوگا۔"

میں شرمندہ ہوگیا۔ حالانکہ ہادی نے بتایا تھا کہ اس کے گھر میں اس کی ممی اور فالج کے مریض دادا جان کے سوا کوئی نہیں۔ ٹیکسی میں سوار ہو کے ذرا سا سکھ کا سانس لیا تو اس حسین و رنگین سفر کی اہمیت کا اندازہ ہوا کیونکہ ہادی میرے ساتھ تھی۔

لیکن میں ذرا سا کنفیوژ تھا کہ کیا پتا ہادی کے گھر والے مجھے پسند بھی کریں گے یا نہیں؟

اس خدشے کا اظہار میں نے ہادی سے بھی کیا تھا۔ تو اس نے انتہائی جذباتی انداز میں آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے خوب بلیک میل کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ ٹیکسی تیزی سے منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ منظر تیزی بدل رہے تھے۔ اتنے سالوں میں رستے بدل گئے

تھے۔ نہیں شاید رستے تو وہی تھے' کھیتوں' باغوں اور پارکوں کی جگہ بلند و بالا عمارتوں نے لے لی تھی اور میں مکمل طور پر ہادی کے رحم و کرم پہ تھا۔ سارے پرانے راستے بھول چکے تھے۔ وقت کی دھول میں گم ہو گئے تھے۔ تین' چار گھنٹے کا سفر اونگھتے ہوئے گزرا کیونکہ ہم دونوں ہی تھک چکے تھے۔ ٹیکسی آف وائٹ گیٹ کے سامنے رکی اور اک لمحے کو تو میں کچھ سمجھ ہی نہیں پایا۔ ہم ٹیکسی سے نکلے۔ میں تذبذب میں ہادی کے ساتھ آگے بڑھا۔ جیسے جیسے گیٹ کھلتا گیا۔ یادوں کے دریچے اک اک کر کے وا ہوتے گئے۔

یہ آنگن... آنگن میں بسنے والے لوگ... اور اس آنگن میں نیم کا درخت تو مجھے کبھی بھی نہیں بھولا تھا۔ اس کا اک اک کونا میری یادوں میں بسا تھا۔ یہ نیم کا پیڑ تو میرے ہر اک لمحے کا ساتھی تھا۔

☼ ☼ ☼

اس شخص کی آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی اور چہرے پر ویرانی سی تھی۔ الجھے ہوئے بال اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ اس بے بس بوڑھے لاچار وجود کو دیکھ کر مجھے رمیر اس کا "رب" یاد آ گیا۔ میں نے ادب سے اس انسان کا گھٹنا چھوا' جو دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔

میں نہیں جانتا وہ ایسا کیوں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے ہر ممکن زیادتی کی۔ مگر وہ سب تو گزرے وقت کی باتیں تھیں اور وہ گزر گئیں۔ مگر بہر حال اک بات کا اعتراف مجھے ضرور تھا کہ آج میں جس مقام پہ ہوں اسی شخص کی وجہ سے ہوں۔ میری ترقی کے پیچھے اسی شخص کی زیادتیوں کا ہاتھ تھا اور آج وہی کر و فر اور رعب داب والا شخص فالج زدہ زندہ لاش کی طرح بستر پہ پڑا تھا۔ میرے گھٹنے چھونے پہ اس نے اپنا کپکپاتا ہاتھ میرے ہاتھ پہ رکھا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ... اپنے ہاتھ میں لے لیا' سچ ہے کہ مصیبت اور بیماری بڑے سے بڑے انسان کو جیت

کر دیتی ہے۔

ہادی نے سب کو میرے بارے میں جتا دیا تھا۔ اگر نہیں جتایا تھا تو صرف مجھے' حتیٰ کہ سعد بھی اس سارے ڈرامے میں شامل تھا۔ ہادی کا خیال تھا اگر وہ مجھے اندھیرے میں نہ رکھتی تو شاید میں پاکستان کبھی نہ آتا اور میں جو اس بات پہ ششدر تھا کہ اس لڑکی سے اپنائیت کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ تو یہ عقدہ اب کھلا تھا۔

مجھے وہ چھوٹی سی ننھی سی فیری یاد آ گئی جو کونوں کھدروں میں شرما کے چھپتی پھرتی تھی۔ جو ذرا سی تیز ہوا پہ ڈر کے مارے رو پڑتی تھی۔ پھوپھا پہ فالج کا شدید حملہ دو سال پہلے ہوا تھا جب انہوں نے اپنے جوان اور اکلوتے بیٹے کو سپرد خاک کیا جو روڈ ایکسیڈنٹ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ شاید جب ہی بیوگی کے دکھ نے بھابھی کو عمر سے پہلے عمر رسیدہ کر دیا تھا۔

اور وہیں... عینا... داؤد کے ساتھ بیاہ کر فرانس سدھار گئی تھی۔ آنگن میں خوش گوار تبدیلیاں آ گئی تھیں مگر نیم کا درخت وہیں تھا اور اس میں پڑا جھولا غائب تھا۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ذرا سی فرصت ملنے پہ میں نے "ہادی" کا شکریہ ادا کیا کہ جس کی وجہ سے میں اپنوں سے ملا تھا۔ ورنہ تو میں یوں ہی ادھر ادھر بھٹکتا رہتا۔ میری خوشیاں اب مکمل ہو گئی تھیں۔ میری تشنگی سیراب ہو گئی۔ میں خوش تھا بہت خوش...

تو ہادی... مطلب نور الہدیٰ... میں جان ہی نہ پایا اور نہ ہی کبھی ہادی کا مکمل نام پوچھا۔ مجھے لگا ہادی ہی اک مکمل نام ہے۔ بہت اچھا وقت گزرا' پتا ہی نہ چلا دن گزرنے لگے۔ واپسی کا وقت آن پہنچا۔ مجھے جانا تھا۔ واپس آ کے ہادی کو ہمیشہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔

☀

کیوں کھڑی ہو

عنبرین اعجاز

بھاپ اڑاتی کافی پسندیدہ مگ میں انڈیلی جا چکی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ اسٹرابیری چاکلیٹ کپ کیک سنہری کناروں والی سفید پلیٹ میں بڑی شان سے سجے ہوئے تھے۔ فضا میں ایئر فریشنر کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ خزاں رسیدہ سہ پہر کی ملائم دھوپ کی — مدھم کرنیں پردوں میں سے چھن چھن کے آ رہی تھیں اور فرش پہ بچھے ہلکے سبز اور میرون قالین کو مزید شوخ کیے دے رہی تھیں۔ خنک ہوا کے جھونکے ٹیرس پہ پھیلی بوگن ویلیا کی گھنی بیل سے ٹکراتے تو پتوں کی سرسراہٹ ایک لطیف — احساس دل میں اجاگر کرنے لگتی۔

ایک طویل عرصے کے بعد وقت مہربان ہوا تھا۔ فرصت کے چند گنے چنے لمحات میسر آئے تو موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے بک شیلف میں سے پانچ سال پرانی اردو شاعری کی وہ خفیہ کتاب ڈھونڈ نکالی جو مجھے زمانے بھر کی نظروں سے بچا کے تحفتاً" دی گئی



تھی۔ کاؤچ پہ نیم دراز ہوتے ہی میں نے کریم کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور مجموعہ کلام کا پہلا صفحہ پلٹا۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

یہ وہ نذرانہ محبت والفت ہے جو منگنی شدہ ہونے کے بعد پہلی عید پہ میرے منگیتر نے میرے اعزاز میں بطور خراج تحسین اس "منخنیہ" تحفے کے صفحہ اول پر بڑی رازداری کے ساتھ اپنے کانپتے ہاتھوں سے درج کیا تھا (کانپتے ہاتھ اس لیے کہا کیونکہ ان کی ہینڈ رائٹنگ ہی کچھ ایسی لگ رہی تھی) آج 'جبکہ میرا سابقہ منگیتر میرا شوہر نامدار بن چکا ہے' کی پانچ سالہ رفاقت نے میرا یہ حال کردیا ہے کہ۔

"چڑی وچاری کی کرے
تے ٹھنڈا پانی پی مرے"

کُل عالم کو ایک میری ذات ناتواں ہی میسر آئی تھی' ظلم وستم کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ برابر کرنے کو۔ ہر توپ کا رخ میری طرف!

دنیا ظالم سسرال اور سنگ دل شوہر کا رونا روتی ہے۔ میرے لیے تو سسرال اور میکہ دونوں ہی برابر ہو گئے تھے۔ اوروں سے کیا گلہ جب اپنے شوہر کو قدر نہ ہو' نہ اولاد بخشے۔ بچوں کی چھٹیاں تو میرے لیے ہمیشہ وبال جان ثابت ہوتیں۔ شب و روز نت نئے تماشے اور لائیو شوز۔ آج صبح تو حد ہی ہوگئی اور کوئی کھیل نہ سوجھا تو دونوں بہن بھائی نے باہمی مشاورت سے سوچا کہ چلو آج "ماما پاپا" ہی کھیل لیتے ہیں۔ جونہی کھیل ہی کھیل میں مکالموں کا آغاز ہوا گرد و پیش میں خاموشی چھاگئی۔ جو کھیل بڑھنے کے ساتھ ساتھ سناٹے اور پھر سکوت میں ڈھل گئی۔ ہر ذی نفس ہمہ تن گوش اور یہاں میری یہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' سرتاپا شرمندگی ہی شرمندگی۔

دفتر سے چھٹی لینے کے تمام بہانے بیان کرنے کے بعد ۔سبزی منڈی سے واپسی پہ ہونے والے تمام سوالات میرے تھے اور تمام جوابات اسد کے۔ تیسری بار بھی انگور نہ لانے پر شدید بحث جس نے بڑھتے بڑھتے اسد کے قیمتی پرفیومز اور میرے بیش قیمت ڈیزائنر لان کے سوٹ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا' جو طعنوں کی موسلا دھار بوچھاڑ کے بعد ہی اختتام پذیر ہوئی۔

یہ بچے ماں کی طرف دیکھتے تو آنکھیں نکال کے گھورتی۔ آواز دیتی' پکارتی تو کوئی اثر نہیں جیسے کانوں میں کپاس کی فصل اپنے جوبن پہ اُگ آئی ہو۔

ناچار دونوں کی پشت پہ ایک ایک مکا رسید کرنے اور گال پہ ایک ایک تھپڑ جڑنے کے بعد گھسیٹتے ہوئے دونوں کو دروازے سے اندر کیا۔ ردعمل کے طور پر بلند آواز بے سری بھاں بھاں رات گئے تک قوت سماعت کا امتحان لیتی رہی۔

شام کو اسد گھر لوٹے تو بتایا کہ چندا باجی (میری بڑی بہن) کی ساس علیل ہیں۔ ان کی عیادت کے لیے جانا ہے۔ اماں بی کی حالت واقعی ناساز تھی لیکن غیر تسلی بخش بھی نہ تھی۔ دراصل اسد اور میرے بہنوئی کی بہت بنتی تھی' ملاقات کا بہانہ بھی معقول تھا ویسے بھی دونوں ایک ہی منسٹری میں کام کرتے تھے۔ لہٰذا گپ شپ کا طویل دورانیہ چلتا تھا۔

چندا باجی لاکھ منع کرنے کے باوجود کچن میں چلی گئیں اور میں ان کی بیمار بزرگ ساس اماں کو تسلی و تشفی دینے لگی۔ اچانک ہی اماں جی نے رونا شروع کردیا' میں نے گھبرا کر ان کا سر اپنے کندھے سے لگالیا اور ان کے آنسو بھی اپنے "گل احمد" کے دوپٹے سے پونچھنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دل گداز لمحوں میں ان کا اگلا جملہ کیا ہوگا یہی کہ۔

"اگر تیری منگنی بچپن سے ہی طے نہ ہوتی تو میں تجھے اپنی چھوٹی بہو رانی بنالیتی۔ میری چھوٹی دلہنیا!"

اماں جی جب بھی ناک پونچھتے ہوئے یہ فقرہ ادا کرتیں تو میری روح سیراب ہوجاتی۔

زار و قطار روتے ہوئے اماں جی جب ملامت کا اظہار کرتیں تو میرا سارا احساس کمتری ختم ہوجاتا۔ اسد کے حوالے سے جتنے گلے شکوے دل میں دبا اور چھپا

کے رکھے تھے' سب اپنی موت آپ مرجاتے۔ چندا باجی کا دیور تھا ہی ایسا۔ لندن سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ملازمت امریکہ میں۔ ڈیوڈ کیمرون کی فوٹو کاپی اور آواز ہو بہو حمزہ عباسی کے جیسی۔ ابھی میں اماں جی کی اشک زدہ عینک اپنے دوپٹے کے پلو سے رگڑ رگڑ کے صاف کر ہی رہی تھی کہ چندا باجی ٹرے تھامے وارد ہوئیں۔ انہوں نے ایک مشکوک نظر مجھے اور ایک خشمگیں سی نظر میرے ہاتھ میں تھامے اماں جی کے چشمے پہ ڈالی۔

"اب بس بھی کرو کرن! چشمہ صاف کرنا ہے' مانجھنا نہیں ہے۔" چندا باجی نے قریب ہی تپائی پہ ٹرے دھرتے ہوئے تنک کے کہا۔

"اے ہے! ایسا تو خوبی ہے کرن بٹیا میں۔ برتن یوں رگڑ رگڑ کے دھوتی چمکاتی ہے گویا برتنوں کا مساج کر رہی ہو۔" اماں جی نے مجھے فوری تحفظ فراہم کیا۔

"جی اماں! بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اتنا رگڑتی ہے کہ کپ پلیٹ کا ڈیزائن بھی صاف ہو جاتا ہے۔" چندا باجی نے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی ساس کی تائید کی۔

مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ چندا باجی کی مدد کرنے کے خیال سے جب میں کچن میں چائے کے برتن سنک کی نذر کر رہی تھی کہ چندا باجی نے میرا بازو جکڑ لیا۔

"کرن! جانتی ہو کہ میری کام والی ماسی نے مجھ سے کیا پوچھا ہے؟" چندا باجی کی گرفت اب آہنی شکنجے میں بدل گئی تھی۔

"مم! مجھے کیا پتا باجی' کام والی نے پوچھا ہے' میں نے تو نہیں!" میں نے منمناتی ہوئی آواز نکالی۔

"کرن! میری کام والی مجھ سے یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کی ساس کے پاس کمرے میں جو لڑکی بیٹھی ہے' کیا وہ آپ کی نند ہے؟ کام والی کہنے لگی کہ وہ لڑکی آپ کی ساس کی بہت دلجوئی کر رہی ہے' ڈھارس بندھا رہی ہے' جلد از جلد صحت یابی کی دعائیں دے رہی ہے اور تو اور اماں جی کا سر اپنے کندھے سے لگائے ان کے آنسو پونچھ رہی ہے۔" چندا باجی پھٹ پڑیں۔ تو گویا چندا باجی کی ساس کو دعا دینا' چندا باجی کو بد دعا دینے کے مترادف تھا۔

لیجیے جناب! ایک کام والی ماسی رہ گئی تھی میری "عزت افزائی" میں اضافے کے لیے کمینی' پھاپھے کٹنی! افسادن اعلیٰ۔ چندا باجی کا اسٹائل مجھے خوب پتا تھا۔ جس سے دشمنی پال لی تو پال پوس کے ایسی پروان چڑھائی کہ ہر ایک سے دور کر دیا۔ تن تنہا "کالا پانی" کے جزیرے پہ بندہ تمام عمر اپنے رشتے داروں سے ملنے کو ترستا تڑپتا رہے اور سسک سسک کے جان دے دے۔ البتہ جان سے گزر جانے کے بعد سب سے پہلے ہماری چندا باجی ہی ایصال ثواب کے لیے دیگوں کے آرڈر دیتی ہیں۔

اف! جیب کی ٹھنڈی مار اور تنہائی کا عذاب اب میری راہ دیکھ رہا تھا۔ یعنی کام والی ماسی' چندا باجی کے لیے مجھ سے زیادہ معتبر تھی۔ ایک کام والی ماسی کے سوال اٹھانے پہ میری سگی بہن کو مجھ سے شکوہ ہوا تھا۔

✲ ✲ ✲

پیچے بھائی جان' میرے منجھلے بہنوئی بارہ تیرہ گھنٹوں کی طویل مسافت کے بعد رات گئے عزیز و اقارب کے گھروں میں چھاپہ مارنے کے لیے مشہور تھے۔ اپنا سفری بیگ ہمہ وقت تیار رکھتے لیکن اپنے سفری اوقات ہر کسی سے چھپائے رکھتے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ اسی شہر میں ان کی بڑی نخریلی آپا بھی تو رہتی ہیں یعنی میری منجھلی اپیا کی بڑی نند' مگر مجال ہے جو ذرہ برابر زحمت دی ہو' بس وقت بے وقت میرے گھر ہی ہلہ بولنا ہے اپنے ناز نخروں اور خونچلوں سمیت۔

رات کے اگر تین بجے تشریف آوری ہوگی تو اس وقت میرے لاڈلے بہنوئی کے لیے بھلا کس نے فروٹ منڈی یا سبزی منڈی کھولنا تھی۔ پیچے بھائی جان ہمیشہ تازہ اور فریش کھانے کی فرمائش کرتے تھے۔ میرے بچے بھی فریج میں کچھ بچا کچھا باقی رہنے ہی نہیں

دیتے۔ کھیل کے ایسے جنونی ہیں کہ گھر تو گھر اسکول بھی کھیلنے کودنے ہی جاتے ہیں۔ ہر کھیل میں ان کا نام درج ہے۔ رات کو سارا کھانا ہڑپ کر کے سوتے تھے اور کچھ نہ ملے تو کیچپ اور چاٹ مسالے کی خیر نہیں۔

بھائی جان سے تو اسد کی بھی نہیں بنتی تھی لہٰذا جیسے ہی پپے بھائی جان کی بے وقت آمد کی خبر ہوئی تکیہ منہ پہ لپیٹ کے خراٹے لینے لگے۔ اونہہ! گہری نیند سونے کی اوور ایکٹنگ۔ چاروناچار میں نے انڈوں کا خاگینہ بنا ڈالا اور تازہ آٹا گوندھ کے جیسے تیسے چپاتیاں اتار دیں۔ یہ "ایمرجنسی مینیو" دیکھتے ہی پپے بھائی جان کا موڈ آف ہو گیا۔ ڈیٹول کے بھبکے والا ڈائی تولیہ ہاتھ پونچھتے ہی صوفے کی پشت پہ اچھال دیا اور ڈائننگ چیئر زور سے کھینچ کے بیٹھ گئے۔ اتنے شور کے باوجود اسد کی آنکھ نہ کھلی۔ مجھے ہی پپے بھائی جان کے پاس بیٹھنا پڑا۔

"یہ بسکٹ روٹیاں تم نے بنائی ہیں؟ پانچ سال ہو گئے تمہاری شادی کو مگر روٹی ابھی تک بنانی نہیں آئی۔ ہاں بھئی! ساس کا ڈنڈا جو نہیں ہے سر پر۔ لگتا ہے اسد سے روٹیاں پکواتی ہو مگر وہ تو اس وقت سو رہا ہے!" پپے

بھائی جان نے اپنی مخصوص زکام زدہ آواز میں طنز میں بجھے تیر چلائے۔

میں چپ رہی کہ نہ تو بولنے کی طاقت تھی نہ جواب دینے کی ہمت۔ سرخ متورم آنکھیں، دکھتی کمر سر میں درد کی ٹیسیں سنبھالے میں دو گولی ڈسپرین کے متعلق سوچ رہی تھی جو درد کا فوری حل تھا۔

"تم لوگ سست بھی بہت ہو۔ تمہاری بہن کو بھی اگر ایک کپ چائے بنانے کا کہو تو اتنی دیر لگاتی ہے گویا چائے بنا نہیں رہی 'اگا' رہی ہے۔" پپے بھائی جان نے لمبی سی ڈکار لیتے ہوئے کہا۔

میری معصوم منجھلی آپا 'ساٹھ' کا ہندسہ تو اس کا مقدر ہی بن گیا تھا۔ روزانہ ان کے گھر میں جو بھی بنایا پکتا 'ساٹھ' کی تعداد میں ہی بنتا۔ بھری پُری سسرال اور کنجوس پپے بھائی جان کی نام نہاد فیکٹری کے نکھٹو ملازمین کے لیے۔

ساٹھ روٹیاں، ساٹھ کوفتے، ساٹھ کباب، ساٹھ گلاب جامن، ساٹھ پیالی چائے۔ آپا جانی کو بھی کیا پتا تھا کہ منگنی کے بعد سے شادی یعنی رخصتی تک کے درمیانی عرصے میں جو انہوں نے لپک لپک کے انواع و اقسام کے دیسی بدیسی پکوان اور مٹھائیاں اپنے منگیتر اور سسرال والوں کو متاثر کرنے کے لیے بنائے تھے، ان کے سبب آپا جانی کا اپنا شمار "متاثرین" میں ہونے والا ہے۔

میری پیاری آپا جانی اگر اپنے بارے میں سوچتیں تو آج بہت بڑے ریسٹورنٹ کی مالک ہوتیں۔ لیکن آپا جانی نے صرف اپنے لیے نہیں سوچا، اپنے لیے تو میری بڑی آپا نے یعنی چندا باجی نے بھی کبھی نہیں سوچا اس عمر میں بھی دیگر دیورانیوں جیٹھانیوں کے ہوتے ہوئے بھی دل و جان سے ساس سسر کی خدمت میں دن رات جتی رہتی ہیں۔ کولہو کے بیل کی طرح۔ پیچھے رہ گئی میں یعنی۔

"جیڑی وچاری کی کرے
تے ٹھنڈا پانی پی مرے"

سچ بتاؤں تو یہ چڑیا اپنے ان "پیاروں" کے بغیر زندہ بھی تو نہیں رہ سکتی۔ اپنے پیارے ہی تو جینے کی اصل وجہ ہیں تو پھر چہ جائے شکوہ؟ رشتے تو انمول ہوتے ہیں اور ہر رشتے کا اپنا حسن۔ یہ گلے شکوے لڑائی جھگڑے صلح صفائیاں، روٹھنا منانا نہ ہو تو زندگی پھیکی پھیکی سی محسوس ہوگی۔ بے جان، بے کیف اور بے حرکت۔

ہر انسان نایاب ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ لہٰذا آج میں اپنا پسندیدہ ترین اور "یادگار" شعر اپنے ان تمام پیاروں سے منسوب کرتی ہوں جو اپنے شکایت نامے میری ذات کے کمپلینٹ آفس میں "وقتاً فوقتاً" ارسال کرتے رہتے ہیں۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

☆

سیما بنت عاصم

کہانی بہت پرانی تھی

جب دودھ سوا روپے پاؤ۔۔۔ اور انڈا ساٹھ پیسے کا تھا۔ ریڈیو پر دن گیارہ سے ایک بجے تک فرمائشی پروگرام چلتا۔۔۔ اور رات آٹھ بجے۔۔۔ ٹی وی ڈراما۔۔۔ اس پر گلیاں سنسان پڑ جاتیں کچی بستی کی۔۔۔ ٹیڑھی میڑھی تنگ گلیوں کے۔۔۔ ایک پرانے مکان

ناولٹ



میں یکے بعد دیگرے بیاہ کر آنے والی دو بہویں۔۔۔ زبیدہ اور مہر النساء۔۔۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دونوں میں کبھی ایک پل نہ بنی۔۔۔ لد گئے وہ زمانے۔۔۔ جب مہو نے۔۔۔ زبیدہ کو دوپٹا بدل کر بہن بنایا۔ اور پھر بڑے چاؤ سے اپنے اکلوتے دیور کی دلہن بنا کر بیاہ لائیں۔

اب تو دونوں۔۔۔ ایک دوسرے کے نام سے بھی خار کھاتیں۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھتیں۔۔۔ آئے روز کے جھگڑے فساد معمول تھے۔ اس پر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور نیچا دکھانے کا وہ عالم۔۔۔ کہ الامان الحفیظ۔۔۔ صحن کے درمیان پڑے تخت پر دونوں جانب کے باورچی خانوں سے اٹھتی مہک جاتی۔ زبیدہ کے ہاں۔۔۔ ذرا جو ڈھنگ کی ہنڈیا چڑھتی۔۔۔ ڈوئی زور و شور سے بیچ کر جھاڑی جاتی۔۔۔ بہ آواز بلند چٹخارے لیے جاتے۔۔۔ ادھر دوسری بھی اپنے نام کی ایک۔۔۔ چھت پر ٹنگے کپڑوں کے نمونے تک اتار لیتیں۔۔۔ پھر وہی پہن کر اتراتی پھرتیں۔۔۔ چاہے دیورانی لاکھ کلستی۔۔۔ کبھی کبھی تو یہ ہوتا کہ اس پار کا آیا گیا۔ اس پار بھٹک گیا۔ اور دیکھیے جناب۔۔۔ نکل گیا سارے اخلاق و مدارات کا جلوس۔ اٹھائی چپل اور پھر محلے والوں کے بھی محلے والے تماشا دیکھتے۔۔۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک فتنہ و فساد۔۔۔ آگ لگانے کی ماہر، زبان درازی کے ہنر میں طاق۔۔۔ ان کے مزاج مختلف مگر قسمتیں ایک سی۔۔۔ کم آمدنی۔۔۔ بچوں کا ڈھیر، مسائل کا انبار۔۔۔ کچھ وقت گزرا۔۔۔ گھر کے درمیان آخر کار دیوار اٹھ ہی گئی یہ اور بات کہ دیواریں لاکھ بلند ہوں۔۔۔ چور دروازے بھی کھل ہی جاتے ہیں۔۔۔ بچے چھپ چھپ کر کھیلتے۔۔۔ امائیں للکار کر گھسیٹتیں۔



وہ پھر ایک ہو جاتے۔۔۔ غضب تو یہ ہوا کہ۔۔۔ اس آئے روز کی دھکم پیل۔۔۔ چیخم پکار۔۔۔ اٹھا پٹخ کے باوجود محبت پھوٹ نکلی۔۔۔

✡ ✡ ✡

بات تو چھوٹی سی تھی۔ بڑھ کر فتنے کی شکل اختیار کر گئی۔

تایا جی کا ٹھکانہ۔۔۔ صحن کی درمیانی دیوار تلے دھرا تخت تھا۔ اس روز تایا جی دم لگا کر پڑے تھے۔ دیوار پار سے اٹھتی پکاروں پر کون کان دھرتا۔۔۔ رات بھر پیر پسار کر پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لیے۔۔۔ اور اگلی صبح پنکھا کندھے پر لادے۔ مرمت کے لیے۔۔۔ لے جا رہے تھے۔ دو لہٹیچ کی آنکھ مچولی سے پنکھے کی وارننگ تو اڑی۔۔۔ ساری گھر بھر کی وارننگ بھی کام میں آ گئی۔ دو گھروں کا چولہا چوکی الگ۔۔۔ مگر دیگر مد میں سانجھا تھا۔۔۔ گیس بجلی کے بل۔۔۔ گھر کی مرمت۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

سو اک زبانی کلامی معرکہ تیار تھا۔

مظہر نوکری کی تلاش میں تھا۔ اب بھی زمانے بھر کی خاک چھان کر لوٹا تھا۔ عاشی نے اسے آتے ہی خبر دی۔

"آج امی اور تائی کی پھر جنگ ہوئی۔"

"اچھا۔۔۔!" اس نے سنتے ہی کھیسیں نکال دیں۔

"کون جیتا کون ہارا؟"

"مقابلہ برابر رہا۔ ابا نے بیچ بچاؤ کرایا۔"

"حق باہ۔۔۔ چچا نہ ہوئے۔ ریفری ہو گئے۔"

بھاری تن و توش کے چچا میاں۔ چلتے تو پیٹ آگے چلتا۔ ان کے برعکس منحنی سے تایا جی۔۔۔ پھونک مارو تو اڑ جائیں۔ لگتا ہی نہ تھا کہ بھائی بھائی ہیں۔

"برا کیا۔۔۔ ذرا دیکھنا تو تھا۔۔۔ زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔"

"اف خدایا۔۔۔ میں تو امی کو گھسیٹ گھسیٹ کر تھک گئی۔"

"کس خوشی میں۔۔۔ تمہیں تو چاہیے تھا۔ ایک بار چچی کے گلے میں ڈالتیں۔ اور کہیں سے کوئی جوتی اٹھا کر امی کو پکڑا دیتیں۔"

"تمہیں شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔۔۔؟" اس بار وہ برا مان گئی۔

"چچ چچ۔" "انہیں تو چاہیے تھا۔ ایک دوسرے کو ہار پہناتیں۔ بلائیں لیتیں۔"

"جانے آج کیا دیکھ کر دن طلوع ہوا تھا۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ آج طلوع ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ میرا دن تو تمہیں دیکھ کر طلوع ہوتا ہے نا چڑیل۔"

"اچھا لنگور۔۔۔" وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی فی الفور حساب چکتا کیا۔

"اب میری شکل اتنی بھی اچھی نہیں ہے۔"

"بری بھی کہاں ہے۔ اور کاش بری ہی ہوتی۔۔۔ تو کاہے کو دل تم پر آتا۔ اس قدر کشش ہے تمہاری اداؤں میں۔ ہم اگر تم ہوتے۔۔۔ تو خود سے عشق کر لیتے۔" عادت کے مطابق اول فول ہانکی۔

"ہو تو تم کسی چڑیل کے ہی قابل۔" اس نے چڑایا۔

"تب ہی تو تم پر فدا ہوں۔" وہ کون سا کم تھا۔

"عاشی! اری کہاں مر گئی کم بخت مردار۔۔۔"

امی کی پکار پر وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی نیچے آئی تھی۔ تو امی سر نیہواڑے افسردہ سی منے کو لیے بیٹھی تھیں۔

"میرے منے کے پیر میں کانٹا چبھ گیا۔!"

"آئے ہائے۔۔۔ وہ کانٹا آپ کو کیوں نہ چبھ گیا؟" وہ امی کے غم میں برابر کی شریک۔۔۔ منہ پھیر کر ہنسی۔

"کم بخت تو میرے بچوں کی دشمن ہے۔ مردار۔" امی کو اس کی اچھی بھلی شکل سے بھی خار تھا۔

"لے سنبھال اسے۔" انہوں نے بھاں بھاں کرتے دو سالہ منے کو پکڑانا چاہا۔ تو وہ ٹھنک گئی۔

"ہر وقت روتا رہتا ہے۔ یہ کبھی چپ نہیں ہو گا۔"

"ہاں ہاں تو تو جیسے ہنستی ہوئی پیدا ہوئی تھی نا۔ لے سنبھال اسے۔۔۔ اور دلیہ پھٹک کر رکھا ہے۔ چڑھا دینا۔"

"امی پھر دلیہ۔۔۔ میں نہیں کھاتی دلیہ۔" (بچہ)
"نہیں کھاتی۔۔۔ جا نہیں کھا۔" ادھر پروا کسے تھی۔

"اری کم بخت۔۔۔ تیرے لیے کیا آسمان سے تھال اترے گا۔ تیرے باپ کی کمائی میں دال دلیہ بھی چل جائے تو بہت ہے۔"

"ابا کی ساری کمائی تو تم کمیٹیوں میں پھونک دیتی ہو۔ اور بچوں کے لیے دال دلیہ۔"

"ارے کمیٹیاں نہیں ڈالوں گی تو تیرا پہاڑ جیسا بوجھ کیسے سرکے گا؟" سولہ سال کی ہو گئی۔ دو چار سال اور گزر گئے۔ تو میری نیندیں بھی اڑ جائیں گی۔"

"کیوں۔۔۔ میں زیادہ موٹی ہوں۔۔۔ یا زیادہ کھاتی ہوں۔ آٹے کی بوری بھی بھاری ہو گی مجھ سے تول کر دیکھ لو۔"

"ہوری چل چل' زیادہ باتیں نہ بنا۔۔۔ اپنا کام کر اور خبردار جو تو نے میرے بچوں کو ہاتھ بھی لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" وہ برقع سنبھال۔۔۔ جوتیاں گھسیٹتی حسب عادت گھر گھر جھانکنے نکل کھڑی ہوئیں۔

✿ ✿ ✿

تائی جی کے دروازے پر بڑی دھم دھم تھاپ پڑی تھی۔ ادھر چاچی کا چار سالہ گڈو تھا۔

"کون ہے۔۔۔؟" دروازے تک مظہر گیا تھا۔

"میں ہوں۔۔۔ گڈو۔۔۔ دروازہ کھولو۔"

"کون؟ بھک منگا۔۔۔ جاؤ' جاؤ معاف کرو۔ ابھی کھلے پیسے نہیں ہیں۔" مظہر نے مزہ لیا۔

"میں گڈو ہوں۔۔۔ گڈو۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ دیکھو میری انگلی۔" اس نے دروازے کی درز سے اپنی ننھی سی انگلی اندر دے کر یوں ہلائی۔ جیسے مظہر انگلی سے بوجھ جائے گا کہ یہ گڈو کی ہی انگلی ہے۔۔۔ وہ منہ پھاڑ کر ہنسا اور کھٹ سے دروازہ کھول کر گول مٹول گڈو کو اٹھا کر پیار کیا۔ وہ بسور۔۔۔ نے لگا۔

"بھاء۔۔۔ درد ہو رہا ہے۔" بانگڑی نے مارا۔۔۔"

بانگڑی۔۔۔ (میدان کی جھگیوں کے خانہ بدوشوں کا

"کیوں مارا میرے چاند کو۔۔۔؟"

"کہتا تھا۔۔۔ جا دفع ہو جا۔۔۔" اور پھر گڈو۔۔۔ کہاں جاتا۔ ملا کی دوڑ مسجد تائی اور چاچی کے مابین ہزار معرکوں میں سو کی ایک خوبی یہی تھی۔۔۔ کون نہیں جانتا تھا کہ ان کی زبانوں میں پٹاخے فٹ تھے۔ یہ پٹاخے پھوٹتے تو۔۔۔ دور دور تک شور مچتا اور جب پھس ہوتے تو لگتا کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا۔۔۔ وہ سب پھر جڑے نظر آتے۔۔۔ خواہ یہ اڑیل سہیلی خواتین جلتی کلستی پھریں۔ تائی کو پروردگار نے کافی وقفوں سے بچوں سے نوازا۔۔۔ جبکہ زبیدہ کے عاشی کے بعد آٹھ سے دو سال تک۔۔۔ ہر سائز کا ماڈل تھا۔۔۔ چنو منو۔۔۔ گڈو' پپو' گڑیا رانی وہ سب ایک ساتھ کھیل کود کے پلے بڑھے تھے۔ وہ ان سب کی تائی تھیں۔۔۔ تو جگت تائی بن گئیں۔"

"اب گڈو نے اسٹارٹ لیا تھا۔" بانگڑی کو کب مارو گے؟"

"بس ایک بار تو اسے گھیر کر لے آ۔۔۔ پھر دیکھ۔"

"جمعرات کو لے کر آؤں گا۔۔۔ کہوں گا ہماری تائی کے نا۔۔۔ چاول کھلائے جا رہے۔۔۔ ہیں۔۔۔ آ۔۔۔ چل رہا ہے؟"

وہ اسے چمکارتا۔۔۔ اندر لے آیا۔۔۔ ابا کے حوالے کیا۔

"تایا جی۔۔۔ پیسے دے دو۔۔۔" گڈو ٹھنکا۔

"ہائیں۔۔۔ ایسی باتیں نہ کیا کر تو۔۔۔ دل دکھانے والی۔" تائی نے بڑھ کر گڈو کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ پھر اسے چھت کی طرف بڑھتا پا کر ہانک لگائی۔

"اے۔۔۔ کہاں چلا۔۔۔ ناشتا تو کر لے۔" مگر اس نے چھت پر کپڑے پھیلاتی عاشی کی جھلک پا لی تھی۔ اس نے سرعت سے جا لیا۔ اوٹ پٹانگ ہانکی۔

"سانس تو لینے دیا کرو جی۔۔۔ آنکھ کھلتے ہی سامنے آتے ہو۔" دونوں گھروں کی چھت مشترکہ تھی۔ جہاں محبت پلتے پنپتے جڑ بنا چکی تھی۔

"دن چڑھ گیا۔ تمہاری صبح اب ہوئی ہے۔۔۔؟"

"ان بادلوں میں مسیج ہی بھجوا دے۔"
"ان بادلوں سے بچ کے رہنا۔ تم پر برس ہی نہ پڑیں۔"
"کوئی تو برسے... بادل ہی سہی۔" وہ سمجھ کے مسکرایا۔
"بادل خالی مکانوں پر نہیں برستے۔" عاشی نے چڑایا۔
مظہر کی بے کاری نہ بھی ہوتی تو ان دونوں کی نوک جھونک چلتی ہی تھی۔ تایا جی نے لاکھ سر پٹخا کہ وہ ان کا آبائی کام کوٹ پینٹ کی سلائی سیکھ لے۔ اس نے ایک نہ سنی... بارہ جماعتیں پاس کر کے ہی دم لیا۔ جواب گلے پڑ گئی تھیں۔
"ویسے وقت کیا ہوا ہے؟" مظہر نے پوچھا۔
"بارہ بج رہے ہیں۔"
"تمہارے فٹے منہ کا وقت نہیں پوچھا ہے میں نے۔" اس نے بھی چڑایا۔
"کل رات دیوار پار سے حلوے کی بڑی اچھی خوشبو آرہی تھی۔"
"وہ ای چھینکے پر رکھنا بھول گئیں۔ پھینکنا پڑا۔"
"ہائیں... ہمارے ہاں تو جو چیز سڑ جائے محلے میں بٹوا دیتے ہیں۔"
"سچ سچ مجھے پتا ہوتا تو تمہارے حلق تک میں ٹھونس دیتی۔"
"سچی... بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔"
"میرا خون پی کر اور بھیجا کھا کر بھی تم بھوکے کے بھوکے۔ ابھی کچھ نہیں مل سکتا۔ ای نعمت خانے میں تالا ڈال کے گئی ہیں۔"
"تمہاری اماں کا تکو گھر میں کیوں نہیں ٹکتا...؟"
"تمہاری اماں کا کون سا ٹکتا ہے؟"
"میری اماں کو ہزار کام ہیں۔ تمہاری اماں کی طرح گھر گھر جھانکتی نہیں پھرتیں۔"
"ہاں... ہاں سارے کارخانے ان ہی کے دم سے تو چلتے ہیں۔ تمہارے ابا دم لگا کر اوندھے پڑے رہیں گے تو تائی کو ہی دوگنا کام کرنا پڑے گا۔"

ان کی تکرار جاری تھی کہ مظہر کا بلاوا آگیا۔ اس کا کوئی دوست تھا۔
"اچھا میں ناشتا کر کے نکلتا ہوں۔" اس نے چھت سے نیچے جھانک کے ہانک لگائی۔
"ارے ناشتے کو مار گولی۔ میرے ساتھ چل۔" وہ دھڑ دھڑ نیچے اترا تو تائی جانے کہاں تھیں... وہ عجلت میں نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"آگئے...!" تائی نے میاں کی شکل پر نظر پڑتے ہی طنز کا ڈھیلا پھینکا "اور وہ کہاں ہے؟"
"وہ کون...؟"
"ارے... میرا جگر گوشہ...؟"
"مجھے کیا پتا... میں کیا اسے دم سے باندھ کے پھرتا ہوں...؟" انہیں بیوی کا لاڈلا ایک آنکھ نہ بھایا۔ باپ بیٹے کی ایک پل نہ بنتی۔ مگر وہ مظہر سے دبتے بھی تھے۔
"ارے خبر تو لے لیا کرو میرے لال کی۔"
"کیوں... وہ دودھ پیتا بچہ ہے؟"
"ارے تم باپ ہو اس کے...؟"
"اچھا مجھے تو پتا ہی نہ تھا۔ خبر تو مجھے تمہاری لینی چاہیے۔ جس نے لاڈ کر کر کے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔"
"اچھا! یہ بات اس کے سامنے کہنا۔"
"ہاں ہاں جاؤ کہہ دو۔ ڈرتا نہیں ہوں میں اس سے... اس کی کھال میں بھس بھر کے میں اسے الٹا لٹکا دوں گا۔"
گھر میں گھستے مظہر کے کانوں میں ان کا آخری جملہ پڑا تھا۔ وہ یک دم ان کے سامنے آگیا۔
"آپ نے میرے لیے کچھ کہا؟"
اس پر نظر پڑتے ہی ان کی ٹون بدل گئی۔
"ارے میرا بیٹا! میرا چاند... میں تجھے تھوڑی کچھ کہہ رہا تھا۔"
"تو کیا دیواروں کو کہہ رہے تھے...؟"
"ارے رہنے دے بیٹا... ایسے ہی سو رہا ہوتے تو

کا۔ ہے کو دنیا کے جوتے' لاتیں کھاتے پھرتے۔" روٹی بڑھاتی تائی جھلائی تھیں۔

"جوتے لاتیں کھائے تو۔۔۔ اور تیرے ہوتے سوتے۔ اک روز تم مجھے پوجو گے۔ جس روز میرا کاروبار چل پڑا۔"

"ارے کیا ہواؤں میں چلتے ہیں کاروبار۔ تمہارے پلے ہے ہی کیا۔"

"تو دیکھتی جا۔۔۔ اک روز میں تجھے ایسی مالا دوں گا کہ تو راتوں رات مالا مال ہو جائے گی۔"

"ہونہہ اوقات دو ٹکے کی اور باتیں بڑی بڑی۔"

"خاموش ہو جا۔۔۔ کم بخت ماری۔۔۔ ایسا رکھ کے جھانپڑ دوں گا۔۔۔ بغیر ٹکٹ اپنے میکے پہنچ جائے گی۔"

"ای ابا کی تکرار جاری تھی۔۔۔ وہ بھنا کر چھت پر چلا آیا۔ ایک پتھر تاک کر رابو والے آنگن میں پھینکا۔

✲ ✲ ✲

ایک پتھر کھٹاک سے صحن میں آکر گرا اور عاشی نے ململ کا کاسنی دوپٹا سر پر جمایا۔۔۔ "بارش کے آثار ہیں۔ ای چھت سے اچار کا مرتبان لے آوں؟"

"اے لڑکی۔۔۔ تیرے پیروں میں اسپرنگ لگے ہیں کیا۔ گھر کا کام کرتے تو تیری جان جاتی ہے ہر وقت چھت پر ٹنگی رہتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو۔۔۔ تو چھت پر گئی تھی۔"

"ای دھلے کپڑے چھت سے اتارنے گئی تھی۔"

"اری تو کتنا جھوٹ بولتی ہے۔ ابھی کپڑے پھیلائے دیر کتنی گزری ہے۔"

"اوہو۔۔۔ ای ایک تو تم ہر وقت کوستی پیٹتی رہتی ہو۔ اور کچھ کرنے کا پوچھو۔۔۔ تو جان کو آجاتی ہو۔۔۔ پڑھنے لکھنے تم نے نہیں دیا۔ بس کام میں رگڑتی ہو۔"

"اری پڑھ لکھ کر تو کون سی افسر لگ جاتی۔ پکانی تو تجھے روٹی ہی تھی نا۔"

"وہ تو اب بھی مجھ سے ڈھنگ کی نہیں پکتی۔"

"سسرال کے جوتے پڑیں گے تو خود بخود ڈھنگ کی آجائے گی۔۔۔ سسرال کی روٹی بڑی مہنگی پڑتی ہے۔۔۔ یاد رکھیو۔"

"ای۔۔۔ کبھی کوئی اچھی بات بھی منہ سے نکال لیا کرو۔"

"اچھا جا۔۔۔ مگر یاد رکھیو۔۔۔ نیچے آکر روٹی پکانی ہے۔"

"اور وہ اگلی ہی جست میں چھت پر تھی۔ جہاں وہ دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھا تھا۔

"بے وجہ بن گئے۔ ہم تم۔۔۔ اور تم ہم ہو گئے۔"

"اف خدایا۔۔۔ کہیں ہو ہی نہیں جائے تمہیں۔۔۔ مجھ سے اتنی محبت۔"

"تم کہو تو سہی' میں تمہارے لیے چاند تک توڑ کر لا سکتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ راکٹ پر جانا پڑے گا۔ آسمان پر جا کر کوئی واپس آتا ہے کیا۔" اس نے چٹخارہ لیا تو وہ برا مان گیا۔

"میری محبت کا مذاق مت اڑاؤ۔ تم دیکھنا۔۔۔ ایک روز میں تمہارے لیے۔۔۔ اک محل بناؤں گا۔۔۔ اس میں تمہیں شہزادی بنا کر رکھوں گا۔"

وہ منہ پھیر کر ہی ہی کرنے لگی۔ "خیالی پلاؤ۔"

"آج سورج کیوں طلوع نہیں ہوا۔۔۔؟"

"تجھے کیا پتا۔۔۔ میں کیا ڈاکو ہوں۔"

"ڈاکو نہیں چور۔۔۔ میرے دل کی چور۔۔۔ اب بتاؤ حلوہ کب کھلاؤ گی۔"

"جس دن تم نے کوئی شعر ڈھنگ سے پڑھ لیا۔"

"تالو نہیں۔۔۔ بتاؤ نا۔۔۔"

"تمہیں کھانے۔۔۔ اور سونے کے سوا بھی کچھ آتا ہے؟"

"آتا ہے نا۔۔۔ پیار۔" وہ نظروں میں لگاوٹ بھر کر جھکا۔

"خالی۔۔۔ خولی پیار سے پیٹ نہیں بھرتا۔۔۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آج خالی خولی پیار سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ میرے لیے کچھ لے کر آؤ۔۔۔"

"تائی جی کے جوتے کھالو۔ گرما گرم کرارے۔۔۔ مزے دار۔"

"مجھ سے شادی کرلو۔ پھر مل کر کھائیں گے۔" وہ

اپنے نام کا ایک تھا۔ اس نے آلو کے پراٹھے رکھے تھے۔ اچار کے ساتھ لا کر سامنے رکھ دیے۔ جسے بغیر ڈکار ہضم کر کے وہ پھر بھوکے کا بھوکا۔

"ابا کے پراٹھے تھے۔ دو روٹیاں کم پڑ جائیں تو شور مچا دیتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ اس عمر میں لوگ ایسے ہو ہی جاتے ہیں۔"

"تم میرے ابا کو سٹھیایا ہوا کہہ رہے ہو؟"

"میں تو اپنے چاچا کو کہہ رہا ہوں۔ دیکھنا ایک روز وہ دنیا کو پتھر مارتے نظر آئیں گے۔"

"کم بخت۔۔۔ کالی زبان کے۔۔۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔"

"جا رہا ہوں۔۔۔ مگر کل پھر آؤں گا۔" وہ ہنستا ہوا زینہ اتر گیا۔ عاشی کی ناراضی کتنی دیر چلتی۔ یہ وہ بھی جانتا تھا۔ عاشی نے ہر کام چیخ چلا کر اور چیزیں پٹخ پٹخ کر کیا اور وہ مزے سے آنگن میں پیر پسارے اونچی آواز میں ریڈیو سنتا رہا۔

کیا ہے جو پیار تو پڑے گا نبھانا
رکھ دیا قدموں میں دل نذرانہ
قبول کر لو۔۔۔ ہائے ہائے قبول کر لو

✲ ✲ ✲

مظہر گھر میں داخل ہوا تو امی اپنے لاڈلے بلو کو ولار سے میٹھے چاول کھلا رہی تھیں۔

"ارے مجو۔۔۔ اچھا ہوا تو آ گیا۔ میں تیرا ہی راستہ دیکھ رہی تھی۔۔۔ جا ذرا۔۔۔ بلو کو گنجا کرا لا۔"

"یہ کوئی میرا کام ہے۔۔۔؟ وہ چڑا۔ "میں نہیں جاتا۔"

"تیرا تو باپ بھی کرے گا۔"

"تو کرا لو پھر ابا سے۔" "وہ پڑے کونے میں۔۔۔ دم لگا کے۔" اس نے تخت پر اوندھے پڑے ابا کی طرف اشارہ کیا۔

ان کی ٹون بدلی۔ "میرا بیٹا۔۔۔ میرا چاند۔۔۔ گرمی پڑ رہی ہے۔۔۔ چلا جانا۔"

ابا اسی دم لوٹ لگا کر اٹھے تھے۔ مظہر پر نظر پڑتے ہی اپنی جھنجلاہٹ اس پر اتاری۔

"او تم کوئی گدھا گاڑی ہی چلا لو۔ کیا آوارہ گھومتے رہتے ہو۔۔۔؟"

"آئے ہائے۔۔۔ گدھا گاڑیاں چلائیں اس کے دشمن۔۔۔" دو سالہ بلو ہر بات کو دہراتا۔۔۔ اب بھی کہا۔

"آئے ہائے۔۔۔ گاڑیاں چلائیں۔ اس کے دشمن۔"

"رٹو توتا۔۔۔" مظہر نے اسے چھیڑا۔ "سویا نہیں تو؟"

"ایں۔۔۔ ایں۔" اس نے ہاتھ سے ابا کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا یہ سو گئے؟ پر تو نہیں سویا۔" اس نے گدگدایا۔

"ارے میرے باپ تو اسے مت چھیڑ۔۔۔ تو تو اسے چھیڑ کر غارت ہو جائے گا۔ یہ میرا جینا حرام کر دے گا۔"

بلو نے چاول کے پیالے پر ہاتھ مارا۔ چاول بکھر گئے۔۔۔ امی نے اسے ایک دھپ لگائی۔۔۔ "بے غیرت۔"

"بلو۔۔۔ تو بے غیرت ہے۔" مظہر نے پھر مزہ لیا۔

"ہاں۔۔۔" بلو نے شدومد سے منڈیا ہلائی۔

دیوار پار سے یہ تکرار زبیدہ نے سن کر سر جھٹکا۔

"ایسے ہی۔۔۔ باپ کی طرح جوتے لاتیں کھاتا پھرے گا۔ ارے 'یہ کچھ کر کے دکھانے۔۔۔ والا نہیں ہے۔ میری بات لکھ کر رکھ لو۔"

"امی۔۔۔ نوکری ملے گی تو کرے گا نا۔"

"ارے نوکری کیا کوئی تھال میں سجا کر گھر دینے آئے گا؟"

"یہ بھی ایک خوبی ہوتی ہے۔ انسان اتنا قابل ہو کر اس کے قابل ہونا مشکل بن جائے۔۔۔ ایک نہ دو پوری بارہ کلاسیں پاس کی ہیں۔"

"بارہ کلاسیں پڑھ کر افسر تو لگنے سے رہا۔ گدھا گاڑیاں بھی تو انسان ہی چلاتے ہیں۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ بارہ

کلاسیں پڑھ کر بڑا تیر مارا۔"

"یہ بارہ کلاسیں کیسے پڑھائی جاتی ہیں۔۔۔ ذرا پوچھو جا کر تائی سے۔"

"ارمی چل۔۔۔ چل شکل غرق کر سالے تائی کی لگتی۔۔۔ وہ لاجواب ہو کر چڑ گئیں۔ معاملہ (اُنبازی) کا نہ ہوتا تو مظہر ہیروں میں تولے جانے قابل لڑکا تھا۔

"دیسی گھی کے لڈو ہیں۔ ٹیڑھے ہیں تو کیا ہوا۔" وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔۔۔ اور امی جلتی کلستی رہیں۔

☆ ☆ ☆

"آج تو بڑی کمال کی لگ رہی ہو۔۔۔"

"میں نہ کمال کی ہوں نہ جمال کی۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ تم پاگل ہو۔۔۔ اور میری ہو بس!" اس نے ہمیشہ کی طرح اوٹ پٹانگ ہانکی "لڑکی لُو مجھے آج تک کبھی بری نہیں لگی۔"

"نوکری نہیں ملتی۔ تو چھوکری تو دور کی بات۔" وہ جل مری۔

"نوکری ملنی چاہیے۔۔۔ جانِ جگر! چھوکریاں بہت۔"

"ہونہہ، شکل دیکھی ہے آئینے میں۔۔۔؟"

"آئینہ پہلے سے ٹوٹا ہوا ہے۔ ہم تو اپنی شکل۔۔۔"

"جوتے میں دیکھتے ہیں۔۔۔" عاشی نے سرعت سے بات اچکی تھی۔ اور وہ بھی کہاں ہارنے والوں میں سے تھا۔

"جی ہاں۔۔۔ جسے ایک روز آپ چمکائیں گی۔"

"ہونہہ۔۔۔ جاؤ جاؤ۔۔۔ منہ دھو کے آؤ۔"

"ویسے ہی ہزار آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ منہ دھو لیا تو قیامت ہی نہ آجائے کہیں؟"

"ہاہ۔۔۔ دنیا میں اگر خوش فہمی نہ ہوتی تو بے وقوف کیسے زندہ رہتے۔"

"جیسے تم زندہ ہو۔۔۔ ہاہا۔۔۔"

اس کے انداز میں ایسا مسخرا پن تھا کہ عاشی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کل رات دیوار پار سے بڑی اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ چچی کیا پکا رہی تھیں؟"

"تم کیا دیوار سے ہی ناک لگا کر بیٹھے رہتے ہو۔۔۔؟"

"تو اور کیا۔۔۔ بتاؤ نا۔۔۔"

"سوئے قسمت۔۔۔ کباب۔"

"واہ۔۔۔ ان کبابوں میں سے کسی ایک پر میرا نام ضرور لکھا ہوگا۔ ذرا لے کر آنا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کباب واقعی ایک ہی بچا تھا۔

"سوچ کیا رہی ہو۔ یار کچھ کھلا دو۔۔۔ امی نے آج پھر روٹی بند کر دی۔ سچ تمہارے ہاتھ کے پراٹھے کا جواب نہیں۔۔۔ اور اگر ساتھ کباب بھی ہو تو۔۔۔ واہ واہ مزا آجائے۔" وہ مسکہ نہ بھی لگاتا تو عاشی کو اس کی رونی صورت پر رحم آ ہی گیا تھا۔ چھینکے میں کچھ انڈے رکھے تھے۔ اس نے دو انڈوں کا آملیٹ بنا کے۔ پراٹھے کے ساتھ سامنے لا رکھے۔ ساتھ ایک کباب بھی۔

"یہ پراٹھا ہے۔۔۔؟" اس نے پراٹھا اٹھا کر لہرایا۔

"میری اماں کی روٹی۔۔۔ ایسی لاجواب ہوتی ہے۔ اور یہ انڈے؟ اف 'ان انڈوں سے تو ٹنڈے اچھے۔"

"تو جاؤ پھر۔۔۔ اپنی اماں کی روٹیاں توڑو۔۔۔ مفت کی۔ اور ٹنڈے کھاؤ۔"

اس نے پلیٹ اپنی طرف سرکانی چاہی تو اس نے جھپٹ لی۔

"ارے بھوکے کو تو چاند بھی روٹی نظر آتا ہے۔ یہ تو پھر پراٹھا ہے۔۔۔ تم بھی کھاؤ گی۔۔۔؟" اس نے یوں پوچھا کہ کہیں وہ ہامی ہی نہ بھر لے۔

"کھلاؤ گے تو کھالوں گی۔۔۔"

"پھر اس سب کے تین حصے ہوں گے۔ دو حصے میرے ایک حصہ تمہارا۔"

"تم سارا کھالو۔۔۔" اس کی جان جل کر رہ گئی۔ اس نے خاک پروا نہ کی۔ مزے لے لے کر سب ہڑپ کر گیا۔ کچھ ہی دیر میں خالی پلیٹ منہ چڑا رہی تھی۔ وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"ضد پر آجاؤ تو کسی کی نہیں سنتیں۔۔۔ بالکل اپنی اماں پر گئی ہو۔ اڑیل ٹٹو۔۔۔" اس نے پیٹ بھرتے ہی

صلہ دیا۔
"اور تم اپنے ابا پر...."
"امی کہتی ہیں میں کبھی کوئی کام ڈھنگ سے کر ہی نہیں سکتی۔"
"ٹھیک ہی تو کہتی ہیں... دیوار پار سے سب پھٹکاریں سنتا ہوں۔"
"ھاہ... نمک حرام... نکالو میرے انڈے پراٹھے۔"
"تم سے لیے جائیں تو لے لو...." وہ ہنستا ہوا اتر گیا۔
"رات امی نے انڈے ٹٹولے تو دو کم... انہوں نے مشکوک نظروں سے عاشی کو گھورا۔ اور وہ صاف مکر گئی۔
"مجھے کیا پتا... میں کیا ان انڈوں پر بیٹھی... میرا مطلب ہے... رکھوالی کر رہی تھی...؟"
"ارے تجھے سب پتا ہے۔ جا آج رات تیرا کھانا بند۔"

انہوں نے سچ مچ اس کا کھانا بند کر دیا۔ رات تک اس کا پیٹ دہائیاں دینے لگا۔ اور وہ چھت پر بیٹھی سوچتی رہ گئی۔
مظہر اگر کسی دھندے سے لگا ہوتا تو ہم ساتھ مل کر کسی ہوٹل سے نہ سہی... کسی چھابڑی والے سے کچھ کھا لیتے۔ میں لاڈ سے اٹھلا کر اس سے چھولے کی چاٹ کی تو فرمائش کر ہی دیتی... یا پھر چٹ پٹی سموسے۔ کیا بڑھیا اور چٹ پٹی سموسے اتارتا ہے... فی الحال بالی یہ بھی نہ سہی... وہ مجھ سے اتنی محبت تو کرتا ہی ہے کہ... میری خاطر راہ چلتی مرغی ہی پکڑ کر بغل میں داب لے... ہائیں!" خیالات کی رو بھٹکنے پر وہ سٹ پٹا اٹھی۔ بھلا کیوں وہ مرغی چرائے... مرغی چرائیں اس کے دشمن... لیکن اگر اسے اچھی نوکری مل بھی گئی۔ تو کیا تائی اسے ہنسی خوشی اپنی بہو بنا لیں گی؟ ہر گز نہیں
دیوار پار کے معرکے عرصہ ہوا معمول پر تھے۔ امی زبان درازی کے فن میں طاق... اور عاشی ان کا سیدھا ہاتھ... کئی بار تائی سے دوبدو ہوئی... اور پٹتے پٹتے بچی... وہ تو امی آڑے آجاتیں... حق ہاہ۔ کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے۔

☼ ☼ ☼

"مجو... او مجو... او تیری ماں مرے 'اٹھ جا....'"
مظہر کے لیے تائی کی یہ پھٹکاریں نئی نہ تھیں... وہ کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔
"ارے کم بخت 'بارہ بج گئے۔'" اس بار بیلن کام میں آیا۔
"تو کیا پہلی بار بجے ہیں۔ دن میں دو بار بجتے ہیں۔" مظہر جھلایا۔ بیلن اس کے سر پر پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر میں دیوار پار سے ریڈیو کی کان پھاڑتی آوازیں اٹھنے لگیں۔
کان میں جھمکا چال میں ٹھمکا کمر پہ چوٹی لٹکے
ہو گیا دل کا پرزہ پرزہ لگے پچاسی جھٹکے
اور زبیدہ سارے گھر میں جلتی کلستی پھریں۔
"مسٹنڈا... نامراد 'تان سین کی اولاد' مرغے کی طرح چار محلہ جگا کر اٹھتا ہے۔" تائی کی ایسی پکاریں وہ صبح و شام سنتیں۔
"امی... جوتی دو..." بلوان سے لپٹا جا رہا تھا۔ وہ برقع پہنے کھڑی تھیں اور کندھے سے نکلے... منو کو بھی تھپک رہی تھیں۔
"ارے میرے باپ... سو جا..."
"یہ چار محلہ سلا کر سوئے گا۔"
"کم بخت! تو تو ہے ہی میرے بچوں کی دشمن..."
"بڑی بہنیں کیسے لاڈ چاؤ چونچلے اٹھاتی ہیں۔"
"امی ابھی تو میں نے گڈو کو نہلایا ہے۔"
"ہائیں... تو نے تو رگڑ ڈالا ہوگا۔ میرے معصوم بچے کو... رویا تو نہیں تھا۔"

"ایسا ویسا رویا... آں آں آں... کان کھا گیا۔ میں نے بھی رکھ کے دیے... دو..."
"اے تیرا ناس جائے کم بخت۔" میرے "پھولوں جیسے بچے... چل پھر میرے منو کو بھی نہلا دیتی۔"

"یہ سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے امی۔ صبح ہی میں نے اسے نہلا دھلا کر لوشن پاؤڈر لگایا اور اس نے شوں شوں...."

"ہاہ۔ بیٹا یہ کیا گندی بات کری آپ نے...."

انہوں نے لاڈ سے کندھے سے لٹکتے منو کو چمکار کر ٹھوڑی پکڑی۔ اور منو کی بھاں بھاں اسٹارٹ ہو گئی۔

"لو جی.... برا مان گئے۔" منو کی بھاں بھاں زور پکڑ گئی تو امی اسے بہلاتے ہوئے تھپکنے لگیں۔

"اچھا نئیں.... نئیں.... نئیں بہت اچھی بات کری آپ نے.... ہاں.... ایسا ہی کیا کرو۔" اور منو میاں چپ۔ امی نے منو کو اسے تھمایا۔

"تم کہاں جا رہی ہو امی....؟"

"اری تجھے کیا۔ میں کہیں بھی جاؤں۔ آؤں تو کیا میری ماں لگتی ہے؟ دیکھ برتن دھو کے رکھیو۔ میں آؤں تو مجھے روٹی پکی ہوئی ملے۔ آج اگر چاند ہو گیا تو کپڑوں کا ڈھیر پڑا جان کو رو رہا ہے۔"

"اف....!" اس کی جان نکل گئی۔ کپڑوں کا انبار دیکھ کر لگتا تو نہ تھا کہ ایک دن میں ختم ہو جائے گا۔

"ابھی چوٹی دو۔" بلو ان کی ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔

"ارے کم بخت۔ اپنی کچر کچر بند کر اور شکل غرق کر یہاں سے۔" انہوں نے بلو کو پرے دھکیلا اور جوتی سنبھال نکل کھڑی ہوئیں۔

عاشی نے دل جلا کر سنے برتن بڑے دیگچے میں چھپائے۔ ریں ریں کرتے بھائی کا کان مروڑا۔ اور کندھے سے لٹکتے منو کو ایک جھانپڑ لگایا۔ اور پھر.... کپڑوں کا ڈھیر دھونے بیٹھ گئی۔

شام تک عید الاضحیٰ کا چاند بھی ہو ہی گیا۔

مگر کپڑوں کا ڈھیر دھونے ہی میں کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ دھلے کپڑوں سے بھری بالٹی چھت پر لا کر ہانپ رہی تھی۔ جب مظہر ہمیشہ کی طرح اول فول بکتا اوپر آیا

"دیکھا جو چاند کو تو حیرت ہوئی مجھے
وہ آسمان پہ چاند ہے تو پڑوس میں کیا ہے؟"

"بکومت۔ میری عیدی کہاں ہے؟"

"میری جیب میں.... خود لے لو۔" اس نے کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ لہرا گئی۔

"بے وقوف یہ عید.... عیدی کی نہیں.... بوٹیاں کھانے کی ہوتی ہے۔"

"تم میں بوٹیاں ہیں کب جو میں کھاؤں۔"

"اور تم تو جیسے انجمن ہو....." اس نے چڑایا۔

"میرا چاند تو مجھے دن میں بھی نظر آتا ہے۔"

"دن میں تو تمہیں تارے بھی نظر آتے ہوں گے.... جب تائی کے گرما گرم جوتے پڑتے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ تمہاری اماں نے تو جیسے کبھی تم پر جوتی اٹھائی ہی نہیں۔"

"تو وہ تو میری اماں ہیں۔"

"تو وہ کیا میری دشمن ہیں۔ تم نے سنا نہیں.... ممتا کا جلوہ 'پہلے جوتے پھر حلوہ'...."

"اف.... یہ امائیں دشمن سے کم بھی نہیں ہوتیں۔ عید کا چاند ہو گیا۔ اب شامت۔ گھر کے چپے چپے کی جھاڑ پونچھ کروائیں گی۔ کاش تائی جی سے ٹھنی نہ ہوتی۔ تو میں ان کے پاس رہنے آ جاتی۔"

"تو میری اماں کیا تمہیں پلنگ پر بٹھا کر روٹی کھلائیں؛ خون پی جائیں تمہارا۔"

"تمہیں ہو نہ ہو.... مگر تائی کو ایک بہو کی ضرورت ہے۔ جلدی سے کسی دھندے سے لگو۔ تاکہ بہو آئے انہیں سکھ ملے۔"

"بہو تم جیسی ملی تو میری اماں تو جلتی کلستی ہی رہیں گی۔" وہ خوب جانتا تھا.... اس کے نام سے بھی امی کے پر جلتے تھے۔

"اور میری اماں تو جیسے ہنسی خوشی تمہیں میرے سر کا تاج بنا دیں گی۔"

"کیوں۔ کیا کمی ہے مجھ میں....؟"

"دیکھا شیم کی۔" اس نے منہ چڑایا۔ "اس دن میں نے خود سنا۔ تائی.... تمہیں تایا جی کی دم کہہ رہی تھیں۔"

"میری اصل دم تو تم ہو.... پھر اس دم میں چھلے پڑیں گے۔"

"مگر دم پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی۔"

"واہ۔ اسی بات پر گرماگرم چائے پلا دو۔"

"ہائیں.... اتنی گرمی میں چائے....؟"

"تو کیا میں چائے پینے کے لیے سردی کا انتظار کروں گری کو گری مارتی ہے.... ارے ہاں۔ گرمی پر یاد آیا .... سوچتا ہوں.... آج نہا ڈالوں۔"

"کیا ضرورت ہے۔ ایسے ہی بھبکے مارتے پھو جہاں سے گزرو.... دنیا ناک پر انگلی رکھ لے۔" اس کے لیل و نہار اپنے ہی تھے۔ غفلت و بے نیازی۔ کھانا اور سونا بھی کبھی تو اسے ای کا خیال درست ہی لگتا کہ وہ کبھی کچھ نہ کر سکے گا۔

"تم خود بارش کے بارش نہاتی ہو...."

"ٹالو مت.... نکالو میری عیدی...."

"پہلے گلے ملنا پڑے گا...."

"یہ عید.... عیدی والی نہیں ہوتی.... تو گلے ملنے والی بھی نہیں ہوتی...." اس نے ٹھینگا دکھایا۔

اپنے گھر کی چھت سے محلہ کی بی جمالو.... خالہ نصیبن نے یہ منظر دیکھا.... اور توبہ تلا کرتے اپنی راہ لی۔

✡ ✡ ✡

"اُف یہ نصیبن کہاں سے آگئی.... بی جمالو کہیں کی :

زبیدہ نے لشتم پشتم.... برقع سنبھال.... جوتیاں رگڑتی خالہ نصیبن کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا.... کچھ دیر پہلے وہ اتنا غافل تھیں.... برآمدے میں پلنگ پر پڑے .... چنو کو تھپکیاں دیتی ان کی اپنی آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ اب لوڈ شیڈنگ کو کوستی.... پنکھا جھل رہی تھیں۔ خالہ نصیبن کو دیکھ کر بارے باندھے اٹھنا پڑا۔

"ارے آؤ آؤ.... خالہ نصیبن! آج کہاں رستہ بھول پڑیں۔"

"جواب میں خالہ نصیبن نے جو کچھ کہا۔ اسے سن کر زبیدہ کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔

"اپنی اولاد کو لگام دے زبیدہ.... تیری آنکھوں میں دھول جھونک.... اوپر نیچے چلانگیں مارتی پھرتی ہے اور تجھے غش پڑے رہتے ہیں۔ گھر میں جوان بیٹی ہو تو آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ تمہیں برقع سر پر رکھ۔ گھر گھر جھانکنے سے ہی فرصت نہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو۔ صبح و شام یہ گناہ گار آنکھیں کیا کچھ نہیں دیکھتیں۔ چھت پر محبت کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں.... اشارے بازی اور تمہیں خبر ہی نہیں کہ تمہاری ناک تلے کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟"

بی جمالو.... جس میں چنگی ڈال.... یہ جا وہ جا.... اور زبیدہ کے دل کو پتنگے لگ گئے یعنی "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے 'باغ تو سارا جانے ہے'" بچی بات میں وزن ہوتا ہے۔ کھٹ سے جا کر دل کو لگی۔ یہ جھوٹی موے کے سوا.... کس کا کیا دھرا ہو سکتا ہے۔ ان کی عزت مٹی میں ملا کر زمانے بھر میں جگ ہنسائی.... ان کی بیٹی پر جال ڈال کر عزت دو کوڑی کرنے کے ارادے۔

"ای چھت پر ٹنکی ڈھک کے آجاؤں۔ رات بھی بلیاں اچھل کود مچا رہی تھیں۔ کہیں کوئی ٹنکی میں نہ جا پڑے۔" انہوں نے بغور عاشی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر رنگ اور مسکراہٹ تھی.... زبیدہ کے تلووں سے لگی۔ سر پر بجھی۔

"خبردار جو اب چھت کا رخ کیا۔ ٹانگیں توڑ ڈالوں گی تیری.... کھال ادھیڑ دوں گی۔"

وہ ہانپتی کانپتی خود ٹنکی ڈھکنے کے لیے آئیں تو مظہر چھت کی دیوار سے ٹکا' انٹینا ہلا رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر سٹ پٹا گیا۔ زبیدہ کے تیور خطرناک تھے.... مظہر اگلی ہی جست میں نیچے تھا۔ خالہ نصیبن کی بات زبیدہ کے دل کو لگی۔ سوراخ ان کی اپنی کشتی میں تھا اور وہ طوفانوں کو کوس رہی تھیں۔ وہ سارے گھر میں جلے پیر کی بلی بنی' کلستی پھریں۔ پھر برقع سر پر رکھ' رشتے والی مائی منظورا کی طرف اڑان بھری۔

"مجھے عاشی کے لیے جلدی رشتہ چاہیے۔ رشتہ ایسا بڑھیا ہو کہ بس۔ دنیا کی آنکھیں چوپٹ کھل جائیں۔ دشمن جل مریں۔"

"لے دیکھیے... رشتے ہزار... ایک سے بڑھ کر ایک۔" مائی منظوراں نے کئی تصویروں میں سے ایک چھانٹ کے سامنے رکھی۔

"گتے بنانے کا کارخانہ ہے۔ بھرا پرا گھر۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ مگر شادی اگلے مہینے چاہیے۔"

تصویر زبیدہ کے دل کو خاک نہ لگی۔ مگر معاملہ جٹھانی کو پچھاڑنے کا تھا' اس پر مائی منظوراں کے بڑھاوے۔ "آنکھیں بند کر کے رشتہ کر دو۔ بھرا پرا گھر' چلتا کاروبار ہے۔ عیش کرے گی عیش۔"

مائی منظوراں نے انہیں وہ سبز باغ دکھائے کہ وہ کھلی آنکھوں سے سہانے خواب دیکھنے لگیں۔ تصویر بغل میں داب... اگلی چھلانگ بی سی والی کے گھر کی تھی۔

"مجھے اپنی بی سی ہے... اگلے مہینے چاہیے۔ اپنا وعدہ یاد ہے نا۔ جب ضرورت پڑی تم دو گی۔ اپنی عاشی کی اگلے مہینے شادی کر رہی ہوں۔"

اپنے تئیں انہوں نے سب پکا کر لیا تھا نہ سوچ بچار نہ چھان پھٹک بس ایک دھن چڑھ گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

مائی منظوراں کے ساتھ... مہمانوں کی آمد ہوئی۔

"کسے ہوئے لباس میں ملبوس... بھاری بھر کم... تین منزلہ جھالے لہراتی خاتون کے ہمراہ... دو سینک سلائی سی لڑکیاں... چائے ڈکار کے' سموسوں پہ ہاتھ صاف کرنے کے بعد... دال موٹھ پھانکی۔ اور آخر کار عاشی کو پسند کر ہی لیا۔ زبیدہ کو بھلا اور کیا درکار تھا۔ اس بکری جیسی شکل کو کوئی گھاس ڈال دے۔ بڑی بات تھی۔

"اگلے روز لڑکا دیکھنے گئیں تو جھٹ بات پکی کر... منہ میٹھا بھی کرا آئیں۔ لوٹیں تو تصویر ہمراہ تھی۔

"ہائیں... اتنا کالا...؟" عاشی کے دل کو دھکا سا لگا۔

"ارے تو تو کون سی آسمان سے اتری حور ہے۔"

بات تو سچ تھی۔ مگر بات تھی رسوائی کی... آنا' فانا سب کچھ پکا ہو گیا تھا۔ امی کے پیروں کو بریکیں لگ گئی تھیں۔ چیل کی طرح اس کی چوکسی کرتیں۔

منظر نے سنا تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خیر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ جو آئے' آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں... مگر معاملہ گھمبیر تھا۔ وقت کم... مقابلہ سخت تھا... ناچار اسے... ماں کے سامنے منہ سے پھوٹنا پڑا۔ اور انہیں سن کر جیسے ہزاروں والٹ کا کرنٹ لگا۔

"ارے گھاس تو نہیں چر گیا ہے۔ خبردار جو تو نے اس کالی چھپکلی کا نام بھی دوبارہ لیا۔ تو زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔"

"امی کان کھول کر سن لو۔ میں شادی کروں گا تو بس عاشی سے ورنہ نہیں۔"

"ارے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے۔ تجھے قد اٹھاتے اور تیرے منہ میں اس کالی مینا کی زبان بولنے لگی۔"

"امی اب وہ اتنی بھی بری نہیں ہے۔"

"تو کچھ بھی کہہ لے۔ کر لے مگر یاد رکھ۔ میں اس کالی چھچھوندر کو بیاہ کر لانے والی ہرگز نہیں۔"

"تو تم بھی سن لو امی۔ میری شادی ہو گی تو صرف اور صرف عاشی سے۔"

"ارے چل چل... بڑا آیا۔ مجھے تیری شادی کرنی ہے۔ تو لڑکیاں ہزار ایک سے بڑھ کر ایک..."

"آسمان سے اتری حور بھی مجھے منظور نہیں۔"

"ارے تو کیا میں تجھ سے پوچھ کر کروں گی؟"

"میں نکاح والے دن بھاگ جاؤں گا۔"

"ارے کم بخت... اس کالی چڑیل کا نکاح تو زبیدہ نے کہیں اور پکا کر دیا ہے۔"

"میں ہونے ہی نہیں دوں گا... اسے اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

"تو میرا بیٹا ہو کر... دشمن کی حمایت کر رہا ہے؟"

انہیں خیال آ ہی گیا۔ یہ آگ ضرور کسی دشمن کی لگائی ہوئی تھی۔

مظہر کے تیور خطرناک تھے۔ محبت کی بیل پھوٹ کر آسمان تک جا پہنچی۔ انہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہو نہ ہو... یہ اسی ذات کی چمارن زبیدہ کا کیا دھرا ہے۔ تب ہی تو بیٹی... کو کھلی چھوٹ دے دی کہ پھنسا لے۔ ایسا نادر و نایاب ہیرا اور کہاں جڑے گا اسے... ہائے ہائے ان کے معصوم بچے کو ڈورے ڈال کر پھنسا لیا۔ کیڑے پڑیں بد بخت کے... ان کے راج دلارے۔ جان سے پیارے۔ سند یافتہ سپوت کو جانے کیا گھول کر پلا دیا کہ ان کا جوان جہان بچہ... ہاتھوں سے نکلنے کو تھا... تائی اسی وقت برقع سر پر رکھ۔ اپنے پیر کے آستانے... کوئی سریع الاثر تعویذ لینے نکل کھڑی ہوئیں۔

اور یہ کہاں ممکن تھا کہ دیوار یار کوئی لے دے ہو اور اس پار نہ سنی جائے۔ تاجی اور مظہر کی تکرار۔ حرف بہ حرف... زبیدہ کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ اور پھر تو مانو طبل جنگ ہی بج اٹھا۔ ان کی گز بھر لمبی زبان کے سامنے کسی کافر کی مجال تھی کہ ٹھہرتا۔

"اے لو باتیں تو نے کوئی اس کی... میں اپنی چڑھتی ہنڈیا... اتار کے اس موئے مجو سے کیوں کرنے لگی؟ ایسے کون سے لعل جڑے ہیں۔ موا نکما، نکھٹو ڈنڈے بجاتا پھرتا ہے۔"

"تو تیری کون سی آسمان سے اتری حور ہے۔ سوکھی سڑی مردار گلی کا کتا بھی نہ سونگھے۔" تائی تلملا کر میدان میں نکل آئیں۔

"مجھے گلی کا کتا منظور ہے۔ مگر تیرا بیٹا نا منظور ہے۔ کان کھول کر سن لے۔ میں کھود کے گاڑ دوں گی۔ مگر تیرے گھر بیاہنے والی نہیں۔"

"تو میں کون سی جھولی پھیلا کر تیرے گھر ناک رگڑنے آ رہی ہوں۔ اس باون گزی کے لیے آتی ہے میری جوتی۔"

"تو ناک بھی رگڑ لے۔ کچھ بھی کر لے۔ مگر یاد رکھ تیری تو سات پشتوں کی طرف میں کبھی پیر کر کے بھی نہ سووں۔"

"اری چل چل... بڑی آئی اپنی سنگی کو سنبھال پہلے بعد میں بات کریو۔"

☼ ☼ ☼

اگلے مرحلے پر بھاری بھر کم سمدھن نے زبیدہ کا گھیراؤ کیا تھا۔

"آجا بھئی زبیدہ... میدان میں، پہلے تو تو یہ بتا کہ تو کیا کیا دے رہی ہے۔ جہیز میں۔" زبیدہ کی آنکھیں ماتھے سے جا لگیں۔

"اری بہن، آپس کی بات ہے۔ پہلے سے طے ہو جائے تو اچھا ہے۔ کسی کمی بیشی پر ہماری ناک ہی نہ کٹ جائے۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔ میری جو اوقات ہے میں اتنا ہی بیٹی کو دوں گی۔"

"ارے یہ تو سب ہی کہتے ہیں۔ مگر کوئی خالی خولی بیٹی تھوڑی بیاہتا ہے۔ ٹی وی فریج۔ وی سی آر۔ تو آج کل فقیر بھی دیتے ہیں۔ اور ہاں۔ وہ کمرہ ٹھنڈا کرنے والی مشین۔ جس میں ٹھنڈا پانی ڈالتے ہیں۔ نظیرن کی بہو لے کر آئی ہے... سارے علاقے میں ٹور ہی بن گئی ہے نظیرن کی۔" زبیدہ تنتنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ میرے پاس دینے کو ایک کٹورا بھی نہیں ہے... اور اگر آپ کو منہ مانگا جہیز چاہیے۔ تو ایک لسٹ میں بھی بنوا لیتی ہوں۔ فرمائشی بری کی۔"

"ارے آپ تو برا مان گئیں؟" وہ سٹ پٹا گئیں۔ آپ نے بات ہی ایسی کی ہے۔" انہوں نے صاف سنا ڈالا تھا۔ اور جانے کیا بات تھی۔ وہ دب بھی گئیں۔ مگر چور چوری سے جاتا ہے۔ ہیرا پھیری سے نہیں۔ وہ سب لوگ آتے بہانے۔ آئے روز آن دھمکتے... اور کھا پی کر ہی ٹلتے... سمدھن صاحبہ چلتے چلتے کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ جاتیں۔

"شادی کا انتظام ہال میں رکھنا۔ بڑے لوگوں سے میل جول ہے ہمارا۔"

"ویسے تو ہماری اپنی سوزوکی چلتی ہے۔ مگر سلامی میں اسکوٹر دو گی تو تمہاری ہی بیٹی کو آنے جانے کی آسانی

رہے گی۔"

"ان کے ان ہی اوچھے وتیروں کے سبب کئی بار ان کا ارادہ ڈگمگایا۔ مگر وہ اپنے نام کی ایک تھیں۔ جو ٹھان لیتیں کر کے چھوڑتیں۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ یہاں تو پھر سوال جٹھانی کو نیچا دکھانے کا تھا۔

اس دن بھی وہ بڑا بکسا کھولے الجھ رہی تھیں کہ ابا کا نزول ہوا اور انہوں نے اپنی ساری جھنجلاہٹ ان پر اتاری۔

"بیٹی کی شادی سر پر آگئی ہے۔ کچھ فکر ہے کہ نہیں؟"

"اری تجھ سے کہا تو ہے۔ تھوڑا بہت جو کچھ ہے۔ دے دلا کے اسے رخصت کر۔" انہوں نے بے نیازی سے کہتے بیڑی سلگائی۔

"اے باؤلے ہوئے ہو؟ بھائی کی بھنگ چرا کے چڑھالی ہے کیا؟" خالی خولی بیٹی بھی کوئی رخصت کرتا ہے کیا۔ ہمارے پلے ہے ہی کیا۔"

"ہاں.... ہاں بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ بارات کی دیگوں کا میرا ایک چچیرا بھائی.... خرچ اٹھالے گا۔ اور شامیانے قناتوں کی بھی تو فکر نہ کریو۔ میرا ایک دوست لگا دے گا۔ ہوتا رہے گا حساب کتاب۔"

"ارے گھاس تو نہیں چر گئے ہو؟ بیٹی کی شادی میں کیا۔ بس شامیانوں اور زردے پلاؤ کا خرچ ہوتا ہے۔"

"بارہ جوڑے تو سمدھیانے نے پہناونی میں مانگے ہیں۔"

"بارہ جوڑے.... ارے ہم نے کیا گھر بھر کا ٹھیکہ اٹھایا ہے؟" وہ بدکے "کہہ دے کہ بارہ جوڑے تو ہم اپنی بیٹی کو بھی نہیں دے سکتے۔"

"ناکہ.... میرے منہ میں خاک.... آگے جا کر بیٹی جوتے کھاتی رہے؟"

"تجھے ہی شوق چڑھا ہے اسے بیاہنے کا۔ اب بھگت.... ارے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"آئے ہائے۔ یوں کہہ کہ تیرے ماتھے لے ٹکا بھی نہیں ہے۔ اور تو کیوں کرنے لگا اولاد کی پروا۔ میں ٹکا ٹکا نہ جوڑتی۔ کھینچ تان کے گزارا نہ کرتی۔ تو گھر سے اتنا بھی نہ نکلتا۔"

"ارے مجھے اولاد کی پروا نہیں ہے تو ان بچیوں کو کیا تیرا باپ پال رہا ہے؟"

"میرے باپ تک نہ پہنچا کر۔ وہ کیا تیرے گھر روٹی مانگنے آتا ہے؟"

"ایک تو میں تجھ سے تنگ ہوں۔ زبان دراز عورت۔"

"تو مجھ سے تنگ ہے تو میں کون سی تجھ سے خوش ہوں۔"

"تو گھر میں رکھنے قابل عورت نہیں ہے۔ کوئی اور ہوتا تو پرچا پکڑاتا تجھے۔ سوت لا کر بٹھاتا تیری چھاتی پر۔"

"تو اب پکڑا دے۔ لے آ سوت' نیک کام میں دیر کیسی۔ میں بھی تو دیکھوں کون بھگتتا ہے تجھے۔ میرے لیے آج بھی روٹیوں کی کمی نہیں ہے۔"

یہیں پر وہ مات کھا جاتے۔ ان کی ہوائی آمدنی میں۔ بچوں کی فوج کے ساتھ گزارا.... دل گردے کی بات تھی۔ وہ بکتے جھکتے گھر سے نکل گئے۔

✲ ✲ ✲

مظہر پر کالا جادو کرا کے۔ اس کا دل و دماغ.... روزی سب باندھا گیا ہے۔ تائی کو اپنے پیر کی اس بات پر کامل یقین تھا۔ تب ہی منہ مانگی رقم کے عوض.... اپنے پیر کے بخشے تعویذ.... صبح شام اسے گھول گھول کر پلاتیں۔ اس روز مظہر نے انہیں پکڑ ہی لیا۔

"ارے.... میں ماں ہوں تیری.... دشمن نہیں ہوں۔ گھول گھول کر تجھے وہ پلائے گا۔ جسے تجھ سے کوئی مطلب ہو گا۔"

ایسی دہائیاں اب بہ آواز بلند پڑتیں.... تاکہ دیوار پار سنی جا سکیں۔ اب بھی زبیدہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"اوہو.... ای ایک تو تم سے بات کرنا غضب ہو جاتا ہے۔" وہ جھلا کر زینے کی جانب بڑھا تو.... ای کی

للکارتی نظروں نے الارم بجایا۔
"خبردار۔۔۔ اگر تو نے چھت کا رُخ بھی کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"
وہ سر جھٹک کر مڑا۔ ان دنوں یوں بھی "چاند" غروب تھا۔ اس نے لاکھ ڈھیلے مارے مگر بے سود۔
دروازے پر بڑی مدھم سی تھاپ پڑی تھی۔
"کون ہے۔۔۔؟"
"بھک منگا۔۔۔" گڈو کہہ کر خود ہنسا۔ مظہر نے لپک کر اسے جالیا۔
"میں تایا جی کے ساتھ کھیلوں گا۔ مجھے پراٹھا کھانا ہے۔"
"تو چل۔۔۔ میں ابھی لے کے آیا۔"
"مجھے تائی جی کے ہاتھ سے کھانا ہے۔"
"میں ابھی ان سے کہتا ہوں۔"
"بھا! آپ ان سے کہیں گے نا تو وہ نا۔ آپ سے بہت ساری باتیں کریں گی۔" دونوں گھروں کے کشیدہ تعلقات کی خبر گڈو تک کو تھی۔
"تو میں ان کی باتیں نہیں سنوں گا۔"
"بھا' ان سے کہنا گڈو کو پراٹھا کھانا ہے۔ آپ اس کے لیے پراٹھا بنا دیں۔"
"ٹھیک ہے۔۔۔ میں ایسے ہی بولوں گا۔ پر تو اندر نہ آنا۔ اندر "بھاؤ بلا" بیٹھا ہے۔" وہ بھاؤ بلا تائی جی کی ناک پہ دھرا غصہ تھا۔ جو "آخری معرکے" کے بعد گھر بھر میں جلتی کلستی۔۔۔ جلیے پیر کی بلی بنی پھر رہی تھیں۔ مظہر کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔۔۔ وہ آج کل کن ہواؤں میں ہیں۔ اور جب خبر ہوئی تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

گلی بھر میں مکھن بڑے بانٹے گئے۔ تائی جی مظہر کا نکاح چپکے سے کر بھی آئیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ اور تو اور۔۔۔ انہیں بھی جھوٹے منہ نہ پوچھا۔۔۔ پوچھتیں بھی کیونکر۔۔۔ آخری معرکے میں۔۔۔ دیورانی کا طعنہ کھٹ کر کے لگا تھا۔ اگر انہوں نے اسی وقت۔۔۔ دل کے مریض۔۔۔ آج مرے کل دوسرا دن زندگی میں ہی

ٹھان لی تھی۔۔۔ کہ اسے نیچا دکھا کر ہی رہیں گی۔ اگرچہ مظہر نے دم آخر تک ہاتھ پاؤں مارے۔
"امی۔۔۔ دلوں کے سودے تو۔۔۔ محبتوں سے کیے جاتے ہیں۔"
"ارے چل چل۔۔۔ بڑا آیا رہنے دے یہ کتابی باتیں۔ ان ہی کتابوں نے تیرے دماغ میں خناس بھرا ہے۔ اپنے ابا کا کام سیکھ لیتا۔ تو چار پیسے تو گھر آتے۔ اب یہ موئی ڈگریاں لے کر جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔"
امی کی بات تلخ سہی۔۔۔ مگر بجا تھی۔
"امی امید پر دنیا قائم ہے۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔
"امید۔۔۔ انسان کا پیٹ نہیں بھرتی اس کے لیے ہاتھ پیر ہلانے پڑتے ہیں۔ کچھ عقل سمجھ سے کام لے۔ اگر تو خیر سے نوکری کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہو بھی جاتا ہے تو بھی اس چھپن چھری فسادن۔۔۔ زبیدہ کی بیٹی۔۔۔ میں پھر بھی بیاہ کرلانے والی نہیں ہوں۔ باون گز کی زبان ہے موئی کی۔ آج نہیں تو کل۔۔۔ تیرا بیاہ کرنا ہی ہے نا۔ ایک اچھا موقع ہاتھ آ رہا ہے۔ تو میں کیوں ہاتھ سے جانے دوں؟ یاد رکھ بیٹا! کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔"
وہ جانتا تھا۔ عاشی امی کی آنکھوں میں تنکے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اسے بہو بنانا تو ایک طرف۔۔۔ وہ کبھی رخ دے کر بات تک نہیں کرتیں۔ انہیں عاشی کی قینچی کی رفتار کو مات کرتی زبان سے پرخاش تھی۔ جو کئی بار ان کے دل میں خراشیں ڈال چکی تھی۔
"دیکھ مجو۔۔۔ میں زبان دے چکی ہوں۔ اگر تو نے انکار کیا۔ تو یاد رکھ' مجھے میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔"

اور مظہر سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ امی کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ ان کے اڑیل اور ہٹیلے پن سے کچھ بعید نہ تھا کہ کیا کر گزریں۔۔۔ اس کے اندر کوئی شے پگھلتی چلی گئی تھی۔ ٹپ ٹپ ٹپ!
نرگس آٹھ بہن بھائیوں کی بہن ہے۔ سب کے سب اپنے گھروں کے ہیں۔ اک بڑے میاں ہیں جو

سب کا حصہ بھگتا دیا۔ نرگس کے تیس ہزار بینک میں پڑے ہیں۔ میں نے کہہ دیا۔ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا۔ سب کچھ ہے۔ اس رقم سے مظہر کوئی کاروبار کر لے گا۔"

اور یہی نکتہ اس سارے فسانے کی جڑ تھا۔

ای کی بات بجا ہی تھی۔

وہ کس برتے پر چچا کے گھر چڑھتی ہنڈیا اتارتا۔ بلا وجہ ہی آئے روز کی ـــــ چلتی۔ اسے نوکری مل بھی جاتی تو۔۔۔ عاشی کو کبھی منظور نہ کرتیں۔ اور جب وہ نہیں تو کوئی بھی سہی۔۔۔ اس نے سر جھٹکا۔

تو یاد رکھ۔ عمر بھر۔۔۔ یہ یاد رکھ۔ بے ساختہ آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"مہینے بھر میں شادی کے تمام انتظامات مکمل ہوئے تو۔ اس کا سارا کمال ای کی جمع جوڑ کا رہا۔ شاید اسی روز کے لیے وہ ہزار جگہ اپنے دل کو مارتیں۔ کھینچ تان کے بسر کرتیں۔

سسرالیوں کا آنا جانا لگا رہا۔ نثار کو دیکھ کر اس کے اندر سناٹے اتر گئے تھے۔ عام سی شکل و صورت۔۔۔ بھاری تن و توش۔۔۔ تیکھا مزاج اور یہ سب اس بے وفا کی۔۔۔ کج ادائی کے سبب تھا۔ نہ ہوتا وہ تو یا چشم تو زمانے سے ٹکرا جاتا۔ وہ اس روز بھی گھر کے آنگن میں بیٹھی تو در و دیوار دیکھ کر سسک اٹھی۔

کچے آنگن میں اترتی سنہری دھوپ گھرے بادلوں میں جا بجا۔۔۔ اڑتے پنچھی اور اس بے وفا کا پیار۔۔۔ اس کی سوچیں بھٹکنے لگیں۔۔۔ سب کچھ پرایا ہونے کو تھا۔ من کی بستی میں جل تھل تھا۔ بے ساختہ آنکھوں کا کاجل بھیگتا چلا گیا۔۔۔ اور ایک وہ تھا۔ جسے اپنی لن ترانیوں سے فرصت نہ تھی۔ درمیانی دیوار سے تاک جھانک فرمائی۔

تجھ میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر لے
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لے

اور ای سے بغاوت کا تصور بھی دانتوں تلے پسینہ لے آتا۔ ان کی اڑیل ہٹیلی فطرت کے سامنے۔ کس کافر کی مجال تھی کہ دم مارتا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ ان کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ کوئی لاکھ بلبلاتا پھرے اور تڑپے اور اسے تڑپتے مچلتے آنسوؤں کی بھی پروا نہ تھی۔ اس کے دن رات ایک اذیت میں گزر رہے تھے۔

اس کے فرشتوں کو کیا خبر تھی کہ۔۔۔ مظہر نے خود کو سمیٹ لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نہ سمیٹتا۔ تو وہ بکھر جاتی۔ اور وہ بکھر جاتی تو۔ بہت کچھ بکھر جاتا۔

عاشی کو اس سے یہ امید نہیں تھی۔ اک ذرا سی لاٹری کیا ہاتھ لگی۔ نظریں بدل گئیں۔ خود کو افلاطون سمجھ بیٹھا۔۔۔ کیسے کھٹ سے نکاح پڑھا لیا اور میں تو جیسے مری ہی جا رہی تھی۔ اس کے لیے۔ کہاں گئے وہ چاند ستارے توڑ لانے کے دعوے۔۔۔ رات بھر اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔۔۔ اور آخر کار دکھیاری عاشی لہو کے آنسو بہاتی رخصت ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"اے کہاں چلا بن ٹھن کے، لے ذرا یہ کھیر پکڑ! آ نرگس کو۔۔۔ اپنی سسرال چلا جا۔"

"میں نہیں جاتا ادھر۔" وہ بدکا۔ اس نام سے دل کو کچھ ہونے لگتا۔

"تیرا تو باپ بھی جائے گا۔۔۔ جاتا ہے کہ لگاؤں دو۔" ای کی گھوری میں دم تھا۔۔۔ خوب صورت خوان پوش سے ڈھکا پیالہ۔۔۔ لیے چلا آیا۔ چند قدم پر تو گھر تھا۔

"زہے نصیب!" دروازہ ای قیامت نے کھولا تھا۔

"آج تو چاند زمین پر اتر آیا۔۔۔"

"لگتا ہے۔۔۔ میری آمد کی خبر تھی؟" مظہر نے منکوحہ کے سولہ سنگھار اور کسے ہوئے لباس کو طنزیہ دیکھا۔ "تب ہی سرخ جوڑا پہنا ہے۔" مظہر کے اس جملے کو انہوں نے اپنی تعریف خیال کیا۔ لہٰذا مسکرائیں۔ مگر اس کے اگلے ہی جملے پر اس کی پھیلتی مسکراہٹ سکڑ گئی۔

"مجھے تو ڈر ہے۔۔۔ کہیں بیٹا پیچھے نہ لگ جائے

آپ کے۔"

"اوئی رے، کم از کم تعریف تو ڈھنگ سے کر لیجیے۔" وہ شرم و حیا کا پیکر بنی۔۔۔ چوکھٹ سے چپکی۔ اک ادا سے کھڑی تھی۔

"ایا نے سمجھایا تھا۔ اب آپ کا دل مٹھی میں کرنا ہے۔ اور عورت سولہ سنگھار اپنے شوہر کے لیے ہی تو کرتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔! آپ کو دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ آپ کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔" ستا سا لگاوٹ بھرا مصنوعی انداز تھا۔ وہ مظہر پر نچھاور ہونے کو تھی۔ وہ بدکا۔

"ہائیں یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اسی پل بڑے میاں جانے کہاں سے نکل کر آئے۔ اسے دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی۔ مگر وہ تاڑ گیا تھا۔ وہ کھسیا کر نکل آئے۔ مظہر کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

"لگام دے کے رکھیے اپنی صاحبزادی کو۔۔۔"

"اجی۔۔۔ جانے بھی دیجیے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔"

"میں یہ کھیر دینے آیا تھا۔ امی نے بھجوائی ہے۔"

"ہاں میں نے ہی ان سے کہا تھا۔ اجی نکاح کر کے بھی کوئی یوں پھرتا ہے۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ خیر سے آؤ جاؤ۔۔۔ تمہاری خالہ سے ہمارا رشتہ جڑا تو ہم نے تو میاں نکڑ پر ڈیرہ ہی ڈال لیا تھا۔" انہوں نے لفنگوں کی طرح آنکھ مار کے کہا تھا۔

"اب خیر سے آ ہی گئے ہو تو بیٹھو۔ کچھ چائے پانی ہو جائے۔"

مگر اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ سنا تھا شرم و حیا عورت کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے۔ پکے ہوئے پھل جیسی عورت۔۔۔ اس نے سر جھٹکا۔ جانے کتنے گھاٹ کا پانی پیا ہو گا۔۔۔ خود بخود سوچ منفی رخ پر سفر کرنے لگی۔

بے ساختہ نظروں میں وہ شرارتیں۔۔۔ شوخیاں۔۔۔ اٹھکیلیاں اور نوک جھونک گھوم گئیں۔ "اس دل پہ موجود ہیں۔۔۔ تیرے قدموں کے نشاں اب تک۔ گزرنے نہیں دیا کسی کو۔ اس راہ پہ تیرے چلنے کے بعد۔۔۔ وہی اوٹ پٹانگ تک بندی۔۔۔ سوچ میں بھی تھی۔

✲ ✲ ✲

مائی منظوراں نے زبیدہ کو پیسے کی چھب دکھا کر رام کیا تھا۔ مگر وہ دولت مند کم۔۔۔ تو دولتیے زیادہ تھے۔۔۔ بڑے سارے گھر میں یہاں سے وہاں تک کار خانے کا سامان۔۔۔ ابتری۔۔۔ صحن کے آخر میں دو کمرے پڑتے تھے۔ پیچھے دو غسل خانے گھر کی آخری دیوار سے لگے تھے۔ جن کا راستہ کمرے سے ہو کر گزرتا تھا۔ لہٰذا کسی خلوت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور کیسی خلوت' کاہے کی خلوت جو خلوت کا ساتھی تھا۔ اس کے اپنے ہی لیل و نہار تھے۔ رات گئے تک چائے خانہ پر بیٹھا۔ چائے کے کپ پر کپ چڑھاتا۔ فلمیں دیکھتا۔ گھر لوٹتا تو ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتا۔۔۔ پھر فلمیں چلتیں۔۔۔ فجر سے کچھ پہلے ٹی وی بند ہوتا۔ دن بھر وہ بے نتھے سانڈ کی طرح اوندھا پڑا خراٹے لیتا رہتا۔ گھر بھر میں اس کی عزت دو کوڑی کی تھی۔ کاروبار سارا باپ بھائیوں کے ہاتھ تھا۔ جو بات بات پر اس کی ہڈ حرامی کو لتاڑتے۔ وہ بھی منہ کو آتا۔ ساس نندوں کا اور ہی وتیرہ تھا۔ کھانا پینا فیشن اور آوارہ گردی جہاں بیٹھ جاتیں روٹی کھا کر ہی اٹھتیں۔۔۔ نذر و نیاز' لنگر' آستانے۔۔۔ درگاہیں' مزارات خصوصاً" ہر جمعرات۔۔۔ کالی جھنڈی والے بابا کے آستانے پر حاضری لازمی تھی۔ اک روز وہ پوچھ ہی بیٹھی کہ آخر وہاں ملتا کیا ہے۔

"وہاں۔۔۔ وہاں وہ ملتا ہے کہ جھولیاں بھر جاتی ہیں۔"

"ہائیں۔۔۔ کیا وہاں بچے ملتے ہیں؟" بے ساختہ کہہ بیٹھی۔ مگر وہ کہتیں کہ گھر بھران کی کرم نوازیوں سے ہی تو چل رہا تھا۔ مگر جیسا چل رہا تھا۔ یہ کوئی اس کے دل سے پوچھے۔۔۔ کاموں کا انبار' روٹیوں کے لالے' ہر پل ڈستی تنہائی۔۔۔ اس پر نثار کے مزاج۔

"اس سے تو میں گھر بیٹھی اچھی تھی۔۔۔" اور اس کا اتنا کہنا غضب ہو گیا۔ نثار کا ہاتھ اٹھ گیا اور کیا کہنے اس

شان بے نیازی کے اسے پکڑ کر ٹھونک بھی دیا۔ پھر کہا۔
"میں تو روٹی کھانے آیا تھا۔"
وہ سب کونے میں گھسی کھی کھی کرتی رہیں۔ ان کے ہاں عورت پیر کی جوتی اور اسے مارنا ہی مردانگی تھی۔
پھر یہ مار پیٹ کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔
غصہ ہر وقت اس کی ناک پر دھرا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ عاشی کو پیٹ کر اسی سے اپنے پیر دبوا کر سوتا۔ یہ تو خیر ٹھیک ہی تھا کہ وہ ہڈ حرام تھی۔ امی دن بھر اسے کوستی پیٹتی ہی نظر آتی تھیں۔ ساری ہڈ حرامی... ناک کے رستے نکل رہی تھی۔ امی سچ ہی کہتی تھیں کہ سسرال کی روٹیاں بڑی مہنگی پڑتی ہیں۔ بڑا سارا گھر تھا۔ کاموں کا ڈھیر۔ ذرا سی کوتاہی نامنظور تھی اور اس پر اگر منہ کھل جائے تو... پھر شار کا ڈنڈا... اس کے سر پر بجتا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کچھ ہی دنوں میں کس بل نکال کے رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دروازہ زور و شور سے پیٹا گیا تھا۔ نرگس کو دیکھ کر تائی جی کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔
"دلہن تم یہاں کیسے؟"
"ابا چھوڑ کے گئے ہیں... کچھ دیر میں آ کے لے جائیں گے۔" اسے برقع کی ڈوریاں کھولتے دیکھ کر تائی جی کا دل بیٹھتا چلا گیا۔
"اب کیا اندر آنے کو بھی نہیں کہیں گی؟"
دل پر پتھر رکھ کر راستہ دینا پڑا۔ وہ مزے سے آگے بڑھ کر... صحن میں دھرے تخت پر براجمان ہو گئی۔
"اف... گرمی غضب کی ہے۔ پنکھا لگوا دیجیے۔"
مظہر نے ان کے اشارے پر پنکھا لگایا... اور ٹھنڈے ٹھار پانی کا گلاس اس کے سامنے لا دھرا۔ اس کے تاثرات سپاٹ تھے۔ وہ غٹاغٹ چڑھا گئی۔ کچھ دیر گزری۔ تخت پر پیر پسار لیے... پھر کھانا دانا... چائے پانی... سب وہیں اس کے سامنے لگتا رہا۔ وہ اس تخت سے نہ سرکی۔ دن شام اور شام رات میں ڈھل گئی...

تو تائی جی نے مظہر کو سمدھیانے دوڑایا۔ وہاں من بھر وزنی تالا منہ چڑا رہا تھا... اب کیسی رخصتی اور کاہے کی رخصتی۔ رات گزری اور لیجیے جناب ہو گئی رخصتی تائی جی نے خود برقع سر پر رکھ سمدھی کی خبر لی۔ وہ مزے سے پیر پسارے سوتے نظر آئے۔ تائی جی نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔
"میں کل ہسپتال کی ایمرجنسی میں پڑا تھا۔ جوان بیٹی کو کہاں بٹھاتا...؟" سفید جھوٹ۔
"اچھا... آپ کو دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ کل جان کے لالے پڑے تھے۔"
"آپ مانیں نہ مانیں... دنیا جانتی ہے کہ چراغِ سحری دل کا مریض ہوں۔"
"دنیا تو یہ بھی جانتی ہے کہ تم پرلے درجے کے فراڈی، دھوکے باز ہو۔ مکان بیچ... سارا مال کھیسے میں اڑس کر... دنیا کو اس کی چھب دکھاتے تھے... کہ... اس کے صدقے تمہاری بیٹی ٹھکانے لگے۔"
"تو کیا اگلوں کے لیے چھوڑ جاؤں؟ جو باپ کو روٹی نہیں کھلا سکتے۔ انہیں جائیداد کا وارث بنا دوں؟ سب سنتا ہوں میں۔ جو تم کاتی بجاتی پھرتی ہو کہ میری بیٹی کردار کی ڈھیلی ہے۔" ان کے تیور بدل گئے۔
"ہاں... جا... بولا ہے۔ سنا تھا۔ میں نے کسی سے تب ہی بولا ہے۔"
"مجھے نام بتا دو... میں ٹوٹے کر دوں گا۔"
"کیوں بتا دوں... جا نہیں بتاتی..."
"تو تمہارا بیٹا کون سا آسمان سے اترا ہے... ایسے لعل جڑے ہوتے تو خاندان میں رشتہ نہ مل جاتا؟ دو ٹکے کی اوقات نہیں ہے اور چلی ہیں دوسروں کو آنکھیں دکھانے... چلو جی... اپنا راستہ ناپو۔"
"اے... منہ سنبھال کے بات کر... یہ بھی میری شرافت ہے۔ ورنہ تیری بیٹی الٹے قدموں لوٹا دیتی۔"
"تو اب لوٹا دیجیے... آپ کے گھر کی عزت... گلی میں بیٹھی نظر آئے گی۔ میری تو شام کی ٹکٹیں ہیں۔ لاہور جا رہا ہوں۔ بڑے بیٹے کے پاس..." سارا معاملہ سوچا سمجھا تھا۔

بات جہیز کی رقم پر آئی تو وہ صاف مکر گئے۔
"اجی! کون سے پیسے کہاں کے پیسے۔ آپ کا ٹکا خرچ نہ ہوا۔ بہو آپ کے گھر آ گئی۔ آپ بری سجاتیں۔ چار لوگ جوڑتیں ... تو میں جہیز دیتا نا اور صاف بات ہے۔ وہ تیس ہزار تو میرے علاج پر ہی اٹھ گئے۔"
"تو کیا میں نے کہا تھا۔ اپنی بلا میرے سر تھوپ کے رفوچکر ہو جاؤ۔"
"اجی ... میری اگلی سانس کا بھروسا نہ تھا۔ تبھی تو آپ کی امانت آپ کے حوالے کر گیا تھا۔" انہوں نے توتے کی طرح آنکھیں پھیر کر کہا تھا۔ بات صاف تھی۔ تائی جی کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ پیسے کی چھب دکھا کر گھیرا۔ اور بہانے سے بیٹی سر تھوپ دی۔ جہیز کے نام پر صاف ہری جھنڈی ... تائی جی کے تلووں سے لگی۔ سر پر بجھی۔
"تم نے دھوکا کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا میرا نام بھی مہرالنساء ہے۔ ایسا کیس بناؤں گی کہ ساری زندگی جیل میں سڑے گا۔ فراڈی' دھوکے باز۔"
"اجی جائیے جائیے بڑی دیکھی ہیں تم جیسی' جہیز لینا قانونی جرم ہے۔ الٹی دھرلی جائیں گی۔" بھید ڈبھبکی۔
"پر جا پکڑواؤں گی۔ یاد رکھیو۔"
"پکڑوا دیں ... یہ کوئی آپ کے ہاتھ میں تھوڑی ہے۔" اسی لیے پہلی کوشش مظہر پر جال ڈالنے کی تھی۔ پر وہ اٹھ چکا تھا۔ مظہر سامنے تھا۔
وہ سر جھٹک کر پھر سے پیر پسار کے سو گئے۔ جانتے جو تھے۔ صاحبزادی خود سوگنوں کی پوری ہیں۔
"یہ تو ہونا ہی تھا۔" مظہر جلا بھنا بیٹھا تھا۔
اس بڈھے کے ارادے یہی بتاتے تھے کہ خالی خولی بیٹی کسی بہانے ... ہمارے سر تھوپ دے۔ تیس ہزار دیتا ہے اس کا ٹھینگا ... اب بیٹھے ناپتے رہو۔ امی تم سے کتنا کہا تھا۔ یہ سارا گھرانا ... چال باز ... فریبی ہے۔ تم نے ایک نہ مانی۔ میری شرافت تھی کہ رات ... دوست کے گھر گزاری ... مگر اب کون مانے گا۔ ہینگ لگی نہ پھٹکری۔" وہ واہی تباہی بکتا گھر سے نکل گیا۔ تائی جی سر تھامے بیٹھی رہیں۔ گلے پڑا ڈھول تو اب بجانا ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

اب مجھے یاد تم نہیں آتے ... اب مجھے یاد ہو گئے ہو تم
تم کو سوچا بہت خیالوں میں اور برباد ہو گئے ہو تم
مظہر ہمیشہ کی طرح اول فول ہانکتا چھت پر آیا تو وہ بیٹھی۔ اپنی کھوٹی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔
"اے ... تمہارے سسرال میں قحط پڑا ہے۔ کھانے کو نہیں ملتا۔ جو خیر سے آدھی ہو گئی ہو ...؟"
اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔
"اپنوں نے بوجھ سمجھ کر پھینکا۔ دوسرا کیا خاک سر آنکھوں پر بٹھاتا ...؟"
"اللہ رے ... تمہیں سر پر بٹھالیا تو رقص فرماؤ گی۔"
"دور ہو جاؤ میری نظروں سے ... یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔"
"ہاں ہاں ... میں نے ہی تو آرڈر دیا تھا۔ تمہارے اس بھیتے کو کہ تم سے روٹیوں کا ڈھیر پکوائے ... تمہاری ہور گت بنا کے رکھ دے۔"
"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
"چلا جاتا ہوں۔ مگر دل سے نکال کے بتاؤ۔" وہ ہنستا اتر گیا۔ اور وہ بازوؤں میں چہرہ چھپا کے بیٹھ گئی۔
"تم ہر وقت ہر پل میرے ساتھ رہتے ہو۔ کبھی خود کو مجھ سے الگ نہ سمجھنا ... نہ کہنا۔ یہ محبت میری روح میں اتری ہوئی ہے۔ تم میرے نہیں لیکن میں تمہاری جگہ کسی اور کو بھی نہیں دے سکتی۔ یہ اٹل ہے۔"
"وہ کبھی نہ لوٹنے کا ارادہ لے کر آئی تھی۔ مگر جب چھت اپنی نہ رہے۔ تو من خود بخود پرائی ہو جاتی ہے۔ زبیدہ نے بھی اسے سمجھا بجھا کے واپس لوٹا دیا تھا۔
آئے بھی وہ گئے بھی وہ ۔ لو ختم فسانہ ہو گیا
بات یہیں تک رہتی ۔ تب بھی ٹھیک تھا!
تاجی نے تو اپنے کھوٹے مقدر پر صبر کا گھونٹ پی کر

آنسو پونچھ لیے تھے۔ مگر نرگس کے چلن دھیرے ہی کچھ اور تھے۔

والد محترم جتنے چالباز و فریبی تھے۔ صاحبزادی ان سے چار ہاتھ آگے۔ اسے دن رات سونے سے کام تھا۔ نہانے کی چور بھبکے اڑاتی پھرتی۔ سڑی گرمی میں جب دنیا بلبلا کر گھروں سے نکل آتی۔ وہ مزے سے پیر پسارے سوتی نظر آتی۔ تائی جی ہنوز پلنگ پر اسے روٹی دے رہی تھیں اور اس کے عشق ہی نہ پورے ہوتے۔ جب دل میں آتی۔ برقع سر پر رکھ۔ منہ اٹھائے لور لور پھرنے نکل کھڑی ہوتی۔ مظہر کا دل جلتا۔ وہ بھڑکتا۔

"تم ہی بیاہ کر لائی تھیں نا اب بھگتو۔" اگرچہ یہ کہنے والی بات ہی نہ تھی۔ تائی جی سے بڑھ کر بھلا کون اسے بھگت رہا تھا۔ زبان کی تیز تو تا چشم سب سے بڑھ کر کرار کی بچی۔ شادی کو ایک ماہ ہونے کو آیا۔ مظہر نے نظر بھر کر اسے دیکھا تک نہ تھا۔

اور یہی نکتہ فساد کی جڑ بنا۔

✵ ✵ ✵

عاشی اس بار لوٹی تو نیلوں نیل تھی!

"شاباش ہے تمہاری دلیری کو امی۔۔۔ کون نہیں جانتا کہ وہ پرلے درجے کا نکھٹو۔۔۔ چرسی موالی ہے اور یہ بات ذرا سی چھان پھٹک سے پتا چل ہی جاتی۔"

"اری ساری چھان پھٹک دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اگر نصیب کھوٹے نکل آئیں تو۔"

"یہ نصیب نہیں آپ کی کوتاہی ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ جو رشتہ ہاتھ لگا۔ آنکھیں بند کر کے۔۔۔ کر ڈالا یہ نہ سوچا کہ مجھ پر کیا گزرے گی اب بھگتو۔"

اب زبیدہ کیا کہتیں کہ انہیں صرف اور صرف جیٹھانی کو نیچا دکھانے کی پڑی تھی۔

"اے ہے۔۔۔ لڑکا کماؤ ہو۔۔۔ شریف، خاندانی اپنے گھر بار کا ہو۔۔۔ رشتے میں اور کیا دیکھا جاتا ہے۔" "تجھ بکری جیسی شکل کے لیے اگر چھانٹتی رہتی۔۔۔ تو تجھے بیاہتا کون۔ آج تک میرے سینے پر بیٹھی مونگ دلتی نظر آتی۔"

"تو اس کالے بھینسے میں کون سے لعل جڑے ہیں۔ تمہیں بھرا پرا گھر۔۔۔ چلتا کاروبار نظر آیا۔ یہ نہ دیکھا کہ لڑکے میں کیا گن ہیں۔ گھر والے لات مار کے نکال دیں تو کیا کر کے کھائے گا؟"

"ارے تو سسرالیوں سے بنا کے رکھ۔ پہلے بھی تجھے سمجھا کے بھیجا تھا۔ ان کی جوتی سیدھی کر لے گی تو تیری روٹی چلتی رہے گی۔ تجھے اور کیا چاہیے؟"

"امی۔۔۔ تمہیں اس کی چار چوٹ کی مار کھانی پڑے۔ تو تم سے پوچھوں گی۔"

"اے عورت کی زبان چلتی ہے۔ تو مرد کا ہاتھ اٹھ ہی جاتا ہے۔ کتنا کہا تھا کہ زبان تالو سے لگا کر رکھیو۔" امی کہاں ماننے والی تھیں۔

"اس گھر میں زبان کاٹ کر پھینک بھی دو تو گزارا نہیں ہے۔۔۔ اپنی خطائیں میرے سر نہ ڈالو۔۔۔ امی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ تو وہ گڑبڑا تھیں۔

"ارے اس کم بخت مائی منظوراں نے تو کہا تھا۔۔۔!"

"رشتے والیاں۔۔۔ ایسی باتیں نہ کریں۔ تو ان سے رشتے کروائے کون۔۔۔ اس بار تم نے مجھے واپس لوٹایا تو میں ٹرک کے نیچے آ کر جان دے دوں گی۔ مگر اب وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"اے مائی منظوراں۔ تیری قبر میں کیڑے پڑیں۔ قہر ٹوٹے خدا کا۔" ان کے تلووں سے لگی۔ سر پر بجھی۔۔۔ وہ اسی وقت مائی منظوراں کے لتے لینے نکل کھڑی ہوئیں۔

✵ ✵ ✵

مظہر کی بیوی بھاگ گئی۔ عاشی کے مقدر پھوٹ گئے۔ حساب برابر دونوں جانب معاملہ "ڈرابازی" میں بگڑا۔ مگر کون مانتا۔۔۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ انسان تقدیر کے معاملہ میں نصف پر مختار ہے تو ان دونوں معاملات میں بھی۔۔۔ ان خواتین کی اڑیل ہٹیلی فطرت کا بڑا ہاتھ تھا۔ مگر وہی بات تھی۔

رہی جل گئی۔ مگر بل نہ گئے۔ وہ اپنی خطا میں تسلیم کرنے والوں میں سے ہوتیں تو کاہے کا رونا تھا.... سر پر ہاتھ رکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی نظر آتیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ.... اب عقل کے ناخن لیتیں۔ مگر ٹھوکر کھا کر سنبھلنے کے بجائے۔ تیر اندازی پر اتر آئی تھیں۔ ادھر دیوار پار سے تائی جی کی شعلہ بیانی کو ہوا ملی۔

"آ گئیں اوقات پہ۔ بڑی اونچی اڑان بھری تھی۔ لمبی لمبی چھلانگیں.... بڑے بڑے بول سب، جو تابن کر منہ پر آ پڑے۔ آئے ہائے ٹٹ پونجیوں کو کیا بیٹیوں کے رشتے دیے جاتے ہیں۔ اپنا اپنا ہی ہوتا ہے۔"

سچ تو یہ تھا کہ اب زبیدہ بھی پچھتاتیں.... مگر چڑیاں کھیت چگ چلی تھیں اور تائی کی کالی زبان رنگ لے آئی تھی۔ وہ جتنا بلبلاتیں کم تھا۔ جٹھانی کے تیور تو نہ بتاتے تھے۔ کہ وہ کبھی بھولے سے بھی ادھر کا رُخ کریں گی یہ ان ہی کشیدہ دنوں میں سے ایک دن تھا.... ایک دوسرے کا بائیکاٹ چل رہا تھا۔

مظہر۔ عادت کے مطابق تاخیر سے جاگا۔ کھا پی کر.. گھر سے نکلا۔

شام میں وہ نکڑ کے کیبن سے پان کھاتا۔ سگریٹ پیتا اور صبح کے باسی اخبار سے نوکریاں چھانٹتا.... اب بھی نکڑ تک آیا۔

"پان بناؤں۔ باؤ۔" کیبن والا بھی شاید اسی کا منتظر تھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟" اس نے سگریٹ سلگا کر قریبی بینچ سنبھالی اور صبح کا اخبار کھول لیا۔

"میپو نے نکڑ سے دور اپنی سائیکل روکی۔ اور پیغام بھجوایا۔ "بھاء سے بولو مجھے پانچ روپے بھیج دے۔ میں بوتل پیوں گا۔"

"پانچ نہیں ہیں.... تین ہیں۔" جوابی پیغام۔

"میں نہیں لیتا...." وہ نروٹھے پن سے کہہ.... سائیکل سمیت رفو چکر۔ پھر کچھ سوچ کر واپس آیا۔ پھر کہلوایا۔ "وہ تین ہی دے دو۔ میں کچھ اور لے لوں گا۔"

"اب تین بھی نہیں رہے.... میں پان سگریٹ لے چکا۔" وہ بھنا کر پھر تو وہ گیا۔ کھوکے والا ہنسا۔

"تمہارے پان کا مزہ ہی کچھ الگ ہے۔ جواب نہیں۔"

"بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ باؤ اڑا لو مزے۔" کھوکے والا اپنا تمام اسباب سمیٹ کر گاؤں سدھارنے کے چکر میں تھا۔ مظہر کو ایک نیا خیال چھو کر گزرا۔

"نوکری تو ملتی نہیں.... سوچتا ہوں.... کوئی کاروبار کر لوں۔" اس نے گھر آ کر تائی جی سے کہا۔

"ارے کاروبار کیا خالی خولی کرے گا۔"

"نکڑ والا اپنا پان کا کھوکا بیچ رہا ہے۔ اچھی حالت میں ہے.... اور چلتا ہوا ہے۔ اس میں کچھ اوپر کی چیزیں راشن کا سامان بھی رکھ لوں گا۔"

آئیڈیا تو اچھا تھا.... مگر اس وقت اونٹ نکلے کا بھی مہنگا تھا۔ کل ملا کے دو ہزار بنتے تھے۔

"اس بار.... رشیدہ کی بی سی ہے۔ پوچھتی ہوں اگر میری بی سی سے بدل لے۔"

"تائی جی لوٹیں تو کامیاب و کامران.... ہاتھ میں سرخ نوٹ تھے۔ لا کر اس تھمائے۔ مظہر نے ایک ایک کر کے گنے۔ یہ ام میں یہ تو اٹھارہ ہیں۔

ایک بار پھر گنتا ہوں۔" مگر وہ اٹھارہ تھے اور اٹھارہ ہی رہے خیر۔ کھینچ تان کے چل ہی گئے.... ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

"اور وہ جو کہا گیا ہے.... کہ پروردگار بھی اس قوم کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا.... جب تک وہ قوم خود اپنے حالات تبدیل نہ کر لے۔ کھوکا پہلے ہی چلتا ہوا تھا۔ مظہر نے راشن کا سامان رکھا تو اور چل نکلا اس نے کیبن بیچ کر پکی دکان کرائے پر اٹھالی۔ کچھ عرصہ میں اسے بھی بڑھانے کی ضرورت پڑ گئی۔ شومئی قسمت۔ نوکری بھی ہاتھ آ ہی گئی۔ اس نے دکان پر اونگھتے ابا کو بٹھا دیا.... وہ دم لگا کر بیٹھتے تو۔ زمانے بھر سے اڑتے۔ لڑتے مگر دکانداری تو چلا ہی لیتے۔ شام کو

لوٹ کر وہ خود دکان پر جا بیٹھتا۔۔۔ تاجی کے گھر کے حالات تیزی سے بدلے تھے۔۔۔ صحن کے ٹوٹے، چٹخے فرش پر نیا پلستر چڑھوا کر۔۔۔ گھر بھر پر رنگ و روغن بھی کروا لیا گیا۔ پرانے۔۔۔ ٹوٹے بچے۔۔۔ سامان کی جگہ نئے فرنیچر نے لے لی۔ پھر سننے میں آیا۔۔۔ کہ آدھا مکان فروخت کر کے اب کوئی بہتر مکان خریدنے کے ارادے ہیں۔

عاشی نے سنا تو اس کے دل کو دھکا سا لگا۔

وہ قریب تھا تو نظر کے سامنے تو رہتا۔ دل میں اس کی چاہت کا دیا اب بھی جلتا تھا۔ تقدیر سے مات کھا گئی۔ ورنہ شاید اسے بھول جاتی۔

"تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا۔" زبیدہ سے اس کی لے دے آئے روز چلتی۔۔۔ وہ اگلی شادی پر زور دیتیں کہ۔۔۔ دنیا نے ان کا۔۔۔ ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

"امی میرے سامنے دوسری شادی کا نام بھی نہ لیا کرو بس۔۔۔"

"ارے تو کیا ساری زندگی تجھے اپنے سر پر بٹھائے رکھوں۔ ایک کے بعد دوسری شادی بھی تو۔۔۔ انسان ہی کرتے ہیں۔"

وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ جب وہ نہیں۔۔۔ تو کوئی نہیں اور اسی لے دے میں کمال یہ رہا کہ عاشی کے لیے کیا خوب رشتہ اور وہ بھی بروقت آیا۔۔۔ زبیدہ کے کانوں میں ابھی جٹھانی کی گل افشانیاں گونجتی تھیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ نہ نہ کرتے بھی جھٹ بات پکی کر۔۔۔ تاریخ پکڑا دی۔ اگلے مہینے کی تاریخ کا رقعہ لکھنے کو۔۔۔ بلاوا بھی مظہر کو ہی گیا۔۔۔ اور وہ بھی سیرو چشم حاضر۔۔۔ کھٹا کھٹ چچا میاں کے فرمان کے مطابق۔۔۔ اپنے مبارک ہاتھ سے رقعہ درج کیا۔ چچا میاں کو اس پر خاک بھی بھروسا نہ تھا رقعہ جھپٹ کر حاضرین میں کھڑے ہو کر علی الاعلان پڑھا گیا۔ اور سب کا اتفاق پا کر۔ اگلے ماہ کی چودہ تاریخ۔ جمعہ کا مبارک دن مقرر ہوا۔

بعد ازاں یہی تحریر۔۔۔ سنہری روشنائی سے گلابی ریشمی کاغذ پر اتار کر گوٹا کناری سے سجے پوش میں رکھ کر۔۔۔ رقعہ سسرالیوں کو تھما دیا گیا۔ مانو تابوت میں آخری کیل گڑ گئی۔۔۔ مٹھائی بٹی۔۔۔ مظہر نے سب سے بڑا لڈو مزے لے لے کر کھایا۔۔۔ یہی نہیں۔۔۔ سارے بچوں کو جمع کر کے۔۔۔ میز بجا بجا کر رات بھر شادی بیاہ کے گیت بھی گائے۔

بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی۔

بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا اور پھر وہی اول فول۔

"بنو تیرے دولہا کی جوتی جو ٹوٹی

بنو میں جوتا لے کے آیا۔

عائشہ چپل اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑی تھی۔

اور اس نے چڑایا۔ "تو بے فکر رہ۔۔۔ ایک گھر بناؤں گا تیرے گھر کے سامنے۔"

اور اس کا لہو پانی ہوتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اس بار بڑا کماؤ پوت نصیب ہونے جا رہا تھا۔ ساری فیملی ملتان، یہاں ہیں، دو بھائی تھے۔ جو دن رات کام میں جتے رہتے۔ مل میں ڈے نائٹ ڈیوٹیز چلتیں، اس جانب بھی عقد ثانی تھا۔ مگر شادی والے دن کی چھٹی بھی بہ مشکل منظور ہوئی تھی۔ مظہر تایا جی کے ساتھ رشتہ پکا کرنے گیا تو ساری معلومات لے کر آیا تھا اور اس نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ آئندہ کرنا کیا ہے۔

اللہ اللہ کر کے شادی کا دن بھی آ ہی گیا۔

محدود سی تقریب تھی۔ آنگن میں چھڑکاؤ کر کے قناتیں لگائی گئی تھیں۔ اسٹیل کی پانی سے بھری ٹنکیاں۔۔۔ دیوار کنارے رکھ دی گئیں۔ دریوں پر سفید چاندنیاں بچھا کر خواتین کے بیٹھنے کا انتظام اسی مشترکہ چھت پر تھا جہاں کبھی صبح و شام محبت کے بیٹھے راگ الاپے جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ شامیانہ بھر گیا۔

بارات کی آمد کا وقت آٹھ بجے تھا۔ مگر نو بج گئے اور پھر دس۔ بارات کا دور۔۔۔ دور تک نام و نشان نہ تھا۔ گھڑی کی سوئی گیارہ کا ہندسہ عبور کر گئی تو شامیانوں میں بیٹھے مرد کلبلائے اور خواتین میں یہاں سے وہاں

تک سرگوشیاں پھیلتی چلی گئیں۔ زردے پلاؤ کی دیگوں تلے شعلے بجھے تو وہ ٹھنڈی پڑنے لگیں۔ رات کا ایک بجا... کئی سر ایک ساتھ جڑے... یہ کیا ہوا اور اب کیا کرنا چاہیے۔ جیسے امکانات پر روشنی ڈالی گئی۔ اور وہ... وہ بھیانک نقشہ کشی کہ... زمین و آسمان ایک ہو جائیں۔ "کہیں مظہر سے عاشی کے معاشقے کی خبر تو متوقع سسرال تک نہیں جا پہنچی..." بات میں دم تھا۔

زبیدہ کا دل دہل اٹھا... اس بابت تو کسی نے سوچا بھی نہ تھا... فی الفور کسی کو اس جانب دوڑایا گیا۔ ادھر من بھر وزنی تالا منہ چڑا رہا تھا۔ مظہر پیش پیش تھا۔

"خوب جانتا ہوں میں... اس علاقے میں جوئے' نشے کے اڈے چلتے ہیں۔ تب ہی تو کثرت سے چھاپے پڑتے ہیں۔ لگتا ہے دولہا میاں کام آ گئے۔"

"یہاں سے وہاں تک کھلبلی مچ گئی۔ عین شادی والے روز منہ چھپا لینے کے پیچھے... کوئی دل خوش کن امکان تو ہو ہی نہیں سکتا۔

تائی جی کی کالی زبان ایک بار پھر رنگ لا رہی تھی۔ سچ مچ ان کی عزت کا جنازہ اٹھنے کو تھا۔

"اس وقت جو ہاتھ لگے۔ بیٹی کو دو بول پڑھوا کر عزت سے رخصت کردو۔" ابا اور زبیدہ کو دیا گیا مشورہ کسی درد آشنا کا تھا... اور سردست مظہر ہی دستیاب تھا۔ سو اس کی گردن کام آئی۔ بخار میں پھنکتی تائی جی ... منہ سر لپیٹے پڑی رہیں۔ اور لیجیے جناب۔ ان کے راج دلارے سپوت۔ خیر سے گھر بار والے ہوئے۔

"جا کے خبر تو لوں۔ ایسا کون سا غضب ٹوٹ پڑا جو ہماری عزت مٹی میں ملانے کو تل گئے تھے۔"

"زبیدہ کو یہ خیال عاشی کو مظہر کے سنگ بیاہ دینے کے بعد سوجھا... وہ آدھی رات کو ہی۔ برقع سر پر رکھ ... میاں کا ہاتھ تھام چل پڑیں۔

وہاں سب بتیاں... بجھائے اوندھے پڑے تھے۔ ان کا پارہ آسمان کو جا پہنچا دروازہ شدت سے پیٹا... اندر سے کھٹ پٹ ہوئی۔

"او کون ہے جی... یہ بھی کوئی وقت ہے... کسی کا دروازہ بجانے کا... آ رہے ہیں جی... آ رہے ہیں۔"

"دوسروں کی عزت کا تماشا بنا کر مزے سے سو رہے ہو...؟" دروازہ کھلتے ہی ابا نے اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

"ارے بارات نہیں لانی تھی تو ہمیں کاہے کو ذلیل وخوار کیا۔" زبیدہ کا خون ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی کھول اٹھا۔

"بارات تو کل لے کر آنی ہے۔ خود ہی تو لکھ کر دیا تھا۔ چاند کی چودہ تاریخ... وہ تو کل ہے۔"

"ہائیں...!" زبیدہ سٹپٹائیں انہوں نے مظہر کا لکھا گلابی ریشمی رقعہ لہرایا۔ ابا نے چاند کی روشنی میں پڑھا اور زمین قدموں تلے سے سرکتی چلی گئی۔ عیسوی چودہ اور چاند کی چودہ میں صرف ایک دن کا فرق تھا... اور گلابی کاغذ پر عیسوی چودہ جمعہ کا دن حذف کر دیا گیا تھا۔ اور ایک روز میں دنیا ادھر کی ادھر ہو جاتی ہے... اب تک چودہ کی گردان... کو وہ عیسوی چودہ سمجھ کے منڈیا ہلاتے رہے تھے۔

"سالا... کل کا چھوکرا اپن کو استادی دکھا گیا... اس کی تو...!" ابا نے آستینیں چڑھائیں۔

"یہ استادی نہیں محبت ہے۔" نکتہ دیر سے سہی ... مگر زبیدہ کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ میاں کا ہاتھ تھام۔ خوشی خوشی گھر کو لوٹ آئیں...

✲

نمرہ احمد

نمل

کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم

مورچال پہ رات طویل ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ایسے میں حنین بے چین سی دائیں سے بائیں لاؤنج میں چکر کاٹ رہی تھی۔ دیوار پہ آبشار کی صورت بہتے پینٹ اور فرش پہ لڑھکے تھے برش اور ڈبے سے بے نیاز، وہ بار بار گھڑی دیکھتی تھی۔

فارس کہاں ہے؟ زمر کہاں ہے؟ یہی دو سوال پچھلے گھنٹے سے ہر طرف گونج رہے تھے اور اب ایک دم بجلی کا ایک کوندا سا ذہن میں لپکا۔

"سعدی کہاں ہے؟"

وہ تیزی سے اوپر بھاگی۔ اس کا کمرہ کھولا۔ خالی اندھیرا کمرہ۔ وہ کھڑکی تک آئی اور پردے سرکائے۔ نیچے پورچ میں اس کی کار بھی نہیں تھی۔ کہاں گیا وہ؟

مکمل ناول



کب سے گھر نہیں آیا' اسے احساس کیوں نہیں ہوا؟
وہ وہیں کھڑی جلدی جلدی اسے فون ملانے لگی۔ گھنٹی جا رہی تھی' اور مستقل جا رہی تھی' مگر جواب ندارد۔ اسے اب نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

☼ ☼ ☼

احمر شفیع کے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی پارکنگ میں موجود کار کے ڈیش بورڈ پہ رکھا سائیلنٹ موبائل جل بجھ رہا تھا مگر اس کو دیکھنے کے لیے کوئی وہاں موجود نہ تھا۔

اوپر عمارت میں آؤ اور احمر کے فلیٹ میں جھانکو تو باہر پھیلی گھپ رات کے برعکس اندر اب روشنی تھی۔ لاؤنج روشن تھا اور وہ تینوں وہاں کھڑے دبی آواز میں بحث کر رہے تھے۔ پھر ان کا سرغنہ وہاں سے ہٹا اور اندر آیا۔ دروازہ کھولا۔ یہ کمرہ بھی روشن تھا' اور بیڈ کے قریب وہ دونوں بندھے ہاتھوں کے ساتھ زمین پہ اکڑوں بیٹھے نظر آتے تھے۔ آہٹ پہ دونوں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر تر و تازہ چہرے اور چھوٹے گھنگریالے بالوں والا لڑکا بولا۔

"پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔ پون گھنٹے میں یہاں پولیس آجائے گی۔ رپورٹرز الگ ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی جلد آجائیں۔ میری بات کرواؤ نا اپنی مالکن سے۔"

"زیادہ ہوشیار مت بنو۔ قریب کے کسی تھانے میں تم نے رپورٹ نہیں درج کرائی۔ کوئی پولیس نہیں آ رہی۔ ہم نے پتا کروالیا ہے۔" وہ نخوت سے بولا تھا۔ احمر نے بے اختیار سعدی کا چہرہ دیکھا مگر سعدی حیران نہیں ہوا تھا۔

"میں تمہیں پکڑوانا نہیں چاہتا۔ بس تمہاری مالکن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ان سے بات کروا دو ہماری یا ہمیں ان کے پاس لے چلو' پولیس کے آنے سے پہلے۔"

"کہہ رہا ہوں نا' ہم نے پتا کروالیا ہے' کوئی پولیس نہیں آ رہی۔ اب تم سیدھی طرح بتاؤ' تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔" وہ اس کے سر پہ کھڑا ہو کے

اُنتیسویں قسط (دوم)



غرایا۔ احمر نے پھر سعدی کو دیکھا۔ اب کی بار غصے سے۔

"تمہاری مالکن سے بات کرنی ہے۔ اس کو صرف اتنا کہو کہ وہ اپنی ای میل چیک کر لے۔ آگے وہ سمجھ جائے گی۔"

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر جوتے سے زور سے اس کے کندھے پہ ٹھوکر ماری تو سعدی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دوسری جانب لڑھک گیا۔ سرغنہ تن فن کرتا باہر نکل گیا اور سعدی دانت پہ دانت جما کے ضبط کرتا واپس سیدھا ہو بیٹھا۔ احمر وہیں سے غصے سے اس آدمی کو پکار کے لعن طعن کرنے لگا تھا پھر اس کی طرف گھوما۔

"تم نے پولیس بلائی نہ رپورٹرز۔ خود کو بھی مشکل میں ڈال دیا پاگل۔"

گرنے سے اس کی کہنی رگڑی گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے شرٹ اور آستین جھاڑتے ہوئے تلخی سے مسکرا کے سر جھٹک کر رہ گیا۔

"جن لوگوں نے تین دن سے تمہیں بند کر رکھا ہے۔ جن کو تمہیں سرے سے مارنا ہی نہیں ہے۔ جو ڈرائیور اور مالی کے لیول کے گارڈز ہیں اور صرف تمہیں کنگال کرنے، سبق سکھانے اور مار پیٹ کرنے آئے ہیں، انہوں نے مجھے مار کے کیا کرنا ہے؟

میں ایسے ہی نہیں آ گیا۔ بلڈنگ کی سی سی ٹی وی چیک کی تھی۔ تمہارا ٹریک ریکارڈ بھی یاد ہے۔ یہ خاتون خاندانی قاتلوں کے جیسی نہیں ہیں۔ یہ تنہا ہیں۔ تمہاری حرکت کی وجہ سے ان کا خاندان ان سے کنارہ کش ہو چکا ہے، اور ان کی سیاسی سیٹ ان سے چھن گئی ہے۔ یہ اپنے آبائی گاؤں تک واپس نہیں جا سکتیں نہ ان کے پاس خاندان کے مردوں کی سپورٹ ہے۔ ایسی عورت نے کسی کو قتل نہیں کروانا۔ وہ صرف اپنی فرسٹریشن نکالنا چاہ رہی ہیں۔ ایسی عورت سے ہم نپٹ سکتے ہیں۔"

"کب؟ جب ــ وہ ہم دونوں کو مار چکے ہوں گے؟"

"دیکھی ہیں میں نے نیلش کیمن میں خالی سر بجو۔ پستول کا دستہ تک نہیں مار سکے تمہیں وہ۔ ٹرینکولائزر گن سے بے ہوش کیا۔ یہ قاتل نہیں ہیں۔ ایک ڈپریشن کی ماری ہوئی عورت کے احکامات کی وجہ سے بچکچپے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں صرف نکالنا نہیں چاہتا، اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے یہاں سے بہت پہلے بھاگ جانا چاہیے تھا۔" وہ افسوس سے سر دائیں بائیں جھٹک کر کہہ رہا تھا۔ "میں نے اس شہر میں بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ میرے اپنے اعمال ہیں سعدی!"

"ایسا ہی ہے۔" سعدی نے رسمی تردید بھی نہ کی۔

احمر نے سر جھکا کر پیشانی تھام لی۔ "میں اتنا فراڈ، اتنا دھوکے باز، اتنا جھوٹا بن چکا ہوں سعدی کہ اب چاہوں بھی تو ٹھیک نہیں ہو سکتا۔"

"اپنے چاہنے سے کوئی ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کا چاہنا زیادہ ضروری ہے۔ اور پھر کوشش کرنا۔"

"اب کیسی کوشش؟ مسز جواہرات نے اعتبار کیا مجھ پہ، میں وہ بھی خاک میں ملا کر ان کا زیور لوٹ کر جا رہا تھا۔ ایسا آدمی ہوں میں۔ ایسے آدمی کے دوست ہو تم۔" وہ تلخی سے چہرہ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ تین دن سے بندھے ہونے کے باعث وہ شدید ذہنی دباؤ میں تھا۔

"جانتا ہوں مگر ہر شخص خطاکار ہوتا ہے اور بہترین خطاکار وہ ہوتا ہے جو توبہ اور رجوع کرتا ہے۔"

"خطاکار اور گناہگار میں فرق ہوتا ہے۔" وہ پھر زہرخند ہوا۔

"ہاں۔ سب گناہگار نہیں ہوتے، مگر خطاکار سب ہوتے ہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرا کے سر جھکائے، فرش پہ ناخن سے رگڑ کر لکیریں بنانے لگا۔ "میں ایک عمر تک یہ سمجھتا تھا کہ انسان آزمائش آنے پہ دو طرح سے ردعمل دیتا ہے۔ یا وہ پاس ہوتا ہے یا فیل۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام ہر آزمائش پہ پورا اترتے تھے، یا جیسے ہم لوگ جو بار بار فیل ہو جاتے ہیں۔ ہر دفعہ تہیہ کرتے ہیں اب یہ غلط کام نہیں کرنا، ماں باپ سے غصے سے بات

نہیں کرنی' بری عادت کی طرف واپس نہیں جانا۔ مگر اللہ آزماتا ہے اور ہم پھر وہی کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ آزمائش کے دو ہی نتیجے ہوتے ہیں۔ پاس کرو تو درجے بلند اور فیل کرو تو درجہ وہی رہے گا یا نیچے جاؤ گے۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

احمر خاموشی مگر مایوسی سے سنے گیا۔ وہ اس طرح کی باتوں سے خود کو ریلیٹ نہیں کر پاتا تھا۔

"میں بہت عرصے سے قرآن بھی پڑھتا آرہا تھا' مگر کبھی سورۃ کے اس واقعے پہ غور نہیں کیا۔ قید میں ایک دفعہ موقع ملا تو اس واقعے کا مطلب ہی بدل گیا میرے نزدیک۔ وہ داؤد علیہ السلام کا واقعہ ہے' مشہور سا۔ داؤد علیہ السلام اپنی ذاتی زندگی میں کوئی غلطی' کوئی کمی بیشی کر رہے تھے' یہود نے تو بہت سی بے ہودہ کہانیاں گھڑ رکھی ہیں مگر چونکہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں' اس لیے ہم مسلمانوں کو اس واقعے کی گہرائی میں نہیں جانا چاہیے' بلکہ اصل سبق جو لینا ہے' وہ لینا چاہیے۔

تو ہوا یہ کہ داؤد علیہ السلام کو ان کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک مقدمہ بھیجا دو آدمی ان کے پاس دیوار پھاند کے آئے اور ایک نے کہا کہ میرے پاس ایک دنبی ہے اور اس کے پاس ننانوے۔

یہ اب میری ایک بھی ہتھیانا چاہتا ہے۔ قصہ مختصر' داؤد علیہ السلام نے ان کا مسئلہ حل کروایا' اور ان کو نصیحت کی۔ نصیحت کے اس عمل کے دوران ان کو احساس ہوا کہ ان کو خود بھی کوئی ایسا ہی معاملہ درپیش ہے اور اللہ ان کو آزما رہا تھا۔

ہوتا ہے نا بعض دفعہ' ہمارا ہی مسئلہ کوئی اور آکے ہم سے بیان کرتا ہے اور ان کو جواب دیتے دیتے ہمیں اپنے مسئلے کا حل نظر آجاتا ہے۔ تو داؤد علیہ السلام کو احساس ہوا کہ وہ آزمائش پہ پورے نہیں اترے۔ بات ختم نا؟ آزمائش آئی' وہ پورے نہیں اتر سکے' بات ختم؟

مگر نہیں۔ ساری بات ہی یہی ہے کہ آزمائش کا مقصد انسان کو پاس یا فیل کرنا نہیں ہے' ہمیں کچھ سکھانا ہے۔ ہم بھی وہ فیل ہو کر سیکھتے ہیں کبھی پاس ہو کر۔ داؤد علیہ السلام کو جب اپنی کمی کا احساس ہوا تو وہ اللہ کی طرف پلٹے اور توبہ کی۔

آگے اللہ فرماتا ہے۔

"ہمارے پاس اس کے لیے اعلا درجہ ہے۔ اس آزمائش کے ذکر کے ساتھ ہی درجے کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آزمائش ہوتی ہی درجوں کی بلندی کے لیے ہے' تو کسی کوتاہی کے باوجود ان کو اعلا درجہ کیوں مل گیا؟ آزمائش کے ذکر کے فوراً" بعد درجے کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ یہ درجہ ان کی توبہ سے منسلک ہے۔ یعنی احمر شفیع' اگر ہم آزمائش میں فیل ہو جائیں' مگر سبق سیکھ لیں اور توبہ کر لیں تو ہمیں پاس ہونے جیسا درجہ مل جاتا ہے۔ آزمائش اللہ اذیت دینے کے لیے نہیں' کچھ سکھانے کے لیے ڈالتا ہے' جتنی جلدی سیکھ لیں گے اتنی جلدی وہ دور ہو گی۔"

احمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم اچھے آدمی ہو۔ میں نہیں ہوں' سمپل۔"

سعدی ابھی اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دروازہ زور سے کھلا تو ان دونوں نے چونک کر دیکھا' وہ تینوں تیزی سے اندر آرہے تھے۔

"چلو۔ بی بی نے بلایا ہے۔" ایک جھک کر اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ احمر نے چونک کر سعدی کو دیکھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"تجربہ بولتا ہے۔" اور سر کو خم دیا۔

احمر نے گہری سانس لی اور خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

میری شناخت کے پتھر میں شکل باقی ہے
میرے وجود کے ذروں میں زندہ ہے کوئی

گہری مہیب رات اس ہوٹل کی بلڈنگ کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ زمین سے دو منزلیں نیچے... اس

لفٹ میں زمر ایک کونے میں اکڑوں بیٹھی تھی۔ بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ رکھے تھے اور ٹھوڑی ان پہ جمادی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ نظریں پانی کی دھار پہ لگی تھیں۔ فرش پہ دو انچ جتنا گہرا پانی جمع ہو چکا تھا۔ اس کا لباس بھیگ رہا تھا مگر اب وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ بس پانی کے ٹپکتے قطروں کو دیکھ رہی تھی۔ ٹپ ٹپ.... وہ گویا اس کے دل پہ گر رہے تھے۔ وہ بار بار چہرے پہ ہاتھ پھیرتی' ہاتھ آپس میں رگڑتی۔ وہ خوف زدہ تھی' ہراساں تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کوئی ایسی شے نہ تھی جس کے سہارے وہ اوپر چڑھ جاتی اور انگریزی فلموں کی طرح لفٹ کا ڈھکن کھول لیتی۔ وہ بس ساکن بیٹھی تھی۔ سانسیں گن رہی تھی۔

قصر کاردار اس وقت رات کی تاریکی میں ڈوبا تھا۔ کہیں کہیں مدھم بتیاں جلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ فارس سڑک پہ رکی کار کے ساتھ کھڑا تھا اور بار بار گھڑی میں دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ اور سرد سا تھا۔

دفعتاً گیٹ کھلا اور کوئی باہر آتا دکھائی دیا۔ ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس' نیند سے بھری آنکھیں لیے نوشیرواں۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا سامنے آیا اور حیرت سے اسے دیکھا۔

"فیونا نے مجھے اٹھایا کہ تم.... فارس تم ادھر کیا کر رہے ہو؟" وہ اس کے عین سامنے کھڑا ہوا تو چہرہ چاند کی

"دیکھو اگر تم مجھے مارنے آئے ہو تو یاد رکھنا' عدالت...."

اس کے سنگین تاثرات دیکھ کر شیرو نے احتیاط سے بات شروع کی۔

"ہاشم نے زمر کو اغوا کر لیا ہے۔" وہ چبا چبا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولا تھا۔

شیرو گنگ رہ گیا۔ "کیا؟"

"تمہارے بھائی نے زمر کو کہیں بلوایا ہے اور میرے دھوکے میں' وہ چلی گئی ہے اور اس کا اب کوئی پتا نہیں ہے۔ وہ اسے مار دے گا' صرف مجھے اذیت دینے کے لیے۔"

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم لوگ مشہور ہو'

ہاشم بھائی بھی....."

فارس نے جھٹکے سے اس کو گریبان سے پکڑا اور گاڑی سے لگایا۔ "بکواس بند کرو۔"

"مجھے بتاؤ' وہ کہاں ہے۔"

وہ ایک دم اس جارحیت سے ڈر گیا تھا۔ "مجھے نہیں پتا' مجھے سچ میں نہیں پتا۔" فارس نے جھٹکے سے اس کو جھنجوڑا۔

"مجھے پتا کر کے دو۔ ہاشم کے پاس جاؤ اور مجھے پتا کر کے بتاؤ۔ وہ اس وقت آفس میں ہے۔ اس کے فون کے سگنلز وہیں سے آ رہے ہیں۔"

شیرو کو چند لمحے لگے بات سمجھنے میں۔ "مجھے کچھ نہیں پتا۔ یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔ تم لوگ اپنے مسئلے خود سنبھالو۔" اب کے وہ درشتی سے ہاتھ جھلا کے بولا تھا۔

"نوشیرواں!" فارس نے بہت ضبط سے اس کو مخاطب کیا۔ "تم نے اگر کچھ نہ کیا تو وہ مر جائے گی۔"

"وہ مجھے کورٹ میں پراسیکیوٹ کر رہی ہیں' ان کی وجہ سے میں مرنے جا رہا ہوں۔ میں ان کی مدد کیوں کروں؟ اور تمہیں کیا لگتا ہے' میں بھائی کو دھوکہ دوں گا اور تمہارے ساتھ مل جاؤں گا تو بھائی مجھے چھوڑ دے گا؟ بھائی مجھے جان سے مار دے گا۔" وہ برہمی سے بولا اور سر جھٹک کر واپس گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"اگر آخر میں تم نے مرنا ہی ہے' تو کسی کے اقدام قتل کے جرم میں مرنے سے بہتر کسی کی جان بچا کر مرنا نہیں ہے کیا؟"

اس اندھیری رات میں سڑک پہ آگے بڑھتے شیرو کے قدم زنجیر ہوئے۔ وہ بالکل سُن رہ گیا۔ گویا پتھر کا ہو گیا ہو۔

"اگر تمہیں مرنا ہی ہے تو کیا تم کسی لوزر کی طرح مرنا چاہتے ہو؟ کیا تم ساری عمر ایک لوزر رہو گے یا تم واقعی اپنے نام جیسے بننا چاہتے ہو؟ کیا تم "نوشیرواں" ... ہیرو... سپر ہیرو کی طرح مرنا چاہو گے' شیرو؟ اگر مرنا ہی ہے تو کیا تم اس زمر کے لیے مرنا چاہو گے جس نے

تمہیں تمہارے کمپلیکسز سے نکال کر دنیا کے سامنے اٹھ کھڑا ہونا سکھایا؟ کیا تم اس زمر کو بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہو گے، جو اس سب میں تمہارے کیس کی وجہ سے پھنسی ہوئی ہے؟"

کسی خواب کی سی کیفیت میں نوشیرواں اس طرف واپس گھوما۔ ٹکر ٹکر وہ فارس کا چہرہ دیکھے گیا جو اس وقت بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ مدھم چاندنی کے اندھیرے ماحول میں اداسی کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ اور نوشیرواں اورنگ زیب کاروار نے خود کو کہتے سنا۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"دو آپشنز ہیں تمہارے پاس۔" وہ چند قدم طے کر کے اس کے سامنے... بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تو شیرو نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرد تپش سے بھری تھیں اور چہرے پہ بلا کی سختی تھی۔

"یا تو میں تمہیں گن پوائنٹ پہ اپنے ساتھ لے جاؤں، اور ہاشم سے کہوں کہ وہ زمر کو چھوڑ دے ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔"

"تم مجھے اغوا کر کے نہیں لے جا سکتے۔" وہ ششدر سا بولا تو آواز حلق میں پھنسی۔

"لے جا سکتا ہوں مگر لے کر نہیں جاؤں گا کیونکہ ہاشم پھر بھی اسے مار دے گا۔ کوئی بھی مغوی کو زندہ واپس نہیں کرتا کہ وہ جا کر پولیس کو بیان دے دے اور بدلے میں مجھے تمہیں مارنا پڑے گا اور زمر یہ کبھی نہیں چاہے گی۔ اس لیے دوسرا راستہ یہ ہے کہ تم میری مدد

"دیکھو اگر تم مجھے مارنے آئے ہو تو یاد رکھنا، عدالت..." اس کے سنگین تاثرات دیکھ کر شیرو نے احتیاط سے بات شروع کی۔

"ہاشم نے زمر کو اغوا کر لیا ہے۔" وہ چبا چبا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولا تھا۔

شیرو گنگ رہ گیا۔ "کیا؟"

"تمہارے بھائی نے زمر کو کہیں بلوایا ہے اور میرے دھوکے میں، وہ چلی گئی ہے اور اس کا اب کوئی پتا نہیں ہے۔ وہ اسے مار دے گا، صرف مجھے اذیت دینے کے لیے۔"

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم لوگ مشہور ہو، ہاشم بھائی بھی..."

فارس نے جھٹکے سے اس کو گریبان سے پکڑا اور گاڑی سے لگایا۔ "بکواس بند کرو۔"

"مجھے بتاؤ، وہ کہاں ہے۔"

وہ ایک دم اس جارحیت سے ڈر گیا تھا۔ "مجھے نہیں پتا، مجھے سچ میں نہیں پتا۔" فارس نے جھٹکے سے اس کو جھنجوڑا۔

"مجھے پتا کر کے دو۔ ہاشم کے پاس جاؤ اور مجھے پتا کر کے بتاؤ۔ وہ اس وقت آفس میں ہے۔ اس کے فون کے سگنلز وہیں سے آ رہے ہیں۔"

شیرو کو چند لمحے لگے بات سمجھنے میں۔ "مجھے کچھ نہیں پتا۔ یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔ تم لوگ اپنے مسئلے خود سنبھالو۔" اب کے وہ درشتی سے ہاتھ جھلا کے بولا تھا۔

"نوشیرواں!" فارس نے بہت ضبط سے اس کو مخاطب کیا۔ "تم نے اگر کچھ نہ کیا تو وہ مر جائے گی۔"

"وہ مجھے کورٹ میں پراسیکیوٹ کر رہی ہیں، ان کی وجہ سے میں مرنے جا رہا ہوں۔ میں ان کی مدد کیوں کروں؟ اور تمہیں کیا لگتا ہے، میں بھائی کو دھوکہ دوں گا اور تمہارے ساتھ مل جاؤں گا تو بھائی مجھے چھوڑ دے گا؟ بھائی مجھے جان سے مار دے گا۔" وہ برہمی سے بولا اور سر جھٹک کر واپس گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"اگر آخر میں تم نے مرنا ہی ہے تو کسی کے اقدام قتل کے جرم میں مرنے سے بہتر کسی کی جان بچا کر مرنا نہیں ہے کیا؟"

اس اندھیری رات میں سڑک پہ آگے بڑھتے شیرو کے قدم زنجیر ہوئے۔ وہ بالکل سن رہ گیا۔ گویا پتھر کا ہو گیا ہو۔

"اگر تمہیں مرنا ہی ہے تو کیا تم کسی لوزر کی طرح مرنا چاہتے ہو؟ کیا تم ساری عمر ایک لوزر رہو گے یا تم

واقعی اپنے نام جیسے بننا چاہتے ہو؟ کیا تم "نوشیرواں" ..... ہیرو۔۔۔ سپر ہیرو کی طرح مرنا چاہو گے شیرو؟ اگر مرنا ہی ہے تو کیا تم اس زمر کے لیے مرنا چاہو گے جس نے تمہیں تمہارے کمپلیکسز سے نکال کر دنیا کے سامنے اٹھ کھڑا ہونا سکھایا؟ کیا تم اس زمر کو بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہو گے' جو اس سب میں تمہارے کیس کی وجہ سے پھنسی ہوئی ہے؟"

کسی خواب کی سی کیفیت میں نوشیرواں اس طرف واپس گھوما۔ ٹکر ٹکر وہ فارس کا چہرہ دیکھے گیا جو اس وقت بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ مدھم چاندنی کے اندھیرے ماحول میں اداسی کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ اور نوشیرواں اورنگ زیب کاردار نے خود کو کہتے سنا۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"دو آپشنز ہیں تمہارے پاس۔" وہ چند قدم طے کر کے اس کے سامنے۔۔۔ بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تو شیرو نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرد تپش سے بھری تھیں اور چہرے پہ بلا کی سختی تھی۔

"یا تو میں تمہیں گن پوائنٹ پہ اپنے ساتھ لے جاؤں' اور ہاشم سے کہوں کہ وہ زمر کو چھوڑ دے ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔"

"تم مجھے اغوا کر کے نہیں لے جا سکتے۔" وہ ششدر سا بولا تو آواز حلق میں پھنسی۔

"لے جا سکتا ہوں مگر لے کر نہیں جاؤں گا کیونکہ ہاشم پھر بھی اسے مار دے گا۔ کوئی بھی مغوی کو زندہ واپس نہیں کرتا کہ وہ جا کر پولیس کو بیان دے دے اور بدلے میں مجھے تمہیں مارنا پڑے گا اور زمر یہ کبھی نہیں چاہے گی۔ اس لیے دوسرا راستہ یہ ہے کہ تم میری مدد کرو' ہاشم کے پاس جاؤ اور پتا چلاؤ کہ وہ کدھر ہے۔ مجھے اس جگہ کا بتاؤ اور پھر میں اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ نوشیرواں! تمہارے پاس کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے کیونکہ اگر ہاشم نے اسے نقصان پہنچایا تو خدا کی قسم' میں تمہارے اس محل کو آگ لگا دوں گا۔"

وہ غصے سے بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ اذیت سے پُر تھا۔

شیرو اسے یک ٹک دیکھے گیا۔ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اک بے کسی کا جال ہے پھیلا چہار سو
اک بے بسی کی دھند ہے دل سے نگاہ تک

ہاشم کاردار کے آفس میں نیم تاریکی تھی۔ دو کمپیوٹرز کی اسکرین روشن تھیں اور ہاشم ٹیک لگائے بیٹھا' سرد مہری سے اس اسکرین کو دیکھ رہا تھا جس میں وہ لفٹ کے کونے میں بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ خوف زدہ سہمی ہوئی۔ پانی سے بھیگتی' اس کے پاؤں تقریباً" ڈوب گئے تھے۔ موبائل گھٹنوں کے گرد لپٹے ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا اور پرس بھیگنے سے بچانے کے لیے گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔

"سر! پانی کا فلو زیادہ نہیں ہونا چاہیے؟ اس طرح تو اسے ڈوبنے میں گھنٹہ لگ جائے گا۔" رئیس نے اسے پکارا۔

ہاشم نے دائیں بائیں نفی میں سر ہلایا۔ "اونہوں۔ اسی طرح چلنے دو۔ یہ زیادہ دلچسپ ہے۔ میں بعد میں یہ ویڈیو فارس کو دکھا دکھا کر پاگل کرنا چاہتا ہوں۔" وہ محظوظ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس پُرتپش نگاہیں اسکرین پہ گاڑے ہوئے تھا۔ انتقام کی آگ تھی کہ بجھائے نہ بجھتی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ پہ ہاشم نے سر اٹھایا' پھر لبوں پہ تلخ مسکراہٹ آ ٹھہری۔ چوکھٹ میں آلی کھڑی تھی۔ حیران' الجھی ہوئی۔

"ہاشم! کیا ہوا ہے؟ فارس کہاں ہے؟" وہ ایک قدم اندر آئی۔ ہاتھ ہنوز دروازے کے ہینڈل پہ تھا۔ رئیس اٹھا اور ایک کرسی اٹھا کر سامنے رکھی گویا اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا ہو۔ ہر حرکت' ہر جنبش گویا طے شدہ تھی۔ وہ الجھن سے ان دونوں کو دیکھے گئی۔

"آؤ ریڈ! تمہارے لیے تو سجائی ہے یہ بساط۔ تم بھی تو دیکھو کہ وہ کتنا جری مرد ہے۔"

وہ متحیر سی کھڑی رہی۔ نیم تاریک آفس۔۔۔ کونے

میں اونچی میز پہ رکھا روشنیوں سے جگمگاتا ایکوریم۔ اسکرینز کی نیلی روشنی سے دمکتے ہاشم اور زمر کے چہرے۔ ماحول عجیب پُراسرار سا تھا اور آبی کے قدم جم گئے تھے۔ پھر بدقت وہ آگے بڑھی۔ قدم قدم اٹھاتی ہاشم کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ چہرہ اسکرین کی طرف موڑا۔

آنکھیں اچنبھے سے سکڑیں۔ ذرا جھک کر دیکھا۔

"یہ کون ہے؟"

"دیکھو! وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ زمر ایک لفٹ میں قید ہے اور وہ لفٹ جلد ایکوریم بننے جا رہی ہے مگر وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں بیٹھو اور میرے ساتھ یہ تماشا آخر تک دیکھو۔ یہ بے چاری عورت اس کا آخری سانس تک انتظار کرے گی مگر وہ نہیں آئے گا۔ اس کی ساری بہادری اس کی ساری جراتمندی اور دلیری آج تم دیکھ لوگی۔ بیٹھو نا ریڈ کھڑی کیوں ہو۔"

آبدار کی نظریں اسکرین پہ ساکن ہو چکی تھیں گویا پتلیاں حرکت کرنا بھول گئی ہوں۔ بدقت ان بے یقین نظروں کا رخ اس نے ہاشم کی طرف پھیرا۔

"تم پاگل ہو چکے ہو۔" وہ اسے واقعی اس وقت ذہنی مریض نظر آ رہا تھا۔

"عجیب بات ہے ریڈ مگر پاگلوں نے اس دنیا کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ذہین لوگوں نے پہنچایا ہے۔ سارے بم سارے ہتھیار ساری جنگیں یہ سب ذہین لوگوں کے ذہنوں کی کارستانی ہیں۔ بیٹھو اور تماشا دیکھو۔"

وہ شل سی کرسی کے کنارے بیٹھی۔ لب ادھ کھلے تھے اور اسکرین پہ جمی آنکھیں پلک تک نہ جھپک پا رہی تھیں۔ "تم اس کے ساتھ یہ کیوں کر رہے ہو؟"

"تمہارا فیصلہ آسان کرنے کے لیے۔ اس کی اصلیت تمہیں دکھانے کے لیے۔ اس کے بعد تم اس پہ کبھی اعتبار نہیں کر سکو گی۔ وہ کبھی اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا آبدار۔" آہستہ آہستہ آبدار کا ذہن جاگنے لگا۔ اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔

"تم واقعی اسے مار دو گے؟ صرف فارس کو نیچا دکھانے کے لیے؟"

"میرے اس کی طرف بہت سے حساب نکلتے ہیں میں سب کو ایک ہی دفعہ میں بے باق کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم اس کے خاندان سے آخری بدلہ لے رہے ہو۔ اگر زمر کو کچھ ہوا تو... وہ سب۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ "وہ سب... مر جائیں گے مگر فارس اس کے بعد کیا کرے گا؟ وہ بدلہ لے گا۔"

وہ ٹیک لگائے مطمئن سا بیٹھا تھا۔ "کیا تمہارے خیال میں میں اسے بدلہ لینے کے قابل چھوڑوں گا؟" اس کی آواز کی سنگینی... آبدار کی ہڈیوں کے اندر تک سرد لہر دوڑ گئی۔

"تم ایک تیر سے اپنے تمام دشمنوں کو ختم کرنا چاہتے ہو۔ تباہ و برباد۔" اس کی آواز میں دکھ سا بھر آیا پھر جیسے وہ نیند سے جاگی۔ شل ذہن بیدار ہونے لگا۔ اس نے ہاشم کی طرف چہرہ گھمایا۔ "ایسے مت کرو۔ زمر اچھی عورت ہے۔ اس کے ساتھ یہ مت کرو۔"

"اچھا! میرا خیال تھا تم اس کو ناپسند کرتی ہو۔" وہ محظوظ ہوا تھا۔ اس نے بہت سے ذہنی مریض دیکھے تھے ہاشم ان سب سے الگ لگ رہا تھا۔

"ہاشم... یہ مت کرو۔ پلیز تم اس کو نہیں مار سکتے۔ لفٹ کھول دو۔ اسے نکالو۔" وہ منت کرنے کے انداز میں آگے بڑھی کہ خود کی بورڈ پہ کچھ دبائے اسے نہیں معلوم تھا کہ کیا مگر کچھ دبا دے لیکن ہاشم نے کلائی سے پکڑ کر اسے واپس کرسی پہ بٹھایا۔

"آرام سے بیٹھو۔" وہ غرایا تھا اور وہ سہم گئی۔ تنفس تیز ہو گیا۔

"ہاشم... پلیز۔" پھنسی پھنسی سی آواز حلق سے نکلی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اسے چھوڑ دو۔"

"یہ تو تمہارے فارس غازی پہ منحصر ہے۔ کہاں

ہے وہ آبدار؟ کیوں نہیں آیا وہ؟"
"کیا اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔" ساتھ ہی اس نے رئیس کو اشارہ کیا جو سامنے گونگے بہروں کی طرح بیٹھا تھا۔ اس نے سر کو خم دیا اور کی بورڈ پہ کیز دبانے لگا۔ وہ زمر کے نمبر کی لوکیشن آن کر رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

مور جال میں حنین دل مسوس کر بیٹھی تھی۔ لاؤنج پہ پیر اوپر کیے۔ بار بار آنسو صاف کرتی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہاتھ میں زمر کا انکریپٹڈ فون تھا جس سے وہ بار بار فارس اور سعدی کو کال کرتی تھی۔ کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ تبھی نوٹیفکیشن کی آواز آئی۔ وہ چونک کر میز کی طرف جھک کر کھلے لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ۔ زمر کے فون کی لوکیشن جو پہلے مختلف جگہوں پہ بکھری نظر آ رہی تھی، اب صرف ایک جگہ موجود تھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جلدی سے فون پہ ٹائپ کرنے لگی۔ (یہ وہ فون تھا جو انکرپٹڈ تھا، اس کو ٹریس نہیں کیا جا سکتا تھا۔)
"زمر کے فون کی لوکیشن مل گئی ہے۔ وہ آپ کی پرانی یونیورسٹی میں ہیں۔"
اندھیری سڑک پہ وہ کار دوڑا رہا تھا۔ ساتھ ہی مسلسل اندر ابلتے غصے کو جھٹک کر دماغ کو پراگندہ ہونے سے بچاتا تھا۔ وہ اور زمر ایک دفعہ پھر ہاشم کی بساط کے مہرے بن گئے تھے اور وہ ان کی ڈوریں کھینچ رہا تھا۔ ایسا ایک دفعہ پہلے بھی ہوا تھا۔ یا شاید کئی دفعہ۔ وہ ہمیشہ اس سے مار کھا جاتا تھا۔ مگر آج نہیں۔ آج وہ زمر کو کچھ نہیں ہونے دے گا۔ آج وہ ہاشم کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔
جیب میں رکھا بھدا موبائل بجا تو اس نے چونک کر کار آہستہ کی۔ وہ کتنی دیر سے بج رہا تھا، اس نے خیال نہیں کیا تھا۔ اس نے فون نکال کر دیکھا۔ حنین کا پیغام تھا۔ ایک دم اس نے بریک لگائی اور پھر فون فرنٹ سیٹ پہ ڈالتے کار کا رخ موڑا۔ اسے لائبریری جانا تھا۔ یونیورسٹی کی لائبریری۔ وہ یادگار جگہ تھی۔ ان دونوں کے لیے۔
نیم تاریک آفس میں وہ تینوں اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ آبی ہراساں نظر آتی تھی۔ اسکرین کے منظر سے زیادہ وہ بار بار ہاشم کا چہرہ دیکھ کر سہم جاتی تھی۔
وہ ایسا سفاک تو نہ تھا۔ ایسا ابنارمل بھی نہیں۔ یہ سب کیا ہوتا جا رہا تھا؟
تب ہی باہر سے آوازیں آئیں۔ شور سا اٹھا۔ جیسے کوئی گارڈز سے بحث کر رہا ہو۔ رئیس چونک کر اٹھا، ساتھ ہی اسکرین کو بھی دیکھا۔ "فارس نہیں ہو سکتا، اس کے موبائل کے جی پی ایس کے مطابق وہ تو لائبریری جا رہا ہے۔" رئیس عجلت میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ ہاشم چونکا۔ سامنے نوشیرواں کھڑا تھا۔
"شیرو؟ کیا ہوا؟" ہاشم اپنی جگہ سے اٹھا۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔ نوشیرواں ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس تھا، آنکھیں ہنوز خوابیدہ تھیں اور منہ دھوئے بغیر آ گیا تھا غالباً۔ بس الجھا ہوا لگتا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
"کیا ہو رہا ہے بھائی؟"
"تم ادھر کیسے؟" ہاشم کرسی کے پیچھے سے نکل کر اس کی طرف گیا۔ آبدار ذرا سا اسکرین کی طرف جھکی۔ کوئی ایسی کمانڈ جو وہ دبا سکے لفٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے۔
"آہم۔" متامل بیٹھا رئیس کھنکھارا اور پستول جیب سے نکال کر میز پہ رکھ دیا۔ آبی ست سی پڑ کے واپس پیچھے ہو گئی۔
"کیا آپ نے واقعی ڈی اے کو... زمر کو غائب کروا دیا ہے؟" وہ حیران تھا۔
"تم سے کس نے کہا؟"
"فارس سے... وہ گھر آیا تھا۔"
"وہ گھر آیا تھا؟ گارڈز نے نہیں بتایا۔ اس نے نقصان تو نہیں کیا کوئی؟" ہاشم تیزی سے بولا۔ "ممی ٹھیک ہیں؟ اور سونی؟"

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



اس سارے عرصے میں وہ پہلی دفعہ مضطرب ہوا۔
"او ہو بھائی' سب ٹھیک ہے۔ اس نے مجھے باہر بلایا تھا۔ کہہ رہا تھا میں زمر کو بچانے میں اس کی مدد کروں' آپ سے پوچھوں کہ وہ کہاں ہے اور اس کو بتا دوں۔" وہ اکتا کر کہتا آگے آیا اور جھک کر اسکرین کو دیکھا۔ آنکھوں میں چونکنے کا تاثر ابھرا۔
"یہ لفٹ میں بند ہے؟ یہ کیسے کیا آپ نے؟"
"نوشیرواں درست کہہ رہے ہیں۔ یہ دیکھیں۔" رئیس جلدی سے فارس کی لوکیشن چیک کرنے لگا۔ کچھ دیر پہلے وہ واقعی ان کے گھر والے علاقے میں موجود تھا۔
"اور کیا کہا اس نے؟" ہاشم سنجیدگی سے پوچھتا واپس کرسی پہ بیٹھا۔
"یہی کہ اگر میں اس کی مدد کروں اور زمر کو بچا لوں تو وہ لوگ میرے خلاف کیس واپس لے لیں گے۔" وہ جھک کر غور سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ "آدج' مگر اس کی لفٹ میں تو پانی بھر رہا ہے۔ یہ واقعی مر جائے گی کیا؟"
"تم نے اس سے کیا کہا؟" ہاشم نے سپاٹ سے انداز میں پوچھا۔
"یہی کہ وہ اپنی شکل گم کر لے کیونکہ مجھے اس عورت کو بچانے میں دلچسپی نہیں ہے جو کورٹ میں مجھے پراسیکیوٹ کر رہی ہے۔ وہ چلا گیا' مگر بھائی۔" وہ الجھا۔ "اس کو مار کے ہمیں کیا ملے گا؟"
"زمر مر جائے گی' فارس جیل چلا جائے گا۔ سعدی کے لیے ایک اور پلان ہے میرے پاس۔ ان کا خاندان ایک دفعہ پھر تہس نہس ہو جائے گا اور وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ سمپل۔" وہ اب گہرا سانس لے کر اطمینان سے کہہ رہا تھا۔
"گڈ۔ کہاں ہے یہ ویسے؟"
"کل کی نیوز میں دیکھ لو گے۔" وہ تلخی سے بولا۔ شیرو "واٹ ایور" کہہ کر سیدھا ہوا اور کندھے اچکائے۔ پھر آبدار پہ نظر پڑی تو چونکا۔ "آپ بھی انوالوڈ ہیں؟ واؤ۔"
"میں نہیں انوالوڈ۔" وہ چبا چبا کر بولی اور ایک ملامتی نظر ہاشم پہ ڈالی۔
شیرو نے ایک نظر اپنے حلیے کو دیکھا' پھر چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ "میں ذرا۔۔۔ فریش ہو لوں۔" ذرا سا کھسیا کر بولا۔
"بالکل!" ہاشم نے ایک ناپسندیدہ نگاہ اس پہ ڈالی۔ شیرو باہر نکل گیا۔
راہداری عبور کی اور اپنے پرانے آفس میں آیا۔ دروازہ بند کیا۔ تیزی سے باتھ روم میں داخل ہوا' یہ دروازہ بھی مقفل کیا اور جیب سے فون نکالا' پھر ایک نمبر ڈائل کر کے اسے کان سے لگایا۔ ساتھ ہی بے چینی سے بیسن کے اوپر آئینے میں خود کو دیکھنے لگا۔ اس کا اپنا چہرہ سخت مضطرب نظر آ رہا تھا۔
"بولو۔" فارس کی آواز سنائی دی۔
"آر یو شیور کہ تمہارا یہ نمبر ٹریس نہیں ہو رہا کیونکہ دوسرا تو ہو رہا ہے؟"
"یہ نہیں ہو سکتا۔ تم بتاؤ' وہ کیا جو میں نے کہا تھا؟"
"ہاں۔ میں آفس آیا ہوں۔ بھائی کو بتایا تمہارے آنے کا۔ جو تم نے کہا وہ بھی۔ مگر۔۔۔" وہ الجھا۔ "اس طرح تو وہ مجھ پہ شک کرے گا' نہیں؟"
"یہ ضروری تھا' ورنہ وہ اچانک تمہارے بغیر وجہ کے آنے پہ شک کرتا۔ بتایا اس نے' وہ کدھر ہے؟"
"نہیں۔ آبدار بھی یہیں ہے۔ کسی Hostage (یرغمالی) کی طرح۔ بھائی نے زمر کا مجھے نہیں بتایا۔ مگر وہ اسکرین پہ نظر آ رہی ہے۔ سی سی ٹی وی کی لائیو فیڈ میں۔" فارس نے جھٹکے سے بریک لگائی۔ سارا جسم دہل کر رہ گیا تھا۔
"کیا؟ کدھر ہے وہ؟ وہ ٹھیک ہے؟"
"وہ کسی لفٹ میں ہے۔ اور اس کی لفٹ میں پانی بھر رہا ہے۔ وہ کونے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ خوف زدہ سی۔" شیرو نے جھرجھری لی۔ "اگر تم نے اسے نہ نکالا تو وہ مر جائے گی۔ ڈوب کر۔"

"کیسی لفٹ ہے؟ کوئی نشانی' کوئی سائن؟"

دو طرف مرر لگے ہیں۔ آئینے اور بیک پہ براؤن سی وال ہے۔ اور کچھ نہیں سمجھ آیا۔ میں اپنے بھائی کو دھوکا دے رہا ہوں' میں بس اتنا کر سکتا ہوں۔" وہ تلخ ہو گیا۔

"کچھ اور سمجھ میں آئے تو بتانا اور میرے اوپر کوئی احسان نہیں کر رہے تم۔ اپنے اور اپنے بھائی کے گناہوں کو دھونے کی کوشش کر رہے ہو۔" وہ تلخی سے بولا اور فون بند کر دیا۔ شیرو نے سر جھٹکا' فون جیب میں ڈالا اور منہ دھونے لگا۔

وہ واپس آیا تو سب اسی طرح بیٹھے تھے۔ آبی کہہ رہی تھی۔ "میں اس کو پسند نہیں کرتی۔ بالکل بھی نہیں' مگر یہ وحشیانہ سلوک... ہاشم۔ ایسا مت کرو۔ پلیز۔" وہ منت کر رہی تھی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے آبی۔ تم بھی تو دیکھو کہ وہ کتنا قابل ہے۔ میرے لیے اسے ذہنی انگلیوں پہ نچانا کبھی مشکل نہیں رہا۔" وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

"مگر وہ تو آزاد گھوم رہا ہے' ہمارے گھر تک آ گیا۔" شیرو کرسی سنبھالتے ہوئے بولا تھا۔ "وہ زمر کو ڈھونڈ لے گا' پھر؟"

ہاشم نے کوفت سے اسے دیکھا۔ "تم گھر جا سکتے ہو۔"

"اب مجھے نیند نہیں آئے گی' اور میں یہ تھیٹر مس نہیں کرنا چاہتا۔" وہ اطمینان سے رئیس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ "سو فارس اسے کیوں نہیں بچا سکے گا؟" سرسری سا پوچھا۔

"کیونکہ سر' اسے منسٹری کے ایک آفس سے غیر قانونی طور پہ فائلز نکالتے ہوئے گرفتار ہو جانا تھا۔ ہم رات گہری ہونے کا انتظار کر رہے تھے' مگر وہ وہاں سے نکل گیا۔ پلان بی۔ وہ اب لائبریری جا رہا ہے' وہاں پولیس کی ایک وین اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ وہاں سے گرفتار ہو جائے گا۔"

شیرو کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسکرین پہ وہ فارس کی لوکیشن دیکھ سکتا تھا۔ جی پی ایس سگنل سڑک پہ آگے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ نوشیرواں نے بظاہر "واؤ" کہتے پہلو بدلا۔ (اب وہ کیسے دوبارہ اپنے آفس جائے اور اسے فون کرے؟)

"سر! آپ اپنا فون مجھے دے دیں۔" رئیس نے ایک دم اسے مخاطب کیا تو وہ چونکا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ فارس سے مل کر آئے ہیں۔ وہ آپ کے علم میں لائے بغیر آپ کو ٹیگ یا بگ کر سکتا ہے اور آپ کی سیکیورٹی کے لیے مجھے آپ کے تمام gadgets لینے دوں گا۔ مس آبدار کا فون بھی ہم نے اینٹرینس پہ رکھ لیا تھا۔"

"اوکے!" بظاہر لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے فون میز پہ رکھ دیا۔ رئیس اسے اٹھا کر باہر چلا گیا۔ (وہ لاکڈ تھا اور شیرو کال ریکارڈ مٹا چکا تھا) اب نوشیرواں ان دیکھی رسیوں سے بندھا ہوا تھا اور فارس کو لائبریری تک جاتے اور ایک اور پھندے میں پھنستے دیکھنے پہ مجبور تھا۔

ہاشم اب اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ ارد گرد سے بے نیاز' خشم آنکھیں گویا اسکرین میں چبھ رہی تھیں۔ آبی صدمے اور ترحم سے زمر کو دیکھ رہی تھی۔ گود میں ہاتھ رکھے بیٹھی وہ بے بس نظر آتی تھی۔

زمر اسی طرح لفٹ کے کونے میں بیٹھی تھی۔ ٹھٹھری ہی۔ سمٹی ہوئی۔ ٹھنڈے پانی میں اس کا آدھا وجود ڈوب چکا تھا' مگر جائے تو جائے کہاں۔ سو بیٹھی رہی۔ پرس اور موبائل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے دروازے پہ بند ہتھیلی مار دیتی۔ چند آوازیں بھی لگائی مگر تاریک پارکنگ ایریا میں رات کے اس پہر کسی کو نہیں آنا تھا غالباً۔

ساری زندگی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح سے گھوم رہی تھی۔ کو نگی بہری فلم۔ ٹوٹے پھوٹے سین۔ وہ فارس کو کتنی اذیت دیتی تھی' اس سے کتنی تلخی سے پیش آتی تھی۔

ساری بری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ساری اچھی باتیں بھول گئی تھیں۔

وہ موبائل روشن کر کے دیکھنے لگی۔ ایس او ایس ایمرجنسی کالنگ کچھ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے گیلری کھولی۔ اپنی اور فارس کی نئی پرانی تصویریں دیکھیں ... سعدی، حنین ... مورچال ... اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ سگنل ہنوز بند تھے۔ ایمرجنسی کال تک نہ جاتی تھی۔ نوٹیفکیشن بار نیچے کیا تو ذرا ٹھہری۔ وائی فائی کا بٹن عادتاً "آن" تھا۔ اس نے اس زور سے دبایا تو وائی فائی کا خانہ کھل گیا۔ موبائل از سر نو قریبی وائی فائی نیٹ ورکس کو ڈھونڈنے لگا۔ زمر کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ سر اٹھا کے اوپر دیکھا۔ کیمرہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے موبائل ذرا تر چھا کر کے پکڑ لیا۔

دفعتاً "فون نے اطلاع دی۔ قریب میں ایک نیٹ ورک آن تھا۔ شاید کوئی اپنی کار میں ... تھری جی ڈیوائس رکھے ہوئے تھا جو آن تھی اور اس کے سگنل لفٹ تک آتے تھے۔

اس نے اسے دبایا۔ پاس ورڈ؟

وہ کپکپاتی انگلیوں سے ٹائپ کرنے لگی۔

12345678۔ یہی سب سے کامن پاس ورڈ تھا۔

"غلط" نشان ابھرا۔ اس نے لب کاٹتے ہوئے ایک سے نو اور پھر ایک سے دس تک گنتی لکھی۔ غلط۔ دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ پانی اس کے گھٹنوں تک آ گیا تھا اور آنکھوں سے پانی ویسے بھی بہہ رہا تھا۔ "پاکستان" اس نے دوسرا سب سے کامن پاس ورڈ ٹائپ کیا۔ غلط۔ مگر وہ تھکی نہیں۔ بار بار ٹائپ کرتی رہی۔ الفاظ، ہندسے۔ اپنے گھر والوں کے نام۔ یونہی بے کار میں۔

زمر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس وائی فائی کنکشن کے نام میں جو بارہ ہندسے لکھے تھے، وہی اس کا پاس ورڈ تھے۔

☆ ☆ ☆

قتل چھپتے تھے کبھی سنگ کی دیوار کے بیچ
اب تو کھلنے لگے مقتل بھرے بازار کے بیچ

حنین لاؤنج میں اداس سی بیٹھی تھی۔ ایک ہی پوزیشن میں پاؤں رکھنے کے باعث وہ سن ہو گئے تھے۔ وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے مسلسل ناخن دانتوں میں دبا کر کترے جا رہی تھی۔ وہاں زمر کی لوکیشن لکھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دوسری ونڈو میں فارس کی لوکیشن چیک کی۔ وہ یونیورسٹی کے قریب تھا۔ اسے کچھ تسلی ہوئی۔ شکر ہے وہ اس قابل تھی کہ کسی کی موبائل لوکیشن چیک کر سکے اور حالات کا اندازہ کر سکے ورنہ تو مارے ٹینشن کے اس کا برا حال ہو جاتا اور ...

یکدم وہ ٹھہر گئی۔ ایک کوندا سا ذہن میں لپکا۔ اس نے تیزی سے، فون اٹھایا اور کال ملائی۔

"کیا ہوا حنہ؟" وہ ٹھنڈے سے انداز میں بولا تھا۔

"ماموں! مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ دیکھیں پہلے ہمیں زمر کی لوکیشن مل نہیں رہی تھی پھر اچانک سے مل گئی اور اگر مجھے آپ کی لوکیشن معلوم ہو سکتی ہے تو ان کو بھی ہو سکتی ہے۔ آپ ... آپ وہاں نہ جائیں۔"

"میں وہاں جا بھی نہیں رہا۔"

وہ ٹھہر گئی۔ "نہیں؟ کیوں؟"

اور اس بلند و بالا ہوٹل کے سامنے ٹیکسی سے اترتے ہوئے فارس نے فون کان سے لگائے والٹ سے چند نوٹ نکال کر ٹیکسی والے کو تھمائے اور آگے چلتا آیا۔ اس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہیں نظر آتا تھا۔ صرف سنجیدگی اور ٹھہراؤ۔

"کیونکہ میں ہمیشہ اس کے داؤ میں اس لیے پھنس جاتا ہوں کیونکہ میں اس کی طرح نہیں سوچتا۔ وہ صرف جرم کرنے کا نہیں سوچتا، وہ کور اپ کا بھی سوچتا ہے۔ جرم کے بعد الزام کس کے سر جائے گا، یہ طے کر رکھتا ہے۔" وہ تیز تیز چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "پہلے اس نے سوچا کہ وہ شہری کے ذریعے مجھے گرفتار کروا دے، لیکن اسے اندازہ تھا کہ عین ممکن ہے میں گھنٹے بھر میں چھوٹ جاؤں تو اس نے یقیناً "پلان بی" رکھا ہو گا۔ اب وہ چاہتا ہے میں یونیورسٹی جاؤں اور میں جا بھی جاتا اگر میں اپنے کریڈٹ کارڈ کا ریکارڈ نہ

دیکھ لیتا۔"

"کریڈٹ کارڈ کہاں سے آئی؟"

"میرے بلز کو وہ عموماً" مجھے پھنسانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسے گمان ہو گا کہ اتنی افراتفری میں مجھے اپنا اکاؤنٹ دیکھنے کا ہوش کہاں ہو گا۔ مگر زمر نے تمہیں کہا تھا کہ وہ ڈنر پہ جا رہی ہے تو وہ یقیناً" کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ گئی ہو گی۔ لائبریری نہیں اور چند گھنٹے پہلے میرے کارڈ سے دو دن کے لیے اس ہوٹل میں روم بک کیا گیا ہے' جہاں زمر اور میں ایک دفعہ آئے تھے اور جو ہارون عبید کی ملکیت ہے۔" وہ ہوٹل کے داخلے کی طرف تیز قدموں سے چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور ہاشم ہمیشہ ہارون عبید کے ٹولز استعمال کرتا ہے' جیسے سعدی بھائی کی دفعہ کیا تھا۔" وہ جوش سے بولی۔

"بالکل۔"

"اور یقیناً" آپ نے کسی کے ہاتھ فون یونیورسٹی بھجوا دیا ہو گا کیونکہ وہ مسلسل اسی طرف جا رہا ہے۔" وہ اسکرین کو دیکھ کر بولی۔

"نہ صرف فون بلکہ کار بھی۔"

"تو آپ زمر کو اتنے بڑے ہوٹل میں کیسے ڈھونڈیں گے۔ کیا پتا وہ اب تک وہاں نہ ہوں۔"

"کسی نے بتایا ہے کہ وہ لفٹ میں ہے' اور یہ کہہ کر اس نے میری نظر میں اپنے سارے گناہ دھو ڈالے ہیں۔" اس نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا اور داخلے کے قریب آیا۔

"میرا روم بک ہے۔ مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔" اس نے شناختی کارڈ نکالتے ہوئے سیکورٹی آفیسر سے تھکے تھکے انداز میں کہا تھا۔ نہ کوئی روک ٹوک' نہ کوئی پوچھ گچھ۔ اسے ادب اور خوش دلی سے اندر جانے دیا گیا۔

البتہ داخلے کے قریب موجود گارڈ کو اس کی شکل دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

لابی میں داخل ہوتے ہی اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ وہ استقبالیہ کی طرف بھاگا۔ سیکورٹی آفیسر نے فوراً" ہتھیلی لبوں تک لے جا کر کچھ کہا۔ ہوٹل کے کنٹرول روم میں بیٹھے اہلکاروں میں سے ایک نے کان میں لگا آلہ دبا کر غور سے سنا اور پھر آگے کو ہو کر کی بورڈ پہ بٹن دبائے۔ اسکرین پہ چوکھٹے ابھرے لابی اور ریسپشن کا منظر اور ایک طرف بھاگتا غازی۔ اس نے برق رفتاری سے فون اٹھایا۔

☼ ☼ ☼

نیم تاریک آفس میں وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ اسکرین پہ لفٹ میں نظر آتی زمر پانی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سکڑی' سمٹی اور مسلسل موبائل پہ بٹن دبائے جا رہی تھی۔ پانی اس کے کندھوں سے بالشت بھر نیچے تھا اور وہ ہاتھ اٹھا کر موبائل اوپر پکڑے ہوئے تھی۔ چہرے پہ آنسوؤں کے نشان تھے' جیسے ہر شے ختم ہو چکی تھی اور وہ بار بار پاس ورڈ ٹائپ کر رہی تھی۔ فوٹیج میں اتنا دکھائی دیتا تھا کہ وہ ٹائپ کیے جا رہی ہے۔ کیا؟ یہ سمجھ نہ آتا تھا۔ یکدم اس کے ہاتھ سے موبائل پھسلا اور اس نے سنبھل کر اسے تھامنا چاہا مگر وہ پانی میں ڈبکی کھا کر ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے ادھر ادھر ہاتھ نہیں مارے۔ بس سر بند دروازے سے لگا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ پرس' موبائل' سب ڈوب چکا تھا۔ پانی اب اس کے کندھوں کے قریب پہنچتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کھڑی نہیں ہوئی۔ آنکھیں موندے' زیر لب کوئی دعا پڑھے گئی۔ (میرے بعد میرے خاندان والے کوئی انتہائی قدم نہ اٹھائیں اللہ تعالیٰ۔ میرے خاندان والے۔۔۔)

"یہ تو ہارون عبید کے ہوٹل کی لفٹ ہے نا؟" نوشیرواں کو بالآخر یاد آ ہی گیا۔ "آپ کو کیسے پتا تھا کہ وہ اسی لفٹ میں داخل ہو گی جس کو آپ لوگ کنٹرول کر سکیں گے؟"

"نہیں سر۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ اوپر روم تک جائیں۔ ہم نے وہاں ان کو ہراساں کرنے کے لیے کچھ لوگ اکٹھے کر رکھے تھے۔ وہ فوراً" بھاگتیں اور دونوں

اہلی ویٹرز کو مصروف سا کرا کے ان میں سوار ہو جاتیں۔ ان کو لگتا کہ وہ بچ جائیں گی مگر ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ پہلے ہی اس لفٹ میں سوار ہو گئیں۔"

تب ہی فون کی بیل پہ وہ رکا اور موبائل کان سے لگایا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ فارس غازی ہوٹل کیسے پہنچ سکتا ہے؟ وہ تو کہیں اور جا رہا تھا۔" رئیس ششدر سا فون پہ بولا تھا۔ ہاشم لمحے بھر کو بالکل سن سا رہ گیا۔ پھر اس نے فون رئیس کے کان سے کھینچا۔

"کہاں ہے غازی؟ فوٹیج مرر کرو ہمارے سسٹم پہ۔" وہ غرایا تھا۔

آبدار نے پہلے اسے دیکھا' پھر نوشیرواں کو۔ شیرو آگے ہو کر بیٹھا تھا' دم سادھے۔ آبی کو دیکھتے پا کر نظریں چرا گیا۔ وہ اسے چند لمحے دیکھے گئی۔ پھر رخ موڑا۔

اسکرین پہ وہ لابی عبور کرتا نظر آ رہا تھا۔ دائیں سے بائیں بھاگتا۔ وہ ایک طرف جاتا' پھر دوسری طرف۔ ہاشم سانس روکے اسے دیکھے گیا۔ فون کان سے لگا تھا۔

"سنو۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ لڑکی کدھر ہے۔ تماشا نہ بننے دینا کیونکہ بعد میں مرڈر کیس بنے گا تو کور اپ بھی کرنا ہے۔ آرام سے اپنے سیکیورٹی آفیسرز لے کر جاؤ' اور اس کو روک لو۔ بس چند منٹ کے لیے اسے قابو میں رکھو پھر چھوڑ دینا۔"

"مگر اسے پتا کیسے چلا کہ زمر کہاں ہے؟" شیرو سرسری سا لہجہ بنا کر بولا۔

آبی ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم نے فون نیچے کر کے اچنبھے سے کہا۔

"ہو سکتا ہے زمر نے گھر سے نکلتے ہوئے کسی کو بتایا ہو' بہرحال وہ ہمیں دھوکا دینے کے لیے کسی کے ہاتھ اپنا موبائل یونیورسٹی بھجوا کر خود یہاں آیا ہے' لیکن اتنے بڑے ہوٹل میں وہ اسے اتنی جلدی ڈھونڈ نہیں پائے گا۔"

پھر فون کان سے لگایا۔ "وہ سیکیورٹی کی مدد مانگے گا' کنٹرول روم کے کیمروں تک رسائی چاہے گا' اس کو روک کر رکھ لینا۔"

وہ تیز تیز ہدایات دے رہا تھا۔ چہرے پہ غیظ و غضب چھایا تھا مگر وہ ہار نہیں مانے گا' یہ طے تھا۔ آج وہ فارس کو کچھ نہیں کرنے دے گا۔

"سر... میرا نہیں خیال اس کی ضرورت ہے۔" رئیس اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ "وہ سیکیورٹی سے مدد مانگ بھی نہیں رہا۔"

واپس ہوٹل کی لابی میں آؤ تو وہ روشنیوں اور فانوسوں سے مکمل روشن تھی۔ اونچی چھت' مرمریں فرش' درمیان میں فوارہ۔ آگے پیچھے ٹہلتے لوگ۔ غالباً' وہاں کوئی کنسرٹ ہو رہا تھا اور ابھی ختم ہوا تھا تو رش کافی تھا۔ فارس پہلے ایک رخ سے دوسرے رخ تک دوڑا' پھر واپس آیا۔ اب وہ لابی کے وسط میں کھڑا تھا۔ نگاہیں تیزی سے چاروں طرف دوڑاتے' اس نے لمحے بھر میں دیکھ لیا تھا کہ دور کھڑے سیکیورٹی اہلکار اسی کو دیکھ کر آپس میں بات کر رہے تھے۔ زمر کے پاس وقت کم تھا۔ اسے جو کرنا تھا ابھی کرنا تھا۔

"سنو... میری بات سنو۔" وہ کنسرٹ سے لوٹتے لڑکوں کے ایک گروپ کی طرف بڑھا' ایسے کہ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی' چہرہ پسینے سے تر شدید پریشان لگتا تھا۔ اپنے اپنے موبائلز پہ سر جھکائے گزرتے لڑکے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"میری بیوی... میری بیوی لفٹ میں پھنس گئی۔ اس کی کال آئی ہے۔ واٹر لائن پھٹ گئی ہے' اس کی لفٹ میں پانی بھر رہا ہے۔ اور یہ ہوٹل والے مدد نہیں کر رہے۔"

"پلیز سنو... رکو' میرے ساتھ چلو' بات سنو۔" وہ ان کے ساتھ ساتھ قریبی گزرتے لوگوں سے بھی التجا کر رہا تھا۔ چلا چلا کر۔ بہت سے چہرے مڑے' بہت سے قدم اس کی طرف اٹھے۔ چند لپکے۔ چند دوڑے۔

"او گاڈ! یہ کیسے ہوا؟"

"کہاں ہیں آپ کی وائف؟"

وہ کن انکھیوں سے دیکھ سکتا تھا کہ سیکیورٹی گارڈز

تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے' مگر ایک دم سے لابی میں کہرام مچ گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اس طرف دوڑا جہاں لفٹس لگی تھیں' انسانوں کا ایک ریلا اس کے ساتھ بھاگا۔

"کوئی ریسکیو کو کال کرے۔"

"میں کر رہی ہوں۔ آپ لوگ ادھر جائیں۔"

شور آوازیں۔ بہت کم لوگ تھے جو بیٹھے رہے' یا دیکھتے رہے' مگر ایک رش سا تھا' جس میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی' جو اپنے موبائل اور ہینڈز فری جیبوں میں اڑستے فکرمندی سے اس کی طرف دوڑے تھے۔

سیکیورٹی گارڈز کا راستہ رک گیا۔ کسی کو دھکے لگے' کسی کو ٹھڈا آیا۔ کوئی کچن کی طرف بھاگا کسی اوزار کی تلاش میں' کوئی آگ بجھانے والا آلہ اٹھا لایا۔ فارس دوڑتا ہوا لفٹس کی طرف آیا تھا۔

"کون سی لفٹ میں ہے وہ؟" کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ تیز تنفس اور دھڑکتے دل کے ساتھ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"ان ہی میں سے کوئی ہے۔"

ایک لفٹ کو نیچے بلانے کا بٹن دبایا۔ پھر دوسری کی طرف بھاگا' پھر تیسری کی طرف۔ سب کو نیچے بلایا۔ لوگ آگے پیچھے جمع ہو گئے تھے۔ کسی نے پولیس کو بلایا' کسی نے فائر بریگیڈ کو۔ ہوٹل کے ریسکیو کے اہلکار (جو ہاشم کے احکامات تلے نہیں تھے) اطلاع ملنے پہ لفٹ کھولنے کا سامان لے کر اپنے آفس سے باہر دوڑے تھے اور وہ اتنے رش اور شور میں کھڑا ان تینوں لفٹس کے باری باری نیچے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

دفعتاً" یکے بعد دیگرے دو دروازے کھلے۔ پہلی' دوسری... وہ ٹھیک تھیں۔ تیسری لفٹ کی بتی جلی تھی۔ وہ B-2 پہ تھی۔ مگر اوپر نہیں آرہی تھی۔

"یہی ہے۔ یہی ہے۔ بی ٹو کہاں ہے بی ٹو؟" وہ مڑ کر چلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

کسی نے بیسمنٹ کا کہا تو وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ بہت سے نوجوان اس کے ساتھ بھاگے۔

سیکیورٹی اہلکار بے بسی سے کھڑے دیکھتے رہ گئے۔

اور اسکرین پہ یہ مناظر دیکھتے ہوئے ہاشم کی رنگت بالکل سیاہ پڑ گئی تھی۔ وہ چپ تھا۔ بالکل چپ۔ رئیس چلا چلا کر فون پر ہدایات دے رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں' ریسکیو اہلکار ہر وقت ایسی ٹریجڈی کے لیے تیار ہوتے ہیں' ان کو یہ کہیں کہ وہ لفٹ میں پھنسی لڑکی کو بچانے نہ جائیں؟ یہ کہنے پہ وہ رکیں گے تو نہیں' البتہ ہم پہ شک کریں گے۔"

"ان کے کام میں تاخیر ڈالنے کی کوشش کرو۔"

رئیس بے بسی سے کہہ رہا تھا' بار بار خائف نگاہ ہاشم پہ بھی ڈالتا۔ جس کی خاموش نظریں اسکرین پہ گڑی تھیں۔

"سر! پولیس کو بلایا گیا ہے' ہوٹل کی سیکیورٹی ٹیم کے درجنوں ممبران موجود ہیں ادھر اور وہ سب تو ہمارے ساتھ نہیں ملے ہوئے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

ہاشم نے فون رئیس کے کان سے کھینچا اور سختی سے اس میں بولا۔ "وائپ آؤٹ کرو سب۔ ساری ویڈیوز' ثبوت' ریکارڈ' سب کلین کرو' جلدی۔"

"یس سر!" اور اس نے فون میز پہ پھینک دیا۔

پرتپش نظریں اسکرین پہ جمی تھیں اور تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔

فارس دھڑکتے دل کے ساتھ تیز تیز زینے پھلانگ رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے بہت سے مناظر گھوم رہے تھے۔ مگر وہ بار بار نفی میں سر ہلاتا۔ وہ اسے بچا لے گا۔ وہ وقت پہ پہنچ جائے گا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ اس شور شرابے میں بہت سے نوجوان' ملازم' سیکیورٹی گارڈز اس کے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں' وہ کسی کا نہ انتظار کر رہا تھا' نہ جواب دے رہا تھا۔ دیوانہ وار زینے پھلانگتے ہوٹل کی سب سے نچلی بیسمنٹ میں داخل ہوا۔

وہاں طویل اور نیم تاریک پارکنگ ایریا تھا۔ ایک

کونے میں لفٹس لگی تھیں۔ وہ ان کی طرف دوڑا۔ تیسرے نمبر کی لفٹ کے دروازے بند تھے۔ جڑے ہوئے، یوں لگا جیسے قدیم وقتوں کا کوئی زندان ہو۔ وہ اتھل پتھل سانسوں کے ساتھ بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اسے دھڑ دھڑایا۔

"زمر۔۔۔ زمر۔۔۔" وہ زور سے چلایا۔ آواز میں کپکپاہٹ تھی، خوف تھا۔

دوسری جانب خاموشی تھی۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہیں۔ وہ دیوانہ وار دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔ "زمر! جواب دو، زمر۔" اس کے ہاتھ سرخ پڑ رہے تھے۔ اور وہ لوہے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ لوگ قریب آچکے تھے۔ رش کے درمیان سے راستہ بناتے ریسکیو اہلکار آئے اور اسے ہٹانا چاہا، تاکہ وہ دروازے کو مشینری کی مدد سے کھول سکیں۔ کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر پرے دھکیلنا چاہا، مگر وہ کندھا جھٹک کر مڑا اور ریسکیو اہلکار کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"یہ مجھے دو اور پیچھے ہٹو۔" غصے سے غراتے اس کے ہاتھ سے آلہ لیا اور اسے پرے ہٹایا۔ دوسرے اہلکار نے نیچے سے اور اس نے پھر اوپر سے آلہ لفٹ کے دروازوں کی درمیانی درز میں زور سے گھسایا۔ اندر سے پانی رسنے لگا۔ ذرا، ذرا، اب وہ دونوں ایک سمت میں زور لگانے لگے۔ بلیڈ پکڑے اس کے زور لگاتے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی، بے قرار نظریں دروازے پہ جمی تھیں، سانس رک رک کر آرہی تھی۔

ایک دفعہ پہلے بھی دروازہ توڑا تھا۔ وہ ایسا منظر دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ٹوٹے دروازوں کے پار چھوٹتے رشتے دیکھ دیکھ کر تھک چکا تھا۔ اب نہیں، یا اللہ اب نہیں۔

لوگ اونچا اونچا بول رہے تھے، ہمت بندھا رہے تھے اور وہ دونوں زور لگا رہے تھے۔ دروازے کو دائیں طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ عجیب سی آواز کے ساتھ دروازہ ذرا سا دائیں طرف دیوار میں گھسا۔ ایک دم پانی کا ریلا سا باہر کو چھلکا۔ سب بے اختیار پیچھے ہٹے۔ آلے ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔ بس وہ پیچھے نہیں ہوا۔ پانی پوری قوت سے باہر کو گر رہا تھا۔ وہ مکمل بھیگ چکا تھا۔ مگر ابھی کچھ نظر نہ آتا تھا کہ دوسری طرف کیا ہے۔ دروازہ بھی بالشت بھر ہی کھلا تھا۔ اس نے آلہ چھوڑ دیا اور آگے بڑھا۔ دونوں ہاتھوں سے دروازے کا کنارہ پکڑ کر زور سے اندر کو دھکیلا۔ دانت جمائے۔۔۔ بازوؤں کی رگیں ابھر آئیں۔ تکلیف ہونے لگی۔ شاید اس کا ہاتھ کٹ گیا تھا اور خون نکل رہا تھا۔ ہر شے گیلی تھی۔

پانی کا سیلاب اسی طرح باہر نکل رہا تھا۔ سب پیچھے ہٹ چکے تھے۔ صرف وہ کھڑا تھا۔ بھیگا ہوا۔ لبوں میں کچھ بڑبڑاتا ہوا۔ اس کا نام، اس سے کی جانے والی منتیں۔ دھیرے دھیرے بھاری دروازہ اندر گھستا گیا۔ ایک فٹ تک، دو فٹ، اس نے دروازہ چھوڑ دیا۔ گہرے گہرے سانس لیتا وہ بھیگا ہوا چوکھٹ پہ کھڑا تھا اور ادھ کھلے دروازے سے نظر آتا تھا۔

اندر گیلے فرش پہ وہ اوندھے منہ گری پڑی تھی۔ اسے لگا، اس کا دل بند ہو جائے گا۔ بس ایک لمحے کو پیر زنجیر ہوئے، پھر وہ اندر لپکا۔ اس کو سیدھا کیا۔ وہ بھیگی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی یخ۔۔۔ آنکھیں بند تھیں۔ گیلی لٹیں چہرے کے ساتھ چپکی تھیں۔ ہونٹ جامنی تھے۔

"زمر۔" اس پہ جھکے فارس نے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔ وہ اتنی ٹھنڈی کہ اس کے اپنے ہاتھ پیر بھی ٹھنڈے پڑنے لگے۔

"زمر۔" اس نے پکارنے کے ساتھ اس کی گردن پہ ہاتھ رکھا۔ پھر چہرے پہ سانس محسوس کیا۔

وہ زندہ تھی، اوہ خدایا، وہ زندہ تھی۔ زمین پہ بیٹھتے ہوئے، تھک کر اس نے چہرہ اوپر کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ گہرے گہرے سانس لیے۔ وہ زندہ تھی۔ اس نے دیر نہیں کی تھی۔

ریسکیو اہلکار اس کے پاس آگئے تھے، کسی نے

اسے ٹراما بلینکٹ تھمایا' کسی نے کندھا تھپکا۔ کوئی اسٹریچر لانے کی اطلاع دے رہا تھا۔ وہ زندہ ہے... وہ ٹھیک ہے۔ وہ اسے اٹھا کر اب اسٹریچر پہ ڈال رہا تھا اور خود کو کہتے ہوئے سن رہا تھا۔ وہ لڑکے اس کو مبارک باد دے رہے تھے' اس کا کندھا تھپک رہے تھے۔ وہ ہنس بھی رہا تھا' وہ شاید رو بھی رہا تھا مگر وہ کسی کو جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ احتیاط سے اسے اسٹریچر پہ لٹا رہا تھا۔

بیسمنٹ کی سی سی ٹی وی فوٹیج نیم تاریک آفس میں رکھی اسکرین پہ مرر ہو کر آ رہی تھی۔ ہاشم دائیں سے بائیں ٹہل رہا تھا۔ رئیس سر پکڑے بیٹھا تھا۔ نوشیرواں منہ میں ناخن ڈالے انہیں کترے جا رہا تھا۔

اور آبدار... اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ بس اسکرین پہ پھیلے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گیلے بالوں' گیلے کپڑوں والا مرد' اپنی آنکھیں انگلیوں سے رگڑتا' کسی کے شانہ تھپکانے پہ سر جھٹک کر ہنستا' کمبل میں لپٹے وجود کو اسٹریچر پہ ڈال رہا تھا۔ پانی آیا تھا تو سب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ بس وہی کھڑا رہا تھا۔ بس اسی نے لمحے بھر کی غفلت نہیں کی تھی اور اب وہ اسٹریچر کو آگے دھکیل رہا تھا۔ لوگ اسے مبارک باد دے رہے تھے' خوش ہو رہے تھے' آوازیں نہ سنائی دیتی تھیں' مگر چہروں کے تاثرات اور مسکراہٹیں سب کہہ رہی تھیں' کچھ لوگ ان پہ رشک کر رہے تھے۔ ایسے ہوتے ہیں محبت کرنے والے' خیال رکھنے والے شوہر۔ یہ ہوتی ہے محبت۔

اور آبدار نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔

"یہ ہوتی ہے محبت؟"

وہ ماتھے پہ بل لیے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر رہا تھا۔ کوٹ پرے پڑا تھا اور آستینیں اوپر چڑھا رکھی تھیں۔ وہ سخت غصے میں' بے بس سا نظر آتا تھا۔ بار بار پیشانی مسلتا۔ نفی میں سر ہلاتا۔ رنگت سیاہ پڑ رہی تھی۔

"یہ کیسے ہوا؟ اسے ہوٹل کا کیسے پتا چلا؟"

"شاید مسز زمر نے گھر میں بتا رکھا ہو۔"

"مگر اسے یہ کیسے پتا چلا کہ وہ لفٹ میں ہے؟" ہاشم چونکا۔ "وہ جیسے ہی ہوٹل میں داخل ہوا' وہ فوراً "لفٹ کی طرف بھاگا تھا۔ اس نے لوگوں کو متوجہ بھی لفٹ کی طرف کیا۔"

نوشیرواں نے بہت سا تھوک بدقت نگلا اور سرسری سا بولا۔ "شاید اس نے اندازہ لگایا ہو۔"

ہاشم نے چونک کے اسے دیکھا اور پھر ٹھہر کے دیکھتا گیا۔ "تمہارے پاس آیا تھا وہ۔ کیا وعدہ کیا تھا اس نے تم سے؟ زمر کو بچا لو تو کیا دے گا وہ؟ کیس میں معافی؟"

نوشیرواں سناٹے میں رہ گیا۔ پھر بدقت بولا "بھائی' کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ مسز زمر کہاں ہیں۔ میرا تو فون بھی رئیس بھنے لے لیا اور یاد کریں' آپ نے تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہ ہوٹل میں ہے اور پھر میں اسے کیوں بتاؤں گا؟ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔" وہ جلدی میں غیر ضروری صفائیاں دینے لگا۔ مگر ہاشم مشتبہ نظروں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔

"The lady doth cry too much!"

"عورتوں کی طرح چلاؤ مت۔"

رئیس نے بھی شیرو کو سنجیدگی سے دیکھا۔

"آپ میرے موبائل لینے سے پہلے باتھ روم گئے تھے۔ تب موبائل آپ کے پاس تھا۔"

"اے تم چپ کرو۔" وہ ڈپٹ کر بولا۔ "اگر اپنا پلان فیل ہوا ہے تو مجھے ذمہ دار نہ ٹھہراؤ۔ پہلے ہی ساری رات برباد کروی میری۔" اکتا کر کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھایا۔ "میرا فون واپس کرو' تاکہ میں جاؤں' ایک تو تم لوگوں کا ساتھ دو' اوپر سے باتیں بھی سنو۔"

"کیا کسی انسان کے لیے مرنا صحیح ہوتا ہے؟ کیا یہ اسی کی مستحق ہے؟"

ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ گردن ذرا دائیں کندھے کی طرف جھکائے' سر کے اوپر سرخ رومال بندھا تھا جس سے سرخ بال کانوں اور گالوں پہ نکل نکل کر گر رہے تھے۔ رنگت سفید زردی پڑ رہی تھی اور آنکھوں میں زمانے بھر کی ویرانی تھی۔ دکھ تھا' صدمہ تھا۔

(ہاشم نہیں دیکھ سکتا تھا کہ آبدار نے گھٹنوں کے قریب، میز کی نچلی دراز کھول رکھی تھی اور اس میں رکھی کسی کی موبائل یا ٹیب کی ناکارہ ہینڈز فری دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ البتہ جس جگہ نوشیرواں کھڑا تھا' اسے آبی کے گود میں رکھے ہاتھ صاف نظر آرہے تھے۔ وہ متحیر ہوا تھا۔)

"شاید نہیں!" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر چہرے پہ گرنے لگے۔ شیرو کی نظریں اس کے ہاتھوں پہ پھسلیں۔ آبدار نے ایئرپڈ کو ایک ہاتھ سے کھینچا تو وہ تار سے الگ ہوگیا۔ اس نے ننھا ایئرپڈ مٹھی میں دبا لیا اور ٹوٹا ہوا ہینڈز فری دراز میں ڈال کر اسے اندر دھکیلتی کھڑی ہوئی۔ گیلی آنکھیں ہاشم پہ جمی تھیں جو بالکل ٹھہر کے' غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

(میں آبدار عبید ہوں اور میں ایک بری لڑکی نہیں تھی۔ میرا بھی ایک دل تھا جیسے آپ سب کا ہے۔)

مگر زبان سے وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے اس کے لیے کیا کیا نہیں کیا؟ اپنا پیسہ خرچ کیا' وقت صرف کیا' جان کو خطرے میں ڈالا' جو اس نے مانگا' میں نے لا کر دیا۔" انگلی سے اپنے سینے پہ دستک دیتی وہ گلابی آنکھوں کے ساتھ چلائی تھی۔ "میں نے اس کے لیے سب کچھ کیا۔ کیا یہ ہی منظر دیکھنے کے لیے؟"

ہاشم اچنبھے سے اسے دیکھ رہا تھا اور رئیس اور نوشیرواں بالکل سانس روکے۔

(اور کیا برا کیا میں نے اگر ہمیشہ دل کی سنی؟ دل کی مانی؟ کیا عشق مرضی سے کیا جاتا ہے؟ نہیں۔ یہ تو مرض ہے جو یوں لگتا ہے جیسے کسی کو فلو لگ جاتا ہے اور کسی کا فلو کینسر بن جاتا ہے۔)

"میں نے سعدی کو نکلوایا' میں نے ان کو میری انتجیو کے خلاف ثبوت لا کر دیے' فارس کو سری لنکا میں سہولیات میں نے فراہم کیں۔ مگر اسے اس وقت صرف زمر نظر آرہی ہے۔ وہ کسی اور کو دیکھ ہی نہیں پا رہا ہے۔ وہ اس کے لیے یہ سب نہیں کرے گی جو میں کر رہی ہوں۔ مگر اس کے لیے فارس نے خود کو خطرے میں ڈال دیا۔"

ہاشم کی آنکھوں میں برہمی ابھری۔ لب کھولے' پھر بھینچ لیے۔ وہ اب قدم قدم آگے آرہی تھی۔

(وہ میرا کبھی نہیں ہوسکے گا اور میں نہیں جانتی کہ کسی انسان کے لیے جان دینا یا جان لینا صحیح ہے یا نہیں' مگر میرا دل کہتا ہے۔ آج میں سب ختم کر ہی دوں۔)

اس کے چہرے پہ زمانوں کا دکھ اور آنکھوں میں سرخی تھی۔

"یہ میں تھی جو اس کی "جان" بچانے کے لیے رات کے اس پہر تین قاتلوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔" بند مٹھی سے ایک انگلی نکال کر تینوں کی طرف اشارہ کیا۔ "مگر وہ اس وقت میرے بارے میں نہیں سوچ رہا ہو گا۔ وہ زمر کا ہے اور وہ زمر کا ہی رہے گا۔ پھر میں نے اس کی غلامی کیوں کی؟"

ہاشم کی آنکھیں ذرا سکڑیں۔ "تم نے بتایا اس کو؟" اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

(آج میرا من کہتا ہے کہ جہاں اتنا گیا ہے اس کے لیے وہاں ایک آخری بازی بھی لگا دوں۔)

"مگر میم میں نے تو آپ کا فون پہلے ہی لے لیا تھا۔" رئیس بھی چونکا۔

"مجھے اپنے ہوٹل کی لفٹ پہچان کر فارس کو زمر کی لوکیشن بتانے کے لیے کسی فون کی ضرورت نہیں' جب کہ میرے پاس اس کا دیا گیا ایک موجود تھا۔" یہ کہہ کر اس نے مٹھی کھولی' ایئرپڈ دو انگلیوں میں پکڑ کر ان کو دکھایا اور اس سے پہلے کہ کوئی حرکت کرتا۔

آبی تیزی سے ایکوریم تک آئی' ایئرپڈ دانتوں میں ڈال کر کچلا' پھر ایکوریم پہ چہرہ جھکا کر اندر اگل دیا۔ ٹوٹا ہوا ایئرپڈ پانی میں ڈوبتا گیا۔

ہاشم دھک سے رہ گیا۔ "تم... تم یہاں کی ساری گفتگو اس تک پہنچا رہی تھیں؟" اسے یقین نہیں آیا۔

(اگر میں ہمیشہ بری ہی تھی تو آج میرا دل کہتا ہے کہ ایک برا کام اور کر دو۔ عجیب بات... میں اب بھی اپنی

دنیا اور اپنی آخرت نہیں سوچ رہی۔ میں اس انسان کا سوچ رہی ہوں۔ یہ عشق تو غلامی ہے نری غلامی۔)

نوشیرواں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر آواز پھنس گئی۔ وہ بگ نہیں تھا' وہ تو اسی شکل کا عام سا ایئرپیس تھا' مگر وہ نہیں کہہ سکا۔

"ہاں۔ اسے شیرو نے نہیں' میں نے بتایا ہے کہ زمر کہاں ہے۔ میں نے فارس کی "جان" بچائی ہے۔ میں نے!" سینے پہ مٹھی سے دستک دیتی وہ زور سے چلائی تھی۔ رئیس اٹھا' تاکہ ایکوریم سے بڈ نکالے مگر وہ دونوں اس ایکوریم کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے۔

"آبی!" اس کے مقابل کھڑے ہاشم کی آنکھوں میں صدمہ اترا۔ تحیر بھرا صدمہ۔ "تم نے۔ کیوں؟"

"کیا میں نہیں جانتی کہ تم نے مجھے کیوں بلایا ادھر؟ تم مجھے انتخاب کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ تم میرے سامنے ایک عورت کو مار کر مجھے ڈرانا چاہتے تھے۔ تم اس طرح مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے ساری زندگی کے لیے خوف میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے تم ہاشم۔ تم مجھے اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ آج وہ مر جاتی تو میں تمہاری وحشت اور رعب کی غلام بن جاتی۔"

اس نے ہتھیلی سے گیلا چہرہ رگڑا اور نفرت سے اسے دیکھا۔ "تم میری فارس کے لیے محبت کو خوف کی تھپکی دلا کر سلانا چاہتے تھے۔ کیا یہ تمہیں اتنا آسان لگتا ہے؟ محبت سے دست بردار ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا ہاشم۔ مگر میں نے اس سے محبت نہیں کی۔"

وہ دو قدم مزید قریب آئی۔ ہاشم لب بھینچے ناگواری مگر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہولے ہولے سانس لے رہا تھا۔ وہ سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر غرائی۔

"میں نے اس سے عشق کیا ہے۔ عشق غلامی ہے۔ مجھے اس زندگی میں اس سے کبھی آزادی نہیں مل سکتی۔ تم مجھے اس سے آزاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تم مجھے ایک دوسری غلامی میں ڈالنا چاہتے تھے۔ اوہ ہاشم' تمہیں کیا لگا تھا؟ میں ڈر جاؤں گی۔ تمہاری غلام بن جاؤں گی؟ اس کو سوچنے اور اس سے بات کرنے سے بھی ڈرنے لگوں گی؟ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا' اسی خوف سے اس کو چھوڑ دوں گی؟"

چنگاریوں سی دہکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے آبی نے نفی میں سر ہلایا۔

(اور آج میں یہ جان گئی ہوں کہ انسان کو کسی انسان کی غلامی نہیں کرنی چاہیے' مگر میں اس چھوٹی لڑکی جیسی بہادر نہیں ہوں۔ میں خود کو ان پھندے سے آزاد نہیں کر سکتی۔)

وہ اسی طرح دھیرے دھیرے سانس لیتا اسے دیکھے گیا۔ بنا پلک جھپکے' بنا ہلے' بنا بولے۔

"تم نے میری جان بچائی تھی' مجھے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ مگر میں نے تمہیں مسیحا نہیں مانا۔ موت کا فرشتہ مانا۔ موت کا فرشتہ کہا۔ گریم ریپر' جو موت بانٹتا ہے۔ ایک عجیب سا موت کا احساس تھا جو تمہارے ساتھ نتھی ہو گیا تھا۔ ہم ایک تکون بن گئے تھے۔ میں' تم اور موت۔ جب بھی تم بیمار ہوتے' میں تمہیں دیکھنے آتی تاکہ موت بھاگ جائے۔ ہم تینوں اس تکون میں قید تھے۔ میں ہم اور موت۔ پھر وہ آیا اور میں نے اس کو اپنی تکون میں ڈالنا چاہا۔ پرونا چاہا۔ نہ تم جانے پہ تیار تھے' نہ موت جانے پہ تیار تھی۔ اسے ہی نکلنا پڑا۔" اس نے بازو لمبا کر کے میز پہ کھلی اسکرینوں کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ چلا گیا۔ وہ اپنی زندگی کے ساتھ اس تکون میں سے نکل گیا۔ ہم تینوں پھر سے اس میں رہ گئے' قید۔"

"مگر آج میں اس قید کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں ہاشم کہ ہماری فیری ٹیل کے بھیڑیے تم ہو۔"

وہ درد سے پھٹی آواز سے چلائی تھی۔ آنکھوں میں خون اترا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے سے سانس لیتا سنتا گیا' اسے دیکھتا گیا۔

(اور کتنی عجیب بات ہے کہ میں اسے بھیڑیا کہہ رہی ہوں' مگر اندر سے وہ مجھے عزیز بھی تھا' تب ہی تو میں نے کبھی اسے اپنی قید سے آزاد نہیں ہونے دیا۔

قیدی کیسے برے لگتے ہیں؟)

ایکوریم کے پانی میں جگمگاتی روشنیوں کا عکس آبدار کے چہرے پہ پڑ رہا تھا۔ وہ عجیب سی لگ رہی تھی۔

"تم ہو ہر مسئلے، ہر فساد کی وجہ۔ تم نے سب کو برباد کیا ہے۔ وہ تمہاری ماں تھی۔ جس کی وجہ سے میری ماں مری اور جیسے سعدی نے کورٹ میں بتایا۔ کرنل خاور کی زندگی بھی تم لوگوں نے برباد کی۔ باقی سب سے زیادہ تم قصوروار ہو۔ مجرم ہو۔ تم نے وارث غازی کو مارا۔ ڈاکٹر سارہ اور اس کی بیٹیوں کو تباہ کیا۔ تم نے زمر کو تباہ کیا۔ فارس کو تباہ کیا۔ نوشیرواں نے تو سعدی کو زخمی کیا تھا مگر تم نے اس کو اتنے مہینے قید رکھ کے ذہنی مریض بنا دیا۔ تم نے خاور کو بھی برباد کیا۔ تم نے ہی اس چھوٹی لڑکی کا دل دکھایا ورنہ وہ کورٹ میں یوں نہ بولتی۔ تم نے سعدی کی ماں کا دل دکھایا۔ تم نے میرا دل توڑا۔ تم نے اپنے ہی بھائی کو بگاڑ کے رکھ دیا اور مجھے کہتے ہو کہ فارس اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا؟

نہیں ہاشم۔ انسانوں کے بس میں حفاظت کرنا نہیں ہوتا مگر عزت کرنا تو ہوتا ہے۔ وہ اپنی عورتوں کی عزت تو کرواتا ہے نا۔ تم نہیں کروا سکتے۔ تم نے اپنی ماں کو کچہری میں رپورٹرز کے سوالوں کے سامنے تنہا چھوڑ دیا۔ تم نے اپنی بہن کو تنہا چھوڑ دیا۔ تم نے اپنی بہن کو جیل میں سڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پورا شہر جانتا ہے کہ اصل بھیڑیے تم ہو۔ اصل قاتل، اصل گناہ گار تم ہو۔"

"بس کرو یہ گلٹ کی باتیں۔ مجھے افسوس ہے، مجھے دکھ ہے، بس کرو یہ سب کہنا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو کہ تمہیں افسوس ہے اپنے گناہوں کا۔ تمہیں کبھی افسوس نہیں تھا۔ تم جھوٹے ہو۔ عدالت میں جھوٹ بول بول کر اپنے جھوٹ تمہیں سچ لگتے ہیں۔ خود سے بھی سچے نہیں ہو تم۔ تمہیں کوئی گلٹ نہیں ہے ہاشم! تمہیں کوئی پچھتاوا نہیں ہے اور تم نے کبھی بھی اپنے خاندان کو بچانے کے لیے، خاندان کی حفاظت کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ تم نے جو بھی کیا اپنی طاقت قائم رکھنے کے لیے کیا۔ حب جاہ کے لیے کیا۔" وہ زور، زور سے چلا رہی تھی۔

(اور میں نے جو کیا حب جاہ کے لیے کیا۔ جاہ اور جاہ میں فرق ہوتا ہے۔ مگر دونوں کی ہوس انسان کو ہراتی ہے۔ میں ہار گئی ہوں، مگر جیتنے ہاشم کو بھی نہیں دوں گی۔ آج میں اگر کامیاب ہوئی تو فارس کے سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے۔)

"تم بھیڑیے ہو، اور تمہاری فطرت ہی ایسی ہے کہ تم بکریوں کو ہی کھا سکتے ہو تم معصوموں کا خون پینے، ان کا دل نکالتے اور ان کا جگر کاٹنے والے بھیڑیے ہو، تم ایک ایسے شیطان ہو جس کا اب وقت آگیا ہے کہ اسے ختم کر دینا چاہیے۔"

چلا چلا کر ہذیانی انداز میں بولتی آبدار ایک دم میز کی طرف لپکی، پیپر نائف اٹھائی اور ہاشم کے سینے میں گھسانی چاہی مگر ہاشم نے چابک دستی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑا۔ وہ پورا زور لگا رہی تھی مگر ہاشم نے اسے موڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کو گردن کی پشت سے دبوچا اور اس کا چہرہ ایکوریم میں پوری قوت سے ڈبو دیا۔

(اور اگر میں ناکام ٹھہرتی ہوں تو بھی فارس کے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ تو پھر کیا ہو جو میں اپنے دل کی مان لوں؟ اس دل کی جو میری مانتا ہی نہیں۔)

نوشیرواں چلا کر بڑھا تھا مگر رئیس نے فوراً سے اسے دبوچ کر روک دیا۔

"بھائی... اسے چھوڑ... وہ مر جائے گی۔" وہ بدقت رئیس کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی مزاحمت صدمے کے زیر اثر ہلکی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھیں اس طرف جمی تھیں، جہاں وہ آپی کو گدی سے پکڑے پانی میں اس کا سر ڈبوئے ہوئے تھا۔

آبدار کے ہاتھ ایکوریم کی دیواروں پہ سختی سے جمے تھے اور وہ سر ادھر ادھر پانی میں ہلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس پہ جھکے اس کو اندر کی طرف دھکیلتے ہاشم کی

قوت زیادہ تھی۔ چاقو کب کا نیچے گر چکا تھا۔

(اور میں کبھی نہیں تسلیم کروں گی کہ میں ایک بری لڑکی تھی' میں بری نہیں تھی۔ میرا دل برا ہو گیا تھا اور دیکھو۔ میں اب بھی اسی آدمی کو سوچ رہی ہوں۔ کیا یہ عشق ہے یا کوئی آسیب؟)

"سب کچھ کیا میں نے تمہارے لیے اور تم نے اس کے لیے مجھے دھوکا دیا۔" وہ سرد' سرخ آنکھوں سے غراتے ہوئے اس کا سر پانی میں ڈبوئے ہوئے تھا۔

نوشیرواں اب چل نہیں رہا تھا۔ ششدر سا ساکت کھڑا تھا۔ آبی چلا رہی تھی۔ پیر مار رہی تھی مگر سب بے سود تھا۔

"میں نے تمہاری جان بچائی تھی۔" اس کے ڈوبے سر کے قریب جھک کر' مسلسل نیچے کی طرف زور لگاتے' وہ زور سے چیخا تھا۔ "تمہاری زندگی پہ سب سے بڑا حق میرا تھا۔ اور تم نے مجھے دھوکا دیا۔ تم نے اس کے لیے مجھے دھوکا دیا۔" آبدار کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ پانی میں ادھر ادھر ہلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

(اور میں پہلی دفعہ مرنے نہیں جا رہی۔ میں آبدار ہوں۔ پانی سے بنی۔ ایک دفعہ پانی میں پہلے بھی مر چکی ہوں۔ مگر اس وقت چند سوال ادھورے رہ گئے تھے۔ آج ان کے جواب مل جائیں گے۔ کم از کم اب میں نیوٹرل نہیں رہی۔ میں نے ایک سائڈ چن لی تھی۔ میرے دل کی سائڈ۔ کم از کم اب وہ نورانی وجود مجھ سے ناراض نہیں ہوگا۔ اور دیکھو میں اپنی ماں کی روح کو یہاں سے بھی دیکھ سکتی ہوں۔ ہاں اب میں اس کے علاوہ بھی کچھ سوچ رہی ہوں۔)

پھر اس کے شیشے کی دیواروں پہ جمے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ جسم کو ہلکے سے جھٹکے آئے۔ مزاحمت کم ہوتی گئی۔ ہاتھ نیچے گر گئے۔ ایکوریم کے پانی میں خون کی بوندیں شامل ہوئیں۔ آبی کا سرخ رومال کھل کر پانی میں گر گیا۔ اس کا سر بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔

(لیکن میں تمہیں بتاؤں۔ انسان کے عشق میں جان دینا صحیح ہوتا ہے یا نہیں۔ مگر اس کی اجرت کسی جہان میں نہیں ملتی۔)

ہاشم نے اسے گردن سے کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔ ہونٹ جامنی تھے۔ آنکھیں ساکت تھیں۔ ہاشم نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ پورے قد سے زمین پہ آگری۔ بے جان' ساکت۔

نوشیرواں پلٹا اور باتھ روم کی طرف لپکا۔ دیواروں کا سہارا لیا۔ لیمپ کو تھاما۔ لیمپ نیچے گر گیا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ پکڑتے' ٹٹولتے' وہ ڈگمگاتے قدموں سے بیسن کے قریب آیا' اس پہ جھکا تو اسے الٹی ہونے لگی۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکلنے لگے۔

نیم روشن آفس میں خاموشی چھا گئی تھی۔ رئیس بالکل ششدر' چپ کھڑا تھا اور ہاشم کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کی شرٹ اور بازو گیلے ہو چکے تھے۔ پھر وہ میز تک آیا' ٹشو باکس سے ٹشو باہر کھینچے۔ چہرے پہ گرے چھینٹے صاف کیے۔ گردن اور گریبان سے پانی کی بوندیں صاف کیں۔ ٹشو پرے اچھالا۔ تہ شدہ آستینیں کھول کر کلائی تک لایا۔ کف کے بٹن بند کیے۔ اس کی رنگت سفید تھی' برف جیسی۔ سارے تاثرات جم گئے تھے' گلیشیر ہو گئے تھے۔ سپاٹ' سرد۔ اس نے گردن جھکائے' ٹائی کی گرہ کسی۔ پھر اسٹینڈ سے کوٹ اٹھا کر پہنا۔ نادیدہ شکنیں درست کیں۔ ذرا سا کالر جھاڑا۔ بالوں پہ ہاتھ پھیرا اور ان کو گویا درست کیا۔ موبائل جیب میں ڈالا۔ اب کے مڑا تو آبدار کا بے جان وجود فرش پہ گرا نظر آیا۔

"کیا اس کے گارڈز باہر ہیں؟" اس نے بدلی ہوئی ٹھنڈی ہموار آواز میں پوچھا۔ رئیس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی۔ ان کی کار ان کے ساتھ آئی تھی۔"

"کتنے ہیں؟" وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا اور نہیں بھی لگ رہا تھا۔

"تین۔"

"اور گھر میں کتنے لوگوں نے اسے ہماری کار میں

بیٹھتے دیکھا تھا؟"

"چار ملازموں نے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں۔"

"کل ہوئے سات۔ ان ساتوں کا بندوبست کرو۔ ان کو خرید لو یا خاموش کرا دو۔ آیدار آج رات یہاں نہیں آئی۔ وہ راول لیک گئی تھی۔ اسے موت اور ڈوبنے کی obsession تھی۔ وہ راول لیک میں ڈوب کر خودکشی کر لیتی ہے اور دو آدمی... تمہارے کوئی سادہ نظر والے آدمی... اس کی لاش اسپتال لے کر جاتے ہیں۔ سرکاری اسپتال۔ وہاں ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ڈاکٹر آفتاب واسطی اس کا پوسٹ مارٹم کرے گا اور لکھے گا کہ موت جھیل میں ڈوبنے سے ہوئی۔ ہارون شہر سے باہر ہے' اس کے آنے سے پہلے رپورٹ تیار ہو جانی چاہیے۔ کل دوپہر میں جنازہ ہو جائے گا۔ میرا سیاہ شلوار سوٹ تیار کروا دینا اور اب تم اس سارے میس کو صاف کرو۔"

اشارہ فرش پہ گری آئی پائی' لڑھکے فلور لیمپ وغیرہ کی طرف کیا۔ پھر آیدار کے پاس سے نکل کر ایکوریم تک رکا۔ اس کی سطح پر تیرتا سرخ ریشمی رومال اٹھایا' مٹھی میں بھینچ کر نچوڑا اور اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ قدم قدم چلتا دروازے تک آیا تو نوشیرواں باتھ روم سے نکلتا دکھائی دیا۔ اس کا گیلا چہرہ یرقان کے مریض جیسا دکھتا تھا اور آنکھوں میں بہت سا غم تھا۔

"اس کی جان کیوں لی؟" وہ دبا دبا سا چیخا تھا۔ ہاشم نے کندھے اچکائے۔

"کیونکہ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے افسوس نہیں ہے۔ دس دفعہ موقع ملنے میں دس دفعہ یہی کروں گا۔"

وہ جان چکا تھا' سو سرسری سے انداز میں اطلاع دی اور باہر نکل گیا۔ لفٹ کی طرف جاتے اس کے قدموں میں ذرا سی لرزش تھی اور چہرہ مردوں کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں بے جان تھیں۔

قصر کاردار کے لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ٹائی ڈھیلی کر رہا تھا۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے وہ سونی کے کمرے کے باہر رکا اور دروازہ کھولا۔ وہ اندر لحاف میں دبکی سوتی' دکھائی دے رہی تھی۔

"تم اور میں۔ ہم اکیلے ہیں سونیا۔ مجھے سب نے دھوکا دیا ہے۔ ممی' شیرو' سعدی' آبی۔ سب نے مجھے میری محبت کی سزا دی ہے۔ انہوں نے مجھے بھیڑیا بنا دیا ہے اور اب میں ان کو دکھاؤں گا کہ بھیڑیا کیا ہوتا ہے۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے' مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ میں نے خود کو دریافت کر لیا ہے۔ میں نے سارے رشتے کھو دیے ہیں' سوائے تمہارے سونی۔ مگر اب مزید میں ان کو جیتنے نہیں دوں گا۔ یہ مجھے جتنا ہرا سکتے تھے' انہوں نے ہرا لیا۔"

سونی کو دیکھتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

اس نے ایک عزم سے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آیا۔ کوٹ اتارا اور وہ گیلا سرخ رومال بیڈ سائڈ ٹیبل پہ پھیلا دیا۔ پھر میڈیسن کیبنٹ کھولی۔ نیند کی گولیوں کی ڈبی نکالی' چند گولیاں پھانکیں اور بغیر پانی کے نگل گیا۔ اب وہ بیڈ پہ بیٹھا جھک کر جوتے اتار رہا تھا۔ اس کے لب ایک ہی فقرہ بڑبڑا رہے تھے۔

"Fight with down going not am i but..."

شہ مات

"میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاتی ہوں لڑکی!" ملکہ نے بہت تفاخر سے کہا تھا۔

"اور وہ یہ ہے کہ...

ہر فیری ٹیل کا

خوش گوار انجام نہیں ہوتا۔

وہ چند قدم چل کر قریب آئی۔

اور ملکہ کے کان میں بولی۔

"آپ نے درست فرمایا تھا ملکہ عالیہ!"

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ...

ہر فیری ٹیل کا خوش گوار انجام ہو۔

لیکن ایک بات طے ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ...

ہر فیری ٹیل میں... ہر ظالم ملکہ...

اپنے برے انجام کو ضروری پہنچتی ہے۔ (شونڈا)

رائمز)

صبح کی نیلی روشنی سارے میں پھیل رہی تھی۔ اس پُرتعیش ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں سے لان نظر آتا تھا۔ جس میں پرندوں کے بولنے کی آوازیں کسی مدھر نغمے کی مانند گونج رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں وہی تینوں ملازم احمر اور سعدی کو بٹھا کر ان کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے تھے اور اب وہ دونوں وہاں تنہا تھے۔

احمر کا لباس داغ دار اور میلا کچیلا لگتا تھا۔ آستینیں چڑھائے، بکھرے بال، تین راتوں سے جاگتے رہنے اور تشدد سہنے کے آثار چہرے پہ شدید تھکن اور اضطراب کی صورت نمایاں تھے۔ سعدی بھی تھکا ہوا تھا، مگر احمر کی نسبت کافی بہتر تھا اور چوکنا سا بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

"اب پلان کیا ہے؟" تھکے تھکے بے زار سے احمر نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"پلان ہے تو آیا ہوں نا، ورنہ اتنا اچھا نہیں ہوں کہ کسی کے لیے یوں خطرے میں کود پڑوں۔" بار بار کے ایک ہی سوال سے وہ بھی اکتایا۔ احمر نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اسے شدید پریشانی ہو رہی تھی۔ سر الگ پھٹ رہا تھا۔ چوکھٹ پہ آہٹ ہوئی تو دونوں چونکے۔ پھر بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

صاحب زادی صاحبہ سامنے سے چلتی آ رہی تھیں۔ قیمتی چادر سلیقے سے سر پہ اوڑھے، ایسے کہ بالوں کا اسٹائل، کانوں کے بندے اور گردن کا زیور صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ شاہانہ سے انداز میں مقابل بڑے صوفے پہ بیٹھیں۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور تمکنت سے ساتھ کھڑے ملازم کو اشارہ کیا، جس نے وہ سیاہ بیگ میز پہ رکھ دیا اور پھر باہر نکل گیا۔

"یہ زیورات لے کر میں تمہیں چھوڑ دوں گی، کیا یہی سمجھا تھا تم نے؟" سرمئی آنکھوں میں سرد مہری لیے احمر کو دیکھا تو اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ شرمندگی سے نہیں، شاید مصلحت سے۔ صاحب زادی صاحبہ نے نظروں کا رخ سعدی کی طرف پھیرا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ سادگی تھی، البتہ آنکھوں میں چمک بھی تھی۔

"آپ یہ زیورات رکھ سکتی ہیں، لیکن ہم دونوں کو تو آپ کو چھوڑنا ہی ہوگا۔"

"ہوں!" اس نے غور سے سعدی کو سر سے پیر تک دیکھا۔ "تم نے اپنی ای میل میں لکھا تھا کہ تم احمر کے فلیٹ میں جا رہے ہو جہاں میرے آدمی نادانستگی میں تمہیں یرغمال بنالیں گے اور چونکہ تم مشہور ہو چکے ہو تو مجھے تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ بلکہ تمہاری آفر سننی چاہیے، سو بولو، تمہیں کیا کہنا ہے؟"

"احمر کو جانے دیں۔ حفاظت اور امن سے اور دوبارہ اس کا کبھی پیچھا نہ کریں۔" وہ سنجیدگی سے شرائط سامنے رکھ رہا تھا۔

احمر نے پوری گردن گھما کر سعدی کو دیکھا۔ پلان کیا تھا آخر؟

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ "اس کو جانے دوں؟ جس نے میرے خلاف میڈیا مہم چلائی۔ مجھے میرے خاندان نے شہر بدر کر دیا۔ میرا کیریئر ختم ہونے پہ آ گیا اور تم کہتے ہو کہ میں اس کو جانے دوں؟"

"سیاست کوئی ہفتہ وار کھیل نہیں ہوتا کہ کسی اسکینڈل، کسی کیس سے کوئی تباہ ہو جائے۔ آپ کا کھیل جاری رہے گا اور اس نے جو بھی کیا، وہ اپنی مالکن کے کہنے پہ کیا۔ آپ اس کی مالکن سے حساب کیوں نہیں لیتیں؟ اگر میں آپ کو اس کی مالکن کا کچھ لا کر دوں تو؟"

"یہ زیور، یہ وہی مشہور زمانہ زیورات ہیں جو ہارون عبید کی بیوی کے تھے اور غائب ہو گئے تھے؟ یہ اب جواہرات کو چاہئیں ہیں نا؟ ان زیورات کے لیے میں تمہارے دوست کو کیوں چھوڑوں گی، جبکہ میں ان کو حاصل کر چکی ہوں۔"

اس نے تفاخر سے کندھے اچکائے تھے۔ احمر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ (گھامڑ، بک بھی دے اب کہ پلان کیا ہے؟)

"میں نے کہا نا، زیورات آپ رکھ سکتی ہیں، میں

ان کی بات نہیں کر رہا۔" وہ احمر کی گھوریوں کو نظرانداز کر رہا تھا۔

"پھر....؟"

"مسز کاردار آج کل ہاشم کے زیرِ عتاب ہیں اور ہاشم ان سے متنفر ہے۔ وہ اس کا دل دوبارہ جیتنے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

احمر نے پھر مضطرب سا ہو کر سعدی کو دیکھا۔ (یہ سب تو تجھے رات کو میں نے بتایا ہے' بے غیرت۔ اپنا کیا لایا ہے تو؟)

اب وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ اس وقت ہاشم سے ذرا سا بھی بگاڑ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ان کے ہاتھ میں نہ مال ہے' نہ اولاد۔ وہ بالکل بے بس ہیں' تو آپ ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں۔"

صاحب زادی صاحبہ کی بھنویں دلچسپی سے اکٹھی ہوئیں۔ "اور وہ کیسے؟"

"آپ کوئی پیشہ ور مجرم تو ہیں نہیں۔ یہ اپنے ڈرائیور اور مالی ٹائپ لوگوں سے آپ نہ لوگوں کو بلیک میل کر سکتی ہیں' نہ اغوا اور قتل۔ معذرت کے ساتھ آپ ٹیپکل خاتون ہیں' تو عورتوں والی لڑائی لڑیں نا' جو زبان سے لڑی جاتی ہے۔ طعنوں' طنز اور چیخ و پکار کر کے۔"

"تم کچھ جانتے ہو جواہرات کے بارے میں؟" وہ ذرا آگے کو ہوئی۔

"میں یہ جانتا ہوں کہ اس نے کچھ ایسا کیا ہے جو اس کے بیٹوں کو نہیں معلوم اور اگر پتا چل گیا تو وہ ان دونوں کو کھو دے گی۔"

احمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھی مزید دلچسپی سے آگے ہوئی۔ "ہوں' ایسا کیا ہے؟"

"آپ کے قبیلے کے لوگ اپنے وعدے سے نہیں پھرتے۔ پہلے ہم سے وعدہ کریں کہ اگر میں وہ بتا دوں تو آپ ہمیں جانے دیں گی۔" پھر جلدی سے اضافہ کیا "زندہ سلامت۔"

"اگر وہ معلومات کسی لائق ہوئی تو ضرور' میرا وعدہ ہے۔"

"صاحب زادی صاحبہ۔" سعدی ہلکا سا مسکرایا۔ "ہر معلومات کی اچھی خاصی قیمت ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے وعدے سے پھریں تو میں نے غازی کو بھی میل کر دی تھی' وہ ہم دونوں کو ویسے بھی نکال لے گا یہاں سے' مگر میں اس تسلی کے ساتھ جانا چاہتا ہوں کہ آپ احمر کو کچھ نہیں کہیں گی دوبارہ۔"

"چلو' وعدہ کیا' اب بتاؤ۔"

کمرے میں چند لمحے خاموشی چھا گئی۔ احمر کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا سعدی کیا کہنے جا رہا ہے۔

"جواہرات کاردار نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔ ہاشم اور نوشیرواں کے باپ اور نگ زیب کاردار کو۔"

لمحے بھر کو کمرے میں ہوا کے ساتھ سانسیں بھی ساکن ہو گئیں۔

"اور اس کے بیٹے نہیں جانتے؟" وہ سانس روک کے بولی۔

"نہیں!" وہ دونوں ایک ساتھ بولے اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرا کیسے جانتا تھا' دونوں نے سوچا۔ صاحب زادی صاحبہ کی آنکھوں میں ایسی چمک ابھری جو میز پہ رکھے زیورات سے زیادہ آنکھیں چندھیا دینے والی تھی۔

"باطور خان..." اس نے جذبات سے مخمور آواز میں زور سے آواز لگائی۔ ملازم بھاگتا ہوا آیا۔

"ناشتا تیار کرواؤ اور پھر گاڑی لگواؤ۔ ہمارے مہمان ناشتے کے بعد واپس چلے جائیں گے' تب تک میں ان سے کچھ بات کر لوں۔" خوش گوار موڈ میں اس کو ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً "سو دب سا پلٹ گیا۔ اب وہ مسکراتے ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا ثبوت ہے اس کا؟"

"ثابت تو نہیں کرنا آپ نے عدالت میں۔ صرف اس کے بیٹوں کو بتانا ہے۔ آگے جواہرات کا چہرہ بتا دے گا کہ وہی قاتل ہے۔" سعدی نے اطمینان سے کہا تو احمر نے جلدی سے اضافہ کیا۔

"مگر ہم آپ کو وہ واقعات بتا سکتے ہیں جو اس قتل

کے آس پاس یا اس کی وجہ سے ہوئے' آپ ان کا ذکر کریں گی ہاشم کے سامنے' وہ مان جائے گا۔"

"گڈ۔" وہ مسکرا کے پیچھے ہوئی۔ "میں سن رہی ہوں' تم بولتے جاؤ۔"

ڈیڑھ گھنٹے بعد جب صبح پوری طرح روشن اور چمک دار ہو چکی تھی' وہ دونوں احمر کی فلیٹ بلڈنگ کے سامنے کھڑے تھے اور جو کار ان کو عزت و اکرام سے ادھر چھوڑنے آئی تھی' وہ اب زن سے آگے بڑھ گئی تھی۔ احمر اس کی طرف گھوما اور ایک دم غصے سے اسے دیکھا۔

"اب جواہرات سے کیسے بچیں گے ہم؟ ان کا اتنا بڑا راز کھول دیا ہے تم نے۔ میں کبھی بھی ان کو ایسی دغا نہ دیتا' اگر تم نہ بات شروع کرتے۔"

"وہ بالکل' تم ان کو لوٹ سکتے ہو' ان کا مال لے کر بھاگ سکتے ہو' مگر ان کو دغا نہیں دے سکتے' ٹھیک ٹھیک۔"

"بک بک نہ کرو۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور جیسے اضطراب کم کرنا چاہا۔ "اب میں جواہرت کا کیا کروں گا؟"

"جیسے کہ میں جانتا ہی نہیں کہ تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔ ویسے ایسے موقعوں پہ جان بچانے والے کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔" سعدی نے قدرے خفگی سے یاد دلایا۔

احمر کے تنے تاثرات ڈھیلے پڑے۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پہ اُمڈ آئی۔

"شکریہ۔ اب کیا کچھ کھلاؤں تمہیں؟ صبح والا ناشتا؟ نہ کہ وہ خوف والے ماحول جیسا ناشتا۔" جھرجھری لیتے اس نے جیب پہ ہاتھ رکھا۔

"جو والٹ انہوں نے تمہارا واپس کیا تھا احمر! وہ تمہاری اس پاکٹ میں نہیں ہے' بلکہ دوسری میں ہے۔"

احمر کا ہاتھ رک گیا' مگر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "تم بدل گئے ہو' بڑا بوائے!"

"Best the from learned"

وہ بھی سادگی سے مسکرایا تھا۔ دونوں اس خوش گوار صبح میں کھلے آسمان تلے عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔

"پھر تم یہاں سے بھاگ رہے ہو یا نہیں؟" سعدی نے پوچھ ہی لیا تھا۔ وہ جوتے سے زمین کو مسلتا سر جھکائے بولا۔

There are three ways for a person to disappear. first is to die the second is to lie and the third is to reborn.

اور پھر ٹھہر کے بولا۔ "ولیم شیکسپیئر۔" سعدی نے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں سمجھ گیا۔ اپنا خیال رکھنا' اب میں چلتا ہوں بڑو۔"

احمر نے اس کا شانہ جواباً تھپتھپایا اور مسکرا کے بولا۔ "تم بھی شادی کر لینا۔" وہ الوداعی ملاقات کسی بھی جذباتی سین کے بغیر ختم ہوئی اور وہ دونوں محض گلے ملے' پھر ہاتھ ملایا اور سعدی پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا۔ اپنی کار میں آ کر بیٹھا تو دیکھا' موبائل زوں زوں کر رہا تھا۔

"ڈی! میں آ رہا ہوں گھر اور نہیں' میں نے کورٹ میرج نہیں کی' آپ بے فکر رہیں۔"

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ خوش گوار سے انداز میں بولا تھا' مگر دوسری طرف کے الفاظ سن کر وہ دھک سے رہ گیا۔

"زمر؟ کیا ہوا زمر کو؟ کس اسپتال میں۔۔۔؟"

✲ ✲ ✲

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

ہسپتال کا وہ کمرہ خاموش سرد سا لگتا تھا۔ مگر میز پہ رکھے تازہ پھولوں کی خوشبو نے اسے معطر کر رکھا تھا۔

یہ پھول حنین لائی تھی اور خود جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اس وقت کوئی نہیں تھا۔ وہ یوں چت لیٹی تھی کہ سرہانے سے بیڈ اٹھا ہوا تھا' اس لیے تکیے پر رکھا سر اونچا دکھائی دیتا تھا۔ ہاتھ پہلو میں رکھے تھے اور ان پہ نالیاں لگی تھیں۔ چند ایک خراشیں' گلا خراب' بخار' صدمہ۔ اس سے زیادہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دیکھنے میں قدرے زرد مگر پرسکون نظر آرہی تھی۔

بیڈ پہ اس کے قریب بیٹھا' اسے دیکھتا فارس' تھکا تھکا سا چہرہ لیے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھامے' شرمندگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"زمر!" اس نے نرمی سے پکارا۔ زمر نے نظریں پھولوں سے ہٹا کر اس کی طرف موڑیں۔ ملائمت سے مسکرائی مگر بولی کچھ نہیں۔

"شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔" جانے کس دل سے اس نے کہا اور وہ بھی کس دل سے مسکرائی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ رات والے لباس میں تھا۔ آستینیں اسی طرح چڑھا رکھی تھیں۔ چہرے پہ تھکن سے زیادہ فکر تھی۔

"ہوں!" اس نے لیٹے لیٹے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"میں بہت ڈر گیا تھا۔ مجھے لگا' میں تمہیں کھو دوں گا۔"

وہ اسی طرح اسے دیکھے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ لبوں پہ مسکراہٹ برقرار رہی۔

"تم بھی ڈر گئی تھیں؟"

"ہوں!" اس نے پھر سے سر کو خم دیا۔

"اب ذہنی طور پر کیسا محسوس کر رہی ہو؟" فارس نے بات کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

"ہوں!" اس نے ساتھ ہی ذرا سے شانے اچکائے گویا ٹھیک ہوں' کہہ رہی ہو۔ فارس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"تمہاری آواز تو ٹھیک ہے نا؟ کیا گلا بیٹھ گیا ہے؟ تمہیں بہت چلانا پڑا ہو گا' بے تاب؟"

"اوں ہوں!" اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ جانے وہ تینوں میں سے کس بات کا جواب تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ چند لمحے فضا میں خاموشی' پھولوں کی مہک سے لپٹی' ساکن کھڑی رہی۔

وہ بار بار لب کھولتا' پھر ٹھہر جاتا۔ وہ انتظار کیا کیے کہ آگے سے وہ کچھ بولے' کوئی بات کرے۔

"کچھ بولو۔ کچھ کہو۔"

وہ اسی طرح خاموش رہی۔ اسے زمر کو اس شاک سے نکالنا تھا۔ کچھ تو اسے خود کہنا پڑے گا۔

"مجھے تمہیں کچھ بتانا تھا۔ بہت پہلے بتا دینا چاہیے تھا مگر نہیں بتا سکا۔ کل رات مجھے پہلے سے زیادہ یہ بات محسوس ہوئی۔"

وہ اب کے نظریں جھکا کر بولا تھا۔ تکیے پہ سر رکھے لیٹی زمر ابھی سادگی سے اسے دیکھے گئی۔

"مسز کاردار نے صرف تمہاری کڈنی رپورٹ میں رد و بدل نہیں کیا تھا۔ وہ تمہاری منگنی تڑوا کر تمہیں کولیٹرل ڈیمیج بنانا چاہتی تھیں' تاکہ تم میرے خلاف گواہی دو۔ اس لیے انہوں نے....."

اس نے سر جھکا۔

"وہ سب ایک جھوٹ تھا کہ تم ماں نہیں بن سکو گی' تمہاری کبھی فیملی نہیں ہو سکے گی۔ تمہاری فیملی ہو گی زمر! تمہاری..... ہماری فیملی ہو سکتی ہے زمر!" وہ اب بھی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔

"مجھے یہ بات تب معلوم ہوئی جب ہم نے زندگی ابھی شروع کی تھی۔ اسی لیے میں نے تمہارے ڈاکٹر کو پیٹا تھا۔ اور میں شاید تمہیں بتا بھی دیتا مگر اسی رات سعدی قید سے بھاگ نکلا تھا۔ مجھے لگا ابھی اپنے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ پھر بعد میں' میں نے کافی عرصے تک تمہیں یہ سب نہیں بتایا' کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ایک خاندان بنانے کی آرزو میں اپنی صحت داؤ پہ لگاؤ۔ یہ ممکن ہے مگر مشکل ہے اور میں تمہیں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ آئی ایم سوری'

مجھے یہ سب نہیں چھپانا چاہیے تھا مگر میں نے وہی کیا جو مجھے تمہارے لیے بہتر لگا۔"

اس نے نظریں اٹھائیں تو وہ اسے اسی طرح دیکھ رہی تھی۔ نرمی اور ملائمت سے مسکراتے ہوئے۔ اسے شک سا گزرا۔

"تم جانتی تھیں؟"

"اونہوں۔" اس نے سچائی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ نہیں جانتی تھی مگر جان کر بھی کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ فارس نے گہری سانس لی۔

"تمہیں برا لگا میرا تم سے چھپانا؟"

اس نے پھر نفی میں گردن کو جنبش دی۔ فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کچھ تو بولو زمر۔ کوئی تو بات کرو۔ کل رات کی کوئی بات کرو، کچھ کہو۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے لب کھولے۔ "قانون شہادت میں وہ کون سا آرٹیکل ہے جس کے تحت میاں بیوی کو ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا؟" اس کی آواز صاف تھی۔

"کیا؟" فارس بالکل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔ اچنبھے اور پریشانی سے۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایسا آرٹیکل موجود ہے جس کے تحت میاں بیوی ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے کے پابند نہیں ہوتے؟"

فارس نے تحیر سے نفی میں سر ہلایا تو زمر نے مسکرا کے اثبات میں گردن ہلائی۔

"دیکھا! میں تمہیں جانتی ہوں۔"

"تم..... میرا خیال ہے، تم آرام کرو۔ میں آپا اور حنین کو دیکھتا ہوں۔" وہ الجھا ہوا سا اس کا ہاتھ چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ زمر نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

"وہ ذہنی طور پہ ٹھیک نہیں ہے۔" باہر آ کر وہ حنہ کے قریب آ رکا اور دھیرے سے بولا۔ "مجھ سے قانون شہادت کے آرٹیکلز کا پوچھ رہی ہے۔ استغفراللہ۔"

"ہیں!" حنہ کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ پھر اسے افسوس ہوا اس ساری ٹریجڈی میں قانون شہادت کو لانے کا کیا مطلب تھا؟ یقیناً وہ ذہنی طور پہ شدید ہل کر رہ گئی تھی۔

"تم لوگ اس سے اب ایسی کوئی بات نہ کرو۔"

ندرت ان دونوں کو ٹوکتی اندر بڑھ گئیں اور اسی پل دوسرے جانب سے سعدی آتا دکھائی دیا۔ فارس اور حنین جو سرگوشی میں بات کر رہے تھے، اس کو دیکھ کر اسی کی جانب گھوم گئے۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"زمر ٹھیک ہیں نا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے، تم کیسے ہو؟ اور یہ کیا ای میل کی ہے تم نے مجھے؟" وہ برہمی سے بولا۔

"احمر مشکل میں تھا، ساری تفصیل بتاتا ہوں، پہلے میں زمر سے مل لوں۔"

پریشانی سے کہتا وہ دور جاتی ندرت کے پیچھے لپکا۔ فارس مشکوک انداز میں آنکھیں سکیڑ کر اسے جاتے دیکھتا رہا۔

اس تلخ اور اندھیری رات کا اختتام ہو چکا تھا اور یہ صبح کافی امید افزا لگتی تھی۔

☼ ☼ ☼

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

قصر کاردار پہ عجیب سی مردنی چھائی تھی۔ صبح طلوع ہو چکی تھی اور ملازم نئے سرے سے اس محل کو سجانے سنوارنے میں لگ گئے تھے۔ مگر ایک عجیب سی ویرانی اور ہولناکی در و دیوار سے ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں جواہرات شب خوابی کے لباس میں ملبوس لاؤنج کی کرسی پہ تمکنت سے بیٹھی اخبار سامنے پھیلائے ہوئے مطالعے میں منہمک تھی۔ تب ہی

دروازہ زور سے کھلا تو اس نے عینک کے پیچھے سے نگاہیں اٹھا کے دیکھا۔

دروازہ زور سے واپس پار کے شیرو اندر آیا تھا۔ چال میں عجیب سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ رات کا ملگجا لباس اور سرخ آنکھیں، بکھرے بال۔ جواہرات نے ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"تم ساری رات کدھر تھے؟ اور کیا منہ دھونے کا وقت بھی نہیں ملا تھا؟"

"وہ ہو چلا جا رہا تھا" آواز پہ رکا اور سرخ آنکھیں گھما کر تنفر سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ کے بڑے بیٹے نے بتایا نہیں کہ اس نے کیا کیا ہے؟"

جواہرات نے چونک کر اخبار نیچے کیا۔ "ہاشم؟ کیا ہوا؟ وہ ٹھیک تو ہے؟"

"بھائی نے... ممی زمر کو ہوٹل کی لفٹ میں بند کر دیا تاکہ تاکہ وہ مر جائے۔" وہ درد سے تنفر سے، غصے سے دبی دبی آواز میں غرایا تو وہ سکتے میں آ گئی۔

"مگر وہ نہیں مری۔ فارس نے اسے بچا لیا تو پتا ہے بھائی نے کیا کیا؟ آپ کو... آبدار کو مار دیا۔ اپنے ہاتھوں سے اس کو میرے سامنے مار دیا۔"

آبدار مر گئی، ممی آب دار مر گئی۔

وہ بڑبڑاتا، دھر ادھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر جا رہا تھا اور ملکہ برف بنی بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابھی بادباں کو تہ رکھو ابھی مضطرب ہے رخ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آ کے چلا گیا!

مور چال میں شام اتری تو گھر کی رونقیں پھر سے جاگ اٹھیں۔ زمر ڈسچارج ہو کر آ گئی تھی اور اپنے کمرے میں صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھی تھی۔ بیڈ پہ لیٹے رہنا اسے گوارا نہیں تھا۔ بال آدھے بندھے تھے اور ناک سرخ لگتی تھی۔ پانی میں پڑے رہنے کے باعث اسے بخار اور فلو ہو گیا تھا۔ سو ہاتھ میں ٹشو بھی پکڑ رکھا تھا۔ البتہ چہرے پہ بس مسکراہٹ تھی۔ بالکل

ساتھ بڑے ابا کی وہیل چیئر تھی اور وہ فکر مندی سے اس کی طرف جھکے اس سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھ رہے تھے۔ اور وہ ہلکی سی آواز میں جواب دے رہی تھی۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

سوائے ملازموں کے، سب ہی جان گئے تھے کہ گزشتہ رات کیا ہوا تھا۔

"آخر یہ ہاشم کب ہماری جان چھوڑے گا؟" ابا نے بھیگی آواز میں اس سے پوچھا تھا۔ "یہ سب کب ختم ہو گا؟"

زمر نے گہری سانس لے کر ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "پتا نہیں۔"

"زمر!" حنہ دروازے سے اندر آئی۔ زمر نے سر اٹھا کے مسکرا کے اسے دیکھا۔ وہ قدرے جھجک کر داخل ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں ایک سی ڈی پکڑ رکھی تھی۔ پریشان، مرجھائی ہوئی لگتی تھی۔ "صرف ہاشم نہیں، اور بھی لوگ شامل تھے اس میں۔ مثلاً" وہ شہرین۔" اس کی آواز برہمی سے ذرا کانپی۔ "اس کا بھی کچھ کرنا ہو گا۔"

"چھوڑو حنین۔" زمر نے سر جھٹکا مگر اس نے وہ سی ڈی اس کی طرف بڑھائی۔

"یہ شہری کی ویڈیو ہے، جو احمر نے دی تھی بہت پہلے۔" بڑے ابا کی موجودگی کے باعث اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (کارڈ گیم، کلب والی ویڈیو!) آپ اس کو شہری کے خلاف....."

زمر نے سی ڈی اس کے ہاتھ سے لی اور کھٹ کے ساتھ اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ حنین کچھ بول نہ سکی۔

"انتقام کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا حنہ۔ چھوڑو، جانے دو۔"

اس نے دونوں ٹکڑے بے نیازی سے میز پہ ڈال دیے۔ حنہ نے سر جھکا دیا۔ چند لمحے تینوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر حنہ نے آنکھیں اٹھائیں۔

"آپ کچھ بات تو کریں۔" گویا شکایت کی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



زمر چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ "تمہاری آنکھیں اب کیسی ہیں؟"

"میری... آنکھیں؟"

"ہوں... آپریٹ ہوئی تھیں نا۔ لیزر سرجری۔ عینک اتارنے کو۔ اب نظر ٹھیک آتا ہے؟"

"جج... جی۔" ایک عجیب حیران سی نظر اس پہ ڈالی اور "میں آتی ہوں۔" کہہ کر باہر نکل گئی۔

کچن کے کھلے دروازے سے دیکھا تو فارس اور سعدی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ وہ تیزی سے اس طرف آئی۔

"زمر کو واقعی کچھ ہو گیا ہے۔ عجیب باتیں کرنے لگی ہیں۔" وہ فکر مندی سے بولی تھی مگر وہ دونوں متوجہ نہیں تھے۔ حنہ نے ان کے تاثرات دیکھے۔

"آپ لوگ زمر کی فکر کریں نا کہ مسز جواہرات کی۔ مار دیا انہوں نے اپنے شوہر کو۔ اب ختم کریں ان کا قصہ۔" صبح سے ساری گفتگو سن سن کر وہ بے زار آ گئی تھی۔

"ہم اس بات کو زیادہ اچھے طریقے سے استعمال کر سکتے تھے۔" کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا فارس افسوس سے بولا تھا۔ ساتھ ہی بار بار نفی میں سر ہلاتا پھر سعدی کو گھورتا۔ "اگر تم مجھے وقت پہ بتا دیتے..."

"جیسے آپ تو کبھی کچھ چھپاتے ہی نہیں ہیں۔"

"زیادہ بک بک مت کرو۔" ان کے اپنے مسئلے تھے۔

اندر کمرے میں ابا زمر سے سوال کر رہے تھے۔ "تم اتنی چپ چپ سی کیوں ہو؟"

"کیونکہ میں ہمیشہ بولتی ہی رہتی ہوں، ابا۔" وہ مدھم آواز میں بولی تھی۔ "آوازیں ہوا کی لہروں پہ ابھرتی ہیں، دائیں بائیں بکھرتی ہیں۔ پانی میں دب جاتی ہیں۔ اتنا سارا پانی دیکھا ہے میں نے کہ میں اب بولنا، لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتی۔" وہ زخمی سا مسکرائی۔ "میں سکون، صلح صفائی سے رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ہر بات کے سو جواب نہیں دینے، مجھے بحث نہیں کرنی۔ بہت گزار لی زندگی لڑتے جھگڑتے، بحث کرتے۔ اب میں تھک گئی ہوں۔ میں سکون چاہتی ہوں۔"

"ماموں، بھائی، زمر۔" اسامہ کی لاؤنج سے چلاتی ہوئی آواز پہ وہ چونکی۔ دل زور کا دھڑکا، پھر ایک دم اٹھ کر باہر کو دوڑی۔ ٹشو کہیں نیچے گر گیا۔

لاؤنج میں سب بھاگم بھاگ جمع ہوئے تھے۔ اسامہ دیوار پہ نصب ٹی وی اسکرین کے سامنے کھڑا تھا جہاں خبر چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر بول رہی تھی۔ تصویریں چمک رہی تھیں، مگر اسامہ سکتے سے صرف ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

"آبدار عبید... ڈوب کر مر گئی۔" لاؤنج میں سناٹا چھا گیا۔

زمر نے کرب سے آنکھیں بند کیں اور بدقت صوفے پہ بیٹھتی چلی گئی۔ حنین نے لبوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ سعدی نے پریشانی سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے جلدی سے موبائل نکالا تھا اور فارس... وہ خالی خالی نظروں سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈوب کر مری تھی۔ وہ پانی میں مری تھی۔ وہ آبدار تھی۔ پانی سے، کانچ سے بنی۔ وہ اسکرین کو دیکھ رہا تھا اور اس کی رنگت سفید پڑتی جا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

قبریں ہی بتا سکتی ہیں اس شہر جبر میں
مر کر دفن ہوئے ہیں کہ زندہ گڑے ہیں لوگ

دو دن بعد۔

ہارون عبید کی رہائش گاہ کے سبزہ زار پہ گزشتہ دو روز سے عجیب سناٹا چھایا تھا۔ سارے پرندے سہم کر اڑ گئے تھے۔ مور اپنے پنجروں میں دبک کر بیٹھے تھے۔ جانور ساری ساری رات عجیب سی آوازیں نکالتے تھے اور ایک سفید ایرانی بلی تھی جو درد سے چلاتی سارے میں بولائی بولائی پھرتی تھی۔ ہر شے پہ جھپٹتی، ہر کونا سونگھتی مگر قرار کہیں نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر بھاگتی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے راہداری عبور کی اور اسٹڈی کے ادھ کھلے دروازے کے سامنے جا رکی۔ درد سے عجیب

آوازیں نکالتی وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔

اسٹڈی نیم روشن تھی۔ ہارون آرام وہ کرسی پہ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ دو انگلیوں میں سگار دبا تھا جس سے دھوئیں کے مرغولے اڑا اڑ کر فضا میں گم ہو رہے تھے۔ کمرے میں سفید دھواں سا بھرا محسوس ہوتا تھا اور نکوٹین کی بو۔ ان کا لباس بے داغ' کلف لگا' نفیس سا تھا' بال' شیو' سب بنے تھے۔ بس چہرے پہ گہری ویرانی تھی۔ آنکھوں میں خالی پن تھا۔ ایسا درد دل کو کاٹتا جاتا جو نہ کبھی پہلے محسوس ہوا تھا نہ کبھی محسوس کرنا چاہا تھا۔ میز پہ ایک فوٹو فریم رکھا تھا جس میں سرخ رومال سر پہ باندھے مسکراتی ہوئی لڑکی نظر آرہی تھی۔ ہارون کی ویران نظریں اس شفاف چہرے پہ جمی تھیں۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔

ساتھ رکھا موبائل زوں زوں کرنے لگا تو وہ گہری سانس لے کر سیدھے ہوئے۔ سگار ایش ٹرے میں ڈالا اور کھنکھار کے خود کو سنبھالا کیا' پھر فون کان سے لگایا۔

"تمہاری بیٹی کا مجھے بہت افسوس ہے۔" جواہرات کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ "جنازے میں سرسری ملاقات ہو سکی تم سے۔ تفصیل سے بات ہی نہیں ہو پائی۔ سوچا چوٹ ذرا پرانی ہو جائے تو کال کروں گی۔"

"سن رہا ہوں' بولو۔" ان کی آنکھیں سرخ ہوئیں۔

"ظاہر ہے' میں نے ہی بولنا ہے کیونکہ تم ہر لحاظ سے سننے کی پوزیشن میں ہو۔"

"میں جانتا ہوں' یہ سب تمہارے بیٹے نے کیا ہے۔" ان کی آواز کانپی۔

"کیوں خود کو تھکا رہے ہو یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہیں اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی؟ ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم اسے استعمال کرنا چاہتے تھے' اس کے گارڈز میں اضافہ بھی اسی لیے کیا تھا کہ کوئی اس کو تمہاری کمزوری سمجھ کر تمہارے خلاف استعمال نہ کر سکے۔ تم اس کے ذریعے ہماری دولت اور طاقت میں شراکت چاہتے تھے' اور یوسفز کے ذریعے ہمیں تباہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں کام تم خود کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس لیے۔" وہ رکی۔ سانس بھری۔ "اب تمہارا غم ہلکا ہو ہی گیا ہو گا تو میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتی چلوں۔ میں اور ہاشم تمہیں تمہارے منہ مانگے شیئرز اور کمپنی کے Assets (اثاثے) دینے کے لیے تیار ہیں۔"

وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔ آنکھیں مزید سرخ پڑ رہی تھیں۔

"تم ایک سیاست دان ہو ہارون! اور سیاست دانوں کی طاقت کے لیے ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ تم ہم سے بگاڑ کر کبھی ترقی نہیں کر سکو گے۔ اور ہمارے وہ دوست' جن کے پیسے کو وزیرستان سے آگے جانے کے لیے ہماری مدد چاہیے ہوتی ہے' ان کو کبھی اچھا نہیں لگے گا اگر تم اور ہم آپس میں بگاڑ لیں۔ تو یوں کرو' ہمارے گھر آجاؤ۔ ہم آج ہی ڈیل کر لیتے ہیں۔"

"مجھے ہر چیز کاغذات پہ چاہیے' بلیک اینڈ وائٹ اور زرنگار کے زیورات بھی۔" وہ سرد مہری سے بولے تھے۔

"وہ بھی مل جائیں گے۔ مگر شیئرز اور دوسرے اثاثہ جات کی بات پہلے ہو گی۔ میں لنچ پہ انتظار کر رہی ہوں۔"

خوش گوار سے انداز میں کہہ کر اس نے فون بند کیا تو ہارون نے موبائل بے زاری سے میز پہ ڈال دیا اور آنکھیں میچ لیں۔

قصر کاردار میں واپس آؤ تو ہاشم کے کمرے کے پردے بند تھے اور وہ رف سی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ دوپہر کے باوجود اندھیرا لگتا تھا مگر ہاشم کا ویران چہرہ' بڑھی شیو' بکھرے بال' سب ٹیبل لیمپس کی زرد روشنی میں نظر آرہا تھا۔

کھڑکی کے قریب کھڑی جواہرات نے موبائل میز پہ رکھا اور اپنائیت سے مسکراتے ہوئے اس کے قریب آئی۔ وہ سنجیدگی سے سامنے دیکھتا رہا۔ سپاٹ سرد سا۔

جواہرات نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبایا۔

"میں تمہیں سمجھ سکتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"تھینکس۔" اس کے چہرے پہ چھائی سرد برف میں دراڑ پڑی۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ دو دن سے کمرے سے نہیں نکلے۔"

"ٹھیک ہوں، ممی!" وہ دھیرے سے بولا۔

"تمہیں گلٹ (پشیمانی) ہے؟" وہ نرمی سے کہتی اس کے ساتھ بیٹھی۔

"نہیں۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جو کیا، ٹھیک کیا۔" وہ گردن اکڑا کے بولا تھا۔ "اور اب جو بھی مجھے دکھ دے گا، میں اس کو اپنے ہاتھوں سے عبرت ناک شکست دوں گا۔" اس کی آنکھوں میں آگ کی لپٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ جواہرات مسکرائی۔

"گڈ۔ امید ہے اب تم مجھے سمجھ سکو گے۔ میں نے خاور اور سعدی کی موت کا حکم نامہ اسی لیے جاری کیا تھا کیونکہ میں تمہیں مزید تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔ اگر وہ دونوں مرگئے ہوتے تو اس دن کی نوبت ہی نہ آتی۔"

ہاشم نے محض سر کو ہلایا۔ بولا کچھ نہیں۔ جواہرات غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ اسے تسلی ہوئی۔ سرد دیوار پگھل رہی تھی۔

"کل سے میں تمہارے ساتھ آفس آؤں گی۔ ان کاغذات کو واپس لے لو۔ ہارون سے متعلق بہت سے معاملات مجھے ہی سنبھالنے ہوں گے۔" ملکہ کو اپنا تخت واپس مل گیا تھا۔ ولی عہد نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر اسے دیکھا۔

"ہارون... کیا مجھے یوں ہی جانے دے گا؟" وہ ذرا حیران تھا۔ جواہرات بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی گوری رنگت میں گلابیاں سی گھل گئیں۔

"ارے تم نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ ہر انسان کو اپنی اولاد سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے جتنی مجھے ہے؟ نہیں ہاشم! ہر طاقتور، ہر دولت مند انسان اپنی اولاد کی میری طرح پرستش نہیں کرتا۔ ہم اس کے غم کا مداوا کر دیں گے تو وہ ہمارے سامنے آواز تک نہیں نکال سکے گا اور پھر جو کچھ بھی ہو، تمہاری ماں...." اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ "تمہارے ساتھ ہے۔"

ہاشم نے اب کے نرمی سے شکریہ کہا تھا۔ وہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ اور جواہرات کسی ایسی فیری ٹیل ملکہ کی طرح لگ رہی تھی جو کسی نوجوان خوب صورت لڑکی کا خون پینے کے بعد پھر سے جوان ہو جاتی ہے۔

سائیڈ ٹیبل پہ رکھا، ابھی تک گیلا محسوس ہوتا سرخ رومال اسی خاموشی سے وہاں پڑا رہا۔

☆ ☆ ☆

سورج سوا نیزے پہ تھا۔ اور فوڈلی ایور آفٹر کی اونچی کھڑکیاں دھوپ سے چمک رہی تھیں۔ پارکنگ لاٹ میں کار روک کر فارس باہر نکلا تو وہ سنجیدہ سا دکھائی دیتا تھا۔ بھوری شرٹ پہنے، بال تازہ چھوٹے کٹے تھے۔ بھنویں بھینچے وہ دروازہ لاک کر رہا تھا۔ جب نوشیرواں اس کے قریب آکر رکا۔ وہ احساس ہونے پہ پلٹا۔ اس سے نگاہ ملی تو خاموشی سے واپس مڑ کے کار کا لاک پھر سے چیک کرنے لگا۔

"آبدار مرگئی، فارس!" شیرو کے الفاظ ٹوٹے ہوئے تھے مگر حلیہ آج ٹھیک تھا۔

وہ ڈریس شرٹ اور کوٹ میں ملبوس تھا اور شیو بھی بنی ہوئی تھی مگر ناک گلابی تھی اور آنکھوں میں کرچیاں تھیں۔

"جانتا ہوں۔" وہ سپاٹ انداز میں بولا اور ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی۔ "کیوں آئے ہو؟"

"وہ وہیں تھی۔ اس رات.... تمہیں میں نے لفٹ کا بتایا مگر اس نے الزام اپنے سر لے لیا اور ہاشم بھائی نے میرے سامنے اس کو مار دیا۔"

"تم کیوں آئے ہو؟" وہ دھوپ کے باعث آنکھیں

چھوٹی کر کے اسے دیکھ رہا تھا۔
نوشیرواں نے زکام زدہ انداز میں ناک سے سانس اندر کھینچی۔
"خیر..." اس نے سر جھٹکا۔ "تمہاری ڈیل کا کیا؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ کیس واپس لے لو گے۔"
"اچھا؟ مجھے ایسا کوئی وعدہ یاد نہیں۔"
"کیا؟" شیرو کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔
"میں نے کہا تھا' سعدی سے کہوں گا کہ تمہیں معاف کر دے۔ وہ میں کہنے کی کوشش کروں گا' جب عدالت تمہیں سزا سنا دے گی.... تب!!!! اور کچھ؟"
"میں نے تمہاری...." وہ زور سے بولنے لگا' پھر اردگرد آتے جاتے لوگوں کا احساس کر کے قریب آیا اور دبا دبا سا گڑگڑایا۔ "میں نے تمہاری مدد کی۔ زمر کو بچایا۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ تم صرف کوشش کرو گے؟ اور اگر تم کامیاب نہ ہوئے تو؟"
"تم نے آبدار کو بچانے کی کوشش کی؟ کیا تم اس میں کامیاب ہوئے؟" وہ تندی سے بولا تھا۔ شیرو لمحے بھر کو کچھ کہہ نہیں سکا۔
"وہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔"
"اور یہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے کہتا پلٹ گیا مگر نوشیرواں تیزی سے اس کے سامنے آیا۔
"میرے خلاف کیس واپس لے لو' مجھے باعزت بری ہونے دو۔ میں ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ نئی زندگی شروع کر لوں گا اور میں آبدار کے قتل کیس میں گواہی دینے کو بھی تیار ہوں۔ میں نے خود ہاشم بھائی کو اسے مارتے دیکھا ہے۔"
فارس نے افسوس اور ترحم سے اسے دیکھا۔
"ہمیشہ اپنا ہی سوچتے ہو تم۔ جو بھائی تمہیں بچانے کے لیے سب کر رہا ہے' اس کے خلاف کھڑے ہونے کو تیار ہو' واہ۔"
"مگر آبدار کے قتل کیس میں تم لوگوں کو اس سے بڑی گواہی کہاں سے ملے گی؟"
"اے.... کون سا قتل کیس؟ کہاں کا کیس؟ ہم کوئی کیس نہیں کر رہے کسی پہ۔ ہم آبدار کی فیملی نہیں ہیں۔ جو کیس ہو گا' وہ اس کا باپ کرے گا۔ ہم نہیں کر سکتے۔ اس لیے میرا وقت ضائع نہ کرو۔ میں نے کہا نا' سعدی سے بات کروں گا' آگے اس کی مرضی۔"
"میں نے زمر کی جان بچائی ہے فارس!"
"یہ مت بھولو کہ وہ اس اذیت کا شکار بھی تمہاری وجہ سے ہوئی تھی۔ کوئی احسان نہیں کیا تم نے اس پر اور یہاں سے چلتے بنو۔ تمہارے بھائی کے ہرکاروں نے دیکھ لیا تو وہ تمہاری جان لے لے گا۔" اور ایک سرد نظر اس پہ ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ نوشیرواں دبے دبے غصے سے اسے دیکھتا رہ گیا۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ فارس بے حس نہیں ہے۔ وہ ڈسٹرب ہے۔

✲ ✲ ✲

اور قصر کاردار کے ڈائننگ ہال میں اشتہا انگیز مہک پھیلی تھی۔ طویل میز انواع و اقسام کے طعام سے سجی تھی۔ سربراہی کرسی پہ بیٹھی جواہرات دائیں ہاتھ پر براجمان ہارون کی طرف کاغذ بڑھا رہی تھی جنہیں وہ انہماک سے پڑھنے لگے تھے۔
پھر مقابل بیٹھے شیو بنائے' بال جمائے' تازہ دم سے ہاشم نے قلم ہارون کی طرف بڑھایا تو انہوں نے اسے تھامتے ہوئے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی پھر دستخط کر دیے۔ وکلاء نے اٹھ کر ہاتھ ملائے' جواہرات نے مبارک باد دی اور ہاشم نے فاتحانہ نگاہوں سے ہارون کو دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا جسے انہوں نے بدقت مسکرا کے تھاما۔ سارے سودے طے ہو گئے' سارے حساب ختم ہو گئے۔ اور ملکہ اپنی سربراہی کرسی پہ لوٹ آئی تھی۔ کیا زندگی اس سے بھی زیادہ حسین ہو سکتی ہے؟ جواہرات نے سوچا تھا۔

✲ ✲ ✲

جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

نوشیرواں کے جانے کے بعد فارس کچھ دیر فوڈلی

اور آفس کے کاؤنٹر پہ بے مقصد حساب کتاب چیک کرتا رہا' پھر باہر نکل آیا۔ وہ بہت خاموش تھا۔ چہرہ بالکل سپاٹ جیسے ہر طرف سکوت ہو۔ سناٹا ہو۔ وہ اسی خاموشی سے کار میں بیٹھا اور اسے بے مقصد سڑکوں پہ دوڑاتا گیا۔ تارکول کی گرم دہکتی سڑکیں۔۔۔ ساتھ ساتھ بھاگتے درخت۔۔۔ اور زندگی بھی پیچھے کو بھاگنے لگی تھی۔

زرتاشہ کے قتل کو دو دن ہوئے تھے شاید۔ وہ روز زمر کی خیریت پوچھنے جانے لگا تھا۔ بار بار۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس روز وہ اور زرتاشہ وہاں کیا کر رہی تھیں۔ جب زمر کو ہوش نہ آیا اور اسے کوئی جواب نہ مل پایا تو وہ دوسرے رشتے داروں سے جواب مانگنے لگا۔ اس کی نفرتیں 'گھر والے' کسی کو کچھ بتایا ہو گا زرتاشہ نے۔ مگر کوئی بھی باخبر نہ تھا۔ سفید دھند آنکھوں سے ہٹی تو اس کی ساری حسیات جاگنے لگیں۔ وہ زرتاشہ کی موت کا سراغ لگا کر رہے گا' یہ تو طے تھا۔ مگر کہاں سے اور کیسے؟

اس نے زرتاشہ کا کمرہ کھنگالا۔ ہر شے پلٹ کر رکھ دی' اور تب ہی اس کو ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے وہ سی ڈی ملی۔ وہ ہاشم کی بیٹی کی سالگرہ کی مووی تھی' وہ کیپشن پڑھ کر ہی رکھ دیتا مگر یوں ہی باکس کھولا تو اندر ایک پیلا پوسٹ اٹ نوٹ لگا تھا۔ زرتاشہ کی عادت تھی گھر میں ہر جگہ بالخصوص فریج پہ پیلے نوٹس لگا کر رکھتی تھی۔ گروسری میں کیا لانا ہے' کس کی سالگرہ آنے والی ہے۔ یہ بھی اس نے لگایا تھا۔

وہ ٹھہر کر دیکھنے لگا۔ اس میں دو مختلف نمبرز لکھے تھے۔ دو اوقات۔ دونوں کے درمیان تقریباً" دو گھنٹے کا وقفہ تھا۔

وہ مووی اٹھا لایا اور اسے لیپ ٹاپ میں لگا کر دیکھنے لگا۔ وہ پارٹی کے ہی اوقات کار تھے۔ (ویڈیو کے کونے میں وقت لکھا آ رہا تھا۔) اس نے درج شدہ وقت تک ویڈیو فارورڈ کی۔ وہ لاؤنج کا منظر تھا۔ اس نے دوسرے وقت تک فارورڈ کی۔ وہ بھی لاؤنج کا منظر تھا۔ ان دونوں مناظر میں کچھ خاص نہ تھا۔ تقریب کے عام سے مناظر تھے۔ ان میں سب ہی مہمان موجود نظر آتے تھے۔ پھر زرتاشہ نے ان دونوں اوقات کو نوٹ کیوں کیا؟

وہ دوبارہ دیکھنے لگا۔ پہلے وقت میں خاور سیڑھیاں اترتا دکھائی دے رہا تھا' اور دوسرے میں وہ لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ باقی سب ویسے ہی تھے۔ البتہ ان دونوں اوقات کے درمیان ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے خاور کہیں نظر نہ آتا تھا۔

تب پہلی دفعہ اسے شک سا ہوا' مگر اس نے سر جھٹک دیا۔ مگر پھر زیادہ موقع نہ ملا کیونکہ اگلے روز پولیس اس کو گرفتار کرنے آن پہنچی۔ زمر یوسف نے بیان میں نہ صرف اس کو نامزد کیا تھا بلکہ لمبی سی کہانی بھی سنائی تھی۔ فارس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا کہ وہ گرفتار بھی ہو سکتا ہے۔ اس گرفتاری نے اسے شدید دھچکا لگایا تھا۔ سعدی بار بار آتا' صفائیاں دیتا' امیدیں دلاتا' مگر اس کا غصہ اور فرسٹریشن بڑھتی جا رہی تھی۔ تھانے کا ماحول عجیب سا تھا۔ گھٹن زدہ جگہ تاریک اور ان ہی تاریک راتوں میں وہ بیٹھ کر زرتاشہ کی سی ڈی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ پارٹی میں نہیں تھا تو خاور بھی نہیں تھا۔ خاور کو تو ہاشم چلاتا تھا۔ تو کیا ہاشم۔۔۔؟ لیکن پھر اور کون ہو سکتا تھا؟ کون اس گھر سے اس کی گن نکال سکتا تھا' اس کی کار میں ثبوت رکھوا سکتا تھا۔ اتنا قریب کون تھا آخر؟

اس روز سعدی اسے جیل میں دیکھنے آیا تو وہ پھٹ پڑا۔ کہہ دیا کہ اسے ہاشم پہ شک ہے۔

سعدی الگ اسے ملامت کرنے لگا اور اندر آتا ہاشم الگ طریقے سے شروع ہو گیا۔ وقتی طور پر وہ چپ ہو گیا۔ کیا حالات اسے ذہنی طور پر اتنا پست بنا چکے تھے کہ وہ اپنوں پہ شک کرنے لگا تھا؟ اس نے پھر سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔

سارا خاندان ایک طرف اور زمر ایک طرف۔ زمر نے بیان واپس نہیں لیا' نتیجتاً" اس کو چودہ روز بعد جیل بھیج دیا گیا۔ تھانے کا لاک اپ مختلف دنیا تھی۔ دنیا میں تمام ملزموں کو حوالات میں رکھا جاتا ہے' ملزم

لیعنی وہ جس کے کیس کا ابھی فیصلہ نہیں آیا۔ مگر پاکستان وہ ملک ہے، جہاں ملزموں کو بھی مجرموں کے ساتھ جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور جیل ' حوالات جیسی نہیں ہوتی۔ جیل ایک بہت بڑی تاریک مہیب سی دنیا تھی جس کے اندر عجیب لوگ بستے تھے ' عجیب داستانیں پنپتی تھیں۔

جیل میں اے ' بی اور سی کلاس تھی۔ ہر کلاس کے اپنے بلاک تھے۔ تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگوں کو اے یا بی کلاس میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کو بھی اے کلاس الاٹ ہوئی تھی۔ یہ الاٹمنٹ عدالت نے کی تھی ' مگر جس لمحے وہ جیل میں داخل ہوا ' وہ ساری کہانیاں جو اس نے "قراطین" کے بارے میں سن رکھی تھیں ' وہ سچ ثابت ہونے لگیں۔ اسے ڈرایا گیا ' سمجھایا گیا کہ جیل کا Quarantine (قرنطین) آفیسر جس کو دیسی انداز میں قراطین کہا جاتا تھا ' جیل کے سیاہ اور سرمئی کا مالک ہے کیونکہ یہاں کوئی سفید نہ تھا۔ وہ طے کرے گا کہ آپ کس بلاک میں جائیں گے ' وہ طے کرے گا کہ آپ کو جیل کا کھانا کھانا ہے یا آپ کے رشتے داروں کا بھیجا من وسلویٰ آپ کو مل سکتا ہے۔ وہ طے کرے گا کہ آپ چار پانچ افراد کے ساتھ مل کر خفیہ چولہا رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ ہانڈی والا آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے اور آپ کے رشتے داروں کو ہر ملاقات پہ اسے پچیس ہزار رشوت دینی ہے یا پچاس ہزار ' یہ سارے فیصلے قراطین کرے گا۔ اسے قراطین سے نہیں بگاڑنی تھی۔ اسے قراطین کو خوش رکھنا ہے۔

مگر اس نے اپنا غصہ قراطین پر نکالا وہ اسے دبوچ کر گرا کے مارنے لگا۔ اتنا پیٹا ' اتنا پیٹا کہ اس کی آنکھ کے قریب سے خون ندی کی صورت بہنے لگا۔

اس کے بعد قراطین نے چند ہفتے کسی کو اس سے ملنے نہ دیا ' اور اس کو سی کلاس عنایت کر دی۔ اس کو کھانے میں سب سے گھٹیا کھانا ملتا اور بات بات پہ رشوت طلب کی جاتی۔ اس قراطین کا نام جلال الدین آتش تھا اور اس سے ہر شخص خار کھاتا تھا۔ کوئی اس کے تعلقات سے جلتا تھا تو کوئی اس کی طاقت سے خائف تھا۔

آتش اس جیل کا بادشاہ تھا۔ وہ جان کر فارس غازی کے سامنے ایسے مواقع پیدا کرتا ' ایسی باتیں کہلواتا کہ فارس اس کو غصے میں آکر مارنے لگ جائے ' مگر وہ اسے دوبارہ نہیں مار سکا۔ قراطین کو پہلے دن مارنے اور پھر جیل میں آگے پیچھے آدھ درجن قیدیوں کو مختلف مواقع پہ پیٹنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اکیلا ہوتا جا رہا ہے۔ اسے ہر وقت اپنی نگرانی خود کرنی پڑتی تھی۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا ' اور وہ ہر ایک سے چوکنا تھا۔ اسے تنہا دیکھ کر کوئی بھی اسے مار دیتا ' یہ خوف اس کے اندر جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔

چند دن بعد اسے احساس ہوا تھا کہ جیل کے کسی قیدی کی شکایت کسی پولیس اہلکار سے نہیں کی جاتی۔ چاہے دنیا کا کوئی بھی ملک ہو اور چاہے وہ قیدی آپ کو چاقو بھی نہ کیوں مار دے ' بس اتنا کہو کہ حادثہ تھا ' بس اتنا بتاؤ کہ میری اپنی غلطی تھی۔ کیونکہ اس قیدی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا مگر بعد میں آپ دونوں کو ایک ساتھ ایک ہی جیل میں گزارا کرنا ہے۔

جب کوئی قیدی کسی دوسرے کی شکایت کرتا ہے تو سارے قیدی اس کے خلاف ہو جاتے ہیں اور کوئی اس پہ اعتماد نہیں کرتا۔ ایک ایسی جگہ جو عادی مجرموں ' قاتلوں ' غنڈے اچکوں سے بھری ہوئی ہے ' وہاں دوستوں کے بغیر گزارا نہیں ہے اور دوست اس کے کوئی تھے نہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ' وہ مزید غیر محفوظ اور فکر مند رہنے لگا۔ اس نے لڑنا جھگڑنا بالکل ترک کر دیا۔ خاموش رہتا۔ چوکنا رہتا۔ پریشان رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ دوست کیسے بنائے۔ ساتھی کہاں سے ڈھونڈے۔ اسے ایک دوست چاہیے تھا۔ ایک مضبوط طاقتور ساتھی۔

سیکریٹری صاحب جیل کے دورے پر آئے تھے۔

ایک دن پہلے سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پروٹوکول ' نمود و نمائش ' جھوٹے ریکارڈز۔ وہ خاموشی سے اپنے

حصے کا کام کرتا رہا۔ جس وقت سیکریٹری صاحب اس کے قریب سے مع اپنے مصاحبین کے گزرے' اس نے ان کو انگریزی میں مخاطب کیا اور کہا۔

"سر! لوگ میرے بارے میں جھوٹ گھڑ رہے ہیں۔ میڈیا رپورٹرز کو ایئر فورس بیس حملہ میں ملوث عناصر کی' اس جیل میں موجودگی کی خبر' میں نے نہیں دی۔ نہ ہی میں نے پولیس حکام کا اس دہشت گردی کے واقعے میں ملوث ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ میں تو صرف اپنے گھر والوں کو خط لکھتا ہوں۔ پولیس کے عملے کو منع کریں' مجھے تنگ نہ کرے۔"

سیکریٹری صاحب اس کو آفس میں لے گئے۔ اس کو چائے پلوائی گئی اور اس سے نرمی سے پوچھا کہ وہ کیا جانتا ہے' اور اگر اس نے میڈیا والوں کو اس جیل میں دہشت گردوں کے سہولت کاروں کا بتایا بھی تھا تو خیر ہے' وہ ان پہ اعتماد کر سکتا ہے۔

یہ ایک ایسا کیس تھا جس پہ گرفتاری سے پہلے وہ کام کر رہا تھا اور اس کے کچھ اہم نکات جانتا تھا۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر جتنے تردد سے وہ انکار کر رہا تھا' سامنے بیٹھے اعلا افسران کو گمان ہوا کہ پولیس اس کا منہ بند کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سب کے دو نتائج نکل سکتے تھے۔ یا اس کو رہا کر کے کیس پہ کام کرنے دیا جاتا۔ یا ملوث اہل کاروں کو بھی جیل میں پھینک دیا جاتا۔ دونوں آپشن اچھے تھے۔

وہ بار بار انکار کرتا رہا کہ وہ اس خبر کے لیک کرنے میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی اس نے قراطین آتش کا نام لیا ہے۔ آتش بالکل بے قصور ہے اور وہ تو ایسا آدمی ہے ہی نہیں جو شوال کی فلاں مسجد سے تعلق رکھتا ہو۔ اس وقت تو اس کو عزت سے واپس بھیج دیا گیا' مگر اگلے روز سے کسی نے آتش کو جیل میں نہیں دیکھا۔ اسے سادہ کپڑے والے اٹھا کر لے گئے تھے اور کافی عرصہ اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ تفتیش کے دوران قراطین دہشت گردوں کی سہولت کاری کے الزام سے تو بری ہو گیا' مگر دوسرے کئی جرائم کو قبول کرنے پہ قراطین کو واپس اسی جیل بھیج دیا گیا مگر ایک قیدی کے روپ میں۔

اور جس وقت وہ جیل میں داخل ہو رہا تھا' اس کی آنکھ کے زخم کے نشان کو دیکھتے ہوئے فارس غازی مسکرایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیسا ایک اکیلا مسافر بھی اس جہنمی مسافر خانے کا مہمان بننے آ چکا ہے۔ یہ وہ جیل تھی جہاں آتش ہر قیدی کا قرض دار تھا۔ کسی کے جسم پہ چٹیں لگوانے' کسی کو معذور کرنے' اور کسی کو کنگال کرنے کا مجرم تھا وہ۔

اس وقت کے قراطین نے اس کو بھی سی کلاس میں بھیجا تھا۔ نہ پولیس اس کی رہی تھی نہ قیدی اس کے ہمدرد تھے۔ اس کا غرور' اکڑ' طنطنہ سب خاک میں مل چکا تھا۔

وہ خاموشی سے آیا اور فارس غازی کے قریب بیٹھ گیا۔

اس روز سے وہ دونوں ساتھی بن گئے۔ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بھولا کہ دوسرے نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا' مگر جیل میں اپنی بقا سب سے زیادہ اہم تھی اور جب جلال الدین اس کا دوست بنا تو اس نے فارس کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا۔

گروہ بنا کر جتھے کی صورت کیسے رہنا ہے' جیل کے باقی بدمعاشوں سے کیسے مقابلہ کرنا ہے' اپنی دھاک کیسے بٹھانی ہے' بڑے بڑے گروہوں کی خوشنودی کیسے حاصل کرنی ہے' یہ اسے جلال الدین سکھاتا تھا۔ وہ قراطین رہ چکا تھا' بہت سوں کو اچھے سے جانتا تھا اور اپنی ڈھال کے لیے اسے ایک تنومند' زور آور آدمی درکار تھا۔ فارس اس کے لیے وہ ڈھال بن گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ جیل میں ایڈجسٹ کرتے گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ برابر کا حساب برابر کر چکے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کینہ بھی نکل گیا تھا۔ عجیب سیاستیں تھیں جیل کی۔

وہ فارس سے کہتا تھا۔

"اپنے غصے کو قابو میں رکھو۔ اپنی ذات کے لیے نہ لڑو۔ بھائی اور بیوی کے متعلق ہر بات خاموشی سے سن جاؤ اور پی جاؤ' انسان کا ذہن تب کھلتا ہے جب وہ غصے کو مہار ڈالنا سیکھ لیتا ہے۔"

مگر وہ آگے سے کہتا تھا کہ وہ انتقام ضرور لے گا۔

وقت گزرنے کے ساتھ جلال الدین کو اس سے ہمدردی ہوتی گئی۔ وہ پولیس میں رہ چکا تھا' اے ایس پی سرمد شاہ سمیت بہت سے لوگوں کو جانتا تھا۔ وہ اس سے کہتا' سارے میں یہی کہا جا رہا ہے کہ تمہارے ماموں زاد نے تمہیں پھنسوایا ہے۔

اور فارس اندر سے جانتا تھا' اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ ہاشم ہی ہے' مگر پھر جلال الدین نے اسے خاموش رہنا بھی سکھا دیا تھا۔

جب ایک دن سعدی اس سے پوچھنے آیا کہ وہ مشتبہ افراد کی فہرست دے جو زرتاشہ اور وارث کے قتل میں ملوث ہو سکتے ہیں تو اس نے ہاشم کا نام نہیں لیا۔ وہ ہاشم کا راز نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ اسے پہلے باہر نکلنا تھا' پھر جلال الدین کی توسط سے بنے دوستوں کو استعمال کر کے اپنا انتقام پورا کرنا تھا' پھر ساری دنیا جان ہی لے گی کہ اصل مجرم کون تھا۔ مگر ابھی نہیں۔

چار سال اس جیل میں گزارنے کے بعد وہ وہاں کا عادی ہو چکا تھا۔ جب نکلنے لگا تو محسوس ہوا' ایک زیادہ بڑی جیل میں جا رہا ہے۔

اس روز جلال الدین نے اس سے کہا تھا کہ اب چونکہ وہ اس سے ہمدردی کرنے لگا ہے تو اس کو ایک نصیحت کرے گا اور وہ یہ کہ وہ انتقام چھوڑ دے اور اگر لینا ہی ہے تو اسے دو قبریں کھودنی پڑیں گی۔ فارس غازی کے پاس انتخاب کا وہ آخری موقع تھا۔ اس نے دو قبریں چن لیں۔

کار قبرستان کے قریب روک کر چند لمحے وہ خالی نظروں سے دور نظر آتی قبروں کو دیکھتا رہا۔ یہیں آبدار کو دفن کیا گیا تھا۔ وہ ایک دفعہ بھی ادھر نہیں آ سکا تھا کیونکہ اندر ہی اندر وہ یہ جانتا تھا کہ ہاشم کے بعد اگر کوئی اس کی موت کا ذمہ دار تھا تو وہ خود تھا۔ زمر ان گزرے تین دنوں میں بار بار نرمی سے اسے کہتی رہی تھی کہ وہ گلٹی محسوس نہ کرے' اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

مگر وہ جانتا تھا' جس کارما سے وہ دور اندر ڈرتا آیا تھا'

یہ اس کی پہلی قسط تھی۔

وہ باہر نہیں نکلا۔ شیشہ اوپر چڑھایا اور ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھاتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا چہرہ ابھی تک سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔

☆ ☆ ☆

پندار کے خوگر کو ناکام بھی دیکھو گے؟
آغاز سے واقف ہو' انجام بھی دیکھو گے؟

آج بھی عدالتی احاطے میں ویسا ہی رش تھا جیسا وہ پچھلے کئی ماہ سے دیکھتے آ رہے تھے۔ گرمی اور حبس میں اضافہ ہو گیا تھا۔ زمر سب سے تاخیر سے پہنچ رہی تھی اور اس کے اندازے کے مطابق باقی سب اس وقت کورٹ روم کے باہر پہنچ چکے تھے۔ وہ گھڑی دیکھتی راہداری میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ سینے سے فائلز لگا رکھی تھیں۔

گھنگھریالے بال آدھے باندھ رکھے تھے' اور سن گلاسز ماتھے پہ ٹکے ہوئے تھے۔ چہرہ سنجیدہ مگر پرسکون نظر آتا تھا۔ ایک موڑ مڑی تو بے اختیار ٹھٹکی۔

سامنے نوشیرواں کھڑا تھا اور اسی کو دیکھ رہا تھا۔

دونوں آمنے سامنے رک گئے۔ زمر نے ساتھ موجود دونوں وکلا کو آگے جانے کا اشارہ کیا اور خود گہری سانس لے کر فرصت سے شیرو کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ وکیل کی غیر موجودگی میں مجھ سے بات۔۔۔"

"کیسی ہیں آپ؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو زمر نے لب بھینچ لیے۔ پھر اثبات میں سر کو خم دیا۔ ذرا سا مسکرائی۔

"ٹھیک ہوں۔" مسکراتی بھوری آنکھوں کو اس کے چہرے پہ جمائے' وہ عادتاً گال سے ٹکراتی لٹ انگلی پہ لپیٹنے لگی تھی۔ "اور اس سب کا بھی تھینک یو جو آپ نے میرے لیے کیا۔"

"اچھا۔" وہ تلخی سے ہنس دیا۔ "مجھے لگا آپ لوگ اکنالج تک نہیں کریں گے۔"

"میں اکنالج کر رہی ہوں۔ اس لیے کہہ رہی ہوں' تھینک یو۔"

"اور کیا کوئی میرے خلاف کیس واپس لینے کا سوچے گا بھی یا نہیں؟"

"تو شیرواں!" زمر نے گہری سانس باہر کو خارج کی۔ "آپ نے میرے اوپر ایک احسان کیا ہے۔ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں آپ کے ساتھ ایک اچھے مشورے کی صورت بھلائی کرنا چاہوں گی۔ آج سے ہاشم کو اپنے گواہ پیش کرنے ہوں گے' مگر اس سے پہلے جج صاحب آپ کو کٹہرے میں بلائیں گے۔"

شیرو کے ابرو حیرت سے اکٹھے ہوئے۔ "مگر میں کہہ چکا ہوں کہ حلف لے کر اپنے خلاف گواہ نہیں بنوں گا۔"

"وہ اور چیز ہوتی ہے۔ یہ اور چیز ہے۔ اس میں حلف نہیں لینا' اور سچ بولنے کی پابندی بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بولیں گے تو بھی سزا نہیں ہوگی۔ چاہیں تو خاموش رہیں۔ جج صاحب کو اختیار ہوگا کہ آپ سے چند سوالات پوچھیں اپنی کنفیوژن کلیر کرنے کے لیے اور آپ کے جوابات حتیٰ کہ آپ کی خاموشی سے بھی وہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سچ بول دیں۔ یہ آپ کی اپنے ساتھ سب سے بڑی بھلائی ہوگی۔"

"سچ بولا تو مجھے پھانسی ہو جائے گی۔" وہ دبا دبا سا غرایا تھا۔

"آپ کا دن اچھا گزرے!" وہ پاس سے نکل کر چلی گئی۔

کورٹ روم کے باہر ہاشم کھڑا' موبائل پہ ٹیکسٹ کر رہا تھا۔ ساتھ چند دوسرے افراد کے ہمراہ حلیمہ بھی کھڑی تھی۔ دفعتاً" حلیمہ ہاشم کے قریب آئی اور آہستہ سے بولی۔

"میرے اوپر جرح مسز زمر کریں گی؟ کیونکہ پانچ روز پہلے جب اچانک پیشی ملتوی ہو گئی تھی اور اس دن میں گواہی نہیں دے سکی تھی' تو آپ نے کہا تھا کہ مسز زمر اب ___ مجھے کراس نہیں کر سکیں گی۔"

"اوہ سوری!" اس نے پیشانی چھوئی۔ "میں بتانا بھول گیا۔ اس روز ہی تمہاری گواہی ہو جاتی لیکن زمر نے اپنے کسی گواہ کو پیش کرنے کے لیے مہلت مانگ لی تھی اور پھر ___ میرا خیال تھا وہ کسی لمبے سفر پہ جانے والی ہے' مگر ___" اس نے افسوس سے گہری سانس لی۔ "ایسا نہیں ہو سکا۔ اس لیے آج وہی تمہارے اوپر جرح کریں گی۔"

وہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ بات کرتے کرتے مڑا تو دیکھا' زمر سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ہاشم مسکرا کے آگے بڑھا۔

"مسز زمر ___ میں نے سنا تھا' آپ کسی حادثے میں پھنس گئی تھیں۔ پھول بھجوائے تھے میں نے اسپتال۔ اب ٹھیک ہیں آپ؟"

وہ اس کا تروتازہ چہرہ دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔ "مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا ہوتا ہے۔"

"گڈ!" وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔ "مگر مجھے مایوسی ہوئی کہ آپ نے پولیس میں رپورٹ تک نہیں کروائی' چچ ___"

وہ ہلکا سا ہنس دی۔ "وہ کیا ہے نا ہاشم کہ پانچ سال سے رپورٹ رپورٹ کھیل کر اب تھک گئی ہوں۔ اس دفعہ جس عدالت میں رپورٹ کروائی ہے نا' وہ زیادہ قابل بھروسا ہے۔ آپ کا بھی دن اچھا گزرے۔" نرمی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ مسکرا کے سر جھٹک کر رہ گیا۔

جواہرات آج کورٹ نہیں گئی تھی۔ وہ کاردار گروپ آف کمپنیز کے ہیڈ آفس میں اپنے مصاحبین کے ساتھ ادھر ادھر چکر کاٹتی' نئے نئے احکام دے رہی تھی۔ گردن کا سریا واپس آ چکا تھا۔ لباس پہلے سے زیادہ شوخ رنگ کا ہو چکا تھا۔ لپ اسٹک زیادہ سرخ تھی۔ دو تین معمولی ملازموں کو جاب سے فارغ کیا' دو چار پہ کام کا زیادہ بوجھ ڈالا' کسی کو جھاڑا' کسی کو سراہا' اور ہر ایک کو احساس دلا کر کہ وہ واپس آ چکی ہے' وہ اپنے آفس میں چلی آئی تھی۔ اور اب گھومنے والی کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھی' مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے' کوئی فنڈ ریزر پارٹی منعقد کرے؟ کوئی

گالا؟ تاکہ جب وہ دونوں بیٹوں کے ہمراہ شان سے کھڑی ہو تو سارے میں اس کی مجروح ہوئی دھاک پھر سے بیٹھ جائے مگر گالا کا تھیم کیا ہو۔ لیکن اس سے پہلے ایک معمولی سی پلاسٹک سرجری کروائی جائے؟ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھنا چاہتی تھی۔

اس نے ٹیبلٹ اٹھایا اور اسے چہرے کے قریب لائے، سر کرسی کی پشت سے ٹکائے انگلی اس پہ پھیرنے لگی۔ چند ایک سرجریز کو کھوجا۔ پھر سوشل نیٹ ورکس دیکھنے لگی اور تب ہی ایک جھٹکے سے وہ سیدھی ہوئی۔ شیرنی جیسی بھوری آنکھیں پہلے حیرت سے اور پھر غضب سے پھیلیں۔

اسکرین پہ کسی دعوت کی تصویر میں صاحب زادی صاحبہ بیٹھی دکھائی دے رہی تھیں۔

ان کے چہرے کا ایک رخ واضح تھا۔ ڈی ایس ایل آر کی تصویر جہاں ان کی جلد کے ہر مسام تک کو دکھا رہی تھی، وہاں کان میں موجود زمرد اور ہیرے جڑے ایئر رنگز بھی دکھا گئی تھی۔ جس پہ وہ اپنی دو انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ اور جواہرات کی نظریں انگلی پر پھسلیں۔ ایک انگلی میں نیلاہٹ بھرے ہیرے والی خوب صورت سی انگوٹھی دمک رہی تھی۔ ایک زیور ہوتا تو وہ کاپی کہہ سکتی تھی، مگر یہ دو مختلف زیورات ایک ساتھ... زرنگار کے یہ زیور تو اس کی ملکیت میں تھے۔ مگر یہ صاحب زادی کے ہاتھ میں... جواہرات کے ہاتھوں سے ٹیبلٹ میز پہ لڑھک گیا۔ وہ شل سی بیٹھی رہ گئی۔

احمر... لب پھڑپھڑائے اور پھر شیرنی کی آنکھوں میں غصے بھری سرخی ابھری۔

احمر نے اس کی سب سے قیمتی متاع اس کی دشمن کو دے دی تھی، مگر کیا اس نے صرف یہی متاع دی تھی؟ یا کچھ اور بھی؟ کوئی راز... کوئی بھید...؟

وہ تیزی سے احمر کو فون ملانے لگی۔ مگر ریکارڈنگ نے خبردار کیا کہ مطلوبہ نمبر اب نہیں مل پائے گا۔ جواہرات نے فون رکھ دیا اور کسی بت کی طرح وہیں بیٹھی رہ گئی۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بہت برداشت کر لیا اس نے دوسروں کو خود کو دباتے ہوئے۔ اب وہ نہیں دبے گی۔ دفاع نہیں، جارحیت بہترین حکمت عملی۔ شیرنی کی آنکھیں آگ کے شعلوں کی طرح دہکتی ہوئی سوچ میں گم دکھائی دیتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

کمرہ عدالت میں واپس آؤ تو ہر شخص اپنی مخصوص نشست پہ براجمان تھا۔ سعدی پہلی کرسیوں پہ بیٹھا تھا اور گاہے بگاہے دور پیچھے بیٹھے گول چشمے والے آدمی کو دیکھتا تھا جو آج بھی خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا۔

جج صاحب کے سامنے ہاشم اور زمر قریب کھڑے تھے اور وہ تابعداری سے کہہ رہا تھا۔ "مسز زمر نے آج بھی اپنا آخری گواہ پیش نہیں کیا، نہ اس کی کوئی معلومات مہیا کی ہیں۔ کیا اب یہ عدالت کا وقت یوں ہی ضائع کرتی رہے گی یا ہم آگے چلیں گے یور آنر!"

"یور آنر مجھے آخری گواہ کو پیش کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔" زمر نے کہتے ہوئے ایک نظر پیچھے بیٹھے سعدی پہ ڈالی، جس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ وہ ابھی تک ڈاکٹر پاکو ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔

"آپ پہلے بھی کافی تاخیر کر چکی ہیں، بہرحال ہم کارروائی شروع کرتے ہیں، آپ ڈیفنس کے کلوزنگ آرگومنٹ تک گواہ پیش کر دیں گی تو میں قبول کر لوں گا ورنہ یاد رکھیے گا مسز زمر!" جج صاحب نے عینک کے پیچھے سے اسے دیکھتے ہوئے تنبیہہ کی۔ "اگر کاردار صاحب کے اختتامی دلائل تک آپ نے گواہ پیش نہ کیا تو عدالت یہ ہی سمجھے گی کہ آپ تاخیری حربہ استعمال کر رہی ہیں۔"

"ٹھیک یور آنر۔ میں اس سے پہلے گواہ لے آؤں گی۔" اس نے تابعداری سے سر کو خم دیا۔

(زمر کے گواہ مکمل ہو چکے تھے، اب ہاشم کے گواہان کی باری تھی، اس کے بعد اختتامی دلائل تھے اور پھر جج کو فیصلہ سنانا تھا۔)

"مسز زمر آگے بڑھنے سے پہلے عدالت نوشیرواں کاردار سے حلف کے بغیر چند سوالات کرنا چاہتی ہے۔"

جج صاحب نے مصروف سے انداز میں حکم دیا۔

ہاشم نے شیرو کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور سپاٹ سے انداز میں کٹہرے میں آکھڑا ہوا۔ زمر اب واپس جگہ پر بیٹھی، قلم انگلیوں میں گھماتی غور سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"نوشیرواں! آپ ایکس مئی کو کہاں تھے؟" جج صاحب رخ اس کی طرف موڑے نرمی سے پوچھ رہے تھے۔

"سر! میں دبئی میں تھا۔" وہ خشک سے انداز میں بولا۔ زمر سر جھٹک کر اپنے کاغذ الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"کیا آپ نے سعدی یوسف کو گولیاں ماری تھیں؟"

"نہیں یور آنر' یہ محض ایک بہتان ہے۔ میں تو اس وقت ملک میں بھی نہیں تھا۔ ہاں میرا سعدی سے جھگڑا ضرور ہوا تھا اور کئی جھگڑے رہ چکے تھے' مگر گولی... نیور..."

وہ اعتماد سے کہہ رہا تھا۔ سعدی بس چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اور سعدی کے اغوا میں آپ کا ہاتھ تھا؟"

"سعدی اغوا ہی نہیں ہوا' یور آنر۔ مجھے یونی ورسٹی کے پرانے دوستوں نے بتایا تھا کہ وہ شوال میں رہتا رہا ہے اتنا عرصہ' وہاں وہ دہشت گردوں کی تنظیم..."

وہ رٹے رٹائے انداز میں بولتا رہا۔ جب وہ کٹہرے سے اترا تو بس ایک ملامتی نظر زمر پہ ڈالی اور واپس آکر بیٹھ گیا۔ اب وہ اپنے فیصلے خود کرے گا' اس نے ثابت کر دیا تھا۔

"تو آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ ایکس مئی کو سعدی یوسف' آفس بلڈنگ میں نہیں آیا تھا؟" ہاشم کٹہرے میں کھڑی حلیمہ سے جس وقت پوچھ رہا تھا' اسی وقت پچھلی نشستوں پہ فارس غازی آکر بیٹھا۔ اس نے شرٹ کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور چہرے پہ سنجیدگی تھی۔

"جی نہیں' وہ نہیں آیا تھا۔" حلیمہ اعتماد سے بولی۔

"اور اس سے پہلے متعدد بار آپ کے نمبر سے سعدی کو کال کی گئی تھی۔ وہ کس لیے کی گئی تھی؟" ہاشم پوچھ رہا تھا۔

"سونیا کی پارٹی میں سعدی سے میری ملاقات ہوئی تھی' وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی ملاقات اپنے ایک انکل سے کرواؤں جو ملٹری انٹیلی جنس میں کام کرتے ہیں اور آج کل شوال میں تعینات ہیں۔"

"تو آپ وہ کالز مجھ سے اپائنمنٹ لینے کے لیے نہیں کر رہی تھیں جیسا کہ سعدی نے کہا ہے بلکہ معاملہ شوال کا تھا؟" (شوال ایک علاقہ ہے جو ضرب عضب کے باوجود آج بھی دہشت گردوں کی جنت ہے اور میڈیا رپورٹس کے برعکس وہاں طالبان کا مکمل کنٹرول ہے۔)

"جی... انکل سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا اور جب ہوا تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ یہ ہی بتانے کے لیے سعدی کو کال کی تھی' اس نے الٹا مجھے بھی اپنے کیس کا حصہ بنا دیا۔" وہ ناخوش مگر پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

ہاشم نے مڑ کر ایک مسکراتی نظر سعدی پہ ڈالی اور پھر "یور وٹنس" کہتا ہوا واپس اپنی جگہ پہ آگیا۔

زمر نشست سے اٹھی تو پیچھے بیٹھے فارس نے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پہ فکرمندی نظر آتی تھی۔ (زمر جرح کیسے کرے گی' اور کیا اس ذہنی حالت میں وہ حلیمہ پہ کروار کرش' تابڑ توڑ حملے ٹھیک سے کر پائے گی' کہیں وہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر معاملہ خراب نہ کر دے!)

زمر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' ہاتھ میں چند کاغذ پکڑے کٹہرے کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی۔ حلیمہ نے پورے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں دیکھا گویا وہ تیار تھی۔ صبح ہاشم نے اس کی مٹھی میں چند کافی beans (دانے) ڈالے تھے اور پھر اسے مٹھی بند کرنے کو کہا۔ "یہ تمہارا سرمایہ ہے۔ جرح میں وکیل تمہاری مٹھی خالی کروانے کی کوشش کرے گا' مگر تم نے کوشش کرنی ہے کم سے کم دانے گریں اور زیادہ سے زیادہ تمہارے پاس محفوظ رہیں۔" اور اس مثال سے وہ سمجھ گئی۔

"تھینک یو حلیمہ! عدالت کے ساتھ تعاون کرنے

کے لیے۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئی۔ چمک دار بھوری آنکھیں حلیمہ پہ جمی تھیں۔ "مگر مجھے آپ سے ایک گلہ بھی ہے۔"

حلیمہ اس نرمی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ قدرے تذبذب سے بولی۔ "جی؟"

"یہ سچ ہے نا کہ میں نے آپ کو متعدد بار کالز کیں اور ملنے کی کوشش کی، تاکہ آپ سے آپ کی طرف کی کہانی سن سکوں کیونکہ ابھی تک تو مجھے صرف سعدی یوسف کی طرف کی کہانی معلوم ہے، مگر آپ مجھ سے نہیں ملیں۔"

"یہ میرا قانونی حق ہے، میم!" وہ گردن اکڑا کے بولی۔

"آف کورس یہ آپ کا حق ہے۔ ارے نہیں، آپ غلط سمجھیں۔ میں آپ کا حق سلب کرنے کی بات نہیں کر رہی ہیں بلکہ۔" وہ یاد کر کے ہلکا سا ہنسی۔ "ایک کیس میں، میں خود جب گواہ پیش ہوئی تھی، فارس غازی کے خلاف تو میں نے بھی مخالف وکیل سے بات کرنے یا ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں آپ کی پوزیشن سمجھ سکتی ہوں اور مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ ہم کسی لڑکی کو اس کٹہرے میں لا کر کھڑا کریں۔ اس لیے میں چاہوں گی کہ آپ بالکل کمفرٹیبل ہو جائیں، بس آپ کو میرے چند سوالات کے جواب دینے ہیں اور پھر آپ جا سکیں گی۔"

حلیمہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ زمر کے پیچھے ہاشم کو دیکھنے کی کوشش کی مگر زمر نے جیسے ہی اس کی نگاہوں کا رخ دیکھا، وہ ذرا دائیں طرف سرکی۔ راستہ بلاک ہو گیا۔ حلیمہ اب ہاشم کو دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

"مگر یہ تو سچ ہے نا کہ میں پہلی دفعہ آپ سے اس کیس کے بارے میں بات کرنے جا رہی ہوں۔"

"جی!"

"مگر ہاشم کاردار سے کئی گھنٹے تک آپ نے گواہی ڈسکس کر کے تیاری کی ہو گی تو آپ برا تو نہیں مانیں گی، اگر میرے سوالات لمبے ہو جائیں، کیونکہ مجھے پہلے وقت نہیں دیا آپ نے، تو وہ کمی بھی تو پوری کرنی ہے نا۔" وہ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ حلیمہ نے تھوک نگلا۔ پھر ذرا دائیں طرف ہوئی، مگر زمر اس کے ساتھ اسی طرف سرک گئی۔ راستہ ابھی تک بلاک تھا۔

"جی شیور!" وہ مجبوراً بولی۔

"آپ آبجیکٹ کریں۔" نوشیرواں نے بے چینی سے ہاشم کو مخاطب کیا، جو خود بھی قدرے اچنبھے کا شکار لگتا تھا، مگر جواب میں شیرو کو کاٹ کھانے کو دوڑا۔

"کس بات پہ؟ کہ وہ شائستگی سے کیوں بات کر رہی ہے؟"

"اوکے تھینک یو حلیمہ۔ بس میں آپ کے چند منٹ لوں گی۔" وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔

"میں نے سنا ہے آپ بہت قابل سیکرٹری ہیں اور بہت جانفشانی سے اپنا کام کرتی ہیں۔" زمر توصیفی انداز میں شروع ہوئی۔

"جی۔۔۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اور آپ کبھی بھی چھٹی نہیں کرتیں، بیماری کی حالت میں بھی آفس جاتی ہیں۔"

"جی۔" وہ کردار پہ حملے کی تیاری کر کے آئی تھی اور یہاں اس کی تعریف ہو رہی تھی؟

"گڈ۔۔۔ تو کیس مئی کو آپ آفس میں ہی تھیں؟"

"جی۔ میں سارا دن ڈیسک پہ تھی۔"

"اور اکیس مئی کو نیچے لابی میں کتنے لوگ دن میں آئے تھے؟"

"میں لابی میں آنے جانے والوں سے ناواقف ہوں، میں صرف ان کا بتا سکتی ہوں جو میرے سامنے لفٹ سے اتر کر ہاشم کاردار کے آفس میں جاتے ہیں۔"

"یعنی کہ آپ بلڈنگ میں داخل ہونے والے ہر شخص کا حساب نہیں رکھتیں، صرف ان ہی کا حساب رکھتی ہیں جن کو آپ دیکھ سکتی ہیں۔"

"جی۔"

"جن کو آپ دیکھ سکتی ہیں، رائٹ؟" اس نے زور

دیا۔ سب دم سادھے سن رہے تھے۔
"جی۔۔۔"
"اور سعدی کو آپ نے نہیں دیکھا تھا؟"
"نہیں۔۔۔ اگر وہ آیا ہوتا تو مجھے پتا ہوتا۔"
"کیسے پتا ہوتا؟"
"کیونکہ لفٹ ہے نا۔" زمر نے چند کاغذات اس کے سامنے رکھے، جن پہ آفس فوٹوز پرنٹ کی گئی تھیں۔ "ایک پرائیوٹ لفٹ بھی تو ہال کے کونے میں ہے اور اس سے کاردار صاحب کے خاص مہمان اترتے ہیں، اس کے ایک طرف گلاس وال لگی ہے جو معمولی سی دھندلی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی وہاں سے اترے تو آپ کو کراس کیے بغیر ہی سیدھا کاردار صاحب کے آفس میں چلا جائے؟"
حلیمہ لمحے بھر کو چپ ہوئی۔ ہاشم کو دیکھنے کی راہ ہنوز بلاک تھی۔ "وہ گلاس بہت معمولی سا دھندلا ہے اور کسی انسان کے کندھوں تک آتا ہے۔ کوئی وہاں سے گزرتا تو اس کا سر نظر آ ہی جاتا ہے۔ چند فٹ دور ہی تو میرا ڈیسک ہے۔"
"اور آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟"
"سوری!"
"کیا یہ سچ نہیں ہے مس حلیمہ! کہ بیس اپریل کو آپ کی آنکھوں کی Lasek سرجری ہوئی تھی "پی آر کے" مگر آپ نے صرف دو دن کا آف لیا تھا اور تیسرے دن آپ جاب پہ واپس آ گئی تھیں۔"
"جی۔۔۔ یہ درست ہے۔"
"اور آپ نے اپنے باس کو نہیں بتایا تھا کہ "پی آر کے" کے بعد آنکھ کھلتی ہی دو دن بعد ہے اور بصارت دھندلی ہوتی ہے۔ کم از کم چار سے پانچ ماہ لگتے ہیں دونوں آنکھوں کی نظر شارپ ہونے میں۔ آپ کا نمبر منفی چار اعشاریہ پانچ تھا، جو کافی کمزور ہے۔ آپ کی نظر واپس آنے میں کم از کم بھی دو ماہ لگنے تھے۔"
حلیمہ نے بے چینی سے اس کے پیچھے دیکھنا چاہا، مگر بے سود۔ ہاشم نے کوفت سے پہلو بدلا۔ وہ اعتراض کرتا تو وہ مزید کنفیوز ہو جاتی۔

"میری نظر بالکل ٹھیک تھی۔"
"مگر کیا ان دنوں آپ اسٹیرائڈ ڈراپس آنکھوں میں نہیں ڈال رہی تھیں؟"
"جی مگر۔۔۔"
"اور آپ نے پانچ جون کو اپنے ڈاکٹر کو پوسٹ اپ چیک اپ میں کہا تھا کہ اس ہفتے جب سے آپ نے اسٹیرائڈ چھوڑے ہیں آپ کی نظر بحال ہونے لگی ہے۔ یعنی اکیس مئی تو اس سے پہلے آیا تھا۔ اکیس مئی تک تو آپ ڈاکٹر کے حروف، چھٹی بورڈ کی آخری چار سطور نہیں پڑھ سکتی تھیں۔"
"میری نظر ذرا سی کمزور تھی، مگر میں سارا کام احسن طریقے سے۔۔۔"
"آپ کہہ چکی ہیں کہ آپ بیماری میں بھی آ جاتی تھیں آفس، تو ان دنوں آپ کو دو میٹر سے آگے نظر نہیں آ رہا تھا مگر آپ نے اپنے باس کو نہیں بتایا اور کام کرتی رہیں۔"
"مگر میں۔۔۔" وہ مضطرب ہو کر بولنا چاہ رہی تھی، مگر۔۔۔
"اور یہ عین ممکن ہے کہ قریباً بارہ میٹر دور موجود پرائیوٹ لفٹ سے سعدی جب اترا ہو تو آپ نے فاصلے کے باعث اسے پہچانا نہ ہو۔"
"مگر وہ پرائیوٹ لفٹ سے نہیں اترا تھا۔" وہ بے چینی سے بولی۔
"یعنی وہ اسٹاف لفٹ سے اترا تھا؟" وہ تیزی سے بولی۔
ہاشم نے آنکھیں میچ لیں۔ (اف)
حلیمہ لمحے بھر کو چپ ہوئی۔ "وہ کسی بھی لفٹ سے نہیں اترا تھا۔"
"مگر یہ عین ممکن ہے کہ آپ نے اسے نہ دیکھا ہو، کیونکہ آپ آنکھوں میں ان دنوں اسٹرائڈز ڈالتی تھیں اور پرائیوٹ لفٹ سے آنے والے کو نہیں دیکھ سکتی تھیں، یوں وہ آپ کو بائی پاس کر کے ہاشم کے آفس میں جا سکتا تھا۔ آپ جھوٹ نہیں بول رہیں۔ آپ میں دراصل دیکھنے کی اہلیت ہی نہیں تھی۔ تھینک یو،"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"
اب کی بار ایک دم تیزی اور درشتی سے کہہ کر زمر واپس ہولی۔ حلیمہ نے بے بسی سے ہاشم کو دیکھا جو لب نظر آیا تھا اور اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔ وہ ری ایگزامن کے لیے بھی نہیں اٹھا کہ کہیں وہ مزید کوئی گل افشانی نہ کردے اور گواہ کو جانے دیا۔

"زمر!" وہ واپس بیٹھی تو سعدی نے آہستہ سے اسے مخاطب کیا۔ وہ اس کے قریب ہوگئی۔
"فارس ماموں کی رہائی سے پہلے جب میں نے ایک ہوٹل میں حلیمہ کے ہاتھ میں موجود ہاشم کے لیپ ٹاپ کو یو ایس بی لگا کر ہیک کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ مجھے نوٹس نہیں کرپائی تھی۔ یقیناً اس لیے کہ اس کی نظر خراب تھی۔"
"ہاں......"
"مگر زمر! میں تو ریگولر اسٹاف لفٹ سے اترا تھا۔" اس نے جلدی سے تصحیح کی۔
"سعدی یوسف خان۔ کورٹ روم میں جھوٹ کو سچ سے نہیں ہرایا جاتا۔ جھوٹ کو اس سے بڑے جھوٹ سے ہرایا جاتا ہے۔" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ واپس سیدھی ہوگئی۔
جب وہ باہر نکلی تو راہداری میں اپنے بابر کے ساتھ چلتی حلیمہ اسے صفائیاں دے رہی تھی اور وہ غصے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا کے آگے بڑھ گئی۔ تب احساس ہوا کہ کوئی اس کے ساتھ آکر چلنے لگا ہے۔ وہ رکی نہیں، مڑی نہیں، قدم اٹھاتی رہی۔
"بڑے عرصے بعد کنٹرولڈ، شائستہ اور ٹھنڈے مزاج کی لگی ہیں آپ۔" وہ مسکراہٹ دبائے بولا تھا۔ زمر نے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔
"میں تو وکالت کر رہی تھی۔"
"اور یقیناً اس کے ڈاکٹر کی فیس وغیرہ کا آپ کو ہاشم کے کمپیوٹر سے چوری کی گئی فائلز سے معلوم ہوا ہوگا۔"
"وکیل اپنا سورس نہیں بتاتے اور دو نمبر لوگوں کو تو بالکل بھی نہیں۔" وہ دو قدم آگے بڑھ گئی، مگر وہ رکا رہا پھر مسکرا کے بولا۔
"میں متاثر ہوا ہوں۔" زمر کے قدم زنجیر ہوئے۔ وہ گھومی تو آنکھوں میں حیرت تھی۔
"مجھ سے؟"
"ہوں، تم سے کیونکہ اچھا وکیل وہ ہوتا ہے جو وہاں سے آئے، جہاں سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہو۔ ہم سب سمجھ رہے تھے تم اس کے کردار اور قابلیت پہ حملہ کرکے اس کو جھوٹا کہو گی، مگر تم نے یہ ثابت کیا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ بس بے چاری کو نظر ہی نہیں آیا تھا۔" مسکرا کے بولتے وہ اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔ "مجھے کافی اچھا لگا یہ سب دیکھ کر۔ مگر ڈر بھی لگا۔ سوچ رہا ہوں آئندہ معلوم نہیں باتوں میں تم سے جیت بھی سکوں گا یا نہیں۔"
"استغفراللہ۔" وہ خفگی سے کہتی، سر جھٹکتی آگے بڑھ گئی اور وہ اداس مسکراہٹ سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

صبح کے تخت نشین شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

رات شہر پہ اتری تو بلند و بالا عمارتوں کی ساری روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ ایسی ہی ایک روشن پُرشکوہ عمارت ایک سکس اسٹار ہوٹل کی تھی۔ جس کے اندر جاؤ تو لابی میں رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ ہنستے ہوئے بے فکر خوب صورت لوگ۔ اور ان سب کے درمیان سے گزرتی صاحب زادی صاحبہ جن کے کانوں کے ٹینیے جگمگا رہے تھے اور انگلیوں کی انگوٹھیاں نگاہیں خیرہ کردیتی تھیں۔ ان کے پیچھے دو باڈی گارڈز چل رہے تھے اور وہ تینوں لفٹ کی سمت جا رہے تھے۔
صاحب زادی صاحبہ کی مسکراہٹ ویسی ہی چہرے پہ جمی رہی جب وہ بالائی منزل پہ ایک راہداری سے گزر کے ایک سوئٹ کے باہر آٹھہریں۔ گارڈز نے دروازہ

کھٹکھٹایا تو اگلے ہی لمحے وہ کھل گیا۔ کھولنے والی خود جواہرات تھی۔ سرخ لباس میں ملبوس ' سرخ لپ اسٹک لگائے ' بالوں کو کرل کرکے چہرے کے ایک طرف ڈال رکھا تھا اور مسکرا رہی تھی۔

"آپ کو میرے لیے دروازہ خود کھولنا پڑا؟"

صاحب زادی صاحبہ طنز سے مسکرائیں۔

"چونکہ آپ نے کسی حساس موضوع پہ ملنے کے لیے کہا تھا تو میں نے اپنے اسٹاف کو بھیج دیا۔ آیئے نا۔" خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے راستہ چھوڑا۔

چند منٹ بعد وہ دونوں شاہانہ طرز کی کرسیوں پہ آمنے سامنے بیٹھی تھیں ' درمیان میں میز تھی جس پہ پھول رکھے تھے۔ (گارڈز باہر تھے۔)

"آپ کے زیورات بہت خوب صورت ہیں۔" جواہرات مسکرا کے انہیں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے آپ کی طرح لمبی لمبی اداکاریاں نہیں آتیں جواہرات بیگم۔" وہ اب کے بولی تو مسکراہٹ سمٹ گئی تھی اور آنکھوں میں تپش در آئی تھی۔ "یہ مجھے احمر شفیع نے دیے ہیں۔ آپ کی ملکیت تھے یہ۔ اور اب میری ملکیت ہیں۔"

"احمر!" وہ ہلکا ہنسی۔ پھر کہنی کرسی کے ہتھے پہ رکھے ' ایک انگلی گال تلے رکھے وہ دلچسپی سے صاحب زادی کو دیکھنے لگی۔ "اور کیا دیا ہے احمر نے آپ کو۔"

"مجھے تو آپ پہ ترس آ رہا ہے۔" وہ واقعی ترحم سے بولی تھی۔ "بہت دنوں بعد آپ آفس اور سوشل گیدرنگز میں نظر آئی تھیں ' اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ ' مگر کون جانتا تھا کہ یہ تخت و تاج محض چند دن کا محتاج ہے۔ بس چند الفاظ اس کو الٹنے کے لیے کافی ہیں۔"

"اچھا!! اور آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میرا تخت الٹنے والا ہے؟"

"کیونکہ آپ کے تخت کو اٹھانے والے آپ کے دو بیٹے ہیں اور جس دن وہ آپ کی حقیقت جان گئے ' آپ تباہ ہو جائیں گی۔"

"اور کیا ہے میری حقیقت؟"

"مسز کاردار!" وہ ذرا سا مسکرائی۔ "کہا تھا نا میں نے آپ سے۔ جیسے آپ نے میری زندگی برباد کی ہے ' میں بھی کروں گی۔ کہا تھا نا میں انتقام ضرور لوں گی۔ آپ سوچیں ' اس وقت آپ پہ کیا گزرے گی جب ہاشم جان لے گا کہ آپ نے اس کے باپ کا.... قتل کیا ہے۔"

جواہرات مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے انگلی پہ گھونگھریالی لٹ لپیٹتی رہی۔

"اور یہ بتانے کے احمر نے کتنے پیسے لیے ہیں آپ سے؟" کوئی حیرت ' کوئی شاک نہیں۔

"آپ خود کو جتنا بھی کمپوزڈ ظاہر کرلیں ' آپ کا چہرہ گواہی دیتا ہے کہ آپ اورنگ زیب کاردار کی قاتل ہیں۔"

"اور یہ بھی اس نے کہا ہو گا کہ میرے پاس ثبوت نہیں ہے ' مگر مسز کاردار کا چہرہ اس گواہی کے لیے کافی ہے۔" وہ ہلکا سا ہنسی۔ صاحب زادی صاحبہ کے اعصاب تن گئے۔ ان کو یہ امید نہیں تھی۔ قدرے بے چینی سے بولی۔ "سعدی یوسف سب جانتا ہے کہ کس طرح تم نے اپنے شوہر کو مارا اور میری انجیو بھی گواہ ہے۔"

"اوہ ڈارلنگ ' تم بھی کن لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے قد سے بڑی باتیں کرنے آ گئیں۔" جواہرات نے افسوس سے گہری سانس بھری۔ صاحب زادی صاحبہ کو اب غصہ چڑھنے لگا۔

"جس دن میں نے ہاشم کو بتا دیا نا ' وہ تمہاری جان لے لے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی ' کیونکہ تمہارے ڈرائیور کو جو صبح چھٹی لے کر گیا ہے ' کل شام میں نے خرید لیا تھا اور اس نے مجھے سب بتا دیا کہ کس طرح سعدی اور احمر نے اپنی جان بچانے کے لیے تمہارے ساتھ یہ جھوٹ بولا ' اور تم بی بی! تم چلی آئیں میرا تخت گرانے۔"

یہ کہتے ہوئے جواہرات اٹھی اور ساتھ والے کمرے کا نیم وا دروازہ کھول دیا۔

صاحب زادی صاحبہ نے چونک کر گردن موڑی اور

اگلے لمحے وہ سانس تک لینا بھول گئیں۔
وہاں سے وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے۔ ہاشم اور نوشیرواں۔ سوٹ میں ملبوس چبھتی ہوئی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے' وہ اپنی ماں کے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے تھے اور جواہرات مسکرا کر کہہ رہی تھی۔
"میں جانتی تھی' تم مجھے بلیک میل کرنے آؤ گی' اس لیے میں نے اپنے بیٹوں کو بھی بلا لیا اور دیکھو وہ میرے ساتھ کھڑے ہیں' ان کو مجھ پہ پورا اعتماد ہے۔"
صاحب زادی فق چہرہ لیے کھڑی ہوئیں' تھوک نگلا۔ باری باری ان دونوں کے سپاٹ چہرے دیکھے۔
"تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو مارا ہے۔" وہ باؤلا سا چلائیں۔
"اچھا' کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟ اور سعدی کا نام مت لینا' آپ کے ڈرائیور سے سن چکا ہوں۔ سعدی تو کل تک خاور کو میرے باپ کا قاتل کہتا تھا۔" ہاشم تلخی سے گویا ہوا۔ وہ نارمل نظر آ رہا تھا۔
"تمہاری ملازمہ گواہ ہے' اس نے تمہارے باپ کے باتھ روم سے جواہرات کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔"
"جسٹ گیٹ آؤٹ!" ہاشم نے بےزاری سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
"نہیں... میں ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ تم کیسی عورت ہو۔ اپنے بیٹوں کو دھوکا دے رہی ہو۔ پوسٹ مارٹم والے ڈاکٹر کو بھی تم نے سری لنکا سے احمر کے ذریعے کال کروائی تھی اور جب اس کے پاس گئیں تو اس کو اتنا ڈرایا کہ اس نے خاور کا نام..." (شیرو نے بہت آہستہ سے سر اٹھایا۔)
"نکل جاؤ یہاں سے..." جواہرات حلق کے بل چلائی تھی۔ وہ سہم کر خاموش ہوئی۔
جواہرات قدم قدم چلتی اس کے قریب آئی اور سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھورا۔
"سعدی کو کہنا ہمارا فیملی یونٹ وہ کبھی نہیں توڑ سکتا۔ رزق اور راج صرف کوشش سے نہیں ملتا۔ یہ ادھر (پیشانی پہ انگلی رکھی) ادھر لکھا ہوتا ہے۔ میرا بخت ادھر لکھا ہے۔ رہے یہ زیورات تو تم یہ رکھ سکتی ہو۔ یہ cursed (منحوس) ہیں جلد ہی تمہیں دلدل میں دھکیل دیں گے اور تم مجھ سے بڑی ڈائن بن جاؤ گی۔ اب دفع ہو جاؤ۔" اور صاحب زادی کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔ باری باری سب کو دیکھا اور پھر تیزی سے وہاں سے نکل گئیں۔ جواہرات اب کے مڑی تو آنکھوں میں آنسو تھے۔
"مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں نے صبح میری ساری بات سن کر میرا ساتھ دیا اور سعدی یوسف کے پلان کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ مجھے تم دونوں پہ فخر ہے۔"
ہاشم نے کندھے اچکائے اور صوفے پہ بیٹھ گیا۔ وہ بےزار لگ رہا تھا۔ نوشیرواں البتہ ابھی تک بت بنا کھڑا تھا۔ ہاشم اسی بےزاری سے کہنے لگا۔
"سعدی بار بار ڈیڈ کی موت کو بیچ میں کیوں لے آتا ہے؟ اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ خاور اصل قاتل ہے بھی یا نہیں۔"
جواہرات کا دل بری طرح کانپا۔ وہ بہت بڑا جوا کھیل گئی تھی مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔
"آف کورس خاور قاتل ہے ہاشم۔ اب میں یا تم تو قاتل ہو نہیں سکتے۔ کہیں تم بھی اس کی باتوں میں تو نہیں آ گئے؟"
"اوہو نہیں ممی۔ میں تو بس سوچ رہا ہوں کہ وہ اب اس بات کو ہر جگہ استعمال نہ کرنا شروع کر دے اور..."
"احمر کو کیسے پتا ڈاکٹر کے گھر والی بات؟" نوشیرواں کسی خواب کی سی کیفیت میں بولا تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔
"پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کے گھر ریس' میں' آپ اور بھائی گئے تھے۔ احمر تو تب ہمارا ملازم بھی نہیں تھا۔ تو اسے کیسے پتا چلا کہ آپ نے ڈاکٹر کو ڈرانے والی باتیں کی تھیں؟" شیرو عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بپھر گئی۔
"کیونکہ احمر کے ذریعے خاور کا پتا صاف کیا تھا ہم نے' شاید میں نے ہی بتایا ہو۔ اب کیا تم مجھے ایسے

دیکھو گے؟"

"اور اس نے میری کا نام کیوں لیا؟ آپ میری کو ڈی پورٹ کرنا چاہتی تھیں' آپ میری سے ڈیڈ کی وت کے بعد سے خوف زدہ نہیں تھیں۔"

"نوشیرواں! ممی پہ شک مت کرو۔" ہاشم اکتا کر کھڑا ہوا۔ "ان کی باتوں کو اپنے ذہن پہ سوار مت کرو' چلو ڈنر کرتے ہیں۔" اس نے اس کا شانہ تھپتھپایا تو شیرو نے سر جھٹکا۔ گویا بہت سے خیالات بھی جھٹکے۔

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ الجھے نظر آتے تھے اور جواہرات بظاہر پرسکون سی' اندر عجیب طوفانوں میں گھری تھی۔ صاحب زادی کے بتانے سے بہتر تھا وہ خود ان کو بتا دے' یہ حکمت عملی اس کا آخری آپشن تھا۔ آخری جوا اور اس کا نتیجہ اتنا حوصلہ افزا نہیں تھا جتنا وہ چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی ان کے بیٹے اس کے ساتھ تھے۔ اسے اور کیا چاہیے تھا؟

امید کے صحرا میں جو برسوں سے کھڑا ہے
حالات کی بے رحم ہواؤں سے لڑا ہے

سو ہال پہ وہ حبس زدہ رات مغموم سی پھیلی تھی۔ لاؤنج کی دیوار کو نئے سرے سے صاف پینٹ کر کے حنین فارغ ہو چکی تھی۔ وہ نقش و نگار چھپ گئے تھے اور اب وہ چند روز میں اس پہ اسٹینسل پینٹ کر سکتی تھی۔

"شکر!" وہ گلوز اتارتی' برش اور ڈبے اٹھاتی' سیڑھیاں چڑھنے لگی تاکہ اپنے کمرے میں جا کر اس سامان کو ٹھکانے لگائے پھر سعدی کے کمرے کی جلتی بتی دیکھ کر ادھر چلی آئی۔

وہ اسٹڈی چیئر پہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور پرسوچ نظریں چھت پہ ٹکی تھیں۔

"پریشان نہ ہوں' بھائی! ہم پھر سے ڈاکٹر مایا کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔" اس کے نرمی سے پکارنے پہ وہ چونکا' پھر اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

"پتا ہے حنین! صرف ایک بات مجھے تسلی دیتی ہے کہ ہمارے جج صاحب ایمان دار آدمی ہیں۔"

"اور مجھے صرف ایک بات خوف دلاتی ہے کہ بڑے فیصلے کرنے کے لیے صرف ایمان دار ہونا کافی نہیں ہوتا۔" وہ سوچ کر رہ گئی' مگر بولی تو صرف اتنا۔

"چاہے ہم جنگ جیتیں یا ہاریں' حق کے لیے لڑنا ہمیشہ درست ہوتا ہے۔"

پھر وہ چلی گئی اور وہ وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ مایوسی' اداسی اور امید کے درمیان وہ کہیں ہوا میں معلق تھا۔ کسی کچے دھاگے سے لٹکا' کسی کی زنجیر سے بندھا۔

"بھائی بھائی۔" پرسکون ماحول کا بلبلہ ایک دم سے پھٹ گیا۔ حنین دھاڑ سے دروازے کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ٹیب تھا اور چہرے پہ بلا کا افسوس۔

"وہ آپ لوگوں کا دوست... احمر شفیع... اس کے بارے میں سوشل میڈیا پہ خبر دیکھی آپ نے؟"

سعدی نے گہری سانس لی اور مسکرا کے اسے دیکھا۔ "ہاں' دیکھی تھی۔ ایک کار حادثے کے بعد ایک جلی ہوئی لاش ملی ہے جو اسی کی عمر کے بندے کی ہے اور اتفاق سے اس کے ساتھ جو احمر شفیع کے نام کا شناختی کارڈ' پاسپورٹ وغیرہ تھے' وہ بالکل بھی نہیں جلے۔" حنہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"آپ کا دوست ہلاک ہو گیا اور آپ آرام سے بیٹھے ہیں؟"

"اسے غائب ہونے کے طریقے آتے ہیں' ایک فیک ڈیتھ اسٹیج کرنا اس کے لیے مشکل نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مگر ہو سکتا ہے' یہ سب ڈرامہ نہ ہو۔ بلکہ اس کو منز کاردار نے مروا دیا ہو۔" اسے فکر ہوئی۔

"مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ ایسا نہیں ہے' کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ ولیم شیکسپیئر نے کہا ہے۔

There are three ways for
a person to disappear. first
is to die the second
is to lie and the third
is to reborn.

"اسی طرح اس نے کہیں اور کسی نئے نام سے جنم لے لیا ہو گا۔"

"حنین!" وہ خفگی سے بولا مگر وہ مڑے بغیر باہر جا چکی تھی۔

وہ اسے پہلے ہی دن سے برا لگتا تھا۔ پہلی دفعہ جب اس نے حنین کو دیکھا تھا تو اسے اس کی اخبار میں چھپی تصویر یاد آ گئی تھی اور لگ گیا تھا اس کے بارے میں کھوج لگانے۔ کہ اس نے ایف ایس سی میں ٹاپ کرنے کے باوجود انجینئرنگ کیوں نہیں پڑھی۔ وہ اس کا سیاہ راز تھا اور اسی لیے اس احمر شفیع سے وہ شدید پریشانی محسوس کرتی تھی۔ مگر اب نہ وہ راز بے چین کرتا تھا نہ وہ فراز ان کی زندگیوں میں رہا تھا۔ اور ویسے بھی کل سے ڈرائنگ روم کی پینٹنگ بھی شروع کرنی تھی' سو آج رات گوگل کے آئیڈیاز کے نام!

☼ ☼ ☼

عجیب سوال کیا آندھیوں نے پتوں سے
شجر سے ٹوٹ کر گرنا' بتاؤ' کیسا لگا

بہت دن بعد آج سر شام ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اوپر سے جیسے پانی کے تھال گرا دیے گئے تھے۔ پہاڑی علاقے کی اس بل کھاتی سڑک کے اوپر۔ چوٹی سے بنے پتھروں کے گھر کی کھڑکیوں پہ بوندیں تراتڑ برس رہی تھیں۔ باہر مئی کے باوجود ٹھنڈ ہو چکی تھی۔ اس سٹنگ روم میں نوعمر لڑکا آتش دان میں ہیٹر جلانے لگا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر صوفے پہ بیٹھے ہاشم کو وضاحت دی۔

"ابو کو ٹھنڈ نہ لگ جائے' اسی لیے جلا رہا ہوں۔"

ہاشم نے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا اور پھر وہیل چیئر پہ بیٹھے خاور کو دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد لگ رہے تھے۔ جہاں ہاشم ترو تازہ' تیار' ستھری پینٹ میں ملبوس چاق و چوبند بیٹھا تھا' وہیں خاور لاغر' کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتا تھا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور شیو بھی سفید تنکوں جیسی تھی۔ گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اور نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔

"تم جاؤ بیٹا! میں کچھ وقت تمہارے ابو کے ساتھ اکیلے میں گزارنا چاہتا ہوں۔" لڑکا ہیٹر سیٹ کر کے تابع داری سے سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ باہر برستی بارش کی تڑتڑاہٹ بھی معدوم ہونے لگی۔

"پچھلے ہفتے جب میں نے وہ دن ایک سرخ رومال کو دیکھتے کمرے میں بند گزارے' تو ایک دفعہ ایسا موقع بھی آیا کہ فون کھول کر اپنے کانٹیکٹس کے گروپس دیکھے۔ فرینڈز' فیملی' کولیگز' تشنا سا فرینڈز کے خانے میں بہت سے نام تھے۔"

وہ مغموم مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے خاور پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"مگر کوئی بھی کام کا نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا کہ دوست کون ہوتا ہے؟ وہ جس کی وفا غیر مشروط ہو۔ جو آپ سے بھلے اختلاف رکھتا ہو مگر آپ کو سنتا ہو' آپ کو سمجھتا ہو اور اس کو جب مدد کے لیے پکارو' وہ حاضر ہو اور جس کے لیے آپ بھی ہمیشہ حاضر ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ جو ہمارے لیے ہمیشہ حاضر ہوتے ہیں' وہ ہم سے اپنے لیے ہماری حاضری کی توقع نہیں رکھتے مگر خاور.... مجھے احساس ہوا کہ شاید تم میرے سب سے اچھے دوست تھے۔"

بوندیں تڑتڑ شیشوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ خاور کی آنکھیں اوپر کہیں جمی تھیں۔ جسم سے نالیاں لگی تھیں اور وجود میں ذرا سی جنبش بھی نہ ہوتی تھی۔ سوائے پلکیں جھپکنے کے۔

"اب تک مجھے تم پر غصہ تھا۔ ناراض تھا۔ سوچتا تھا کیا اتنی نفرت تھی تمہیں میرے باپ سے کہ ان کو مار ہی ڈالا؟ مگر اب میں ناراض نہیں ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں اب سمجھنے لگا ہوں۔ تمہیں بھی اور خود کو بھی۔ اپنے ہاتھوں سے ایک محبوب انسان کو مارنے کے بعد مجھے لگنے لگا ہے کہ قتل صرف نفرت اور دشمنی میں

نہیں کیے جاتے۔ محبت میں بھی ہو جاتے ہیں۔ مجبوری لے ڈوبتی ہے۔ شاید تمہیں میرے باپ سے کوئی نفرت نہ ہو' شاید تمہاری مجبوری ہو' مگر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اب تمہیں سمجھ سکتا ہوں۔"

وہ اداسی سے کہہ رہا تھا۔ لبوں پہ مسکراہٹ ہنوز قائم تھی۔ خاور اسی طرح ایک طرف دیکھے گیا۔

"مجھے آج کہنے دو کہ میں تمہیں مس کرتا ہوں۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ تمہارے جانے کے بعد ہر چیز میرے لیے خراب ہونے لگی ہے۔ سب بگڑ رہا ہے۔ مگر میں آخری دم تک لڑوں گا' لیکن مجھے کہنے دو کہ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا' کاش تم میرے ساتھ ہوتے ان دنوں۔ کاش تم نے میرے باپ کو نہ مارا ہوتا۔"

پھر وہ آگے ہوا اور قریب سے اس کو دیکھا۔

"کیا واقعی تم نے ڈیڈ کو مارا تھا؟" اس کی آواز میں ایک شبہ سا تھا۔ ایک شک۔۔۔ ہیجان

خاور دوسری جانب دیکھتا رہا۔ وہ اٹھا اور گھوم کر اس کی وہیل چیئر کے سامنے آیا' دونوں ہاتھ وہیل چیئر کے بازوؤں پہ رکھے اور اضطراب سے اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا جو کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔

"اور اگر تم نے ہی ان کو مارا تھا تو کس کے کہنے پہ؟ کیا میری۔۔۔" آواز کانپی "میری ماں کے کہنے پہ؟ ہاں' بتاؤ مجھے۔"

اس کی رنگت سرخ پڑ رہی تھی' اور وہ تڑپنے کے سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ پلیز' کیا میری ماں نے میرے باپ کو مارا ہے؟ میں وجہ نہیں پوچھتا۔ صرف ہاں یا ناں پوچھ رہا ہوں کیونکہ میں۔۔۔"

وہ سیدھا کھڑا ہوا اور تھکان سے پیشانی مسلی۔

"میں دو دن سے اس کشمکش میں ہوں کہ میری ماں اس وقت صرف کور اپ کر رہی ہے' یا وہ واقعی بے قصور ہے۔ اور میرا دل دونوں باتوں کو نہیں مانتا۔

مگر ایک بات میں جانتا ہوں کہ۔۔۔ شاید اب میں ممی کو سمجھ سکتا ہوں۔ میں تمہیں بھی سمجھ سکتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے پہلی جان لی ہے میں نے' اور بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اگر یہ سچ ہوا خاور۔۔۔ اگر واقعی ممی نے یہ سب کیا ہے' تو میں۔۔۔ میں ان سے راستہ الگ کر لوں گا۔ ان کو چھوڑ دوں گا۔ ان سے محبت کرنا ترک نہیں کر سکتا لیکن۔ اور ہاں' میں یہ سمجھتا رہوں گا۔ قتل مجبوری میں ہوتے ہیں۔ شاید ان کی بھی کوئی مجبوری ہو۔"

پھر وہ تلخی سے ہنسا۔

"چند ماہ پہلے تک میں ایسا نہیں تھا۔ اب میں بدلتا جا رہا ہوں۔ میں بے حس ہوتا جا رہا ہوں۔ لیکن شاید یہ سعدی کی کوئی نئی گیم ہے۔ اگر ممی انوالوڈ ہوتیں تو ہم دونوں کو صاحبزادی بیگم کے ملازم کا بیان نہ بتاتیں۔ اس بات کو چھپاتیں۔ وہ بے قصور ہیں اسی لیے تو۔"

اس نے سر جھٹکا۔

"کیا تم مجھے سن رہے ہو؟" اس نے امید سے پکارا' یاس سے پکارا۔ مگر دوسری طرف وہی خاموشی تھی۔

"شاید تم سن نہیں سکتے۔ تمہاری سماعت متاثر ہوئی ہے۔ مگر اچھا لگا تم سے بات کر کے۔"

وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے' ایک آخری نظر اس پہ ڈالتا' مڑا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ خاور نے آنکھوں کا رخ پھیر کر دروازے کو دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

نہ وہ رنگ فصل بہار کا' نہ روش وہ ابر بہار کی
جس ادا سے یار تھے آشنا' وہ مزاج باد صبا گیا

کالونی کے بنگلوں کی بتیاں رات میں جلتی ہوئی بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ حبس اور گرمی کے بعد بارش نے سارے ماحول کو رونق بخش دی تھی۔ کچھ لوگوں کے گھروں میں بنتے ہوں گے پکوڑے اور چپس' مگر مور چال میں حنین پینٹ کی بو پھیلائے بیٹھی تھی۔ سارا گھر اس سے بے زار تھا' مگر چونکہ وہ اپنا ہیرو خود تھی تو

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

اس کا دماغ عرصے سے آسمان سے اترنا بھول گیا تھا۔
فارس اس ساری چخ چخ سے جو ندرت' حنہ اور حسینہ کے درمیان جاری تھی' تنگ آکر اوپر ٹیرس پہ آبیٹھا تھا۔ موسم خوشگوار تھا' اور ٹھنڈی ہوا بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ پیر لمبے کر کے میز پہ رکھے' آنکھیں بند کیے' ٹیک لگا کر بیٹھا' خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کر تا رہا۔

"ٹھک۔ ٹھک" آواز پہ چونک کر آنکھیں کھولیں۔ زمر اس کے سر پہ کھڑی تھی۔ سبز رنگ کے لباس میں' گھنگریالے بال آدھے باندھے' وہ کھلی کھلی سی لگ رہی تھی' ساتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا مگ بھی بڑھا رکھا تھا۔
وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "تھینک یو۔" اور مگ لے لیا۔ وہ اس کے ساتھ کرسی پہ آبیٹھی یوں کہ اس کی طرف گھومی ہوئی تھی۔
"کیا سوچ رہے ہو؟"
"ہوں؟ کچھ نہیں۔" فارس نے سر جھٹکا اور مگ ہونٹوں سے لگایا۔
"اور میں جانتی ہوں کہ تم کچھ سوچ بھی نہیں رہے۔"
وہ چونکا۔ "کیوں؟"
زمر کی اس پہ جمی بھوری آنکھوں میں فکر مندی دکھائی دیتی تھی۔ "تم خود کو مت پریشان کرو۔ مت تھکاؤ۔ گلٹی فیل مت کرو۔ آبدار کے ساتھ جو ہوا' اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔" وہ نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ فارس ہلکا سا مسکرایا۔
"پھر کس کا قصور ہے؟"

"ہاشم کا' اس کے باپ کا۔ وہ لوگ ذمہ دار ہیں۔ تم نہیں۔"
"مگر میں نے اس کو استعمال کیا تھا زمر! یہ سوچے بغیر کہ وہ مشکل میں پڑ سکتی ہے۔"
"تم نے سری لنکا تک اس کو استعمال کیا تھا' وہاں تو وہ مشکل میں نہیں پڑی نا؟ جس مشکل میں تمہارا ہاتھ نہیں' تمہاری نیت نہیں' اس کے لیے دل بھاری مت کرو۔"
"اچھا' کوشش کروں گا۔" وہ زخمی سا مسکرا کے گھونٹ بھرنے لگا۔
"اور یہ سب مت سوچو جو سوچ رہے ہو اور میں جانتی ہوں کہ کیا سوچ رہے ہو۔ تم ضبط کیے بیٹھے ہو اور چاہتے ہو ایک ہی وقت میں جا کر ان سب کو مار ڈالو۔ آبدار اور میرے ساتھ جو ہوا اس رات' اس کے ذمہ داروں کو سزا دینے کا مت سوچو فارس۔"
وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ چائے پیتے سنے گیا۔
"میں جانتی ہوں' تم فرسٹریٹڈ ہو۔ بہت چپ رہنے لگے ہو۔ تمہیں یہ ساری بھڑاس ان لوگوں پہ نکالنی ہے' مگر میں چاہتی ہوں تم درگزر کر دو۔ معاف کرو۔ نہیں تو صبر کر لو۔ ہمارا کیس عدالت میں ہے۔ ہمیں وہ جیتنے دو اور پھر میں تو ٹھیک ہوں بالکل۔"
"تم ٹھیک ہو نا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔
"ہوں۔" اس نے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا۔
"اس وقت نہیں تھی۔ شاک میں تھی۔ شل تھی' مگر اب ٹھیک ہوں۔ وعدہ کرو تم کچھ نہیں کرو گے ان کے خلاف؟"
"اوکے۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔" اس نے آخری گھونٹ پیا اور کپ اسے تھما دیا۔ زمر نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
"اتنی شریفانہ شکل بنا کر جب حکم مانتے ہو تو مجھے پتا نہیں کیوں یقین نہیں آتا۔"
"تمہاری سوچ ہی خراب ہے۔"
"اور تمہاری نیت۔"

"اُف۔" وہ کراہا۔ "اچھا بھلا میں تیسری شادی کرنے کے قابل ہو رہا تھا' اب پچھتا رہا ہوں کہ کیوں بچانے گیا تمہیں۔"
"تمہیں سچ میں تیسری شادی کا اتنا شوق ہے یا صرف میرے سامنے بنتے ہو؟"
"تم کہتی ہو تو تجربہ کر کے دکھادوں تمہیں؟"

"ہونہہ!" وہ ناک سکوڑ کر سیدھی ہوئی اور ٹیک لگا کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔ نیچے سے حنین اور ندرت کی بحث کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"میں سوچ رہا ہوں ہم نیا گھر لے لیں۔"

"چیونٹی کا گھر چھوڑ دو گے تم؟" زمر کو یقین نہیں آیا۔

"بی بی! یہ چیونٹی کا گھر نہیں ہے۔ یہ پورا جڑیا گھر ہے۔" وہ جیسے تڑپ کر بولا تھا۔ وہ ایک دم ہنسنے لگی۔

"میں سنجیدہ ہوں۔ چلو اب ہم اپنا گھر لیتے ہیں۔ جہاں ہم سکون سے رہ سکیں۔ جہاں ہر وقت یہ سرحدی جھڑپیں نہ ہوتی رہیں اور ہر دوسرے دن کنذو گوشت نہ بنا کرے۔"

"تم اتنا تنگ ہو میرے گھر والوں سے؟" وہ خفا ہوئی۔

"میں اس سے بھی زیادہ تنگ ہوں۔" وہ سخت اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ "مجھے تو یہاں کوئی اپنا سمجھتا ہی نہیں ہے۔"

"میں تو سمجھتی ہوں نا۔"

"اچھا واقعی؟"

"میں تمہیں سمجھنے بھی لگی ہوں۔"

"سنو، ذرا پھر سے کہنا۔"

"تمہیں واقعی نہیں معلوم تھا کہ قانون شہادت میں ایسا آرٹیکل بھی ہے جس کے تحت میاں بیوی کو ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے پہ مجبور نہیں کیا جا سکتا؟"

"بیڑا غرق ہو قانون شہادت کا۔ یہ ہماری ہر بات میں کیوں آجاتا ہے۔"

اور وہ ہنستی چلی گئی۔ "میں اس کا جواب تمہیں نہیں دوں گی مگر میں صحیح تھی۔ تمہیں واقعی اس آرٹیکل کا علم نہیں تھا۔ کاش تم نے کلاس میں مجھے دیکھنے کے سوا بھی کچھ کیا ہوتا۔"

"کیوں نہیں کیا تھا؟ دو لڑکیاں بہت پسند تھیں مجھے۔ ایک کا نام رباب تھا اس کے گھر کا پتا تک یاد ہے مجھے۔ اور دوسری۔"

اور جواب میں وہ خفگی سے کچھ کہنے لگی تھی۔ مگر وہ اثر لیے بغیر ٹیک لگا کر بیٹھا، پاؤں میز پہ رکھے، بولے جا رہا تھا۔ اس پانی کی ساری تلخی اور تکلیف ڈھل گئی تھی اور وہ پہلے جیسا ہو کر پہلے جیسی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ زمر کے خیال میں۔

☼ ☼ ☼

کمرہ عدالت میں کٹہرے میں جواہرات کھڑی تھی اور زمر اس سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا یہ درست نہیں ہے کہ 21 مئی کو نوشیرواں پاکستان میں ہی تھا، مگر اس کو دیکھنے والے تمام ملازم آپ نے چند دنوں میں فارغ کر دیے تھے؟"

"ملازم دوسری وجوہات پہ فارغ کیے تھے، سب کے ٹرمینیشن لیٹرز کی کاپیز میں آج ہی جمع کروائے دیتی ہوں۔" وہ مسکرا کے بولی تھی۔

"نوشیرواں دبئی میں تھا اور آپ کی اس شادی کے بعد ہی چلا گیا تھا جس کو کروانے کے لیے آپ نے میری منت کی تھی، زمر صاحبہ!"

"شادی کے بارے میں آپ سے زیادہ کون جان سکتا ہے مسز کاردار، آپ پہ تو ویسے بھی آج کل اپنے ہی شوہر کو قتل کروانے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔" وہ بھی تپانے والی مسکراہٹ سے بولی۔ ہاشم کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ دھاڑ سے وہ "آبجیکشن" بولتا اٹھا۔

"وڈڈران!" (واپس لیا۔) زمر نے سادگی سے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ جواہرات نے تلخ مسکراہٹ سے سر جھٹکا تھا۔

☼ ☼ ☼

لیبارٹری میں کھڑا ڈاکٹر توازش تکان سے اپنا بیگ سمیٹ رہا تھا۔ چیزیں الٹ پلٹ کرتے، اس نے اپنا موبائل اٹھا کر دیکھا۔ چند پیغام تھے۔ ان کو پڑھنے وہ کھڑا ہو گیا۔ تب ہی اچانک سے لیب کی بتی بند ہو گئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ادھر ادھر دیکھا، مگر اس

سے پہلے کہ وہ مڑتا' پیچھے سے کسی نے اس کو دھکا دیا تھا۔ موبائل پھسلا' اور خود وہ نیچے لڑھکا۔ پھر یکایک بوکھلا کر سر اٹھایا۔ اس کے قریب دو جو گرز آر کے تھے۔ اس نے حیران نظریں اٹھائیں۔ اوپر جینز اور سرمئی شرٹ پہنے' آستینیں چڑھائے' چھوٹے کٹے بالوں والا فارس غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

"کون ہو تم؟ اندر کیسے آئے؟" مگر فارس جواب دینے کے بجائے جھکا' اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کا چہرہ اپنی سرخ آنکھوں کے قریب لے جا کر غرایا۔

"آبدار عبید کا پوسٹ مارٹم تم نے کیا تھا؟"

"کون آبدار؟" وہ ہکلایا مگر بات مکمل نہیں ہوئی۔ فارس نے اسے میز پہ یوں دھکیلا کہ بہت سا سامان' شیشے کی بوتلیں' فلاسک وغیرہ نیچے گرتی گئیں۔ ہر طرف ٹوٹتے کانچ کی آوازیں اور کرچیاں بکھر گئی تھیں۔ ڈاکٹر کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔

"یادداشت آ گئی ہے واپس تو اب بتاؤ۔" اسے گدی سے پکڑ کر اٹھایا اور کھڑا کیا۔ "کیا کیا لکھنا بھول گئے تھے اس کی رپورٹ میں؟"

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ چہرے پہ خوف و ہراس تھا' اور ماتھے سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

"اس کے جسم پہ تشدد کے نشان تھے۔ بازو' ہاتھ اور گردن پہ اور پھیپھڑوں سے ملنے والا مواد کسی جھیل یا... یا سمندر کا نہیں تھا' اگر ہوتا تو اس میں diatoms..."

"کس کے کہنے پہ بنائی تھی رپورٹ؟ بتاؤ!" وہ غرایا تو اس کی گرفت میں پھڑپھڑاتا مخنی سا ڈاکٹر کانپ اٹھا۔

"ڈاکٹر آفتاب واسطی' ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ!"

"آئندہ... تم کسی کی بھی رپورٹ بنانے کے قابل نہیں رہو گے۔" اور یہ کہہ کر اس نے اس کے دائیں

ہاتھ کو موڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ عجیب سی آواز آئی اور ڈاکٹر کی چیخیں نکل گئیں۔ فارس نے نفرت سے اسے پرے پھینکا' اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر مڑا اور بڑی میز کو دھکیلتے ہوئے' سامان سمیت اس کے اوپر گرا دیا۔ ایک کرسی کو ٹھوکر ماری اور پھر نفرت سے اسے دیکھتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

کمرہ عدالت میں سب دلچسپی اور توجہ سے کٹہرے میں کھڑی شیریں کو سن رہے تھے جو ڈھٹائی سے کہہ رہی تھی۔

"میرے علم میں نوشیرواں کے پاس ایسی کوئی گن نہیں ہے' اور نہ ہی میں نے اسے کبھی گلاک کا یہ ماڈل چلاتے دیکھا ہے۔"

"مگر کیا اس دن آپ میرے اور فارس کے پاس نہیں آئی تھیں یہ کہنے کہ ہم آپ کو کیا دیں گے اگر آپ اس گن کا لائسنس ڈھونڈ دیں ہمیں؟" زمر سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ صریح بہتان ہے۔ میں آپ کے گھر کبھی نہیں آئی۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

دفاع کی کرسیوں پہ موجود ہاشم کا موبائل بجا تو اس نے نکال کر دیکھا۔ بلاکڈ نمبر سے پیغام موصول ہوا تھا۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم سعدی یوسف کو دہشت گرد ثابت کروانے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو ہند سے لکھ کر ٹویٹ کر دو۔ میں سمجھ جاؤں گا۔"

ہاشم نے ٹویٹر کھولا اور "پرامید" کے پیچھے وہی ہند سے لکھ کر ٹویٹ کر دی۔ پھر مسکرا کے فون جیب میں رکھا' ذرا سا مڑا تو پیچھے گول چشمے والا آدمی اپنا موبائل دیکھ رہا تھا۔ ہاشم مسکرا کے سیدھا ہوا اور نوشیرواں کی طرف جھکا۔

"تم بے فکر رہو۔ سعدی یوسف کے دوسرے دشمن ہم سے زیادہ اس خاندان کی تباہی کے خواہش مند ہیں۔"

شیرو خاموش رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

مورچال گری بھری رات میں ڈوبا تھا' اور سرونٹ

کوارٹر میں بیٹھا صداقت افسوس سے سامنے بیٹھی حسینہ سے کہہ رہا تھا۔
"مجھے بڑا ارمان لگا کہ فارس بھائی اس دن ہم پہ شک کر رہے تھے۔ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"اصل میں میں نے جو بول دیا کہ تم لائے ہو تو وہ اس لیے شک کرنے لگے۔" وہ جلدی سے بولی۔ وہ چونکا۔
"تم نے بتایا نہیں کہ یہ تمہاری امی جی نے تمہیں تحفے میں دیا ہے۔"
"ایسے ہی بتاتی، نظر لگ جاتی ہے۔"
رات مزید گہری ہوئی تو وہ سرونٹ کوارٹر سے نکل کر سبج سبج چلتی چار دیواری کی پچھلی سمت جانے لگی۔ یہاں کونے میں ایک بڑا سا درخت تھا۔ وہ کسی بلی کی طرح اس پہ چڑھی اور پھر چڑھتی گئی، دیوار تک پہنچی، پھر وہاں سے دوسری طرف پھلانگ گئی۔ سامنے اندھیرے میں وہ شخص کھڑا تھا اور اس نے سرخ سا مفلر چہرے پہ لپیٹ رکھا تھا۔
"اب اور کیا کرنا ہے مجھے؟ بہت مشکل سے آئی ہوں۔ اگر میرے مالکوں کو معلوم ہو گیا نا تو میری جان لے لیں گے۔"
"بس ایک آخری کام!" وہ آہستہ سے بولا تھا اور پھر دھیمی آواز میں اس کو کچھ سمجھانے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمپیوٹر اسکرین روشن تھی۔ سعدی اور حنین اس کے سامنے پورے انہماک سے بیٹھے تھے۔ حنہ ساتھ ساتھ ٹائپ بھی کیے جا رہی تھی۔
"مزے کی بات یہ ہے کہ پی ایم ڈی سی نے سارے پاکستان کے ڈاکٹرز کا ڈیٹا اپنی ویب سائٹ پہ ڈال رکھا ہے۔ معمولی سی ہیکنگ اور یہ دیکھیں۔" حنہ مزے سے کہہ رہی تھی۔ "میرا فیشل ریکگنیشن سافٹ ویئر اپنا کام چند منٹ میں کرلے گا، اور اگر ڈاکٹر مایا کی شکل کی کوئی لڑکی یہاں ہوئی تو وہ نکل آئے گی۔"
"ویری گڈ جاب ہیڈ گرل!" اس نے حنہ کا شانہ تھپکا تھا۔ وہ مسکرا کر اور سعدی فکر مندی سے اسکرین کو دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

سرخ نشان ابھرا تو حنین اور سعدی، دونوں کے منہ کھل گئے۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ مایوسی سی سارے میں پھیل گئی تھی۔
"یعنی مایا پاکستان میں رجسٹرڈ ہی نہیں ہے۔ اسے کسی اور ملک سے بلوایا گیا تھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔
"یعنی اب ہمارے پاس اور کوئی گواہ نہیں ہے۔ اب بند کر دوان کی ویب سائٹ۔"
"ارے واہ۔ ایسے ہی بند کر دوں؟ تھوڑی سی ایڈیٹنگ تو کرنے دیں۔" اس کی آنکھیں چمکیں اور اس نے کی بورڈ سنبھال لیا۔ سعدی حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کاؤنسل کا "اباؤٹ" سیکشن ایڈیٹ کر رہی تھی۔
"ہم سے ملیے۔ ہم ہیں پاکستان مینٹل اینڈ ڈپریسڈ کیونٹی۔ ہم نے صرف پرائیویٹ میڈیکل کالجز کو کھلی چھٹی دے کر بچوں کا بیڑا غرق نہیں کیا بلکہ ہم نے انٹری ٹیسٹ کے نام پہ دنیا کا سب سے منافع بخش کاروبار بھی شروع کر رکھا ہے۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ انٹری ٹیسٹ کیا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کو ہم اس لیے ختم نہیں کر رہے کیونکہ ہمارے بہت سے دوست اور رشتہ دار انٹری ٹیسٹ ریپ کی اکیڈمیاں چلا کر ہر سیزن میں اربوں روپے بنا لیتے ہیں۔ ورنہ اس کا صرف ایک مقصد ہے۔ اٹھارہ انیس سال کے بچوں کے ذہن کو مفلوج کرنا۔ ان کو خوفزدہ کرنا۔ میٹرک سے ان کے ذہن پہ سوار کر دینا کہ انہوں نے تعلیم حاصل نہیں کرنی بلکہ ایک ہزار سے اوپر نمبر لینے ہیں۔ اور وہ بچے اپنے سینئرز کو ان کے ناموں سے نہیں "998 نمبر والا" اور "1021" نمبر

والی جیسے القابات سے یاد کرتے ہیں۔ اور چونکہ ہمارے پاس سیٹیں تھوڑی ہوتی ہیں اور ہم ہزاروں بچوں کو کامیاب نہیں کرپاتے تو ہمیں فخر ہے کہ جس کا میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہو' اس کو معاشرہ "نالائق" سمجھتا ہے۔ وہ بچہ کسی بھی فیلڈ میں چلا جائے' وہ اس احساس کمتری اور ڈپریشن میں رہتا ہے کہ اس کا میڈیکل میں داخلہ نہیں ہوا اور ان ہزاروں ناکام بچوں کو' ہماری کوشش ہے کہ کبھی یہ نہ پتا چلنے دیا جائے کہ انٹری ٹیسٹ پاس یا فیل کرنا اہم نہیں ہے۔ اس کی تیاری کرنا اور اس کو دے ڈالنا' یہی سب سے بڑی جدوجہد ہے۔ جسے اگر آپ نے کرلیا ہے' تو بھلے آپ کا میڈیکل میں ایڈمشن نہ ہو' آپ دنیا کی ہر اچھی فیلڈ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتے ہیں اگر آپ خود پہ اعتماد رکھیں۔ آپ نالائق نہیں تھے۔ یہ آپ کی حکومت کا ناانصافی پہ مبنی نظام تھا۔"

"بس کرو حنہ۔ سائبر کرائم میں پکڑی جاؤگی۔" وہ اس کو باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اوہیں!"

☼ ☼ ☼

"پلیز گولی مت چلانا۔ میری بات سنو' میں تمہیں سب سچ سچ بتادوں گا۔" وہ نیم تاریک کمرہ تھا جس کی چھت سے ایک بلب جھول رہا تھا۔ فرش پر ایک میز رکھی تھی جس کے سامنے کرسی پہ بندھا ہوا ڈاکٹر آفتاب پسینہ پسینہ ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے ہتھکڑی سے بندھے اور گریبان کے دو بٹن کھلے تھے۔ کہنی سے شرٹ پھٹی ہوئی تھی اور جلد چھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پہ خوف تھا۔

آستینیں چڑھائے' کھڑے فارس نے پستول میز پہ رکھا اور اس کے سامنے جا ٹھہرا۔ تیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے' ایک جوتا اس کے گھٹنے پہ رکھا اور دبایا۔ گھٹنے پہ شاید کوئی زخم تھا' جس سے خون رسنے لگا اور وہ کراہنے لگا۔

"رکو' پلیز میری بات سنو۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"میرے بھائی کی رپورٹ تم نے بنائی تھی نا۔ وہ اینٹی ڈپریسنٹ کھاتا تھا' یہ بھی لکھا تھا تم نے۔ اس کے جسم پہ تشدد کے نشان نہیں تھے' میرے جری بھائی نے خودکشی کی تھی' یہ سب لکھا تھا ناتم نے۔ آب دار کی رپورٹ بھی تم نے بنوائی ہے نا۔"

"میں نے ہاشم کے کہنے پہ..." وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ایک ہی سانس میں سب کہتا گیا۔

"اور کس بات سے جواہرات نے تمہیں مجبور کیا کہ تم اس کے شوہر کی رپورٹ بدلنے پہ مجبور ہوگئے؟" ڈاکٹر آفتاب چپ ہوگیا تو اس نے پستول اٹھایا اور اس کے دوسرے گھٹنے کی طرف تان لیا۔ اس کا چہرہ اتنا سرد تھا اور اتنی تپش لیے ہوئے تھا کہ ڈاکٹر کا سانس اٹکنے لگا۔

"میں بتاتا ہوں۔ طوبیٰ... میری بیوی کی بیٹی تھی۔ میری بیوی اور اس کا بیٹا... طوبیٰ کا بھائی... نہیں جانتے کہ طوبیٰ نے میری وجہ سے خودکشی کی تھی' میں نے..." وہ جلدی جلدی بتاتا گیا۔ اس عمر میں وہ ہڈیوں میں لگنے والی گولی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ چپ ہوا تو فارس نے جوتا اٹھالیا۔

"میں چاہتا تھا کہ تمہارے بازو کی اس نس میں چھرا گھونپ دوں جو تمہاری انگلیوں کو سن کردے گی اور تم کبھی دوبارہ سرجری نہیں کرسکو گے' مگر نہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے گریبان پہ لگا پین اتارا' اس کی کیپ کو دبایا اور اسے دکھایا۔ "میں نے تمہاری طوبیٰ والی کہانی ریکارڈ کرلی ہے اور میں اسے تمہاری بیوی اور اس کے بیٹے کو دے دوں گا۔ وہ دونوں خود فیصلہ کریں گے کہ انہیں تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔"

"نہیں..." اس کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ "ایسا مت کرو۔"

"یہ رہی تمہاری ہتھکڑی کی چابی۔" اس نے چابی اس کی طرف بڑھائی اور جب اس نے امید سے دیکھا تو فارس نے چابی اس کے قدموں میں گرادی۔

"جب تک تم اپنی ہتھکڑی کھول کر آزاد ہو گے' وہ یہ ویڈیو دیکھ چکے ہوں گے۔" اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر بولا۔ "الوداع۔" بازو بڑھا کر لیمپ کھینچا۔ بلب بجھ گیا۔ اب اس کے دور جاتے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"گواہوں کے بیانات اور شواہد سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے یور آنر کہ...." زمر چبوترے کے سامنے کھڑی' دونوں ہاتھوں میں قلم کو گھماتی بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ "کہ ملزم نوشیرواں کاردار نے میرے مؤکل سے ذاتی عناد کے باعث پہلے اس کا پیچھا کیا' پھر اس کو تنہا پا کر اسے گولیاں ماریں۔ پھر بھی اس کی جان نہیں گئی تو اسے ہسپتال سے اغوا کرا لیا اور ملک سے باہر بھیج دیا۔ ملزم کے اثر و رسوخ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا قطعاً مشکل نہیں ہے کہ یہ سب اس کے لیے بہت آسان تھا۔ میرے مؤکل کو قید میں نو ماہ شدید اذیتیں دی گئیں اور اب تک ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ نہ صرف ملزم کو مجرم قرار دیا جانا چاہیے بلکہ اس کو سزائے موت بھی سنائی جائے۔" اور ذرا ٹھہر کر وہ سرد آواز میں بولی۔

"Prosecution pleads for death penalty"۔

(استغاثہ سزائے موت کی درخواست کرتا ہے۔)

اسکول کے آڈیٹوریم میں عجیب ہنگامہ سا مچا تھا۔ جہاں چند منٹ پہلے بچے اسٹیج پہ پرفارم کر رہے تھے' وہاں اب وہ سہم کر ایک طرف کھڑے تھے اور ان ہی میں چپ چاپ سر جھکائے کھڑی سونی بھی تھی۔ پروجیکٹر اسکرین پہ ایک ویڈیو چل رہی تھی' جس میں شہرین کارڈز کھیلتی اور پیسے ہارتی نظر آ رہی تھی۔ ڈی جے پاگلوں کی طرح کیز دبا رہا تھا' کسی طرح اس ویڈیو کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اسٹاپ نہیں ہو رہی تھی۔ انتظامیہ ندامت سے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور حاضرین میں کھڑی شہرین کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ رہا تھا۔ والدین مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہے تھے' چہ میگوئیاں کر رہے تھے اور ساتھ کھڑی جواہرات تیکھی سے بڑبڑا رہی تھی۔

"آج کے بعد تم سونی کے دو فٹ قریب بھی نہیں آؤ گی۔ ایک لفظ مت بولنا۔ تم قابل حقارت عورت ہو۔ اس قابل نہیں ہو کہ اس بچی کی پرورش کر سکو۔ ابھی اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ سونی کو گھر میں لے جاؤں گی۔" اور شہری نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا پرس اٹھایا تھا۔

"میں اس کی گارجین اینجل ہوں' پتا ہے آپ کو مادام شہرین!" شہری خفت سے چہرہ جھکائے' پرس ماتھے پہ رکھے تیز تیز چلتی باہر جا رہی تھی جب آڈیٹوریم کے باہر کسی نے اسے پکارا۔ وہ ٹھٹک کر مڑی۔ حنین کو دیکھا تو بے اختیار پرس والا ہاتھ نیچے گر گیا۔ آنکھوں میں اچنبھا اور پھر بے یقینی در آئی۔

"تم نے کیا ہے یہ؟"

"میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ ہر بری گھڑی میں میں فارس غازی کے ساتھ کیوں ہوتی ہوں؟"

وہ سینے پہ بازو لپیٹے' اپنا ٹیبلیٹ ایک ہاتھ میں پکڑے سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"جب وارث ماموں کو مارا گیا تب میں ان کے ساتھ تھی۔ جب زرتاشہ کو گولی لگی' تو وہ میرے ساتھ ہوٹل میں تھے۔ جس قمرالدین کے قتل کے الزام لگا ان پہ' اس کے قتل کے وقت اس صبح بھی وہ میرے ساتھ تھے۔ پھر اس رات جب تم نے اور تمہارے سائیکو شوہر نے زمر کو مارنا چاہا' تب بھی میں فارس غازی کے ساتھ تھی۔ پتا ہے کیوں؟" وہ دو قدم قریب آئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "کیونکہ میں فارس غازی کی گارجین اینجل ہوں اور میرا کام ہے ان کے راستے کے چھوٹے موٹے جھاڑ جھنکار کو صاف کرنا۔" کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

شہری مارے غصے کے پیر پٹخ کر رہ گئی مگر اس کے پیچھے نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہیں سے سارے والدین نکل کر آ رہے تھے۔

"یور آنر' مسز زمر کے افسانوں کے برعکس...." ہاشم اب چبوترے کے سامنے دائیں سے بائیں چلتا'

ہاتھ ہلا ہلا کر متانت سے کہہ رہا تھا۔ "اس کیس میں فی الحال اب تک صرف یہی بات ثابت ہو پائی ہے کہ سعدی یوسف کو کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔ وہ واقعی زخمی ہوا تھا اور یہ اس کے ساتھ زیادتی تھی۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اس کے مجرم نیاز بیگ کو' جو جرم قبول کر چکا ہے واقعی سزا ملنی چاہیے۔ مگر انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس گولڈ ڈگر لڑکے نے اپنی زخمی حالت کا ناجائز فائدہ اٹھایا' اور شوال میں مقیم اپنے دہشت گرد سہولت کاروں ۔۔۔ کی مدد سے خود زیر زمین چلا گیا۔ ہر گواہ چیخ چیخ کر بتا چکا ہے کہ سعدی یوسف کی سرگرمیاں مشکوک تھیں اور وہ شرپسند عناصر کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ اب چونکہ وہ واپس آچکا ہے تو اپنے اتنے مہینوں کی گمشدگی کو کور اپ کرنے کے لیے اس نے ایک امیر خاندان کو نشانہ بنایا۔ تاکہ کیس کے دوران وہ خاندان سیٹل منٹ کے نام پہ اس کو بھاری رقم ادا کر دے اور تیسرے فریق کے ذریعے بارہا اس نے کیس سیٹل کرنے اور پیسے لینے کا عندیہ بھی ظاہر کیا' مگر ہم نے ٹھان لی تھی کہ پیسے نہیں دیں گے' بلکہ انصاف لیں گے اور۔۔۔" اس کی آواز عدالت میں گونج رہی تھی اور سب خاموشی سے سن رہے تھے۔

قصر کاردار کی عقبی بالکونی میں ہاشم کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ سامنے' دور پہاڑوں پہ سورج غروب ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' شرٹ کی آستینیں موڑے' مغموم سے انداز میں اس نارنجی تھال کو دیکھ رہا تھا جو بس کسی پل لگتا تھا کہ زمین پہ الٹ جائے گا' مگر بادل اس کو سنبھالے ہوئے تھے۔ سہارا دیے ہوئے تھے۔

"تم نے شہری کو بے دخل کر کے اچھا کیا۔ اس کی وجہ سے سونی کی بہت انسلٹ ہوئی۔ سونیا تب سے ڈپریشن میں ہے۔" ساتھ بیٹھی جواہرات کہہ رہی تھی۔

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ نظریں ڈوبتے سورج پہ جمی تھیں۔ "سونی کو اس کی ماں کے غلط کاموں کی وجہ سے پریشان نہیں کرنا چاہتا میں۔ اسے ایسی ماں کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہیے جو اولاد کی پروا کیے بغیر اتنے غلط کام کرتی رہی ہو۔"

جواہرات کا دل زور سے دھڑکا مگر بظاہر مسکرائے گئی۔ "صحیح کہا۔ ہر ماں تمہاری ماں جیسی نہیں ہوتی جو اولاد کے لیے ہر شے قربان کر دے۔"

ہاشم نے نظریں پھیر کر اجنبی سے انداز میں اسے دیکھا۔ "ہمارے لیے کیا آپ کو کچھ بہت مشکل کام بھی کرنے پڑے تھے؟"

اور وہ جان گئی کہ وہ جان گیا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بہت مشکل کام ہاشم! بہت ہولناک کام۔"

ہاشم اسے دیکھتا رہا۔ گردن میں ابھر کر ڈوبتی گلٹی صاف دکھائی دی۔ "اور ایسے کام کرتے وقت کیا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا آپ کے پاس تب شاید۔ آپ وہ نہ کرتیں؟"

"دوسرے راستوں میں میرے بیٹوں کی تباہی تھی۔ میں نے بیٹوں کو چنا۔" اس کی آنکھ سے آنسو ٹپ سے گرا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پہ نظریں جمائے ہوئے تھے۔ سانس بندھے تھے۔ ایک دوسرے کو کھوجنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اور کیا آپ نے سوچا کہ آپ کے کسی ایسے قدم سے ۔۔۔ ہولناک قدم سے ۔۔۔ آپ کے بیٹوں کو کتنی تکلیف ہو سکتی ہے؟"

"تکلیف کا علم تھا' مگر تباہی سے بچانے کے لیے ذرا سی تکلیف دینا بہتر تھا۔"

"ذرا سی ۔۔۔ تکلیف؟" اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ وہ بس دکھی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کی اولاد کا دل اس ذرا سی تکلیف سے باہر اب تک نہ نکلا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے بیٹے کے ہر تلخ فیصلے کے پیچھے آج بھی اسی تکلیف کا ڈراما بسا ہو۔ پتا نہیں اگر یہ "تکلیف" ایسی ہے تو "تباہی" کیسی ہو گی؟" پھر سر جھٹکا اور سامنے نظر آتے سورج کو دیکھنے لگا۔

"ٹرائل کا فیصلہ آجائے' پھر میں اور سونیا یہاں سے شفٹ کر جائیں گے۔ میں نے آفس کے قریب ایک

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

گھر لیا ہے۔ جب تک ہمارا اپنا گھر تعمیر نہیں ہوتا، ہم وہیں رہیں گے۔"

جواہرات کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"میں۔۔۔ تمہارا گھر دیکھنے آسکتی ہوں؟"

"نہیں۔" وہ کہہ کر اٹھ گیا اور اندر چلا گیا۔ وہ دل مسوس کر بیٹھی رہ گئی۔

اندر ہاشم کی اسٹڈی ٹیبل پہ دو کاغذات پڑے تھے۔ ایک اورنگزیب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ جس میں موت کا وقت لکھا تھا۔ ایک اندازہ کہ اتنے سے اتنے بجے کے درمیان موت واقع ہوئی ہے اور دوسرا۔۔۔ اس نے وہ کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک ای میل تھی۔ جب اس رات جواہرات کمرے سے باہر آئی تھی، تو اس نے ہاشم سے کہا تھا کہ اس کا جی میل کام نہیں کر رہا، تب ہاشم نے جواہرات کے فون سے اپنے فون پہ "یہ ہاشم ہے 'ام کے فون سے'" لکھ کر ای میل بھیجی تھی۔ اس کے کوئی آدھے گھنٹے بعد انہوں نے اورنگزیب کو مردہ پایا تھا۔ اس ای میل کا وقت پوسٹ مارٹم میں لکھے موت کے وقت سے اوپر تھا۔ (جواہرات اورنگزیب کو قتل کر کے، خود کو سنبھال کر، کمپوزڈ کر کے میک اپ کر کے باہر نکلی تھی۔ اس سب میں وقت لگا تھا۔) اس ٹائم سٹیمپ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اورنگزیب کی موت اس وقت ہوئی، جب وہ کمرے میں تھی۔ ہاشم نے کرب سے آنکھیں موند لیں اور اس کاغذ کو مٹھی میں مروڑ دیا۔

فرش پہ ایک لکڑی کے پھٹے کے اوپر شاہ فرمان چت لیٹا تھا۔ اس کا جسم ڈکٹ ٹیپ سے بندھا نظر آرہا تھا۔ سامنے ڈرل چارجنگ پہ لگی تھی اور وہ بار بار ضبط کرتا فارس کو دیکھ رہا تھا جو اب کرسی ڈالے اس کے قریب بیٹھا تھا۔

"تم دن میں ہوٹل سیکیورٹی دیکھتے ہو اور رات میں فری لانس کنٹریکٹر کے طور پہ کام کرتے ہو۔ بڑے بڑے لوگوں کے برے برے کام کر کے دیتے ہو۔ میری بیوی کو لفٹ میں ڈبونے کے کتنے پیسے دیے تھے کاردار زنے؟"

"پیسے کام کے بعد میں ملنے تھے۔"

"جیسے مجھے تو علم ہی نہیں کہ سارے کنٹریکٹرز آدھے پیسے پہلے لیتے ہیں۔"

"تم وہ پیسے لے لو۔ مجھے جانے دو۔"

وہ کرسی سے اٹھا اور بوٹ سے اس کے منہ پہ ٹھوکر ماری۔ "مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہئیں۔" ٹھوکر اس کے دانت پہ لگی تھی۔ بھل بھل خون بہنے لگا۔

"میرا دل چاہتا ہے 'اس رات کی اذیت کے بدلے۔۔۔ میں تمہارے جسم میں اس ڈرل سے اتنے سوراخ کروں کہ۔۔۔" مارے ضبط کے اس نے زور سے آنکھیں میچیں۔ پھر گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"مجھے بتاؤ میں کیوں نہ کروں تمہارے ساتھ یہ سلوک؟"

"تم۔۔۔ تم میرے کلائنٹس کی لسٹ لے سکتے ہو۔ میں نے ان کے جو بھی کام کیے ہیں، تم وہ دیکھ سکتے ہو۔" وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔

فارس واپس کرسی پہ بیٹھا اور ڈرل مشین اٹھالی۔ ہوا میں بلند کر کے ٹریگر دبایا۔ زوں کی آواز سے وہ چلنے لگی۔ اس نے الٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لیا۔ پھر اسے بند کر کے دیکھا۔ "اور تم نے رسیدیں سنبھال کر رکھی ہیں تاکہ بوقت ضرورت اپنے کلائنٹس کو بلیک میل کر سکو؟ واہ۔" وہ تلخی سے ہنسا تھا۔

"ہر کوئی ڈاکومنٹس سنبھال کر رکھتا ہے کہ اگر کبھی

پکڑے جائیں تو سیاستدان بچانے آجاتے ہیں۔"

"مجھے تمہارے سیاست دانوں میں دلچسپی نہیں ہے۔ ہاشم کا ردار کے بارے میں بتاؤ۔" اس نے ڈرل مشین سامنے رکھ دی۔ شاہ فرمان کی نظریں ڈرل پہ جمی تھیں۔

"اس کی ماں کا۔۔۔ ایک کام کیا تھا میں نے۔" وہ تیزی سے بول اٹھا۔ فارس رک گیا۔ پھر سیدھا ہوا۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ "اچھا۔۔۔ کیسا کام؟ کسی کا قتل؟ اغوا؟"

"نہیں۔۔۔ چھوٹا سا کام تھا۔ ڈاکومنٹس فارجری (جعلی دستاویزات بنانا)۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی۔

اس رات فوڈلی ایور آفٹر کا اوپری ہال تاریک تھا اور اس میں صرف ٹیبل لیمپ کی روشنی جلتی دکھائی دے رہی تھی۔ فارس میز پہ چند کاغذ پھیلائے پُرسوچ الجھی ہوئی نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ بار بار کوئی تعلق بنانے کی کوشش کرتا۔ بار بار وہ ٹوٹ جاتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ اب کرسی پہ بیٹھا تھا اور سر ہاتھوں میں گرائے سوچ رہا تھا۔

گھڑی۔۔۔ رات کے تین بجا رہی تھی۔ وہ کاغذات دیوار پہ چسپاں کیے' ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ہاتھ میں قلم تھا اور مختلف نقطوں پہ نشان لگاتا پھر نفی میں سر ہلاتا۔

باہر صبح طلوع ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان ہی کی شہ سے انہیں مات کرتا رہتا ہوں
ستم گروں کی مدارات کرتا رہتا ہوں

مور چال میں آج ٹی وی کا شور نہیں تھا۔ حنین اور ندرت کا اس بات پہ اتفاق ہو گیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے ٹی وی کو پیک کر کے رکھ دیا جائے اور اس فیصلے سے اسامہ سخت ناخوش تھا۔ یہ فیصلہ اس کی پڑھائی کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ اس کا ذہب بھی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔

مگر جب سے ٹی وی خاموش ہوا تھا' ان سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں کوئی انوکھا سا سکون در آیا تھا۔ سب کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ ذہن توانا تھے۔ آنکھیں تکان زدہ نہیں تھیں۔ سب لاؤنج میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور صد شکر کہ موبائلز پہ نہیں لگے تھے۔

"اس شیطان کے ڈبے کو واقعی کچھ عرصے کے لیے پیک کر دینا چاہیے۔" ابا بڑے ہی خوش تھے' بار بار اظہار کرتے۔ "عجیب ڈپریشن پھیلا کر رکھتا ہے گھر میں۔ اور اب دیکھو' وقت میں برکت سی محسوس ہونے لگی ہے۔"

"بالکل۔" اسامہ بڑے دل سے بڑبڑایا تھا۔ ابا نے نہیں سنا۔ وہ کچھ اور سوچنے لگے تھے' پھر زمر کو دیکھا۔

"فارس کہاں ہے؟"

"پتا نہیں۔ میں نے تو کل سے اسے نہیں دیکھا۔ فون کیا تھا کہہ رہا تھا کچھ کام کر رہا ہے۔" اس نے رسان سے بتایا۔

"زمر۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے؟" ندرت نے اس کے پاس بیٹھتے پوچھ لیا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"لگ تو ٹھیک رہا تھا۔" اندر سے کچھ اس کو بھی کھٹک رہا تھا۔

"مگر مجھے وہ ایسا لگا جیسا جیل سے آنے کے بعد لگتا تھا اور سعدی کی گمشدگی کے دنوں میں۔ اسی طرح خاموش' عجیب سا۔" وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔

"کچھ معاملات ہمیں اتنے پریشان کرتے رہتے ہیں بھابھی کہ کوئی دوسرا کام ہو ہی نہیں پاتا۔ یا تو انسان ان کی وجہ سے گھل گھل کر ختم ہو جائے یا پھر اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یہ پریشانی میں نے آپ کے حوالے کر دی۔ جب تک میں آپ کے دوسرے بندوں کی مدد کر لوں اور لوگوں کے لیے کچھ اچھے کام کر لوں' تب تک آپ اس مسئلے کو خود سلجھا دیجیے گا۔" وہ اندرونی خلفشار پہ قابو پا کر متانت سے بولی تھی۔ سب خاموش ہو گئے۔ گھر میں ایسے ہی بہت خاموشی

محسوس ہونے لگی تھی۔

چند میل دور.... آفس بلڈنگ کے بالائی فلور پہ ہاشم اپنے آفس میں بیٹھا' کام میں مصروف تھا۔ جب انٹرکام بجا۔ اس نے کان سے لگایا۔ چہرے پہ چونکنے کے آثار نظر آئے۔

"فارس آیا ہے؟" ذرا ٹھہرا۔ "ٹھیک ہے' اندر بھیجو۔" عینک اتار کر رکھی اور ٹیک لگالی۔ ٹائی ڈھیلی کیے' آستینیں موڑے' آنکھوں میں سپاٹ پن لیے' وہ منتظر سا بیٹھا نظر آرہا تھا۔

دروازہ کھلا اور چوکھٹ میں فارس نظر آیا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' وہ سرسری نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہاشم کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"کیسے آنا ہوا' کزن؟"

فارس قدم بہ قدم چلتا' گردن موڑ موڑ کر دیکھتا آگے آیا اور میز کے قریب آٹھہرا۔ پھر ہاشم کو دیکھا۔ "بے فکر رہو' تمہاری سیکیورٹی مجھے چیک کرچکی ہے۔ کوئی خفیہ کیمرہ' وائر یا ہتھیار نہیں ہے میرے پاس۔" ذرا رکا اور مسکرایا۔ "میں آج تمہیں اپنی زبان سے مارنے آیا ہوں۔" ہاشم کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھو نا۔" مگر فارس گردن موڑ کر ایکوریم کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا اسی میں مارا تھا تم نے آبدار کو؟" سرد سی ہوا کا تھپیڑا سا کمرے میں آکر ساکن ہوگیا تھا۔ ہاشم نے بھی رخ موڑ کر آب زیدان کو دیکھا۔

"اس دن اس کی ساری مچھلیاں بھی مرگئیں۔ میں نئی مچھلیاں لایا بھی نہیں۔ شاید اس کا کانچ تک زہریلا ہوچکا ہے۔"

فارس کرسی کھینچ کر بیٹھا' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور دونوں ہاتھ باہم پھنسالیے۔ پھر افسوس سے ہاشم کو دیکھا۔ "تمہیں ترس نہیں آیا اس پر؟"

ہاشم نے شانے اچکائے۔ "وہ خود چاہتی تھی کہ میں اسے ماردوں۔ میں نے صرف اس کی خواہش پوری کی۔ مگر اسے اس سب میں تم نے دھکیلا تھا۔ تم مجھ سے زیادہ قصوروار ہو۔"

"ویسے اس سے فرق نہیں پڑتا کیوں کہ میرے اور اس کے درمیان کچھ بھی نہیں تھا۔"

"بعد میں سب یہی کہتے ہیں۔"

"واٹ ایور!" فارس نے ناک سے مکھی اڑائی۔ چند لمحے کی خاموشی دونوں کے بیچ حائل ہوگئی۔

"خیر.... تم ابھی کیوں آئے ہو؟ حالانکہ ابھی تو تم لوگوں کو عدالتی فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ویسے بھی میں نے ابھی اپنا آخری پتا کھیلا نہیں ہے۔"

"تم پتے کھیل رہے تھے؟ میں تو شطرنج کھیل رہا تھا۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے' آج کل آگے پیچھے لوگوں کو ٹارچر کرتے پھر رہے ہو۔ کیوں اپنا غصہ ان غریبوں پہ نکال رہے ہو؟" وہ دونوں بنا سانس لیے بات پہ بات پھینک رہے تھے۔

"غصہ تو بہت تھا مجھے' اور چند دن نکالتا بھی رہا۔ مگر اب.... ٹھنڈا ہوگیا ہوں' ویسے بھی اصل انتقام ٹھنڈا کرکے کھانے کا نام ہے۔"

"ہوں! سو کیوں آئے ہو؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تمہیں کچھ خاص بات بتانے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولا۔ "میں جانتا ہوں' تمہارے باپ کو کس نے قتل کیا ہے۔"

ہاشم ایک دم زور سے ہنس دیا۔ "یہ تم اور سعدی میرے باپ کے قتل کے گرد سیاست کرنا کب چھوڑو گے؟"

"ہاشم! میں واقعی تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے باپ کا اصل قاتل کون ہے۔" وہ اب سنجیدہ ہوا۔

"تم نے دیر کردی۔ سعدی یہ کارڈ بہت پہلے کھیل چکا ہے اور اس کی وجہ سے میں نے خاور کو...."

"خاور نے نہیں مارا تمہارے باپ کو۔"

"یہ بھی جانتا ہوں اور تم نے مجھے مایوس کیا ہے۔ کیوں کہ میں جان گیا ہوں کہ میرے باپ کو میری ماں

نے مارا ہے۔ صاحبزادی صاحبہ نے بتا دیا تھا مجھے۔" تلخی سے اسے دیکھتے وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ "مگر تم لوگ زیادہ خوش نہ ہو۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے اور میں نے موو آن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ہاشم!" اس نے ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور آگے کو جھکا۔ ہمدردی سے اسے دیکھا۔ "تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو نہیں مارا۔"

کمرے میں ایک دم بھیانک سا سناٹا چھا گیا۔ ہاشم کا سانس تھما۔

"سعدی' صاحبزادی صاحبہ' احمر' سب غلط تھے۔ جواہرات نے تمہارے باپ کو نہیں مارا۔"

"اوہ پلیز!" اس نے اکتا کر ہاتھ اٹھایا۔ آنکھوں میں بے پناہ بے زاری تھی۔ "اب کس تیسرے فریق پہ الزام ڈالنے آئے ہو؟ میرے پاس تمہاری کہانیوں کے لیے وقت نہیں ہے۔"

"مجھے تم پہ ترس آرہا ہے مگر تم واقعی بے خبر ہو۔ میں تمہاری بے خبری دور کرنا چاہتا ہوں۔ آگہی عذاب ہے اور میں چاہتا ہوں تم یہ عذاب جھیلو۔"

"اچھا!" اس نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ "پھر بتاؤ' اس دفعہ کس نے مارا ہے میرے باپ کو۔"

فارس چند لمحے اس کی آنکھوں میں ترحم سے دیکھتا رہا پھر لب کھولے۔

"تم نے خود!"

ہاشم پل بھر کو الجھا' پھر ستائش سے ابرو اٹھائے۔

"واؤ۔ اس سے اچھا طریقہ نہیں ملا تمہیں کسی کو ڈسٹرب کرنے کا؟" پھر افسوس سے سر جھٹکا۔ "واقعی فارس! میرے جیسے آدمی کو تم اب آکر یہ کہو گے کہ محاورتاً "میری کسی حرکت کا دکھ لے کر میرا باپ مرا' یہ وہ۔۔۔ تاکہ میں ڈپریشن میں چلا جاؤں' اور خود کو اپنے باپ کی موت کا ذمہ دار سمجھوں؟ واٹ ربش!"

"تم نے اپنے باپ کا قتل کیا ہے۔ ہاشم!" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ آنکھیں ہاشم کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔ "تم ہو اپنے باپ کے اصل قاتل۔"

"اور اس ساری بے تکی کہانی کا مقصد کیا ہے؟ مطلب کس طرح مارا ہے میں نے اپنے باپ کو' ہاں؟" اسے اب غصہ آنے لگا تھا۔

"جیسے مارا جاتا ہے۔ قتل کر کے۔" فارس نے شانے اچکائے۔

"میں جانتا ہوں میرے باپ کو کس نے مارا ہے۔ میری اپنی ماں نے' اور اس سارے معاملے کو میں کھوج رہا ہوں مگر تمہاری اس ساری بکواس سے۔۔۔"

"جواہرات نے تمہارے باپ کو نہیں مارا۔"

ہاشم دھاڑ سے اٹھا اور میز کی چیزیں پرے گرائیں۔

"ممی نے ہی اورنگ زیب کاردار کو قتل کیا ہے۔ جانتا ہوں میں۔" میز پہ مٹھیاں رکھے' وہ اونچی آواز میں غرایا تھا۔ رنگت سرخ تھی اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

وہ سکون سے بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "ہاں' انہوں نے ہی مارا ہے اورنگ زیب کاردار کو۔۔۔ مگر یہ کس نے کہا کہ وہ تمہارا باپ تھا؟" اور ہاشم کاردار کے جسم کا ہر عضو سُن ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکن ہو گئیں۔ ہاتھ میز پر رکھے رکھے جم گئے۔ نگاہیں اس پہ ہی پتھر ہو گئیں۔

"کس نے کہا ہاشم کاردار کہ اورنگ زیب کاردار تمہارا باپ تھا؟" فارس اٹھ کھڑا ہوا۔ "جواہرات نے بے شک اسے مارا ہے' مگر وہ تمہارا باپ نہیں تھا۔ تمہارا باپ جواہرات کا کزن طیب مطیع تھا۔"

ہاشم کے لب پھڑپھڑائے' مگر آواز نہ نکلی۔ اس کی سانس رک چکی تھی۔ جسم پتھر ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی مگر وہ۔۔۔ سکتے کے عالم میں فارس پہ جمی تھیں۔

"ایک پرائیوٹ کانٹریکٹر کو ایک کام دیا تھا جواہرات بیگم نے۔ جب تم نے اور تمہارے۔۔۔ کیا کہنا چاہیے۔۔۔ جعلی باپ اورنگ زیب کاردار نے۔۔۔ مالی بدعنوانی کے باعث جواہرات کے کزن کو جیل بھجوایا تھا اور خاص تمہارے حکم پہ اس کے اوپر تشدد کیا گیا تھا' تو تمہیں یاد ہو گا کہ اس تشدد سے وہ ہسپتال جا پہنچا تھا۔ جہاں گو کہ وہ مر گیا تھا' مگر اس کے جو بلڈ ٹیسٹ کی

رپورٹ آئی تھی' وہ درست نہیں تھی۔ کیونکہ جواہرات بیگم نے ایک کانٹریکٹر کو کہہ کر اصل بلڈ سیمپل لیب سے غائب کروا کے کسی اور مریض کی رپورٹس جمع کروادی تھیں۔ مگران کانٹریکٹرز کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ رسیدیں ضرور سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اس نوجوان نے اس بلڈ سیمپل کو ضائع کرنے سے پہلے اس کی بہت ساری رپورٹس نکلوائی تھیں' کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ امیر عورتیں عموماً" ڈی این اے رپورٹس بدلوالیا کرتی ہیں۔ اس نے مجھے رپورٹس دیں اور میں نے ان کو تمہارے بلڈ بینک میں' جہاں تم غریب لوگوں کے لیے خون کا عطیہ ہر چند ماہ بعد دیتے ہو اور ساتھ میں فوٹو شوٹ کرواتے ہو' تمہارے سیمپل کے ساتھ میچ کروالیا۔ واٹ اے پرفیکٹ میچ!! یقین نہیں ہے تو خود دیکھ لو۔" اس نے جیب سے ایک تہ شدہ لفافہ نکال کر میز پہ رکھا۔ آنکھیں ہنوز ہاشم پہ جمی تھیں جو ابھی پتھر ہوا ۔۔۔ تھا۔ اسے لگا وہ سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ پلک بھی نہیں جھپک رہا تھا۔

"سو' اورنگ زیب تمہارا باپ نہیں تھا۔" فارس ٹہلتے ہوئے اب کہہ رہا تھا۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے جیسے خود کو سمجھا رہا تھا۔ "مگر طیب کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس جیسے بے کار' گھٹیا اور کنگال آدمی کا ایک شاندار سا بیٹا بھی ہے۔ کسی زمانے میں وہ امیر اور خوش شکل تھا مگر آخری وقت میں تو کافی رذیل سا ہو گیا تھا۔"

وہ اب ٹہلتے ٹہلتے ایکوریم کے قریب آرکا تھا۔ اس نے شیشے کی دیوار پہ اس جگہ انگلی پھیری جہاں کبھی آبی نے سفید پڑتے ہاتھ رکھے تھے۔

"اسی لیے وہ آخری وقت تک جواہرات کو بلیک میل کر رہا تھا اور وہ تمہیں روکتی تھی کہ اس کو جیل میں نہ پھنکواؤ' مگر زیادہ کوشش اس نے بھی نہیں کی کیونکہ وہ اس کا اصل راز نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی اورنگ زیب کا کردار جانتے تھے۔"

وہ اب جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا' اور باہر تاریک رات اور شہر کی روشنیوں کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"اورنگ زیب کو ہمیشہ نوشیرواں پہ شک ہوتا تھا مگر اس کی مشابہت ان سے بہت تھی۔ تم پہ کبھی شک نہیں کیا۔ لیکن تم ان جیسے نہیں تھے۔ اپنی ماں پہ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اور نوشیرواں۔۔۔ ہماری شکلیں اور آوازیں ملتی ہیں۔ ہم اورنگ زیب جیسے ہیں۔ تم ویسے نہیں تھے۔ تم ہمیشہ مختلف تھے۔ تم علیشا جیسے بھی نہیں تھے۔ تم سب سے الگ تھے۔ کیونکہ تم کاردار تھے ہی نہیں۔" پھر چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ سُن کھڑا تھا۔ اس کی پیشانی تر تھی' قطرے کنپٹی سے نیچے ٹپک رہے تھے۔۔۔ مگر اس کی سانس چلتی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ فارس اس کے قریب چلتا آیا۔

"دوسروں کے باپ کو مارتے ہوئے یہ خیال آیا تھا کبھی ہاشم کہ اپنے باپ کے بھی قاتل نکلو گے ایک دن؟ اور جس کو تم ساری زندگی اپنا باپ مانتے رہے' جس کی سیاست بچانے کے لیے تم نے آبل اور نور سے ان کا باپ چھینا' وہ آدمی تو تمہارا کچھ لگتا ہی نہیں تھا۔" پھر اس پہ ایک تاسف بھری نظر ڈالی۔

"تم تاش کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے اور میں شطرنج کھیل رہا تھا۔ اور اسے۔" اس نے میز پہ رکھا لفافہ اٹھایا۔

"اسے شہ مات کہتے ہیں!" کاغذ زور سے ہاشم کے اوپر دے مارا۔ وہ اس سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ مگر برف اور آگ کے بُت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ فارس نے سر جھٹکا' اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایسے ہی کھڑا تھا اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

اگلا سفر کیسے تمام ہوا' کوئی اندازہ نہ تھا۔ کتنے دن بیتے' کتنی راتیں کاٹیں کوئی احساس نہ تھا۔ بس من من بھر قدم اٹھاتا وہ چل رہا تھا۔ بال بکھرے تھے' حلیہ بے ترتیب تھا۔ اور وہ قصر کے سبزہ زار پہ قدم رکھتا جا رہا تھا۔ ملازم اسے دیکھ کر حیرت سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں ایک شیشے کا جار تھا' جس کا منہ بند تھا اور وہ سامنے دیکھتا اس بھری دوپہر میں قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھولا تو سیڑھیوں کے اوپر وہ دونوں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ جواہرات فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔

"تم دوبارہ اس کے دوستوں سے پتا کرو۔ وہ چار دن سے گھر نہیں آیا شیرو۔" وہ روہانسی لگتی تھی۔ شیرو "کرتا ہوں دوبارہ" کہہ کر فون پر نمبر ملانے لگا تھا۔ تب ہی جواہرات کی نظر نیچے پڑی جہاں لاؤنج کے کھلے دروازے کے ساتھ وہ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سفید اور آنکھیں سرخ تھیں۔ جواہرات کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ تیزی سے زینے اترنے لگی۔

"ہاشم تم کہاں تھے؟ او گاڈ۔۔۔ ہم سب کتنے پریشان تھے تمہارے لیے۔ تم ٹھیک ہو بیٹا؟" وہ پریشانی سے اسے دیکھتی قریب آئی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ جار میز پہ رکھ دیا۔

"کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ مت سنو لوگوں کی باتیں۔ سب لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔" وہ اس کے سامنے کھڑی بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتا ہوا قدم قدم قریب آنے لگا۔ جواہرات کو عجیب خوف سا آیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

"میں نے نہیں مارا اورنگ زیب کو۔ جھوٹ بولتے ہیں سب۔ اور تم۔۔۔ تم اورنگ زیب کی محبت میں مجھے بھلا بیٹھے ہو کیا؟" وہ آنسو بہاتی کہہ رہی تھی۔ اوپر کھڑا نوشیرواں ناگواری سے اسے دیکھے گیا۔ ہاشم اس کے قریب آرہا تھا اور وہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔

"کیا کیا اورنگ زیب نے تم لوگوں کے لیے جو میں نے نہیں کیا؟ تمہارے ہر راز کی پردہ دار میں تھی۔ جو بھی کیا' تمہارے لیے کیا میں نے۔ تم مجھے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ ہاشم! میں نے تمہاری پرستش کی۔ تم مجھے سب سے عزیز ہو۔ شیرو سے بھی زیادہ۔ تم مجھے ایسے نہ دیکھو۔" وہ اب رونے لگی تھی۔

وہ اس کے بالکل قریب آرکا۔ اسے گھورتے ہوئے ایک دم سے۔۔۔ اس کے گردن دبوچی۔ جواہرات کے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ایک ہی دفعہ پوچھوں گا۔ سچ سچ بتانا۔" سرخ انگارہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے وہ غرایا تھا۔ ایک

ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ رکھی تھی۔
"میرا باپ کون تھا؟ میرے ڈیڈ یا تمہارا وہ کزن طیب؟"
اور وہ ایک ایسا لمحہ تھا جب جواہرات کے سارے آنسو تھم گئے۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ وہ ایک عجیب ششدر سا لمحہ تھا۔ وہ یک ٹک ہاشم کو دیکھے گئی۔
"کیا وہ میرا باپ تھا؟ بولو۔" وہ دبا دبا سا غرایا۔
اوپر کھڑا نوشیرواں سُن ہو گیا۔ گردو نواح کے کونوں میں کان لگائے کھڑے ملازموں نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیے۔ جواہرات کے لب پھڑپھڑائے۔ اس نے تھوک نگلا۔
"I can explain !" (میں سمجھا سکتی ہوں۔)
اور ہاشم نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ ہاتھ نیچے گرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا درد ابھرا تھا جو جواہرات کی جان نکالنے لگا۔
وہ مڑ گیا اور چند قدم آگے گیا۔ سب ابھی تک سُن کھڑے تھے۔ دم سادھے۔ سانس روکے۔
وہ میز تک گیا' جار اٹھایا' اس کا ڈھکن اتارا اور واپس اس کی طرف گھوما۔ "آج تم نے میرے ڈیڈ کو ... دوسری دفعہ مار دیا۔" اور یہ کہہ کر اس نے جار میں موجود پانی اس کے چہرے پہ پھینک دیا۔
یہ جواہرات کاردار کی چیخیں تھیں جنہوں نے وہاں کھڑے ہر شخص کو بتایا تھا کہ وہ پانی نہیں تھا۔
وہ تیزاب تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایک ہفتے بعد!"
کمرۂ عدالت میں جیسے ہی جج صاحب اپنے چیمبرز سے نکل کر داخل ہوئے' تمام حاضرین (ماسوائے بڑے ابا کے) اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بیٹھنے کے بعد سب بیٹھ گئے۔
"جی' مسز زمر۔ آپ کو کوئی گواہ ملایا نہیں؟" زمر نے ساتھ کھڑے سعدی کو دیکھا' پھر پیچھے کھڑے فارس' حنین' اسامہ' ندرت اور بڑے ابا کو جو آج بصد اصرار یہاں آکر بیٹھے تھے۔ پھر واپس چہرہ گھمایا۔
"نہیں یور آنر۔ ہمیں گواہ نہیں مل سکا۔"
جج صاحب نے اب دفاع کی کرسیوں کی طرف دیکھا۔ وہاں ہاشم اور نوشیرواں اپنے دوسرے وکلاء اور دوستوں کے ہمراہ براجمان تھے۔ دونوں بھائیوں نے پن اسٹرائپ سوٹ پہن رکھے تھے اور نک سک سے تیار نظر آتے تھے۔
"یقیناً" آپ کو بھی کچھ نہیں کہنا؟"
"نو یور آنر!" ہاشم نے ہشاش بشاش سے انداز میں کہا۔
"تو پھر عدالت اپنا فیصلہ سنانے کے لیے تیار ہے۔"
جج صاحب کا یہ کہنا تھا کہ تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جج صاحب نے عینک لگائی اور اپنے کاغذات سے پڑھ کر سنانے لگے۔
"سرکار بنام نوشیرواں کاردار میں عدالت نے تمام وکلاء' گواہان' اور ....."
وہ بولتے جا رہے تھے اور ادب سے کھڑے تمام افراد سن رہے تھے۔ بہت سے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ بہت سی سانسیں تھمی ہوئی تھیں۔ وہ خاندان دو اطراف میں کھڑے تھے۔
صرف جواہرات کی کرسی خالی تھی۔

☼ ☼

(آخری قسط۔ آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



مصروفیت

کبھی پوچھا کرو تم بھی
کہ میں ہر وقت کتابوں میں
اس قدر کیا ڈھونڈتا ہوں
تمہیں معلوم ہے جاناں
میں اب ساری کتابوں کے
ہر عنوان میں
ہر صفحے پر
تمہارا نام ڈھونڈتا ہوں
تمہارا عکس دیکھتا ہوں
تمہاری آنکھیں پڑھتا ہوں
تمہیں ہی یاد کرتا ہوں

علی احمد جان

دیکھیں کتنے چاہنے والے نکلیں گے
اب کے ہم بھی بھیس بدل کر نکلیں گے

چاہے جتنا شہد پلا دو پتوں کو
نیم کے پتے پھر بھی کڑوے نکلیں گے

پیر کے چھالے پوچھ رہے تھے رہبر سے
اک رستے سے کتنے رستے نکلیں گے

اک آئینہ کتنی شکلیں دیکھے گا
مکاری کے کتنے چہرے نکلیں گے

طارق تیری قسمت میں ہی پیار نہیں
اس بیری کے بیر بھی کھٹے نکلیں گے

طارق قمر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کبیرہ گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ کسی مسلمان کی عزت پر حملہ ہے۔"

(ابوداؤد)

خلیفۂ وقت حضرت علیؓ کی انکساری

حضرت علیؓ اپنے معمول کے مطابق ایام خلافت میں چھوٹی آستین اور اونچے دامن کا کرتا پہنے اور معمولی کپڑے کا تہہ بند باندھے بازار میں جا رہے تھے۔ امیرالمومنین کو دیکھ کر ایک شخص رک گیا اور پھر تعظیم کے طور پر ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

حضرت علیؓ نے اس سے کہا۔
"میرے برابر برابر چلو۔"
"امیرالمومنین! میں احترام کے لیے آپ کے پیچھے چل رہا ہوں۔" اس شخص نے عذر کرتے ہوئے کہا۔

امیرالمومنین نے فرمایا۔ "احترام کا یہ طریقہ درست نہیں۔ اس میں حکمران کے لیے فتنہ اور مومن کے لیے ذلت ہے۔"

ساجرہ نیازی۔ میانوالی

ڈپریشن کا علاج،

ڈپریشن ہو تو عبادت کرو۔
پھر بھی ڈپریشن ہو تو خیرات کرو۔
پھر بھی ڈپریشن ہو تو محبت کرو۔
اگر زیادہ ڈپریشن ہو تو معصوم بچوں کو ساتھ رکھنا شروع کر دو۔

(واصف علی واصف)

فزال افضل کھمن۔ کراچی

تشریح،

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز

میٹرک کے پرچے میں درج بالا شعر تشریح کے لیے آیا۔ ایک طالب علم نے اس کی تشریح کچھ اس طرح کی۔

"ایک مرتبہ جنگ کے دوران نماز کا وقت ہو گیا۔ صفیں بن گئیں۔ دو سپاہی جن کے نام محمود اور ایاز تھے، جگہ نہ ملنے کے باعث ایک ہی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ کافروں نے جو دیکھا تو حملہ کرنے کا سوچا کیونکہ انہیں پتا تھا کہ جب مسلمان نماز پڑھ رہے ہوں تو ہلتے بالکل نہیں۔ انہوں نے پوری قوت سے مسلمانوں پر حملہ کیا اور سب مسلمانوں کا صفایا کر دیا۔ سو نہ وہاں کوئی بندہ رہا اور نہ ہی بندہ نواز۔ سب صفاچٹ ہو گئے۔

ناظمہ زیدی۔ چوک اعظم

جواب جاہلاں،

ایک دفعہ جنگل میں گھوڑے اور گدھے کی بحث ہوئی۔ گھوڑے نے کہا۔
"آسمان کا رنگ نیلا ہے۔"
جبکہ گدھے کا کہنا تھا "آسمان کالا ہے۔"
بات بڑھی تو گھوڑے نے کہا "چلو اپنے بادشاہ کے پاس چلتے ہیں۔"

دونوں شیر کے پاس پہنچے اور تمام قصہ سنایا۔
شیر نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔
"گھوڑے کو جیل میں ڈال دیا جائے۔"
گھوڑے نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
"بادشاہ سلامت۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ صحیح بھی میں ہی ہوں اور جیل بھی مجھے جانا پڑے۔"
شیر نے کہا۔" بات صحیح یا غلط کی نہیں ہے۔ تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ایک گدھے سے بحث ہی کیوں کی۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

بہار،

تیرے آنے کی رُت سے پہلے سے
کیاریوں میں گلاب آن بسے

(فرحت عباس شاہ)
انیقہ انا۔ بھوال

موتی مالا،

☆ سب سے آسان کام جس کا نفع بھاری ہے کم بولنا ہے۔ (ارسطو)
☆ جس جگہ عقل کامل ہوگی، وہیں وشر ناقص ہوگا۔ (افلاطون)
☆ صرف نیک ہی نہ بنو، کسی کے ساتھ نیکی بھی کرو۔ (تھورو)

نادیہ، بجنہ۔ گلستان جوہر

فائدہ،

ایک سات سالہ بچہ کلینک میں داخل ہوا اور ڈاکٹر صاحب سے کہا۔
"ڈاکٹر انکل! آپ نے دادا ابو کو کل جو گولیاں دی تھیں، وہی بیس گولیاں اور دے دیں۔"
"صاحبزادے! لگتا ہے ان گولیوں سے آپ کے دادا کو بہت زیادہ افاقہ... میرا مطلب ہے فائدہ ہوا ہے۔ لیکن اتنی زیادہ گولیاں آپ کے دادا ابو نے کیوں منگوائی ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔
"ڈاکٹر صاحب! فائدے کا تو مجھے پتا نہیں لیکن وہ گولیاں میرے کھلونا پستول میں بالکل فٹ آتی ہیں۔"
بچے نے جواب دیا۔

ادم ذوالفقار۔ چشتی نگر

جواب،

پرنسپل:"لیٹ کیوں ہوئے؟"
لڑکا:"بائیک خراب ہوگئی تھی۔"
پرنسپل:"بس میں نہیں آسکتے تھے؟"
لڑکا:"میں نے کہا تھا سر! مگر آپ کی بیٹی کے نخرے ختم ہوں تو تب ناں۔"

صدف عمران۔ کراچی

اعتماد،

ایک دفعہ بہت سارے پروفیسرز ایک ہی جہاز میں بیٹھے۔ جب بیٹھ چکے تو بتایا گیا کہ یہ جہاز آپ کے شاگردوں نے بنایا ہے۔
یہ سن کر سب کے سب اٹھ کر جہاز سے باہر آگئے۔ سوائے ایک پروفیسر کے۔ جب ان سے پوچھا گیا۔
"آپ باہر کیوں نہیں آئے؟" انہوں نے جواب دیا۔
"اگر یہ میرے شاگردوں نے بنایا ہے تو یہ اڑے گا ہی نہیں۔"

آمنہ محمد نوید۔ پیچو کی ملیاں

رسمِ دنیا،

آنگن میں جب تک درخت پھل دیتا رہا، مالکن باقاعدگی سے پانی دیتی رہی لیکن گزشتہ سال سے وہ سوکھتا ہی جا رہا تھا۔ اور سایہ بھی بس برائے نام رہ گیا تھا۔ مالکن بیرون ملک سے لوٹی تو ایک ہفتہ بعد ہی اس نے حکم صادر کر دیا۔
"کسی کو بلا کر یہ درخت کٹوا دینا، بہت جگہ گھیرتا ہے۔"

مدیحہ فہیم۔ کراچی

تکلیف دہ

لقمان حکیم سے پوچھا گیا۔
"کیا کوئی چیز یا لمحہ موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے؟"
حکیم لقمان نے فرمایا۔
"ہاں۔ جب کوئی شریف انسان کسی مجبوری میں کسی کم ظرف کے آگے دست سوال دراز کرے۔"

حرا قریشی۔ ملتان

ایک دسمبر

ایک دسمبر میرے اندر
پتھر جیسی آنکھ کی دھرتی
اور دل سات سمندر
سوچ کی لہریں ٹھہریں ایسے
چاند نگر کے بس کھنڈر
مجھ میں اک لمبا دسمبر

نمرہ، اقرا۔ کراچی

سمجھ داری

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی شادی لوگ ایک خوبصورت عورت سے کرا رہے تھے۔ لوگوں نے کہا۔
"فلاں شخص کی بہن، اس خاتون سے زیادہ عقل مند ہے لیکن یک چشم ہے۔"
حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اس یک چشم دانش مند خاتون سے نکاح کرنا بمقابلہ خوبصورت عورت پسند فرمایا۔ وہ حسن و جمال کے خواہاں نہ ہوئے۔

سوراخ

ایک شخص غصے کا بہت تیز تھا۔ ایک عالم نے اسے مشورہ دیا۔
"جب تجھے غصہ آئے تو جنگل میں جا کر درخت میں کیل ٹھونکنا۔"
اس نے ایسا ہی کیا۔ آخر ایک دن اس کا غصہ ختم ہو گیا۔ اس نے آ کر عالم کو بتایا۔ عالم نے کہا۔
"اب اس درخت سے یہ کیلیں نکال لو۔"
آدمی نے کیلیں نکال لیں۔ لیکن درخت میں سوراخ ہو گئے۔ عالم نے کہا۔
"یہ وہ سوراخ ہیں جو تم غصے کی حالت میں لوگوں کے دلوں میں کرتے رہے ہو۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

گہری بات

مرد اگر ہاتھ چھڑا کر جانا چاہے تو ہاتھ بڑھا کر روک لو، ہو سکتا ہے وہ رک جائے۔
لیکن اگر عورت ہاتھ چھڑا کر جانا چاہے تو کبھی مت روکنا کیونکہ وہ ہاتھ چھڑانے سے پہلے جا چکی ہوتی ہے۔

(اشفاق احمد)

حقیقت پسند یہودی شاعر ایرش فریڈ کا کلام

فریڈ کی ایک بہت ہی چبھنے والی نظم۔ اس نظم کا پس منظر اسرائیل کی طرف سے 1973ء میں مصری قیدی سپاہیوں کو ان کے جوتے اتروا کر صحرا میں دھکیل دینے کا واقعہ ہے۔

تم نے مظلوموں کو حکم دیا
جوتے اتار دو
پھر تم نے انہیں
بھیڑوں کی طرح صحرا میں دھکیل دیا
موت کی بڑی مسجد میں
جہاں جوتیاں ریت کی ہیں
مگر انہوں نے تمہارے گناہوں کو
جنہیں تم ان پر لادنا چاہتے تھے قبول نہیں کیا
ننگے پاؤں کے نقش
صحرا کی ریت میں
تمہارے بموں اور ٹینکوں کے بالمقابل
زیادہ پائیدار ثابت ہوں گے

صدف عمران۔ کراچی

خالدہ جیلانی

میری بیاض

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

جی چاہتا ہے آج عدم ان کو چھیڑیے
در ذر کے پیار کرنے میں کوئی مزا نہیں

مدثرہ سلیم ـــــــ نوشہرہ

دسمبر بیت جانے سے فرق پڑتا ہے اب کس کو
جو رشتہ دل کا رشتہ ہو اُسے موسم سے کیا لینا

عائشہ جہانگیر مرالی ـــــــ کبیر والا

اک ہجر تھا سو وہ بھی رہا شور و شر میں گم
اک وصل تھا سو وصل کو شدت نہ مل سکی
جو لوگ دور تھے سدا دور ہی رہے
جو پاس تھے سو اُن سے طبیعت نہ مل سکی

شازیہ سعید ـــــــ شاہ نکدر

نہ مروت نہ محبت نہ خلوص ہے محسن
میں تو شرمندہ ہوں اس دور کا انسان ہو کر

ساجی عامر ـــــــ ٹنڈو آدم

تمام جذبوں سے معتبر ہے
اُداس آنکھوں سے مسکرانا

عفیفہ فاطمہ ـــــــ بہاول پور

اب تو دیمک بھی کھا کے چھوڑ گئی
تیری دستک کے منتظر دروازوں کو

زارا ڈوگر ـــــــ گوجرانوالہ

کتنے برسوں کا سفر خاک ہوا محسن
اس نے جب پوچھا کیسے آنا ہوا

سیدہ نسبت زہرا ـــــــ کھرڑیانوالہ

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا
شغل میں غم کے تیرے ہم سے گیا کیا کیا کچھ
حسرتِ وصل، غم و ہجر و خیالِ رخِ دوست
مر گیا میں یہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

شبنم شمشاد ـــــــ رزمان

ہم بھلا چپ رہنے والے تھے کہیں
ہاں مگر حالات ایسے ہو گئے
آؤ ناصر ہم بھی اپنے گھر چلیں
بند اس گھر کے دریچے ہو گئے

نادیہ، بجم ـــــــ گلستان جوہر

نکل اے دلربا گھر سوں کہ وقت بے حجابی ہے
چمن میں چل بہار نسترن ہے ماہتابی ہے

نمرہ، اقرا ـــــــ کراچی

نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے!

آسیہ فرید ـــــــ ملتان

وقت گزرا تو یہ ملال ہوا، ختم اک زندگی کا سال ہوا
کتنی شدت سے کوئی یاد آیا آج جینا بڑا محال ہوا

مدیحہ نورین مہک ـــــــ گجرات

میں نے دل کی بات رکھی اور تو نے دنیا والوں کی
میری عرض بھی مجبوری تھی اُن کا حکم بھی مجبوری

شائستہ اکبر ـــــــ گڈو کالونی

جو تار سے نکلی ہے وہ دھن سب نے سُنی ہے
جو ساز پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتا ہے

عائشہ، تحریم ـــــــ کراچی

میں قابلِ تعریف ہوں نہ قابلِ تحسین
اک سلجھی ہوئی لڑکی ہوں اُلجھے مزاج کی

ندا، فضہ ـــــــ کراچی

جب خواب نہیں کوئی، کیا زندگی کرنا
ہر صبح کو جی اٹھنا، ہر رات کو مر جانا

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

تسنیم شریف کی ڈائری سے

جس طرح مختلف پودوں کو مختلف زمین اور آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح محبت کی کونپل بھی ہر زمین دل سے نہیں پھوٹتی محبت کچھ رمز آشکار کرتی یہ خوبصورت نظم تمام باذوق و اہل دل قارئین کی نذر۔

کئی دن سے ناراض ہیں یہ ستارے
کسی سے کوئی بات کرتے نہیں ہیں
بلاتے نہیں سرمئی بادلوں کو
سرِ شام دل میں اترتے نہیں ہیں
ٹھہرتے نہیں نیلگوں پانیوں پر
سڑک بانگی سے گزرتے نہیں ہیں
اداسی نے رکھے ہیں رستے میں پیالے
ستارے خوشی ان میں بھرتے نہیں ہیں
نظر میں جو اک دشت پھیلا ہوا ہے
اسے روز و شب پار کرتے نہیں ہیں
در و بام پر رات پھیلی ہوئی ہے
پرندوں بھری صبح آتی نہیں ہے
ستاروں کے ناراض ہونے کے باعث
محبت کہیں گھر بناتی نہیں ہے

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم آپ سب بہنوں کے لیے۔

درد پھیل جائے تو ایک
وقت آتا ہے
دل دھڑکتا رہتا ہے
آرزو گزیدوں کے حوصلے نہیں چلتے

دشت بے یقینی میں آسرے نہیں چلتے
رہبروں کی آنکھوں میں
منزلیں نہ جب تک ہوں
قافلے نہیں چلتے

اک ذرا توجہ سے دیکھیے تو کھلتا ہے
لوگ ان پہ چلتے ہیں
راستے نہیں چلتے
تو جنھیں سمجھتے ہیں
ساتھ ساتھ چلتے ہے
دور دریاں تھکتی ہیں
فاصلے نہیں چلتے
خواب خواب آنکھوں میں
رتجگے نہیں چلتے
در گزر کے چلتے ہیں
سلسلے نہیں چلتے
درد دلوں کی قربت میں
تیسرا نہیں ہوتا
واسطے نہیں چلتے

مری زندگی ہی تو میرا مرض ہے
مجھے زہر دے دے، دوا دینے والے

خمار اور ترک مے ناب توبہ
سلامت نہ رہیں مشورہ دینے والے

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری سے

وقت محبت کے زخم مندمل کر دیتا ہے لیکن پھر بھی کچھ بھولی بھٹکی یادیں ذہن کے گوشوں میں رہ

جاتی ہیں۔ ناصر کاظمی کی اس غزل میں ان ہی یادوں کی کسک ہے۔

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اولیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جواب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی ہے
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

یہ بھی حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جواب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

رخصت ہوتا ہوا سال جدائی کے لمحات کی طرح جاں گسل ہوتا ہے۔ رائیگانی کا فزوں تر ہوتا احساس ادھورے رہ جانے والے خواب۔ وقت کے کھو جانے کا دکھ "سال کی آخری شام" ان ہی احساسات کو اجاگر کرتی ہے۔

سال کی آخری شام

یہ سورج جو تھامے ہوئے تھا
وہ آنچل کہ جس میں
کہیں بے کلی
کاڑھدی تھی ہوا نے
کہیں تشنگی
ٹانک دی تھی فضا نے
کسی سمت اک خوف
چھپا ہوا تھا
کسی سمت گزرے ہوئے
حادثوں کا نشاں تھا
کہیں بے اماں کی
شکنیں پڑی تھیں
کہیں ناگہانی کے
ہاتھوں سے مسلا ہوا تھا
کہیں ادھ کھلے خواب
کا رنگ... پھیلا ہوا تھا
اس آنچل کا پلو
ابھی تک کسی گرم آنسو سے
بھیگا ہوا تھا
اس آنچل کو تھامے
یہ سورج یہاں آ گیا ہے
جہاں آج کی شام
دونوں ہی ملنے افق کے
کنارے اتر جائیں گے
پھر اک دوسرے سے
بچھڑ جائیں گے

عزہ، اقراء کی ڈائری سے

میری ڈائری میں خمار بارہ بنکوی کی یہ غزل تحریر ہے جو میں آپ سب بہنوں کی نذر کرتی ہوں۔

جنہیں عشق میں آسرا دینے والے
مجھے بھنور میں راستہ دینے والے

کرم جبر حالات کا یہ ہے ورنہ
بڑے با وفا تھے دغا دینے والے

اب اک اک سے خود ہی دوا پوچھتے ہیں
مجھے دردِ دل کی دوا دینے والے

بشر تھا میں کیسے نہ کرتا خطائیں
سنبھل کے سزا و جزا دینے والے



نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

مریم قرۃ العین۔۔۔ ڈیرہ غازی خان

پہلی مرتبہ رائے پیش کررہی ہوں۔ وہ بھی نمرہ احمد کی تحریر نے بہت مجبور کردیا۔ کیا کمال کا لکھتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ہمارے ذہن کو پڑھ کر لکھ رہی ہوں۔ سمیرا حمید نے بہت اچھا افسانہ تحریر کیا۔ زبردست بھئی میں نے اسے دو مرتبہ پڑھا اور خوب سوچ بچار کرکے' آمنہ ریاض بھی بہت اچھا تحریر کررہی ہیں۔ کرن کرن روشنی میں بہت اچھا ٹاپک تھا۔ اگر ہوسکے تو نہاری بنانے کا طریقہ' کوفتے اور کڑاہی گوشت بنانے کا طریقہ ضرور شائع کریں۔ عدنان صاحب بہت اچھے طریقے سے مسائل کا حل بتاتے ہیں' میں اگر کسی کو کوئی بات کا جواب دوں تو کہتے ہیں یہ تو ڈائجسٹ کی زبان بول رہی ہے۔ تو میں سوچتی ہوں جو لکھتے ہیں انہیں کیا کیا نہیں سننا پڑتا ہوگا کیا ایسا ہے۔۔۔؟

ج۔ پیاری مریم! اللہ نے دو کان اس لیے دیے ہیں کہ ایک کان سے فضول بات سنی جائے تو دوسرے کان سے نکال دی جائے۔ آپ بھی پروانہ کیا کریں۔

نہاری' کوفتے اور کڑاہی بنانے کی ترکیب کئی بار دے چکے ہیں' آپ کی فرمائش پر دوبارہ دے رہے ہیں۔

ایمان جلبانی۔۔۔ گاؤں دریا خان جلبانی

عمر سعید کی وفات ایک عظیم نقصان ہے' اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

سب سے پہلے میں نے سمیرا حمید کے افسانے کو پڑھا' میں سیلوٹ پیش کرتی ہوں آپ کو' کیا آپ مجھے اپنی شاگردی میں لیں گی؟ مالک کو پڑھ کے ایسا لگا معجزے انسانوں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں؟ راؤ سمیرا ایاز نے ایک تلخ حقیقت بیان کی ہے۔ آپ لوگ یقین کریں جس جس رائٹر نے جو بھی لکھا ہے۔ وہ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا بھی ہے محسوس بھی کیا ہے' پہلے پہل میں کہانی پڑھ کے سوچتی تھی اچھا ایسے بھی ہوتا ہے' لیکن جب اپنے خاندان' ماحول' معاشرے اور آس پاس دیکھا تو سب کڑوی حقیقتیں سامنے تھیں۔

یہ کیا احمر بھی اغوا ہوسکتا ہے یا حیرت اور اس آئی پہ اتنا غصہ آرہا ہے دل کررہا ہے دادا مرحوم کے حقہ والا ڈنڈا نکال اس بلی کو بیچ میں لال کردوں اور وہ دیکھو جھیگری شہرین چلی تھی فارس کو بے وقوف بنانے' جیسے ڈھنگ سے ارر نگز بھی پہننا نہیں آتے۔ (حرین جی ہیئیں) نمرہ جی! پلیز سسپنس ذرا کم دیا کریں' دل ڈھائی سو کی رفتار سے دھڑکنے لگتا ہے۔ آمنہ ریاض پلیز نعیب کو کیف سے جدا مت کرنا اور اس بیری بابے کو جلدی سے اس بیری کی درخت میں لٹکادیں عین نوازش ہوگی۔ آیو شمتی مجھے لگتا ہے آئے کت کی ہی کوئی گھسٹ (گڑبڑ) ہوگی ورنہ آج کل آیو شمتی کہاں ہیں؟۔ "محبت خواب جزیرہ" شروع میں تو بہت اچھا ہے اینڈ دیکھتے ہیں کیا نکلتا ہے ویسے ایک اور سطوت کی جوڑی اچھی رہے گی۔ "آب حیات" تو اپنے نام کی طرح "آب حیات" ہے' میں اگر سو سال کی ہوئی تا تب بھی یہ ناول پڑھتی رہوں گی اور بار بار پڑھوں گی۔ اینڈ ایک بات پوچھنی ہے پہلے بھی پوچھی تھی پر جواب نہیں ملا' بات یہ ہے کہ آب حیات کیا سچی اسٹوری ہے؟ اور یہ کیا اپنے پاکستان کی کہانی ہے کیا حمین جیسے بچے پلس نوجوان شروع سے ہی اتنے ذہین ہوتے ہیں یا رائٹر کا تخیل ہے۔۔۔؟ جوادی تسلی کو جلد لے کر آئیں کہاں گم

ہو گئے؟

ج۔ کہانیوں کے بارے میں یہ بتانا کہ وہ حقیقت ہیں یا افسانہ تو پیاری ایمان یہ ہمارا راز ہے' جسے کسی قیمت پر افشا نہیں کیا جا سکتا

رہی بات حمین کی تو اللہ کے کرم سے ایسے ایسے دریا یاب پاکستان میں ہیں کہ حمین تو ان کے سامنے بچہ ہے۔ بس کچھ لوگوں کا ہاتھ قسمت تھام لیتی ہے اور کچھ وقت کی دھول میں گم ہو جاتے ہیں۔

مہناز یوسف....کراچی

سب سے پہلے ہمارے نام پڑھا۔ ماشاء اللہ تمام بہنوں کے خطوط بہترین تھے۔ یہ سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے۔ ''انجاز کا رنگ'' میں موجود راؤ سمیرا ایاز کی باتیں بے حد پسند آئیں سب سے اچھی بات یہ لگی کہ سمیرا نے بہت ساری رائٹرز کو پسندیدگی کی سند دی۔ پرانی رائٹرز کے ساتھ ساتھ نئی رائٹرز کو بھی سراہا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا'' بہت دلچسپ تحریر تھی۔ مسکراتی تحریر مجھے بہت اچھی لگی۔ ''نمل'' اف پلیز نمرہ سے کہئے کہ زمر کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے نمل کی یہ قسط بہترین تھی۔ ''دشت جنوں'' بھی بہترین ہے۔ ''خلائی مخلوق'' صائمہ نور کی بہترین کاوش۔ میاں جی بیویوں کو سمجھتے تو انسان ہیں مگر کام ان سے خلائی مخلوق والے ہی چاہتے ہیں۔ ''مالک'' بھی بہت اچھی لگی۔ سمیرا حمید کے تو کیا کہنے' ہر بار ایک الگ طرح کی کہانی کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمیرا کے قلم کو نظر بد سے بچائے۔ آمین۔ سمیرا گل عثمان کا ناولٹ ''اچھی بہو'' بے حد پسند آیا۔

ج۔ پیاری مہناز! آپ کی کہانی داستان الم اس ماہ شعاع میں شامل ہے۔ باقی تحریروں کے بارے میں پڑھ کر تا میں گے۔

طویل غیر حاضری کے بعد آپ نے خط لکھا' تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

فہمیدہ گل....لاڑکانہ

بہت سے مصنفین ایسے ہیں جن سے میں بہت بلکہ بے حد متاثر ہوں' لیکن دو ایسے ہیں جن کی تحریریں' جن کے لکھنے کا انداز اور جن کے الفاظ سیدھے میرے دل کو چھو لیتے ہیں وہ ہیں مظہر کلیم اور نمرہ احمد ''نمل'' پڑھ کر ہمیشہ مجھے خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے کیا نمرہ احمد نے وکالت کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہے۔ نمل سے ہمیں اسلام و قرآن اور قانون کی حقانیت اور عالمگیری کا صحیح معنوں میں ادراک ہوا ہے۔ ''محبت خواب جزیرہ'' اچھی تحریر تھی۔ آخری قسط کا انتظار ہے' لیکن میں کچھ کہوں گی' یہ کہ سطوت کی ماں کے کپڑے' سب کے سب گیلے کیسے ہو گئے اور جو پہنے ہوئے تھے وہ بھی اور سطوت کا ایک سے مالی مدد لینا مجھے اچھا نہیں لگا اور اتنی بھی کیا بھولنے کی بیماری کہ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے قرض اتارا ہے یا نہیں' تھینک یو سلجوق کے لیے کہوں گی تھینک یو راشدہ' باقی سب تحریریں بہت اچھی تھیں۔

ج۔ پیاری فہمیدہ! سطوت کی والدہ کے کپڑے گیلے ہونے پر حیرت کیسی؟ بے ڈھنگی اور بدسلیقہ خواتین کا مال کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے اور قرض لینے والوں کو تو بھولنے کی بیماری ہی رہتی ہے۔ قرض لے کر بھول ہی جاتے ہیں۔ ویسے سطوت نے پیسے کسی غیر سے نہیں لیے ایک اس کے چچا کا بیٹا تھا اور اس نے پیسے دے کر سطوت پر احسان نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا۔

نمرہ احمد اور مظہر کلیم....؟ ان دونوں مصنفین کی تحریروں میں تو کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ آپ کی پسند میں کافی تضاد ہے۔

روزینہ نعیم' یاسمین ساجد....گوجرانوالہ کھیالی

علیزے طاہر اور جاوید شیخ سے ملاقات اچھی رہی' پلیز ہاشم ندیم کا انٹرویو بھی شائع کریں۔ ''دشت جنوں'' کیا کہوں خوب صورت کہانی۔ آنو شمنی جان ہے کہانی کی۔ کیف کے کردار کو زیادہ دکھایا کریں' شاہ میر تو بالکل اچھا نہیں لگ رہا' ویسے یہ ہی خوش نصیب کا دماغ سیدھا کرے گا۔ آئے کت بالکل نہ سمجھ میں آنے والا کردار الجھن سی محسوس ہوتی ہے پڑھ کر ''میں نے کچھ نہیں کیا'' ہلکی پھلکی تحریر ''خلائی مخلوق'' بچی دل کو چھو جانے والی تحریر بالکل فٹ لڑکیوں پر۔ تھینک یو سلجوق ایویں ہی کھڑوس ای حد ہے بھائی معید کے لیے تو بس لوزر ہی لفظ یاد آیا۔ ''مالک'' دکھی کر گئی' لیکن بہت اچھی تحریر۔ اچھی بہو کا ٹائٹل تو کھڑوس ساس ہونا چاہیے تھا ہاہا۔ معذرت سمیرا گل۔

سمیرا حمید پیچیدہ تحریر' پہلا لفظ پڑھتے ہی پتا چل گیا مشکل تحریر ہوگی۔ صندوق گیا کہاں؟ مکمل ناول کو ابھی پڑھا نہیں تو اس لیے زبان بند ہے۔ نمل ہے تو میرے ہاتھوں کے طوطے چڑیاں سب اڑا دیے۔ خدارا زمر کو کچھ نہ کیجیے گا پلیز۔ وہ تو جان ہے نمل کی' نثار بس اللہ کرے اس آبدار کو نمل ہی کرے زہر لگتی مجھے۔

ج: پیاری روزینہ اور یاسمین! شکایتیں ہی شکایتیں اور یہ محبت کی کوئی سی ادا ہے کہ پیارے بھائی فارس کو قاتل بنانا چاہتی ہیں۔ اور بے چاری آبدار تو پہلے ہی دل و جان ہار چکی۔ اور اب کتنا ماریے گا نثار ہیں اسے؟

عائشہ صدیقہ راجپوت..... گوشالہ' چیچہ وطنی

"اعجاز کا رنگ" میں راؤ سمیرا ایاز نے عمیرہ احمد کے جس ناول کا ذکر کیا ہے اس کا نام "حاصل" ہے۔ لڑکے کا نام حدید اور لڑکی کا نام ثانیہ ہے۔

آب حیات کی آخری قسط کا سن کر دل ہول اٹھا' اتنی جلدی اور امامہ نے حمین سے جو یہ کہا کہ رئیسہ اچھی لڑکی ہے اس کا کیا مطلب تھا۔ کیا وہ حمین اور رئیسہ کے رشتے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ لگتا ہے لاسٹ کافی انٹرسٹنگ ہونے والا ہے۔

نمل میں اس بار قرآن پاک کی تفسیر کافی کم تھی۔ اور یہ کیا پلیز زمر کو مارنا نہیں' پلیز نمرہ جی پلیز نمل کی اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ دشت جنوں کافی اچھی اسٹوری ہے۔

اس کے علاوہ موسم کے پکوان سے رس گلے بنا کے دیکھے۔ وہ بہت سخت بنے گیا۔ واقعی اس میں بیکنگ پاؤڈر نہیں ڈلتا کیونکہ مجھے کسی نے کہا ہے کہ رس گلوں میں بیکنگ پاؤڈر بھی ڈالنا' بالوشاہی کی ترکیب میں آدھا کپ گھی میں جب آدھا کپ میدہ ڈالو تو وہ تو ویسے ہی بہت پتلا سا مکسچر بن جاتا ہے اس میں مزید کیا پانی ڈالنا۔ یوں میرے بالوشاہی بھی خراب بنی اور امی سے اچھی خاصی ڈانٹ پڑی۔

ج: پیاری عائشہ! بیکنگ پاؤڈر رس گلوں میں ڈالنا ضروری نہیں ہے رس ملائی میں ڈالنا ضروری ہے۔ رس ملائی کی نسبت رس گلے قدرے سخت ضرور ہوتے ہیں لیکن بہت سخت نہیں' ممکن ہے کہ آپ کے رس گلے زیادہ سخت ہوگئے ہوں۔

گھی جما ہوا ڈالتیں تو میدہ پتلا نہ ہوتا پتلا ہوگیا تھا تو پانی ڈالنے کی ضرورت بالکل نہیں تھی۔ "آب حیات" شروع ہوا تھا تو ختم ہونا ہی تھا آپ کی پسندیدہ تحریر تھی اس لیے آپ کو لگا کہ جلد ختم ہوگیا۔

رضوانہ شکیل راؤ..... لودھراں

ٹائٹل اچھا تھا۔ ماڈل گرل کا میک اپ زبردست تھا۔ "کرن کرن روشنی" میں خواب اور ان کی تعبیر کے بارے میں تفصیل سے پڑھ کر مزید معلومات میں اضافہ ہوا۔

دشت جنوں زبردست تو نمل..... ٹاپ پہ جا رہی ہے۔ خواب اور زندگی راؤ سمیرا ایاز جی اچھی تھی۔ نمرہ اقراء کی ڈائری سے غزل پسند آئی نادیہ نجمہ کے رونے کے انداز کے کیا کہنے بھئی۔ ثریا شاہ آبرو' نسرین' آرم کے اشعار اچھے تھے۔ سلسلہ ہمارے نام رسالے کی جان۔ ایک دوسرے سے آدھی ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ مصنفین کی اصلاح بھی ہوتی ہے بشرطیکہ تنقید برائے اصلاح ہو اور کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ام ہالہ کا خط پڑھ کر لگا جیسے انہوں نے میرے دل کی بات کہہ دی' تھینکس ہالہ جی۔ "عمر سعید بھائی کی وفات کا پڑھ کر اس قدر رنج ہوا کہ مجھے وہ الفاظ ہی نہیں مل رہے جس کے ذریعے میں اظہار افسوس کر سکوں اللہ تعالیٰ ان کی پوری فیملی کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ایک ریکویسٹ ہے آپ سے کہ پلیز بانو قدسیہ کا کوئی نیا انٹرویو ضرور دیں۔ کوثر خالد جی آپ نرالی کریں یقیناً" آپ ایک دلچسپ افسانہ لکھ سکتی ہیں جو اس ٹینشن کے دور میں موڈ ایک دم فریش کردے۔

ج: پیاری رضوانہ! آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ ہم آپ سے متفق ہیں کوثر خالد میں صلاحیت ہے' وہ افسانہ لکھ سکتی ہیں۔ ہم ان تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

مشعل فیاض..... گوجرانوالہ

کرن کرن روشنی ہمیشہ کی طرح روشنی بکھیر رہی تھی۔ راؤ سمیرا ایاز کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ نخرے والی عنیزہ طاہر کا انٹرویو بھی نخرے والا تھا۔ جاوید شیخ سے ملاقات بھی ٹھیک رہی۔ ابن القلم بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ میری ماما نے تو چار دفعہ کہانی پڑھی۔ زبردست سمیرا

حمید۔ میمونہ صدف نے کمال کا لکھا۔ خلائی مخلوق پرانا موضوع۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ ہنسانے کی ناکام کوشش۔ خواب' روپ' زندگی ٹھیک ہی تھی۔ آمنہ ریاض جلدی سے آیو شیمنی کا راز کھول دیں۔ اور سارے کریکٹرز کا آپس میں تعلق بھی جلدی سے بتادیں۔ راشدہ رفعت نے بہت خوب لکھا۔ پڑھ کے مزا آگیا۔ عنیزہ سیدہ زبردست لکھا آپ نے۔ اچھی بہو اتنی اچھی تھی۔ اب آتے ہیں نمل کی طرف۔ زبردست ناول۔ یہ آبدار کا کمرہ۔ سعدی کو بچانے اور زمر کو مروانے کے لیے ایجاد ہوا ہے کیا؟ اب تو آخری قسط آنے والی ہے تو پلیز یہ بتا دیجیے۔ آپی سر پر لال

کفن (میرا مطلب لال اسکارف) لے کر کیوں پھرتی ہے۔ رنگا رنگ پھول بہت ہی عمدہ طریقے سے سجایا آپ نے۔ اس ماہ کا ڈائجسٹ کمال کا تھا۔ اور ہاں جاتے جاتے بتادوں ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔

پیاری مشعل! ہماری تو سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ اتنی پیاری سی آپی سے قارئین کو اتنی نفرت کیوں ہے کہ کوئی اسے برا بھلا کہہ رہا ہے' کوئی اسے قتل کرنا چاہتا ہے اور حد ہے آپ نے تو اس کے اسکارف کو کفن بنا دیا۔ کیا قصور ہے بیچاری کا؟ صرف یہی نا کہ وہ فارس سے محبت کررہی ہے۔ ویسے بھی فارس کو چار شادیوں کی اجازت ہے تو دو دلوں کے ملنے پر آپ لوگوں کو کیا اعتراض ہے۔ تھوڑا دل وسیع کریں' آپی کی محبت سے زمر کو اتنا دکھ نہیں ہورہا جتنا زمر کے چاہنے والوں کو ہورہا ہے۔

امبر خالد۔۔۔ کورنگی

خوب صورت سرورق' دلنشین ماڈل اور دلکش تحریروں سے مزین نومبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ حسب معمول سب سے پہلے ہمارے نام کی جانب پیش رفت کی مگر یہ کیا؟ ایک انتہائی افسوسناک خبر ہماری منتظر تھی۔ خوب صورت تخلیقی صلاحیتوں کے مالک عمر سعید کی موت کی خبر نے چند لمحوں کے لیے مخبوط الحواس سا کردیا ۔ہمارے لیے یہ اتنی روح فرسا خبر تھی تو بشریٰ سعید اس صدمے سے کس طرح نبرد آزما ہوئی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ عمر سعید مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

"ہمارے نام" کے بعد افسانوں کی جانب نظر ثانی کی تو جیسا کہ تمہارے کو لسٹ میں ایک افسانہ "ابن القلم" ٹاپ آف دی لسٹ تھا۔ تحریر کے اعتبار سے بھی وہ بلاشبہ ٹاپ آف دی لسٹ ہی تھا۔۔ ویلڈن سمیرا حمید۔ باقی چاروں افسانے بھی اچھے تھے مگر "مالک" کے مبہم سے اختتام نے ہمیں کچھ الجھا دیا ہے کہ آخر وہ موٹر مکینک تھا کون؟ سلسلے وار تینوں ناول بہت ہی خوب صورت انداز میں اپنے اختتامی منازل کی جانب رواں دواں ہیں۔ مکمل ناول میں "مقدر کب ہو سلجوق" راشدہ رفعت صاحبہ کی ایک بہترین کاوش تھی۔ ناولٹ "اچھی بہو" سمیرا عثمان گل کی تحریر بلاشبہ بے حد اثر انگیز تھی مگر اختتام کرنے میں مصنفہ نے انتہائی عجلت کا مظاہرہ کیا۔ عذرا بیگم جس ناعاقبت اندیشی کا

مظاہرہ ہو ذہن کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھیں ویسی ٹھوکر انہیں لگی نہیں۔ مکمل ناول "محبت' خواب' جزیرہ" پر تبصرہ محفوظ۔

ج۔ پیاری امبر! اچھی بہو جلدی ختم کروایا گیا' یہ احساس ہمیں بھی ہوا تھا لیکن چونکہ کہانی اپنی جگہ مکمل تھی اور اس کے ذریعے جو بات کہی گئی تھی وہ واضح تھی اس لیے ہم نے شامل کرلیا تھا۔

آپ کا افسانہ نومبر کے شمارے میں شامل تھا' عنوان تھا یہی نبض حیات ہے' شاید آپ کی نظر سے افسانہ نہیں گزرا۔

ساحرہ نیازی شرجیل۔۔۔ میانوالی

مجھے شمارہ دو تاریخ خواتین دس اور کرن پندرہ تاریخ تک مل جاتا ہے۔ رسالہ منگوانا بھی مسئلہ تھا لیکن اب کچھ سالوں سے نہیں بلکہ بالکل نہیں رہا۔ پہلے رسالہ شعیب (شوہر تب کزن تھے) لاتے تھے اس کے بعد دیور لاتا رہا پھر میرا اپنا بھائی بڑا ہوگیا ان کے بعد تیسرا کزن اور آج کل چوتھا کزن لا رہا ہے۔ پچھلے سال نومبر 2015 کا شمارہ میرا رہ گیا۔ آپ کو بولا بھی تھا کہ بھجوادیں۔ پتا بھی بھیجا لیکن آپ لوگوں نے نہیں بھجوایا (کوئی بات نہیں) رائٹرز مجھے ساری پسند ہیں۔ خاص طور پر سمیرا حمید (سمیرا آپ کی ہیروئن اوپر سے سادہ اندر سے سرپھری کیوں ہوتی ہے؟) نایاب جیلانی (نایاب جیلانی آپ کے ہیروز کھاتے بہت ہیں۔ سچی مان لیں ریکارڈ موجود ہے) سائرہ رضا (آپ کی نوال کو تو میں جانتی ہوں پچھلی گلی میں رہتی ہے) صائمہ

اکرم (آپ کی کالی یہاں گھوم رہی ہے کوئی جزدان بھی گم ہوئی تھی؟) نمرہ احمد سے کسی نے سوال کیا تھا کہ اگر آپ کی ہیروئن کے پاس گاڑی' لیپ ٹاپ اور موبائل نہ ہو تو وہ کیا کرے گی؟ (اگر یہ سب نہ ہو تو تب بھی وہ بہت کچھ کرے گی نمرہ احمد کی جو ہوئی) مجھے رائٹرز کی جوڑیاں بنانا

بہت پسند ہے جیسے (نبیلہ عزیز' مریم عزیز) (نمرہ احمد' عمیرہ احمد) (سائرہ رضا' ایمل رضا) (سمیرا حمید' سمیرا گل) (تنزیلہ ریاض' آمنہ ریاض) (فائزہ افتخار' رابعہ افتخار' مہوش افتخار) رسالوں کے ٹائٹلز اچھے ہوتے ہیں' کرن کے ساتھ جو کتاب ملتی ہے اس میں بھی گلے کے ڈیزائن اور قمیص کی کٹنگ (جو آج کل فیشن میں ہیں) ضرور دکھائیں۔

ایک آخری بات' وہ جو شعاع میں سلسلہ ہے "تجھ سے ناتا جوڑا ہے اس میں اب یہ لگانا چھوڑ دیں کہ اس ماہ ہم اس حوالے سے نیا سلسلہ شروع کررہے ہیں۔" (نیا سلسلہ اس ماہ سے نہیں 2015 جولائی سے شروع ہوچکا ہے۔)

ج:۔ پیاری ساحرہ! اجازت ہو تو رائٹرز کے بجائے ہم آپ کے سوالات کے جواب دے دیں۔ صرف سمیرا کی ہیروئن کا ذکر کیا ہمارے تو خیال میں ساری لڑکیاں ہی ایسی ہوتی ہیں۔ دوسرے نایاب کے ہیروز پکے پاکستانی ہیں۔ نمرہ کی ہیروئن کے پاس اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو وہ وہی کرے گی جو اسے کرنا چاہیے۔ اور یہ آپ کی جوڑیاں پڑھ کر تو ہم نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ صرف بہنیں ہی ہمارے ماہنامے میں لکھتی ہیں ورنہ تو فساد برپا ہوجاتا۔

عائشہ چوہدری۔۔۔ میرپور خاص

زندگی میں پہلی بار کسی ادارے کے نام اپنے الفاظ قلم بند کرانے کے لیے میں اپنے کاغذ اور قلم کو حوصلے سے تیار کررہی ہوں۔ ایک سائٹ ایریا گاؤں میں رہنے کی وجہ سے سہولیات کا بہت فقدان پر ستاروں پر کمند ڈالنے کی لگن عروج پر۔ بہت مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھی

ابھی تعلیم جاری ہے اور اگر اللہ کا کرم ہوا تو آگے بھی وہ راہیں نکالنے والا ہے' بس اپنی کوشش جاری رکھنی ہے۔

پیاری عائشہ! آپ کی لکھائی اور انداز تحریر بہت خوب ہے' محنت بھی کررہی ہیں' اللہ پر بھروسا رکھیں' وہ آپ کے لیے کچھ کرنے کی راہیں ضرور نکالے گا۔ ان شاء اللہ۔

اور یہ کیا جی تین فل اسکیپ کاغذ پر مشتمل خط اور پرچے کے بارے میں کچھ بھی نہیں؟

حمیرا نذیر۔۔۔ خان گڑھ

نمل کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ نمل بہترین ناول ہے۔ کوئی اور اسٹوری مجھے نمل سے زیادہ تو کیا مجھے اس کے پاسنگ بھی نہیں لگتی۔

نمرہ آپی! کیا آپ زمر کو قتل کروا کر ساری جان نکالنا چاہتی ہیں؟ کیا آپ کسی اور کو نہیں مار سکتیں۔ جیسے شیطان ہاشم' میں آپ کو ایک مشورہ دوں جو ہاشم کی کمپنی ناقص کوئلہ تیار کرتی ہے ان کوئلوں کو اکٹھا کرکے جلا کر ہاشم کو اس کے اندر ڈال دیں۔ ہاشم شیطان یہی ڈیزرو کرتا ہے۔ زمر زندہ نہ رہی تو پھر میرا حال غازی سے بھی برا ہوجائے گا۔ آپ جانتی تو ہیں فارس غازی نے کبھی آب دار کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ تو پھر آپ اس چڑیل کی طرف سے دی گئی بددعا کو کیوں قبول کروانا چاہتی ہیں۔

ج:۔ پیاری حمیرا! چھ صفحے کا خط صرف زمر کی محبت اور آپی اور ہاشم کے لیے بددعاؤں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تو کہانی ہے حقیقت نہیں کیا آپ اپنے اردگرد ایسی حقیقتیں نہیں دیکھتیں؟ کیا آپ نے عافیہ صدیقی جیسی ذہین' قابل' حافظ قرآن خاتون کا انجام نہیں دیکھا جو پاکستان میں ایک یونیورسٹی بنا کر دنیا کے بہترین دماغ وہاں جمع کرنا چاہتی تھی۔ اس کو مشرف نے امریکہ کے حوالے کردیا۔ مقامات آہ و فغاں بہت ہیں۔ ایک کہانی کے لیے اتنا جذباتی نہ ہوں۔ ویسے نمرہ احمد سے اتنی درخواستیں کرنے کے بجائے زمر کی نجات کا کوئی طریقہ سوچ کر لکھ بھیجتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ اور اتنی پیاری آپی کے لیے اتنی بددعائیں؟ دشمن کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرتے ہیں اور پھر آپی کا قصور اتنا بڑا تو نہیں ہے۔

سبل نقوی' یاسمین حنفی۔۔۔ کراچی

سب سے پہلے انشاء جی کا کالم پڑھا۔۔۔ زبردست "نمل" میں کیا کہوں' اس ناول کے بارے میں؟ ایسے

سین پر کہانی لاکر روکتی ہیں کہ دل کرتا ہے کہ بس کیا سے کیا کروالیں پر ہم ٹھہرے پاکستانی عوام جنہیں انتظار کرنے کی عادت ہے' بجلی کا انتظار' بجلی آئے تو کیبل کا انتظار' کیبل

آئے تو ڈرامے کا انتظار اور حد تو یہ ہے کہ ڈراما دیکھتے ہوئے بھی ڈرامے کا انتظار کیوں کہ ہم انتظار نہیں کریں گے تو یہ چینلز کیسے چلیں گے بھئی اشتہارات سے نا! خیر "آب حیات" کے لاسٹ میں "اگلے ماہ آخری قسط" پڑھ کر خوشی سے زیادہ تشویش ہوئی کہ ابھی بہت کچھ رہتا ہے پھر پلیز کہانی کو لپیٹ کر نہ رکھ دیں۔ "وحشت جنوں" ابھی پڑھا نہیں۔ "اچھی بہو" ناولٹ کے نام کا اثر کہانی میں کہیں نظر نہیں آیا۔ ہاں "خاندانی بہو" رکھ دیتیں نام۔ محبت' خواب' جزیرہ' دوسری قسط پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔ ویسے موم بتی بھی ختم ہونے والی ہے (آپس کی بات ہے ویسے)

ج:۔ پیاری بے بی۔ ناحق موم بتی کا خرچا کیا۔ سورج کی روشنی میں' دن کے اجالے میں لکھ لیتیں مگر خیر آپ ٹھہریں پاکستانی جو کسی بھی چیز کی قدر نہیں کرتے' شکوے شکایت ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

زینت' شبانہ۔۔۔۔ فیصل آباد

نمرہ آپی پلیز زمر کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تو فارس اور زمر نے زندگی بھی انجوائے نہیں کی۔ زمر اور فارس کا ایک دوسرے سے محبت کرنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ آپی' آپ نے آیتوں کی تفسیر چھوڑ دی ہے۔ آپ تفسیر کرتی ہیں تو دل کرتا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لیں۔ اور ہاشم کا انجام جیسا ندرت نے کہا ہے۔

"تمہاری سب سے بڑی سزا پتا ہے کیا ہونی چاہیے؟ تمہیں ہدایت مل جائے اور پھر تم ساری زندگی اپنے گناہوں کو یاد کر کے پچھتاتے رہو۔" سرور فاطمہ ہنی کا خط بہت اچھا لگا۔ آپی اور ہاشم کی شادی کر دیں۔ دونوں ایک دوسرے کو ڈیزرو کرتے ہیں۔ "آب حیات" واہ عمیرہ احمد کیا بات ہے آپ کی۔ حمین کا کردار بہت اچھا ہے۔ امامہ اور سالار سکندر کی زندگی بہت اچھی گزری ہے۔ امامہ اتنی محبت ڈیزرو کرتی ہے۔ پلیز سالار کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ کہانی کا ہیپی اینڈ ہونا چاہیے۔ میری زینی کی شادی ہونے والی ہے۔

سائرہ رضا اور سمیرا حمید کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ آپی میں نے پوچھنا تھا کہ عشاء کی نماز سے پہلے اگر سو جائیں تو پھر نماز نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات کا جواب ضرور دیجیے گا۔ کرن کرن روشنی میں اس کو تفصیل سے بیان کریں۔ میں نے سنا ہے۔ لیکن آج تک بھی پڑھا نہیں ہے وہ بھی بڑوں سے۔

پیاری زینب اور شبانہ! آپ کی زینی کو شادی کی مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے نصیب میں ڈھیر ساری خوشیاں لکھ دے۔ کوئی دکھ اس کو چھو کر بھی نہ گزرے۔

ساجی عاصم۔۔۔۔ ٹنڈو آدم

ٹائٹل بہت پیارا سا تھا مگر نمل کا تجسس' اتنا تھا کہ بس سرسری سا دیکھ کر بھاگ لیے نمل کی طرف۔ لیکن کیا یہ ستم نہیں قارئین پر آپ ایسے نازک موڑ پر ختم کر دیتے ہیں ناول کو۔ جانے کتنی بے ہوش ہوئی ہوں گی۔ یہ تو خبر ہے مجھے کہ زمر نے نہیں مرنا۔ یا تو ہاشم مرے گا۔ یا جواہرات' اور شہری کو بھی سزا ضرور دینا۔ اور یہ ہاشم ہر چیز اس کی تابع ہے۔ حد ہے یار۔ کیسے زمین کے خدا بنے بیٹھے ہیں۔ اللہ غارت کرے ایسے لوگوں کو۔ یہ آپی کو تو اللہ کرے دل کا دورہ پڑ جائے۔

عنیزہ سید کو اتنے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ مگر یہ کیا باقی آئندہ دیکھ کر منہ کا ذائقہ ایسا ہو گیا ہے جیسے نیم کا شربت یا کریلے کی بریانی کھالی ہو۔ سمیرا حمید کا "ابن القلم" تو جیسے شعور کی تیسری آنکھ کھول گیا۔

ج:۔ پیاری ساجی! طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور یہ کیا بھئی' آپ بھی آپی کو بددعائیں دے رہی ہیں۔ ہم تو یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بے چاری آپی کا قصور کیا ہے۔ آپ کے شاگرد رشید انجاز کے لیے دعائیں۔

عنبر عتیق الرحمٰن۔۔۔ لاہور

7 تاریخ کو شمارہ ملا۔ حسب معمول پہلے فہرست دیکھی کہ کسی قسط کا ناغہ تو نہیں ہے۔ دیکھ کر اطمینان قلب حاصل ہوا۔ شروع سے آخر تک نمرہ نے گویا کسی سحر میں جکڑے رکھا بلکہ صرف اسی قسط کی بات کیوں کریں انہوں نے تو شروع قسط سے ہی ہمیں مسحور کر رکھا ہے۔ سب کردار بہت پسند ہیں۔ زمر اور فارس کی نوک جھونک اور ہلکا پھلکا رومانس بہت اچھا لگتا ہے۔

آب حیات میں جہاں سالار کی موجودگی سے اس کے

حیات ہونے کا اطمینان ہوا' وہاں نیا اسکینڈل شروع ہونے سے پریشانی بھی ہوئی۔ عمیرہ احمد بہت خوب صورتی سے ناول آگے بڑھا رہی ہیں۔

سمیرا گل عثمان کی تحریر کی "الجھان" تو اچھی تھی لیکن "سلجھان" بہت جلدی کی گئی۔ یعنی اتنے ڈھیٹ اور خود غرض لوگ صرف ایک واقعے سے ہی سنبھل گئے۔ ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ ویسے اچھی تحریر تھی۔

عنیزہ سید کی تحریر میں آخری صفحے تک پہنچنے سے پہلے ہی خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ ناول مکمل نہیں ہو سکے گا اور قسط وار ہو گا۔ خدشہ پورا ہونے پر دکھ ہوا۔ روایتی سی کہانی لگی۔ آمنہ ریاض کا ناول بہت اچھا لگتا ہے۔ سب افسانے اچھے لگے۔ سب سے اچھا عاصمہ فرحین کا لگا۔ مزاح کی چاشنی لیے یہ افسانہ بہت خوب صورت تھا۔ راؤ سمیرا ایاز کا افسانہ حقیقت کے قریب تھا۔ اللہ کرے حقیقی زندگی میں بھی سب بیٹیوں کے گھر والے اس افسانے کے اختتام کی طرح اپنا رویہ درست کر لیں۔ میمونہ صدف کا افسانہ اپنے مالک حقیقی پر یقین بڑھا رہا تھا۔ صائمہ نور کا افسانہ گھر میں عورت کی موجودگی کی اہمیت بتا رہا تھا چاہے وہ ماں ہو یا بیوی۔ سمیرا حمید کا افسانہ غرور کا سر نیچا کا سبق دے گیا۔ زینب کلثوم کا کردار زبردست تھا۔

ج:۔ پیاری عنیزہ چھ سال پہلے آپ کے دو خط شائع ہوئے اور دو شائع نہیں ہوئے۔ حساب برابر تھا تو دل ٹوٹنے کا کیا سوال؟ اور پھر ایسی شدت کی ناراضی کہ چھ سال خاموشی اختیار کیے رکھی۔ یہ اچھی بات تو نہیں ہے نا۔ زندگی میں بہت کچھ سہنا پڑتا ہے اور پھر بھی جینا پڑتا ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فائزہ بھٹی۔۔۔ پتوکی

اس بار شمارہ کافی لیٹ ملا مگر سرورق پر نظر پڑتے ہی ساری بے زاری ہوا ہو گئی۔ سب سے پہلے "دشت جنوں" پسندیدہ کردار ہے کیف کو واپس لائیے آمنہ جی۔۔۔ خوش نصیب جس طرح کی حرکتیں کرتی ہے' زندگی میں ایسے بندے صحیح معنوں میں تپ چڑھا دیتے ہیں۔

بعض جگہ وہ ٹھیک ہوتی ہے۔ مگر بعض دفعہ بالکل عجیب تر۔ آگے کت اور معاویہ کی کہانی ابھی کہانی ابھی بہت سی الجھنوں میں ہے۔ "آب حیات" ہائے اللہ عمیرہ جی اگلی قسط آخری اور اتنا کچھ ہونے والا ہے۔ اس سعد احسن کو تو کوئی مارے۔ اتنا عالم فاضل بننے کا فائدہ جب بولنا نہ آتا ہو (ہونہہ) اور ہاں یہ سالار سکندر کو پھانسی کس خوشی میں بھئی۔ سارے زمانے کو تختہ دار پر لٹکا دیجیے گا عمیرہ جی مگر سالار سکندر نہیں جبریل کے ساتھ بھی کچھ کم برا نہیں ہوا رہا۔ اب عبداللہ اس سعد احسن کی وجہ سے نظر انداز ہو گا۔ یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ "محمل" اس دفعہ رائٹرز نے سید حاول پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس مغرور ہاشم کو اللہ کرے سالار سکندر کی جگہ پھانسی ہو جائے (ٹھنڈ پڑ جائے دل میں) اف فارس کو یہ آپی لے ڈوبے گی۔ "محبت" "خواب جزیرہ" عنیزہ سید کا نام دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ ناول کوئی انوکھا سا نہیں ہو گا۔ ویسے یہ عنیزہ کی ہیروئن اتنی ڈرپوک کم ہمت اور کمزور دل ہوتی ہے اور ہیرو اتنا ہی فاسٹ 'سچویشن' کا وقت اور جگہ کیا خوب چنی عنیزہ نے۔ راشدہ رفعت کا "مقتیک یو مخلوق" اچھا ناول تھا۔ یہ بہت عجیب تھا بھئی جب پہلے کچھ نہیں کر سکے تو بعد میں ناکام محبت کی قبر پہ چادر چڑھانے کا فائدہ (ہاں بتاؤ)

"اچھے ہیں"۔ سمیرا کی کہانی نارمل تھی۔ یہ بہت ہائی اور نہ بہت لو' اتنے برے سسرال سے تو اللہ بچائے۔ سسرال بھی کسی بلا سے کم نہیں ہے۔ (ان کہانیوں میں تو ایسا ہی ہے) افسانوں میں سمیرا حمید کا "ابن القلم" سب سے بہتر رہا سمیرا تو پہلے ہی سوچ کر بیٹھی ہوئی ہیں لکھتا ہے اور سب سے الگ انداز میں۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔" متاثر کرنے میں ناکام۔ "مالک" میمونہ صدف' سمیرا کے بعد دوسرے نمبر پر رہیں۔ "خواب روپ اور زندگی" انوکھی کہانی تھی۔ "خلائی مخلوق" مردوں کی اس طرح کی بھڑکیں ایسے ہی غبارے میں ہوا ثابت ہوتی ہیں۔

ج:۔ پیاری فائزہ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

نقصان

ایک طرف ٹی وی پر گاگا کر ماڈل اپنے بالما سے مشروب پلانے کی فرمائش کر رہی ہے کوئی کھانا مزے دار لگنے کی خبر دے رہا ہے تو دوسری طرف ڈاکٹر عوام کو کہہ رہے ہیں کہ جھاگ دار مشروب (بھئی ہماری کولڈ ڈرنکس) کا ایک گلاس اگر روزانہ پی لیا جائے تو آپ بڑے آرام سے ذیابیطس (شوگر) کا شکار ہو سکتے ہیں۔

سائنس دانوں نے خبردار کیا ہے کہ ایک کین یا گلاس بوتل (کولڈ ڈرنکس) پی لی جائے تو اس کے انتہائی خوف ناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس قسم کے سافٹ ڈرنکس دن میں صرف ایک بار پیتے ہیں ان میں ذیابیطس کی ابتدائی علامتیں نمودار ہونے کے چھیالیس فیصد زیادہ امکانات ہوتے ہیں



یکسانیت

سننے میں آیا ہے کہ فواد خان دبئی میں ہونے والے بولی وڈ کے ایوارڈ شو کی میزبانی کریں گے۔ ان دنوں فواد لاہور میں ہیں۔ وہاں ہونے والی ایک تقریب میں گفتگو کرتے ہوئے فواد خان نے کہا کہ "مجھے فلم تک لے جانے کا سہرا پاکستانی ڈراموں کے سر ہے تاہم آج کل وہ ڈراموں میں اس لیے کام نہیں کر رہے کہ اب ڈراموں میں یکسانیت آتی جا رہی ہے۔ ان میں کچھ نیا نہیں ہو رہا (جب ہی تو ڈراما لکھنا اتنا آسان ہو گیا ہے کہ اب ڈراما۔۔۔ بھئی ہر "کوئی" لکھ رہا ہے یا لکھوا رہا ہے۔) تاہم جب بھی کوئی نیا اچھوتا اور اچھا ان کے پاس آیا وہ ضرور اس میں کام کریں گے۔ (سن لو بھئی۔۔۔ ڈراما لکھنے والے۔۔۔ لیوں لے۔) ویسے فواد کی اس بات کی تو ہم بھی حمایت کریں گے کہ ڈرامے کا معیار اب بہت گر گیا ہے۔

خبر

فرحان سعید اور عروہ حسین کی دوستی اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی دونوں جوڑی کے طور پر ہی پہچانے جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک ایوارڈ شو میں فرحان اور عروہ سے تین تین سوالات ایک دوسرے کے بارے میں کیے گئے۔ (کیوں۔۔۔؟) فرحان نے بتایا کہ عروہ کو کرینہ کپور پسند ہیں کھانے میں سبزیاں اور پسندیدہ رنگ گلابی ہے جب کہ عروہ حسین نے بتایا کہ فرحان سعید کو کالا رنگ اور کھانے میں چکن پسند ہے۔ عروہ یہ نہ بتا سکیں کہ فرحان کو اداکار یا اداکارہ کون پسند ہے۔ (عروہ کی ناپسندیدہ بھی تو ہو سکتی ہے۔۔۔؟) یہ ہم بتا دیتے ہیں کہ فرحان کو عامر خان پسند ہیں۔ تازہ خبر ہے کہ عروہ کو فرحان نے ایفل ٹاور پر جا کے پرپوز کیا ہے جو عروہ نے قبول کر لیا۔ (نہ کرنے کی صورت میں کس نے کس کو دھکا دینا تھا؟۔ یہ خبر ابھی نہیں آئی



درنہ۔)

(خواہ مخواہ اتنی دور گئے۔ کراچی میں کھارادر کے ٹاور پر جاکے پروپوز کرتے تو وہ تب بھی قبول کر لیتی بھائی)

لالچ

حنا دل پذیر نے حال ہی میں ایک فلم جیون ہاتھی میں کام کیا ہے۔ کام حنا دل پذیر نے اپنی ٹیم کے ساتھ کیا ہے۔ مصنف حسب معمول فصیح باری خان ہیں (فصیح باری خان حنا کو ذہن میں رکھ کر ہی کردار لکھتے



ہیں۔) یہ فلم ریلیز ہو چکی ہے۔ یہ فلم صرف ایک گھنٹے کے دورانیہ پر مبنی ہے لیکن ٹکٹ کی قیمت تین گھنٹے کی فلم کی ہے۔ سینما مالکان نے اس کی توجیہہ پیش کی ہے کہ وہ فلم کے دوران شائقین کو مفت ریفریشمنٹ دیا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ (غضب کیا تیرے وعدہ پر اعتبار کیا۔) فصیح باری خان کا اس بارے میں کہنا ہے کہ عام فلم بینوں کو اس طرح کی کوئی سہولت نہیں دی جا رہی ہے۔ جس کا ثبوت انہوں نے خود سینما گھر میں جا کر دیکھا۔ فصیح کا کہنا ہے کہ اس طرح فلم کا بزنس متاثر ہو رہا ہے۔ (فصیح خان باری! کیا فلم بینوں کا سینما گھر میں لانے کے لیے فلم کا اچھا ہونا ضروری ہے یا ریفریشمنٹ، سمجھ میں نہیں آیا....؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆۔ بدقسمتی سے ایسا طبقہ وجود میں آچکا ہے جو حسن نثار سے دانش، فرحان ورک سے فارن ڈپلومیسی، ساحر لودھی سے علم اور عامر لیاقت سے دین سیکھتا ہے۔

(سوشل میڈیا سے)

☆۔ کراچی کے امن کو کراچی والے مستقل نہیں سمجھتے۔ یہاں کا سب سے باخبر طبقہ کاروباری ہے۔ وہ میڈیا سے بھی زیادہ جانتا ہے کہ یہاں اندر خانے کیا چل رہا ہے۔ اس طبقے کے کئی بڑوں کا اتفاق ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، عارضی ہے۔

(امت رپورٹ)

☆۔ سندھ رینجرز کے ذمہ داران یہ کہتے نہیں تھکتے کہ انہوں نے اتنے ہزار آپریشن کیے یا اتنے ہزار آپریشن کیے، لیکن اس سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا کہ کتنوں کو سزا ہوائی۔ فاٹا سے پکڑے گئے جتنے دہشت گردوں کو پھانسی اور پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کراچی میں نہیں ہوا۔

(امت رپورٹ)

آہ انسان فانی - یاد باقی

آمنہ حسین شہداد پور

ہوئے نام ور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

زندگی ایک مہلت وقت... وقت گزر جاتا ہے مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا سے رخصت ہو بھی جائیں تو ان کا کام' ان کا نام زندہ رہتا ہے۔ تخلیق کار مر جاتا ہے' لیکن اس کے لفظ' اس کی کہانیاں زندہ رہتی ہیں اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ پیارے عمر سعید! دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مجھے آج تک یاد ہے جن دنوں "سفال گر" خواتین میں چھپا کرتا تھا' میں مین اسٹیج گرل تھی۔ کچھ اقساط پڑھ کر چھوڑ دیا' کچھ مشکل اور کچھ سلسلے وار کی وجہ سے مکمل پڑھنے کا اتفاق کچھ عرصہ پہلے ہوا۔ ناول پڑھتے ہوئے اس کی سطر سطر اپنے سحر میں جکڑتی چلی گئی اور یہی ناول عمر سعید سے رابطے کی وجہ بن گیا۔

وہ پرنیاں ہی تھی جس نے احساس دلایا کہ محبت پاکیزہ ہوتی ہے' محبت پاکیزہ رہتی ہے اور اسی محبت نے دنیا میں اسے تنہا کر دیا' مگر وہ اس محبت کے حصار سے نہ نکل پائی' یہاں تک کہ اس نے محبت کو پالیا۔

اے پرنیاں
اے پھولوں سے گندھی لڑکی
تم نے مجھ پر آشکار کیا
یہ دنیا محبت ہے' یہ زندگی محبت ہے

گرانٹ' وہ جو خواہشوں کی تکمیل چاہتا تھا' جو محبت کا ساتھ چاہتا تھا۔ جس کی خواہشیں پوری نہ ہوئیں اور جو قسمت کی اونچ نیچ میں محبت کو بھی ترستا رہا۔ محبت ملی بھی تو تب جب موت کا فرشتہ اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔

عمر سعید! آپ نے گرانٹ کا کردار تخلیق کر کے بتایا کہ نفرت انسان سے نہیں انسان کی غلطیوں اور گناہوں سے کی جانی چاہیے۔ ہم لوگ جو عام زندگی میں ہر اس انسان سے نفرت کرتے ہیں جو کسی برائی میں ملوث ہوتا ہے' مگر گرانٹ سے میں پھر بھی نفرت نہ کر سکی کیوں کہ عمر سعید آپ نے اپنے لفظوں کی جادوگری سے باور کروایا کہ نفرت انسان سے نہیں برائی سے کرو۔ انسان سے محبت کرنا اس کا حق ہے۔ سفال گر نے مجھے زندگی کے ایسے سبق سکھائے جو تمام عمر میرے لیے مشعل راہ ہیں۔ اتنے پیارے کردار تخلیق کرنے والے عمر سعید خود کتنے اچھے انسان تھے' کوئی ہم سے پوچھے۔ عمر! آپ ہمیں کیوں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمیں اور ادب کو ابھی آپ کی ضرورت تھی۔ آپ کے ان الفاظ کی ضرورت تھی جو امر ہو سکتے ہیں۔ اپنی وفات سے کچھ دن پہلے آپ نے بتایا کہ آپ بچھل پائی لکھ رہے ہیں۔ چند اقساط دے چکے ہیں اور آپ نے ہی کہا تھا کہ آنے والا ناول بہن آمنہ کے لیے گفٹ ہوگا اور میں انتظار میں کہ کب وہ موتی جڑے الفاظ پڑھنے کو ملیں' مگر بے رحم وقت نے اجازت نہ دی۔ حساس دل شاید دنیا کا درد سہہ نہیں پاتے اسی لیے جلد عدم کا سفر کرتے ہیں۔ آپ بھی شاید جوانی میں ہی دل ہار بیٹھے اور ابدی سفر پر روانہ ہو گئے اور اپنے پیچھے اپنے پرستاروں کو غمگین چھوڑ گئے۔ مرنے والوں کو کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ان کی قبر پر تاج محل تعمیر ہوتا ہے یا بارشوں میں دھنس کر گڑھا بن جاتی ہے' مگر پیچھے رہ جانے والوں کو بہت فرق پڑتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے گھر والوں اور معصوم دو پیارے بچوں کو صبر عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ابدی سکون و راحت عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ کا باورچی خانہ

نجیبہ گیلانی

1۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند' غذائیت' گھر والوں کی صحت؟

ہمارے گھر میں کوشش یہی ہوتی ہے کہ کھانا سب کی پسند ناپسند کو مدنظر رکھتے ہوئے پکایا جائے' مگر مشکل یہ ہے کہ سب کی پسند ناپسند ایک دوسرے سے کم ہی ملتی ہے جس کی وجہ سے اکثر کھانا دیکھ کر کسی ایک کا موڈ ضرور بگڑ جاتا ہے' ایسے میں آملیٹ یا کسی بچے ہوئے سالن سے کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کھانا سادہ ہی بنتا ہے جو کہ غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔

2۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے' کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کرسکیں؟

مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اس لیے ہمارے گھر میں مہمانوں کی خاطر تواضع بھی حسب توفیق کی جاتی ہے۔

ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی مہمان بن بلائے آئے۔ اکثر مہمان فون کرکے ہی آتے ہیں پھر بھی اگر اچانک کوئی آجائے تو وہی کھانا کھلاتے ہیں جو گھر والوں کے لیے پکا ہو۔ ساتھ میں چاول اور میٹھا بنالیا جاتا ہے اور ایسے وقت میں سب سے آسان کسٹرڈ سویاں بنانا لگتا ہے جو بننے میں زیادہ سے زیادہ تیس منٹ لیتی ہیں اور اس کی ترکیب کچھ یوں ہے۔

سویاں	ایک چھٹانک
ونیلا کسٹرڈ	ایک ساشے
دودھ	دو کلو
گھی	دو چمچے
چینی	حسب ضرورت
سبز الائچی	تین عدد
پانی	دو پیالی
ناریل	کٹا ہوا
بادام	پسے ہوئے

ترکیب:

دیگچی میں گھی گرم کرکے سبز الائچی ڈال دیں جب الائچی کی خوشبو آنے لگے تو سویاں ڈال کر کچھ دیر بھونیں۔ پھر پانی اور چینی ڈال دیں جب سویاں پک جائیں تو دودھ ڈال کر پانچ سے دس منٹ تک پکالیں پھر تھوڑے سے دودھ میں کسٹرڈ مکس کرکے ڈالیں اور دس منٹ تک پکائیں۔ آخر میں ناریل' بادام ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ مزے دار سی کسٹرڈ سویاں تیار ہیں۔

3۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ہر گھر میں کچن کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے' عورت کی سلیقہ مندی کچن سے ہی ظاہر ہوتی ہے یہ عجیب بات ہوجائے گی کہ مہمانوں کو تو ہم اچھے سے اچھا کھانا کھلانا پسند کریں' مگر جیسے ہی مہمان آپ کے کچن میں جائیں تو گندا سندا کچن ان کا منتظر ہو۔

میری یہی خواہش ہوتی ہے کہ کچن صاف ستھری حالت میں ہی رہے چیزیں بکھری ہوئی نظر نہ آئیں کچن میں نظر پڑتے ہی سکون کا احساس ہو ہر چیز اپنے ٹھکانے پر موجود ہو۔

مجھے اگر کچن میں کام کرنا ہو تب بھی میری خواہش ہوتی ہے کہ کچن صاف ہو تاکہ کھانا بناتے ہوئے بے چینی محسوس نہ ہو اس لیے میں پہلے کچن اور چولہا صاف کرتی ہوں پھر کھانا بناتی ہوں۔

ہاں! اگر مہمان زیادہ ہوں کام بھی زیادہ ہو پھر ذرا مشکل ہوتی ہے' میں روزانہ صفائی کے ساتھ ہفتہ وار صفائی بھی کرتی ہوں۔

4۔ ''صبح ناشتے میں کیا بناتی ہیں' ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہوں؟''

ہمارے ہاں عام طور پر ناشتے میں پراٹھے ہی بنتے ہیں جو کہ دہی' آملیٹ یا رات کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار نان چنے بھی ناشتے میں شامل کرلیے جاتے ہیں۔ سردیوں میں میتھی' آلو اور مولی کے پراٹھے دہی کے ساتھ کھانا پسند کرتے ہیں۔

5۔ آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں۔
(1) جب کوئی لے جائے۔ (2) کسی کی سالگرہ پر۔
(3) کسی خوشی کے موقع پر؟

ہمارے ہاں باہر کھانا کھانا پسند نہیں کیا جاتا' مگر جب بھی گھر میں مہمان یا میری دونوں بڑی بہنیں آئی ہوں تو رات کو سب مل کر آئس کریم یا برگر کھانے ضرور جاتے ہیں اور اس دن کو ہم سب مل کر خوب انجوائے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا رات کا کھانا کھانے کا موڈ نہ ہو تو برگر منگوا کر بھوک مٹا لیتی ہوں۔

6۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

موسم کے لحاظ سے ہمارے گھر میں کچھ نہ کچھ ضرور بنتا ہے جیسے سردیوں میں بیسن کا حلوہ' گجریلا' گنے کے رس کی کھیر' کافی اور چائے کے ساتھ پکوڑے.....

اور گرمیوں میں شیک' آئس کریم اور پیٹھے کا حلوہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر میں میٹھا بہت شوق سے کھایا جاتا ہے تو میٹھے میں اکثر مختلف چیزیں بنا کر گھر والوں کی تعریفیں وصول کرتی رہتی ہوں۔ میٹھے میں ''کریسپی سویٹ بریڈ'' کی ترکیب حاضر خدمت ہے' جو کہ میں جب بھی گھر میں بناؤں تو گھر والے کہتے ہیں۔ ''دل مانگے مور۔''

کریسپی سویٹ بریڈ

ڈبل روٹی	ایک پیکٹ
چینی	ایک کپ
گھی	حسب ضرورت
ناریل	باریک پسا ہوا
پانی	ڈیڑھ سے دو کپ

ترکیب:

سب سے پہلے بریڈ کو تکون سائز میں کاٹ لیں پھر فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے تمام بریڈ کے پیس ڈال کر فرائی کرلیں۔ اچھی طرح سنہری ہونے پر نکال لیں۔

پھر چینی اور پانی کو فرائنگ پان میں ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب چاشنی تیار ہوجائے تو اتار کر ٹھنڈا کرنے کے بعد تمام بریڈ کے ٹکڑوں کو چاشنی میں ڈال کر دو منٹ بعد نکال کر ٹرے میں سیٹ کرکے رکھیں پھر اوپر سے پسا ہوا ناریل چھڑک کر فریج میں ٹھنڈا کرکے کھائیں اور مجھے دعائیں دیں۔

7۔ اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

کوئی بھی کھانا تب ہی مزیدار بنتا ہے جب اس میں محنت اور محبت شامل ہو۔ اسی لیے میری بھی کوشش ہوتی ہے کھانا بناتے ہوئے ان باتوں کا بھی خیال رکھوں ---- میں اب آہستہ آہستہ ہی سہی مگر اچھا پکانے لگی ہوں کیوں کہ پہلے گھر میں میری بڑی سسٹر بناتی تھی۔ گھر والوں کو آج تک اس کا ذائقہ یاد آتا ہے' مگر مجھے بھی یقین ہے' ابھی تو کھانا بنانا شروع کیا ہے' جتنا عرصہ بڑی سسٹر نے پکایا' اتنے عرصے تک میں بھی ان شاء اللہ ماہر ہو ہی جاؤں گی۔

8۔ کچن کی کوئی ٹپ جو دینا چاہیں۔

کھانا بنانے سے پہلے بسم اللہ پڑھیں ان شاء اللہ کھانے میں برکت ہوگی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گاجر کا حلوہ

ضروری اشیا :

گاجر	ایک کلو
گھی	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
کھویا	آدھا پاؤ
چھوٹی الائچی پسی ہوئی	چار یا پانچ عدد
بادام' پستے	حسب ضرورت

ترکیب :

گاجروں کو اچھی طرح دھو کر کدوکش کرلیں اور دھیمی آنچ پر پکانے کے لیے رکھ دیں۔ اس میں چینی بھی ڈال دیں۔ گاجریں گل جائیں تو بھون لیں۔ اتنا بھونیں کہ پانی خشک ہو جائے۔ اب الائچی ڈال دیں اور گھی بھی ڈال دیں۔ آخر میں کھویا ڈال کر اچھی طرح مکس کردیں اور ڈش میں نکال کر بادام' پستے سے چھڑک کر گرما گرم پیش کریں۔

بیف نہاری

ضروری اشیاء :

گوشت	ایک کلو
دار چینی	دو ٹکڑے
بڑی الائچی	چار سے پانچ عدد
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
لونگیں	آٹھ سے دس عدد
جائفل	ایک عدد
جاوتری	چار سے چھ عدد
ثابت سیاہ مرچ	دس سے بارہ عدد
سونف	دو کھانے کے چمچے
سونٹھ	ایک چائے کا چمچہ

(ان تمام مسالوں کو گرائنڈر میں باریک پیس کر کسی بوتل میں رکھ لیں اور ضرورت کے مطابق تیار مسالا نہاری میں شامل کریں۔)

سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
لہسن' ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
آٹا	آدھا کپ
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
تیار نہاری مسالا	دو کھانے کے چمچے
پانی	حسب ضرورت

ترکیب :

دیگچی میں تیل گرم کر کے اس میں کٹی ہوئی پیاز ڈال کر گولڈن براؤن کرلیں اور گوشت ڈال کر بھون لیں۔ لہسن' ادرک پیسٹ' نمک اور نہاری کا تیار مسالا ڈال کر بھون لیں۔ اب اس میں دو سے ڈھائی لیٹر پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر ابال آنے تک پکائیں۔ اس کے بعد ہلکی آنچ پر دو سے تین گھنٹے پکنے دیں۔ جب گوشت اچھی طرح گل جائے تو حسب پسند شوربہ بنالیں۔ ایک کپ پانی میں آٹا جسے پہلے سے بغیر گھی کے بھون رکھا ہو گھول کر تھوڑا تھوڑا شامل کریں اور مسلسل چمچہ چلاتی رہیں اور مزید چالیس سے پینتالیس منٹ پکائیں۔

مزے دار نہاری تیار ہے' ڈش میں نکالیں۔ کٹی ہوئی' ہری مرچ' ادرک کے اور لیموں سے سجا کر گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

عنوان

گھریلو الجھنیں

ایک بہن

دسمبر میں جب میرا خط شائع ہوا تھا۔ اس دسمبر کی آخری دوپہر بڑی بے رحمی سے مجھ سے میری پیاری امی جان کو جدا کر گئی۔ ان کی ملاقات کے بعد میں کافی بیمار پڑ گئی اور گھر کی ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔
چھوٹی بہنیں جو ہاتھ تو بٹاتی تھیں۔ مگر پڑھائی کی مصروفیات کی وجہ سے گھر کو زیادہ ٹائم نہیں دے سکتی تھیں۔ لہٰذا زیادہ بوجھ مجھ پر آ گیا۔

میری بیماری اور حالات کو دیکھتے ہوئے میرے بابا جان نے بڑے بھائی کی شادی کر دی۔
اب مسئلہ یہ ہے کہ ہماری بھابھی گھر کی ذمہ داری سے کتراتی ہے۔ وہ صرف اپنے شوہر تک محدود رہتی ہے۔ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ ماں کی طرح اس کا احترام کریں، ہر بات اس سے پوچھیں اور کہیں جانے سے قبل اس سے اجازت لیں اور برا یہ ہے کہ یہ سب کرنے اور گھر کی ذمہ داری بھی لینے کے باوجود بھابھی ہمارے بھائی کو ہمارے خلاف کرنے میں لگی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھائی ہم سے اچھے رویے سے پیش آنا تو دور، بات بھی نہیں کرتا۔
گھر کے سکون کو بنائے رکھنے کے لیے میں ہر بات پر خاموش ہو جاتی ہوں۔ مگر یہ خاموشی میرے اندر ایک طوفان برپا کیے رکھتی ہے۔ جس سے صرف میں ہی واقف ہوں۔
ہم نے اپنے بھائی کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ کچھ ایسا مشورہ دیں کہ بھابھی جب زیادتی کرے اور بھائی ڈانٹے تو میں اپنے دل کو تسلی دے سکوں اور انتقامی خیالات کو ذہن سے جھٹک سکوں۔

ج : عزیز بہن! بہت اچھی بات ہے کہ آپ لڑائی جھگڑا نہیں کرتیں لیکن بری بات یہ ہے کہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی ہیں۔ آپ بھائی اور بھابھی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ بھابھی اپنی فطرت نہیں بدل سکتیں اور بھائی آپ کی خاطر اپنی بیوی کو ناراض نہیں کرے گا۔ لیکن آپ اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کریں۔ اپنے اور اپنی بہنوں کے کام خود کریں۔ صبر اور خاموشی کو اپنا ہتھیار بنا لیں۔ آپ کو ہمیشہ اس گھر میں نہیں رہنا۔ شادی کے بعد آپ اپنے گھر چلی جائیں گی اور آپ کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی مناسب وقت پر اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔ اپنی تسلی کے لیے صرف ایک جملہ یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔
"اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

صائمہ علی....سیالکوٹ

ہم دو بہن بھائی ہیں۔ بھائی بڑے ہیں۔ امی ابا کو بھائی کی شادی کا قدرتی طور پر بے حد ارمان تھا لیکن ان کی خواہش تھی کہ پہلے میری شادی ہو۔ میرا رشتہ بچپن سے پھوپھی کے ہاں طے تھا، میں چاہتی تھی کہ پہلے بھائی کی شادی ہو جائے تاکہ میرے گھر سے چلے جانے کے بعد امی ابا کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔ بھائی خوش شکل، تعلیم یافتہ اور برسرروزگار تھے۔ گھر ہمارا اپنا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ خاندان میں ان کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ ویسے بھی ہمارا خاندان بہت مختصر ہے۔ ایک رشتہ کرانے والی خاتون نے ہمیں کئی لڑکیاں دکھائیں۔ ایک لڑکی ہمیں بہت اچھی لگی۔ مڈل کلاس گھرانے سے تعلق تھا۔ انٹر پاس تھی، والدہ بیمار رہتی تھیں اس لیے پڑھائی چھوڑ کر گھر سنبھالنا پڑا تھا۔ بھائی کو بھی لڑکی کو دکھایا گیا تھا۔ بھائی ان کے گھر گئے تھے لڑکی نے بھی —— شادی سے پہلے بھائی کو دیکھا تھا۔ رشتہ طے ہونے کے بعد فوراً ہی شادی کی تاریخ طے کر لی گئی کیونکہ پھوپھی کو شادی کی جلدی تھی۔ ہم لوگ

شادی سے پہلے ان کے گھر وہ ایک بار گئے' لیکن لڑکی سے ملاقات نہ ہوسکی بھی وہ شاپنگ کے لیے گئی ہوتی' کبھی کسی بہن کے گھر ہوتی۔ خیر شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد بھابھی کا جو روپ سامنے آیا۔ وہ ہمیں ششدر کر گیا۔ ہمارے تصور میں بھی نہ تھا کہ ایسے عجیب و غریب حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ رخصتی کے بعد جب میں اپنی کزنز کے ساتھ بھابھی کو بھائی کے کمرے میں لے کر گئی تو بھابھی نے مجھ سے جائے نماز مانگی' اس کے بعد ہمیں کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ ہمیں حیرانی تو بہت ہوئی برا بھی لگا کزنز بھی جو ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ یک دم چپ ہو گئیں۔ ہم سب باہر نکلے تو انہوں نے فوراً" دروازہ لاک کر لیا۔ بھابھی ساری رات نماز پڑھتی رہیں۔ پھر بھائی نے اور ہم سب نے لاکھ کوشش کی' انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ گھر میں چونکہ مہمان تھے اس لیے ہم نے خاموشی اختیار کی۔ بھائی گھر کے پچھلے دروازے سے باہر چلے گئے اور ہوٹل میں رات گزاری کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ خاندان میں کسی کو پتا چلے اور مزے کی بات یہ کہ دن میں بھابھی نے کوئی نماز نہیں پڑھی اور سارا دن سوتی رہیں۔

یہ پہلا دن تھا اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آگے ہمیں کیا کیا نہیں بھگتنا پڑا ہوگا۔ بھائی کا مہر پانچ لاکھ تھا' طلاق بھی نہیں دے سکتے تھے۔ میکے والے تو ایک طرح سے اپنے سر سے بوجھ اتار کر فارغ ہوگئے تھے۔ ہم نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ اس کے اوپر سایہ ہے۔ جنات آتے ہیں۔ جب ایسی کیفیت ہو تو اسے چھیڑا نہ جائے اور چپ چاپ اس کی بات مان لی جائے۔ اب بھابھی کا حال یہ ہے کہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ بھائی کے ساتھ بھی لاتعلقی کا رویہ ہے۔ دل چاہتا ہے تو بات کر لیتی ہیں ورنہ گھنٹوں گم صم بیٹھی رہتی ہیں۔ کبھی بلاوجہ رونا شروع کر دیتی ہیں' کبھی کسی نادیدہ شخص سے لڑائی شروع کر دیتی ہیں۔ آپ بتائیں کیا واقعی جنات کا کوئی وجود ہے؟ ہم نے کئی عاملوں کو بھی دکھایا' وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان پر سایہ ہے۔ جنات ان پر قابض ہیں۔

ج۔ اچھی بہن! جنات کا وجود ہے۔ قرآن پاک میں بھی جنات کا ذکر ہے' لیکن یہ قطعاً" غلط ہے کہ جنات انسان پر قابض ہو سکتے ہیں یا انسان کے اندر حلول کر سکتے ہیں نہ ہی کسی کتاب میں ایسا کوئی حوالہ ہے جہاں تک عاملوں کی بات ہے تو ظاہر ہے وہ یہ نہیں کہیں گے تو ان کا کاروبار کیسے چلے گا۔

دراصل یہ ذہنی بیماری ہے۔ دماغ میں کچھ اجزا کی کمی سے یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ آپ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے باقاعدہ ان کا علاج کرائیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ علاج سے ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس طرح کے کیسوں میں ستر فی صد مریضوں کو دواؤں سے فائدہ ہوا ہے' یہ ضرور ہے کہ یہ بیماری جلدی ٹھیک ہونے والی نہیں کبھی تو سالوں لگ جاتے ہیں اور کبھی کبھار زندگی بھر دواؤں کا استعمال جاری رکھنا پڑتا ہے' لیکن خدارا عاملوں کے چکر میں نہ پڑیں۔ اس سے وقت اور پیسے کے زیاں کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

آپ کے بھائی نے اپنی حیثیت سے زیادہ مہر رکھا' یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ عموماً" سوچ یہ ہوتی ہے کہ مہر دینا تو ہے نہیں' جتنا چاہے رکھ لو' لیکن یہ سوچ غلط ہے۔ مہر کی ادائی فرض ہے اور مہر کو حیثیت کے مطابق مناسب ہونا چاہیے تاکہ ادائی مشکل نہ ہو۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



حرا کاشف۔۔۔ کراچی

س: 1 ۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پہ مستہ نما سیاہ تل ہے، وہ ویسے تو خوب صورت لگتا ہے، مگر اس پر بال نکل آئے ہیں۔ پہلے صرف ایک بال تھا جو میں نے اکھاڑ دیا، اس کے بعد کئی بال نکل آئے۔ ابھی میری عمر صرف بائیس سال ہے، جب عمر زیادہ ہوگی تو نہ جانے کتنے بال ہو جائیں گے۔ تل ہونٹوں کے نیچے ٹھوڑی پر ہے۔ براہ مہربانی اس کا کوئی ایسا حل بتائیں، جس پر عمل کرکے مجھے ان ناپسندیدہ بالوں سے نجات مل جائے۔

2 ۔ میرا دوسرا مسئلہ دبلا پن ہے۔ میرا قد پانچ فٹ ساڑھے تین انچ ہے، مگر میرا وزن 44 کلو ہے۔ جو عمر اور قد کے حساب سے کم ہے۔ میں اسی وجہ سے دیکھنے میں بھی چھوٹی لگتی ہوں، ہومیو پیتھک علاج کیا تھا، مگر خاص فرق نہیں پڑا۔ پھر حکیمی شربت پیے۔ وقتی فرق پڑ گیا۔ پھر وہی ہوگئی، ایلو پیتھک ادویات سوٹ نہیں کرتیں، کوئی مناسب علاج بتائیں، کھانا نہیں کھایا جاتا، کام زیادہ کرنا پڑتا ہے، نیند مناسب لیتی ہوں، پانی کم پیتی ہوں۔

3 ۔ تیسرا مسئلہ میری رنگت کا ہے۔ میرے ہاتھ پیر اور گردن کا رنگ تو بہت صاف ہے، مگر چہرے کا رنگ کم ہے۔ چہرے پر پژمردگی چھائی رہتی ہے۔ بیماروں والا چہرہ لگتا ہے۔

ج: بہن حرا کاشف آپ کے سوالات کے جواب حاضر ہیں۔

1 ۔ تل کے اوپر جو بال نکلتے ہیں۔ ان کو نوچنے سے کھینچ کر نکال دیں، اس کا سب سے بہتر اور آسان علاج یہی ہے۔ آپ چونکہ کراچی میں رہتی ہیں، اس لیے الیکٹرولائسس کے ذریعے بھی بال نکلوا سکتی ہیں۔ اس طریقے سے بال نکلوائیں تو تقریباً چھ ماہ تک بال دوبارہ نہیں آتے۔ کسی بھی اچھے بیوٹی پارلر سے رجوع کیا جائے تو آپ کا یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

2 ۔ عمر اور قد کے لحاظ سے آپ کا وزن بالکل صحیح ہے، وزن بڑھانے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ وزن بڑھانا بہت آسان ہے، لیکن بڑھے ہوئے وزن کو کم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یوں بھی 30 سال کی عمر کے بعد وزن خود بخود بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ وزن کی کمی آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ چہرے کا پیلا پن اور پژمردگی اصل سبب ہے۔ اس بنا پر آپ کمزور لگتی ہیں۔

گاجر کا موسم آگیا ہے۔ گاجر میں خون صاف کرنے اور جلد کو سرخی مائل شگفتہ کرنے کی خاص خوبی ہے۔ اگر آپ نے باقاعدگی سے کچی گاجر کا رس استعمال کیا تو جلد میں ایسی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو جائے گی کہ آپ خود بھی حیران رہ جائیں گی۔ کچی گاجر دوپہر کھانا کھانے سے پہلے کھائیں اور ممکن ہو تو صبح نہار منہ ایک گلاس گاجر کا جوس پئیں۔ گاجر کا جوس پینے کے آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے بعد دودھ کا ایک گلاس پی لیں تو یہ آپ کی صحت پر غیر معمولی اچھے اثرات پیدا کرے گا۔ جلد سرخ و سفید اور شفاف ہو جائے گی۔ آنکھیں چمک دار اور پرکشش ہو جائیں گی۔

ادویات استعمال کرنے کے بجائے سبزیاں اور پھل کھائیں۔

شاہدہ رانا۔۔۔ لیہ

س: پلیز باجی! میری ہیلپ کریں۔ میری عمر پندرہ سال ہے اور میری آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے ہیں، جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میں نیند بھی پوری لیتی ہوں، دودھ اور پھل بھی استعمال کرتی ہوں، وٹامن سی کی گولیاں بھی کھاتی ہوں۔

ج ۔ شاہدہ! ابھی آپ کی عمر بہت کم ہے۔ اس عمر میں جسم کی نشوونما کے لیے اچھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ کی آنکھوں کے گرد حلقے ہیں تو جسم میں کچھ اجزا کی کمی ہے۔ اچھی غذا کے ساتھ ساتھ درج ذیل مشوروں پر عمل کریں۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دور کرنے کے لیے عرق لیموں میں چند قطرے گلیسرین ملا کر رات کو سونے سے پہلے آنکھوں کے گرد آہستہ آہستہ مساج کریں۔

دن میں کسی وقت آلو کے قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھ کر لیٹ جائیں۔ اس سے حلقوں میں فرق پڑے گا۔

☼